

تفسیر نمونہ مومنوئی  
پیام قرآن

آیت الہامیہ مرکز اسلامی  
مولانا سید صفدر حسین نقوی  
مہتاب القرآن ٹرسٹ

تفسیر موضوعی

جلد پنجم

زیر نظر

آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی

# پیامِ قرآن

نگارش

اہل قلم کی ایک جماعت

ترجمہ

مولانا سید تقی علی شاقب نقوی

ناشر

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور پاکستان

قرآن سینٹر 24 الفضل مارکیٹ اردو بازار لاہور۔ 0321-4481214, 042-37314311

## جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب-----تفسیر موضوعی: پیام قرآن  
جلد-----پنجم  
مؤلف-----آیۃ اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی  
مترجم-----مولانا سید نقی علی ثاقب نقوی  
فنی معاون-----قلب علی سیال  
کمپوزنگ-----فضل عباس سیال (الحمد گرافکس لاہور)  
سال اشاعت-----جون 2012ء  
ناشر-----مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور  
ہدیہ مکمل سیٹ (جلد اول تا دہم)-----3000 روپے

اس کتاب کی اشاعت کیلئے مدینۃ العلم فاؤنڈیشن کراچی نے بطور قرض  
حسنہ تعاون فرمایا ہے ہماری دعا ہے کہ خداوند عالم ان کی توفیقات خیر میں  
اضافہ فرمائے اور ان کے مرحومین کی مغفرت فرمائے۔ آمین۔ ادارہ۔

### ملنے کا پتہ

قرآن سینٹر 24 الفضل مارکیٹ اُردو بازار لاہور۔ 0321-4481214, 042-37314311

[www.misbahulqurantrust.com](http://www.misbahulqurantrust.com)

عرضِ ناشر

اَلْحَمْدُ لِلّٰہ! مصباح القرآن ٹرسٹ۔۔۔۔ عرصہ دراز سے دورِ حاضر کی بعض عظیم ترین تفاسیر و تالیفات کی نشر و اشاعت کے سلسلہ میں ایک عظیم اور پُر وقار مرکز کی حیثیت سے اُمتِ مسلمہ کیلئے اپنی عاجزانہ خدمات انجام دے رہا ہے۔

دور حاضر میں جب تفسیر قرآن کی بات ہو تو ذہن میں انہی کتب کا تصور آتا ہے جو عموماً صدرِ اوّل سے لے کر آج تک لکھی جا رہی ہیں کہ جن میں سونتوں اور آیتوں کی ترتیب کے مطابق نوبت بہ نوبت ان کی تفسیر کی جاتی ہے۔ مگر تفسیر قرآن کا یہی ایک طریقہ نہیں ہے بلکہ اس کتاب الہی کی تفسیر کے پانچ طریقہ ہیں۔ ۱۔ تفسیر مفرداتی ۲۔ تفسیر ترتیبی ۳۔ تفسیر موضوعی ۴۔ تفسیر ارتباطی ۵۔ تفسیر کلی۔

تفسیر کے پہلے دو طریقے عام طور پر متعارف ہیں۔ بلاشبہ تفسیر قرآن کا قدیمی طریقہ یہ رہا ہے کہ بالترتیب ایک کے بعد دوسری سورۃ کی تفسیر کرتے ہوئے پورے قرآن کی تفسیر مکمل کی جاتی ہے۔ لیکن آیت اللہ جعفر سبحانی اور آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی نے تفسیر کی ایک نئی روش اپنائی ہے کہ جس میں کسی اصل و فرع یا مضمون و عنوان سے تعلق رکھنے والی آیات قرآنی کو ایک مقام پر لا کر ان کی تفسیر بیان کی گئی ہے۔ چونکہ اس میں ہر عنوان اور موضوع کی جملہ آیات اور ان کی تفسیر یکجا کر دی گئی ہے، لہذا اس کو تفسیر موضوعی کا نام دیا گیا ہے۔

ادارہ ہذا کے ذریعے تفسیر موضوعی کا 12 جلدوں پر مشتمل پہلا سلسلہ (قرآن کا دائمی منشور) منظر عام پر آچکا ہے۔ تفسیر موضوعی کا زیرِ نظر سلسلہ (پیام قرآن) جو کہ آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی کی سعی جمیل کا نتیجہ ہے، اس کی دس جلدیں (جلد اول تا جلد دہم) قارئین کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہیں۔

زیر نظر کتاب ”تفسیر موضوعی - پیام قرآن جلد پنجم“ کا اردو ترجمہ مولانا سید نقی علی شاقب نقوی نے کیا ہے۔ جو اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اس کتاب کی اشاعت میں مدینۃ العلم فاؤنڈیشن کراچی نے بطور قرض حسنہ تعاون فرمایا ہے۔

ہمیں اُمید ہے کہ صاحبانِ علم و تحقیق حسبِ سابق ”مُصباح القرآن ٹرسٹ“ کی اس کوشش کو بھی پسندیدگی کی نظر سے دیکھیں گے اور اس گوہرِ ناپاب سے بھرپور علمی و عملی استفادہ فرمائیں گے۔ اور ادارہ کو اپنی قیمتی تجاویز و آراء سے ضرور مستفید فرمائیں گے۔

مزید برآں مصباح القرآن ٹرسٹ کی ویب سائٹ تیاری کے آخری مراحل میں ہے۔ جون 2012ء تک آپ ہماری تمام کتب ہماری ویب

سائٹ [www.misbahulqurantrust.com](http://www.misbahulqurantrust.com) کے ذریعے گھر بیٹھے پڑھ سکتے ہیں۔۔۔ والسلام

## اراکین

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور پاکستان



## فہرست

### تفسیر موضوعی: پیام قرآن جلد نمبر 5

صفحہ نمبر	عنوان
40	۱۔ یوم القیامۃ
41	۲۔ یوم الآخر
43	۳۔ یوم الحساب
44	۴۔ یوم الدین
44	۵۔ یوم الجمع
45	۶۔ یوم الفصل
45	۷۔ یوم الخروج
46	۸۔ یوم الموعود
47	۹۔ یوم الخلود
47	۱۰۔ یوم عظیم
48	۱۱۔ یوم الحسرة
49	۱۲۔ یوم التغابن
50	۱۳۔ یوم التناد
51	۱۴۔ یوم التلاق
52	۱۵۔ یوم ثقیل
53	۱۶۔ یوم الازفة
54	۱۷۔ یوم عسیر
55	۱۸۔ یوم الیم
55	۱۹۔ یوم الوعد
13	۱۔ اہمیت معاقرآنی نظر سے
16	تفسیر و جمع بندی آیات
16	پے در پے تاکیدیں
19	انکارِ معادین گمراہی ہے
22	نتیجہ
24	معاذ کے لیے قرآنی تعبیرات
25	تفسیر و جمع بندی آیات
25	۱۔ قیامت
27	۲۔ مردوں کا زندہ ہونا
28	۳۔ ”بعث“ (اٹھنا)
29	۴۔ حشر
31	۵۔ نشر
32	۶۔ معاد
34	۷۔ لقاء اللہ
35	۸۔ رجوع الی اللہ
38	نتیجہ
39	قرآن میں قیامت کے ستر نام
40	پہلا حصہ

عنوان	صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
۲۰- اليوم الحق	56	۳۷- يوم تبلى السر أثر ۳۸- يوم هم	73
۲۱- يوم مشهود	57	بأرزون	
۲۲- يوم معلوم	57	۳۹- يوم ينظر الهرء ما قدمت يداه	75
۳۳- يوماً عبوساً قمطيراً	58	۴۰- يوم تجد كل نفس ما عملت من	75
۲۴- يوم البعث	59	خير محضراً وما عملت من سوء	
۲۵- يوم نطوى السماء كطي السجل	61	۴۱- يوم تتقلب فيه القلوب والابصار	76
للكتب		۴۲- ليوم تشخص فيه الابصار	
۲۶- يوم تبدل الارض غير الارض	62	۴۳- يوم يتذكر الانسان ما سعى	77
والسبوت		۴۴- يوم تاتي كل نفس تجادل عن نفسها	78
۲۷- يوم تمور السماء مورا	63	۴۵- يوم يقوم الناس لرب العلمين	79
۲۸- يوم تشقق السماء بالغمام ۲۹- ۶۴	64	۴۶- يوم يقوم الاشهاد ۴۷- يوم	79
يوم تشقق الارض عنهم سراعا		يقوم الروح والملك صفا	
۳۰- يوم تكون السماء كالمهل	65	۴۸- يوم لا ينفع مال ولا بنون ۴۹- ۸۱	81
۳۱- يوم ترجف الارض والجبال	66	يوم لا بيع فيه ولا خلال	
۳۲- يوم يسمعون الصيحة بالحق	67	۵۰- يوم لا تجزى نفس عن نفس	82
۳۳- يومهم الذي فيه يصعقون	67	شيئاً ۵۱- يوم لا تملك نفس لنفس	
۳۴- يوم ينفخ في الصور	68	شيئاً ۵۲- يوم لا يجزى والد عن ولده	
۳۵- يوم كان مقداره خمسين الف	69	۵۳- يوم تبيض وجوه وتسود وجوه	83
سنة		۵۴- يوماً كان شره مستطيراً	85
تيراحه	72	۵۵- يوم يفر الهرء من اخيه	85
۳۶- يوم يكون الناس كالفراش	72	۵۶- يوماً يجعل الولدان شيباً	87
المبثوث		۵۷- يوم لا ينطقون	88

صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر	عنوان
105	کیا خاک پھر سے انسان ہو جائے گی؟	۵۸- یوم یکشف عن ساق ویدعون	
106	عقل انسان ایسا نہیں کہہ سکتا؟	88	الی السجود فلا یستطیعون
107	یہ سب افسانے ہیں؟	۵۹- یوم لا ینفع الظلمین معذرتہم	89
108	فقط ایک بار حیات اور ایک بار مرگ	۶۰- یوم یعرض الظالم علی یدیہ	90
109	نتیجہ کلام	۶۱- یوم یرض الذین کفروا علی النار	91
11	پہلا حصہ	۶۲- یوم تقلب وجوہہم فی النار	91
111	دلائل امکان معاد اولین خلقت	۶۳- یوم یدعون الی نار جہنم دعا	92
112	تفسیر و جمع بندی آیات	۶۵- یوم لا مردلہ من اللہ	92
112	تفسیر و جمع بندی آیات	۶۴- یوم نبطش البطشۃ الکبریٰ	93
117	نتیجہ بحث	۶۶- یوم یدع الداع الی شیء نکر	94
117	توضیحات	۶۷- یوم یسحبون فی النار علی	
117	اس دن کہ جب انسان خلق ہوا	وجوہہم	95
118	۲- اللہ کی قدرت مطلقہ	۶۸- یوم نقول لجنہم هل امتلات	96
119	تفسیر و جمع بندی آیات	۶۹- یوم یقول المنافقون و	
119	اس کے لیے ہر چیز آسان ہے	المنافقات...	97
123	نتیجہ بحث	۷۰- لیوم لا ریب فیہ	97
124	۳- احیاء ارض	نتیجہ بحث	98
126	تفسیر و جمع بندی آیات	دلائل معاد	102
126	قیامت مردہ زمینوں کی نئی زندگی کی طرح ہے	عناوین	102
132	ایک سوال کا جواب	پہلا حصہ	102
134	۴- تغیرات جنین	دوسرا حصہ	102
136	تفسیر و جمع بندی آیات	۱- امکان معاد اور منطق مخالفین	103
136	قیامت میں شک ہے تو جنین کو دیکھیں	تفسیر و جمع بندی آیات	105

صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر	عنوان
	۴ (۲) تاریخ میں عقیدے کا تسلسل۔ فطری ہونے	143	نتیجہ بحث
172	کی دلیل	144	۵۔ معاد تو انانیوں کی دنیا میں
173	۲۔ دلیل حکمت	145	تفسیر
174	تفسیر	145	تو انانیوں کی حیات نو کے مظاہر
174	قیامت کے بغیر بے معنی زندگی	150	معاد کے عینی اور تاریخی نمونہ
177	چند وضاحتیں	150	۱۔ عزیر کی موت کے بعد زندگی
	کون عاقل چند روز دنیاوی زندگی کو ہدف خلقت	153	۲۔ ابراہیمؑ اور مسئلہ معاد
177	سمجھتا ہے؟	155	قابل توجہ نکات
179	۳۔ دلیل عدالت	156	۳۔ داستان اصحاب کہف
180	تفسیر	157	کچھ وضاحتیں
180	اگر قیامت نہ ہو تو عدالت بھی نہ ہوگی	157	(۱) واقعے کا خلاصہ
183	چند وضاحتیں	158	اصحاب کہف کا واقعہ۔ تاریخی کتب میں
183	خلقت کا بنیادی قانون۔ عدل	159	اصحاب کہف کی غار کا محل وقوع
185	۴۔ دلیل ہدف و حرکت	159	اصحاب کہف کا واقعہ۔ موجودہ علم کی روشنی میں
186	تفسیر	162	بنی اسرائیل کے فرار کا واقعہ
186	تمام راستے خدا پر منتہی ہوتے ہیں	163	مقتول بنی اسرائیل کا واقعہ
189	چند وضاحتیں	166	وقوع معاد پر دلائل
189	سفر کی آخری منزل	167	۱۔ دلیل فطرت
190	۵۔ دلیل رحمت	167	تفسیر
190	تفسیر	167	معاد، دل کی گہرائیوں میں
193	۶۔ دلیل وحدت	170	وضاحت
194	تفسیر	171	چند وضاحتیں
194	یہ اختلافات کب ختم ہوں گے؟	171	۱۔ قیامت فطرت کے آئینہ میں

صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر	عنوان
220	گروہ اول	198	چند وضاحتیں
222	تفسیر	200	۷۔ دلیل بقائے روح
222	۱۔ بوسیدہ ہڈیاں کیسے زندہ ہوں گی؟	201	تفسیر
223	گروہ دوم	201	استقلال ارواح
224	تفسیر	202	شہدائے فی سبیل اللہ
224	۲۔ کس طرح قبروں سے اٹھیں گے؟	203	آل فرعون پر برزخی عذاب
226	گروہ سوم	204	قبض روح
226	تفسیر	207	چند وضاحتیں
226	۳۔ تم دوبارہ مٹی سے محسوس ہو گے	207	۱۔ بقائے روح
228	گروہ چہارم	208	۲۔ کیا روح مستقل ہے؟
228	تفسیر	211	۳۔ روح کے عدم استقلال پر مادہ پرستوں کے دلائل
228	۴۔ معاد زمینوں کے زندہ ہونے کی مانند ہے	212	دلیل کے کمزور پہلو
229	گروہ پنجم	213	۴۔ استقلال روح کے طرفداروں کی ادلہ
230	تفسیر		الف: (وجود سے باہر کی دنیا سے آگاہی)
230	۵۔ کیا ہمارا مٹی میں سے دوبارہ اٹھنا ممکن ہے؟	213	”واقعیت نمائی کی خاصیت“
230	گروہ ششم	214	ب: شخصیت کی یکتائی
232	تفسیر	216	ایک اشتباہ سے پرہیز
	۶۔ بہشت کی مادی نعمتوں کا معاد جسمانی پر	216	ج: چھوٹے بڑے کا ایک دوسرے پر منطبق نہ ہونا
232	دلالت کرنا	217	سوال
234	گروہ ہفتم	217	پاسخ
236	تفسیر	218	د: مظاہر روح مادی کیفیات سے ہم آہنگ نہیں
236	۷۔ دوزخ کی مادی سزائیں	219	۵۔ کیا روح مجرد ہے؟
236	تفسیر	220	معاد جسمانی

صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر	عنوان
266	توضیحات	238	۸۔ ایک اور زندہ دلیل۔ اعضائے بدن کا گفتگو کرنا
266	۱۔ قبل از تاریخ کی قوموں میں معاد	239	گروہِ نہم
268	۲۔ بعد از تاریخ کی قوموں میں ایمان معاد	239	نتیجہ بحث
268	الف۔ قدیم مصریوں میں معاد	240	چند وضاحتیں
270	ب۔ بابلی	240	معاد جسمانی عقل کی رو سے
270	ج۔ سومری	241	منکرین معاد جسمانی کے شبہات
270	د۔ زرتشتی	241	۱۔ اعادہ معدوم کا محال ہونا
271	ھ۔ چینی	241	وضاحت
271	و۔ جاپانی	243	۲۔ شبہہ آکل و ماکول
271	ز۔ یونانی	243	توضیح
272	ح۔ رومی	246	شبہہ آکل و ماکول کا آخری جواب
272	۳۔ یہودی کتابوں میں عقیدہ معاد	۳۔ دورانِ زندگی موادِ جسمانی کے تبدیل ہونے	
274	۴۔ اناجیل میں ذکر قیامت	248	کا مسئلہ
275	نتیجہ بحث	249	توضیح
276	ایمان معاد اور تربیت	250	۴۔ زمین پر درکار مٹی کی قلت
279	تفسیر	251	۵۔ جسم فانی کے لئے حیاتِ باقی کیونکر؟
279	اعمال صالح کا باعث، معاد پر ایمان	252	۶۔ معاد جسمانی و روحانی بیک وقت کیونکر؟
281	معاد پر ایمان اور استقامت	253	۷۔ کون سا جسم لوٹے گا؟
283	انکار معاد کے منفی نتائج	253	نتیجہ بحث
285	ایمان معاد گناہوں سے بچاتا ہے	254	معاد (گذشتہ اقوام کے کلچر میں)
288	معاد پر ایمان اور حق بینی	256	تفسیر
291	نتیجہ بحث	256	مختلف زمانوں میں عقیدہ معاد
291	توضیحات	265	نتیجہ بحث

صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر	عنوان
334	نتیجہ بحث	291	۱۔ قیامت پر ایمان کے غیر معمولی اثرات
334	چند وضاحتیں	293	۲۔ معاد کا تربیتی اثر روایات کی نظر میں
334	۱۔ برزخ، روایات کے آئینے میں	296	۳۔ ایمان آخرت اور آسودگی حال
339	۲۔ برزخ، عقل و احساس کے میزان میں	299	دروازہ عالم بقاء (۱) موت (۲) برزخ
340	۳۔ عالم برزخ، علماء کی نظر میں	300	(۱) موت عالم بقاء کا دروازہ
343	۴۔ عالم برزخ کی خصوصیات	203	تفسیر
343	الف: سوال قبر	203	۱۔ موت ایک عمومی قانون ہے
345	ب۔ فنثار قبر	304	۲۔ حقیقت موت
346	ج: کن امور کے بارے میں سوال ہوگا؟	305	۳۔ روح قبض کرنے والے فرشتے
347	د: دنیا سے روح کا رابطہ	۴ و ۵	موت کے وقت مومنوں اور ظالموں کی
	ر: دوسروں کے نیک اعمال سے ارواح کا بہرہ	306	حالت
348	مند ہونا	308	۶۔ موت سے ڈرنے کی دلیل
349	۵۔ کیا برزخ عمومیت رکھتی ہے؟	310	۷۔ فلسفہ موت و حیات
350	۶۔ فلسفہ برزخ	312	۸ و ۹۔ عالم نزع کی سختی اور جان کنی کے مقدمات
351	ایک وضاحت	315	”واپس لوٹنے اور تلافی کرنے کی تمنا“
		316	نتیجہ بحث:
		317	چند وضاحتیں
		317	۱۔ موت، درپچہ عالم بقاء
		318	۲۔ موت سے ڈر کیسا؟
		320	۳۔ موت روایات اسلامی میں
		323	(۲) برزخ
		325	تفسیر
		325	برزخ اور اس کی خصوصیات

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

## اہداء

- ان لوگوں کے نام جو قرآن مجید سے عشق کی حد تک محبت کرتے ہیں۔
- ان لوگوں کے نام جو اس چشمہ زلال سے زیادہ آب حیات نوش کرنا چاہتے ہیں۔
- ان لوگوں کے نام جو قرآن مجید کو زیادہ سے زیادہ جاننا اور سمجھنا چاہتے ہیں۔



- ۱۔ حجۃ الاسلام آقائے محمد رضا آشتیانی
  - ۲۔ حجۃ الاسلام آقائے محمد جعفر آملی
  - ۳۔ حجۃ الاسلام آقائے عبدالرسول حسنی
  - ۴۔ حجۃ الاسلام آقائے محمد اسدی
  - ۵۔ حجۃ الاسلام آقائے حسین طوسی
  - ۶۔ حجۃ الاسلام آقائے محمد محمدی
- کے تعاون اور ہمکاری کے ساتھ

## اہمیت معاد قرآنی نظر سے

اشارہ

قرآن مجید کی آیات پر اجمالی نظر سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام کے اعتقادی مسائل میں بعد از توحید کوئی مسئلہ بھی معاد، حیات بعد از موت کے اعتقاد، بندوں کے اعمال کے حساب و کتاب، سزا و جزا اور اجرائے عدالت جتنی اہمیت نہیں رکھتا۔ معاد کے بارے میں مجموعی طور پر قرآن مجید میں ۱۲۰۰ آیات ہیں۔ قرآن کے تقریباً تمام صفحات پر، بدون استثناء، معاد کا ذکر آیا ہے۔ نیز قرآن مجید کی آخری بہت سی سورتیں مکمل طور پر یا زیادہ تر، معاد، مقدمات قیامت اور اس کی علامتوں اور نتائج کے بارے میں بات کرتی ہیں۔ یہ سب صورت حال اس مدعا پر ایک منہ بولتا گواہ ہے۔

قرآن مجید میں جگہ جگہ ایمان باللہ کے ذکر کے بعد دوسرے جہان پر ایمان کا ذکر ہے۔ تقریباً تیس آیات میں یہ دونوں ذکر ایک دوسرے کے ساتھ آئے ہیں:

### ویومنون باللہ والیوم الآخر

یا اس سے ملتی جلتی عبارات ہیں۔ سو سے زیادہ موارد پر ”الیوم الآخرۃ“ یا ”الآخرۃ“ کا ذکر فرمایا گیا ہے:

ایسا کیوں نہ ہو جب کہ:

- ۱۔ اللہ، اس کی حکمت، عدالت اور قدرت پر ایمان معاد پر ایمان کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔
- ۲۔ معاد پر ایمان سے انسانی زندگی بامعنی ہو جاتی ہے اور یہ عقیدہ اس عالم کی زندگی کو بے وقعت ہونے سے بچاتا ہے۔
- ۳۔ معاد پر ایمان انسانی زندگی کو کمال و ارتقاء کے راستے میں روشنی عطا کرتا ہے۔
- ۴۔ معاد پر ایمان تمام قوانین الہی کے اجراء کا ضامن ہے، تہذیب نفوس کا اصلی جذبہ محرکہ ہے، احقاق حقوق کا باعث ہے، فرائض پر عمل کے لیے تحریک ہے، ایثار شہداء کا ذریعہ ہے، فداکاروں کی فداکاری کا وسیلہ ہے اور یہ ایمان انسان کو اپنے بارے میں تجزیہ کرنا سکھاتا ہے۔
- ۵۔ معاد پر ایمان روح دنیا پرستی کو کمزور کرتا ہے جب کہ یہ روح تمام گناہوں اور برائیوں کا باعث بنتی ہے۔ یہ ایمان دنیا کو حقیقی ہدف سے نکال کر سعادت ابدی کے حصول کا وسیلہ بناتا ہے اور ان دو نکتہ ہائے نظر میں کس قدر تفاوت ہے!

۶۔ معاد پر ایمان انسان کو مشکلات میں قوت عطا کرتا ہے۔ موت جو ہمیشہ ایک خوفناک صورت بنا کر افکار انسانی کو بوجھل بنائے رکھتی ہے اور اس کا سکون چھینے رہتی ہے، یہ ایمان اس موت کے چہرے کی وحشت انگیزی کو بدل دیتا ہے اور موت کو فنا و نیستی کے مفہوم سے نکال کر اسے جہان بقاء کے لیے ایک درتچے میں بدل دیتا ہے۔

۷۔ مختصر یہ کہ معاد پر ایمان، جب اس کے ساتھ مبداء عالم ہستی پر ایمان بھی شامل ہو خدا پرستوں اور مادہ پرستوں کے مابین ایک حد فاصل شمار ہوتا ہے۔

اس اشارے کے بعد اب ہم مندرجہ ذیل قرآنی آیات کو گوش جان سے سنتے ہیں:

(۱) اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ ۖ لِيَجْمَعََنَّكُمْ إِلَى يَوْمِ الْقِيَمَةِ لَا رَيْبَ فِيهِ ۚ وَمَنْ

أَصْدَقُ مِنَ اللَّهِ حَدِيثًا ۝ (نساء ۸۷)

(۲) زَعَمَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنْ لَنْ يُبْعَثُوا ۚ قُلْ بَلَىٰ وَرَبِّي لَتُبْعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ

بِمَا عَمِلْتُمْ ۚ وَذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ ۝ (تغابن ۷)

(۳) وَيَسْتَنْبِئُونَكَ أَحَقُّ هُوَ ۖ قُلْ إِنِّي وَرَبِّي إِنَّهُ أَحَقُّ ۚ وَمَا أَنْتُمْ بِمُعْجِزِينَ ۝ (يونس ۵۳)

(۴) وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَأْتِينَا السَّاعَةُ ۚ قُلْ بَلَىٰ وَرَبِّي لَتَأْتِيَنَّكُمْ ۚ

عَلِمِ الْغَيْبِ ۚ (سبا ۳)

(۵) رَبَّنَا إِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَا رَيْبَ فِيهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُخْلِفُ

الْبِعَادَ ۝ (ال عمران ۹)

(۶) أَلَا إِنَّ الَّذِينَ يُمَارُونَ فِي السَّاعَةِ لَفِي ضَلَالٍ بَعِيدٍ ۝ (شوری ۱۸)

(۷) وَالَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَلِقَاءِ الْآخِرَةِ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ ۚ هَلْ يُجْزَوْنَ إِلَّا

مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝ (الاعراف ۱۳۷)

(۸) وَأَنَّ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ أَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ۝

(بنی اسرائیل ۱۰)

(۹) وَقِيلَ الْيَوْمَ نَنْسِفُكُمْ كَمَا نَسِيتُمْ لِقَاءَ يَوْمِكُمْ هَذَا وَمَأْوَاكُمُ النَّارُ وَمَالَكُمْ مِنْ نَصِيرِينَ ﴿۳۴﴾ (جاثیہ ۳۴)

(۱۰) وَإِنْ تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ ءِذَا كُنَّا تُرَابًا ءِإِنَّا لَفِي خَلْقٍ جَدِيدٍ ؕ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِرَبِّهِمْ ؕ وَأُولَٰئِكَ الْأَغْلَىٰ فِي أَعْيَاقِهِمْ ؕ وَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ؕ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿۵﴾ (الرعدہ ۵)

ترجمہ

(۱) اللہ، اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں۔ وہ یقیناً تم سب کو قیامت کے دن جمع کرے گا جس میں کوئی شک نہیں اور اللہ سے بڑھ کر سچا کون ہے؟

(۲) کافروں نے گمان کیا کہ انہیں ہرگز نہیں اٹھایا جائے گا۔ کہہ دیجیے! میرے رب کی قسم تم سب (قیامت میں) مبعوث کئے جاؤ گے۔ پھر جو کچھ تم نے عمل کیا ہو گا اس کی تمہیں خبر دی جائے گی اور یہ اللہ کے لیے آسان ہے۔

(۳) آپؐ سے پوچھتے ہیں: کیا وہ (جزا و سزا الہی کا وعدہ) حق ہے؟ کہہ دیجئے ہاں! اللہ کی قسم یقیناً حق ہے اور تم اسے روک نہیں سکتے۔

(۴) کافروں نے کہا کہ قیامت ہرگز ہم تک نہ پہنچے گی۔ کہہ دیجیے: ہاں، میرے رب کی قسم، جو غیب سے آگاہ ہے، (قیامت) تم سب تک پہنچے گی۔

(۵) پروردگار! تو لوگوں کو اس روز جمع کرے گا جس میں کوئی شک نہیں۔ اللہ اپنے وعدے کی ہرگز خلاف ورزی نہیں کرتا۔

(۶) ..... آگاہ رہیں کہ جو قیامت میں شک کرتے ہیں عین گمراہی میں ہیں۔

(۷) اور جو لوگ ہماری آیات اور ملاقات قیامت کی تکذیب (اور انکار) کرتے ہیں ان کے اعمال نابود ہو جائیں گے۔ جو کچھ انہوں نے عمل کیا ہے کیا اس کے سوا بھی انہیں کوئی جزا ملے گی؟

(۸) جو لوگ قیامت پر ایمان نہیں لاتے ان کے لیے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

(۹) اور ان سے کہا جاتا ہے: آج ہم تمہیں بھلا دیں گے جیسے تم نے آج کی ملاقات کو بھلا دیا تھا اور تمہارا ٹھکانا دوزخ ہے اور تمہارا کوئی مددگار نہیں۔

(۱۰) اور اگر تو (کسی چیز پر) تعجب کرنا چاہتا ہے تو عجیب تو ان کی بات ہے جو کہتے ہیں کہ کیا جب ہم خاک ہو جائیں گے تو (پھر سے زندہ ہوں گے) اور پھر خلقت تازہ پائیں گے؟ یہ وہ لوگ ہیں کہ جو اپنے رب کے کافر ہو گئے ہیں۔ طوق و زنجیر ان کی گردنوں میں ہیں، وہ اہل نار ہیں جس میں ہمیشہ رہیں گے۔

## تفسیر و جمع بندی آیات

### پے در پے تاکیدیں

مندرجہ بالا آیات میں معاد اور حیات بعد از موت کے مسئلے پر بہت تاکید کی گئی ہے اور اسے مختلف صورتوں میں ذکر کیا گیا ہے۔ یہ سب کچھ اس خاص اہمیت کا مظہر ہے کہ جو قرآن اس مسئلے کو دیتا ہے۔

پہلی آیت میں اس روز کہ جس میں کوئی شک نہیں، انسانوں کے یقینی اجتماع کی بات کی گئی ہے فرماتا ہے: اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں اور وہ تم سب کو یقینی طور پر اس قیامت کے دن جمع کرے گا جس میں کوئی شک و انکار نہیں (اللہ لا الہ الا هو لیجمعنکم الی یوم القیامة لا ریب فیہ)

اس کے بعد مزید تاکید کے لیے اضافہ فرماتا ہے: ”اللہ سے بڑھ کر سچا کون ہے؟ (ومن اصدق من اللہ حدیثاً)۔ آیت کا آغاز و اختتام اور اس کا ہر حصہ اس مسئلے پر تاکید ہے۔ یہ اس اہمیت کا نشان دہندہ ہے جو قرآن کی نظر میں اس مسئلے کو حاصل ہے۔<sup>[۱]</sup> یہ بات قابل توجہ ہے کہ مقائیس اللغہ کے بقول ”ریب“ دراصل ہر طرح کے شک کے معنی میں ہے، یا ایسا شک جو خوف و وحشت سے مملو ہو۔ اس کلمے کا ”حاجت“ پر اطلاق بھی اس وجہ سے ہے کہ صاحب حاجت کو عموماً اس کے حصول میں شک ہوتا ہے، شک ہاتھ سے جانے کے خوف کے ساتھ۔

”فروق اللغہ“ میں ”شک“ اور ”ریب“ میں یہ فرق بیان کیا گیا ہے کہ ”ارتباب“ ایسا شک ہے جس میں تہمت بھی شامل ہو۔ قرآن مجید میں معاد کے بارے میں اس لفظ کا استعمال شاید اس وجہ سے ہو کہ مخالفین معاد اظہار شک کے علاوہ رسول اللہ پر بھی تہمت لگاتے تھے کہ انہوں نے یہ باتیں اپنے پاس سے گھڑ لی ہیں۔

البتہ اس سوال کی گنجائش باقی رہ جاتی ہے کہ قرآن نے اس جگہ اور اس جیسی دوسری جگہوں پر صرف ادعاء پر قناعت کیوں کی ہے اور کوئی دلیل کیوں ذکر نہیں فرمائی؟

[۱] قرآن میں اور بھی بہت سی آیات ہیں کہ جو اس امر پر تاکید کرتی ہیں کہ معاد میں کوئی شک نہیں ہے۔ مثلاً حج ۷۰، آل عمران ۹، ۲۵، انعام

۱۲، کہف ۲۱، مؤمن ۵۹، شوریٰ ۷، جاثیہ ۲۶ و ۳۳۔

اس کی وجہ اولاً یہ ہے کہ قرآن مجید میں جگہ جگہ دلائل معاد کا ذکر ہے اور بار بار اسے پیش کیا گیا ہے۔ لہذا اس امر کی ضرورت نہ تھی کہ ہر آیت میں ان دلائل کا تکرار کیا جاتا۔ ثانیاً گویا قرآن مجید اس حقیقت کو بیان کرنا چاہتا ہے کہ معاد کے دلائل اس قدر روشن اور واضح ہیں کہ اس میں کسی شک و تردید کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی۔ [۱]

دوسری آیت میں رسول اکرمؐ کو حکم دیا گیا ہے کہ تاکید کے ساتھ قسم کھائیں کہ قیامت اور حشر نشر یقینی ہے۔ فرماتا ہے: کافروں نے کہا: ہمیں ہرگز اٹھایا نہیں جائے گا۔ کہہ دو! ہاں میرے رب کی قسم کہ تم سب کو اٹھایا جائے گا۔ پھر جو کچھ تم نے کیا اس کی تمہیں خبر دی جائے گی اور یہ بات اللہ تعالیٰ کے لیے آسان ہے (زعم الذین کفرو ان لن یبعثوا قل بل ینزلنا ربنا ربنا لتبعثن ثم لتنبون بما عملتم وذلک علی اللہ یسیر)۔

ہم جانتے ہیں کہ قسم کھانا عام طور پر اچھا کام نہیں، وہ بھی پروردگار کی قسم۔ لہذا قرآن لوگوں کو اس سے منع کرتا ہے اور کہتا ہے:

”ولا تجعلوا اللہ عرضة لایمانکم“

”اپنی قسموں میں اللہ تعالیٰ کو شریک نہ کرو۔“ (بقرہ ۲۲۴)

لیکن کبھی بات اتنی اہم ہوتی ہے کہ اس وقت قسم کھانا نہ صرف منع نہیں بلکہ ضروری ہوتا ہے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ لتبعثن اور لتنبون میں موجود تاکیدات کے علاوہ آیت کے آخر میں بھی تصریح کی گئی ہے کہ یہ کام اللہ کے لیے آسان ہے، لہذا اس میں شک و تردید نہ کرنا۔ [۲]

تیسری آیت میں یہی بات پیغمبر اکرمؐ اور مشرکین کے درمیان ہونے والے سوال و جواب کی صورت میں ذکر کی گئی ہے۔ فرماتا ہے:

”وہ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا عذاب الہی کا وعدہ حق ہے؟ (ویستنبونک احق ہو)۔

توجہ رہے کہ ”یستنبئونک“ ”نبا“ سے ہے جس کے معنی ہیں ”اہم خبر“۔ مفردات میں راغب کے مطابق یہ ایسی مفید اور

[۱] توجہ رہے کہ لیجمعنکم میں لام علامت قسم ہے۔ پھر اس کی تاکید ثقیلہ کا نون بھی آیا ہے۔ اس کے بعد ”لاریب فیہ“ کہہ کر تاکید کی گئی ہے۔ پھر آخر میں سب سے زیادہ تاکید کا جملہ ہے: ومن اصدق من اللہ حدیثاً (اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر سچی بات کرنے والا کون ہے) یہ کہ ”لیجمعن“ یہاں ”الی“ کے ساتھ متعدی کیوں ہوا ہے جب کہ قاعدتاً ”فی“ کے ساتھ ہونا چاہیے۔ اس سلسلے میں بعض مفسرین نے کہا ہے کہ ایسا اس لیے ہے کہ ”لیجمعن“ ”لیحشرن“ کے معنی میں ہے کہ جو ”الی“ کے ساتھ متعدی ہوتا ہے یا پھر ”الی“ ”یہاں فی“ کے معنی میں ہے۔

[۲] ”زعم“ (بروزن طعم) دراصل ایسی بات کے معنی میں ہے جو یقیناً یا احتمالاً جھوٹ ہو۔ بعض اوقات باطل خیال جس میں بات نہ ہو کے لیے بھی یہ لفظ آتا ہے۔ شیخ طوسی نے بتیان میں، قرطبی نے اور روح البیان کے مصنف وغیرہ نے نقل کیا ہے کہ ”زعم“ (بروزن طعم) دروغ کی کنیت ہے۔

باعظمت خبر کے معنی میں ہے جس کے بارے میں انسان علم یا ظن غالب رکھتا ہو اور اگر (فائدہ، عظمت، علم) یہ تین امور اس میں نہ ہوں تو اسے ”نبأ“ نہیں کہا جاتا (لہذا مشکوک، کم اہم یا بے فائدہ خبروں کو ”نبأ“ نہیں کہتے۔ یہ جو سورۃ میں نبا کی توصیف ”عظیم“ بیان کی گئی ہے تو یہ بیشتر تاکید کے لیے ہے)۔ یہ جو پیغمبر کو ”نبی“ کہا جاتا ہے تو یہ بھی اسی لیے ہے کہ اس کی خبریں ان تین خصوصیات کی حامل ہوتی ہیں۔

اس کے بعد رسول اکرم کو حکم دیا گیا ہے: کہہ ہاں! میرے رب کی قسم یہ حق ہے (قل ای و ربی انہ لحق)۔

”رب“ کا عنوان یہاں اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ قیامت ربوبیت پروردگار کے تسلسل اور اس کے مظاہر میں سے ہے۔ اس بات کی وضاحت انشاء اللہ دلائل معاد کی گفتگو میں آئے گی۔

آیت کے آخر میں پھر مزید تاکید کی گئی ہے۔ کہتا ہے: ”تم اللہ کو عاجز نہیں کر سکتے اور نہ ہی اس کی عدالت کی گرفت سے فرار کر سکتے ہو۔“ (وما انتم بمعجزین)۔

کچھ مفسرین نے اس آیت کو حقانیت قرآن یا نبوت پیغمبر اسلام کی طرف اشارہ سمجھا ہے جب کہ آیت کا ماقبل و مابعد بخوبی گواہی دیتا ہے کہ نبأ سے مراد معاد اور قیامت میں بدکاروں پر ہونے والے عذاب کا مسئلہ ہی ہے جسے مختلف تاکیدوں کے ساتھ ایک حقیقت مسلم کے طور پر ذکر کیا گیا ہے۔

کلمہ ”ای“ اور ”ربی“ کی قسم اور ”ان“ اور ”لحق“ میں لام اور خود کلمہ ”حق“ اور اس جملے کا اسمیہ ہونا اور ”وما انتم بمعجزین“ کا جملہ، یہ سب کچھ اس سلسلے میں تاکید کو ظاہر کرنے کے لیے ہے۔

چوتھی آیت میں بھی مطلب ایک نئے انداز سے پیش کیا گیا ہے۔ پہلے کافروں کی زبانی نقل کیا گیا ہے کہ انہوں نے کہا: ”قیامت ہرگز ہم تک نہیں پہنچے گی“ (وقال الذین کفرو لا تأتینا الساعة)۔

اس کے بعد رسول اللہ کو حکم دیا گیا ہے: ”کہہ دو! میرے اس رب کی قسم کہ جو اسرارِ نہاں سے واقف ہے یقیناً اور مسلماً قیامت تمہیں آ لے گی۔“ (قل بلی و ربی لتأتینکم عالم الغیب)۔

”عالم الغیب“ کا ذکر ممکن ہے اس لئے ہو کہ منکرین معاد کا انکار اس وجہ سے تھا کہ وہ کہتے تھے: یہ پراگندہ ذرات جو زمین میں ادھر ادھر بکھر گئے ہیں، انہیں کون جمع کر سکتا ہے؟ اور انسانوں کے اعمال کہ جو سب محو فنا ہو گئے ہیں اور جن کے کوئی آثار باقی نہیں رہے کون ان کا حساب کر کے سزا و جزا دے سکتا ہے؟ قرآن ایک کلمے میں اس کا جواب دیتا ہے: وہی اللہ جو عالم الغیب اور جملہ اسرارِ نہاں سے آگاہ ہے۔ یہ کام اسی کے ذمہ ہے۔

رہا یہ سوال کہ قیامت کا ایک نام ”ساعة“ کیوں ہے، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ارباب لغت کے مطابق ”ساعة“ دراصل اجزاء زمان کے ایک چھوٹے سے جز کے معنی میں ہے، یا دوسرے لفظوں میں زود گزر لحظات۔ قیامت میں بندوں کا حساب یا اصل قیام قیامت چونکہ بسرعت

انجام پائے گا لہذا قیامت کے لئے یہ نام منتخب ہوا ہے [۱]۔

ضمناً توجہ رہے کہ لسان العرب کے مطابق کلمہ ”ساعت“ دنیا کے خاتمے کے ناگہاں لُحْطے کو بھی کہا جاتا ہے اور قیام قیامت کو بھی، کیونکہ یہ بالکل اچانک واقع ہوگی۔

بعض نے ساعت کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے:

۱۔ ساعت کبریٰ

۲۔ ساعت وسطیٰ

۳۔ ساعت صغریٰ

پہلی ساعت سے مراد ہے روزِ معاد، دوسری سے اسی زمانے کے لوگوں کی اچانک موت (جیسے قومِ نوح کی موت، جو طوفان کی وجہ سے اکٹھی غرق ہو گئی) اور تیسری سے ہر انسان کے مرنے کی گھڑی۔ [۲]

پانچویں آیت میں یہی مفہوم را سخون فی العلحد کی زبانی ذکر ہے۔ وہ جب اللہ سے مناجات کرتے ہیں تو معاد و قیامت کا ذکر ایک قطعی ترین مسئلے کے طور پر کرتے ہیں۔ کہتے ہیں: پروردگار! تو لوگوں کو اس دن جمع کرے گا جس میں کوئی شک و شبہ نہیں، (ربنا انک جامع الناس لیوم لا ریب فیہ)۔

مزید تاکید کے لئے اضافہ کرتا ہے: ”اللہ اپنے وعدے کی ہرگز خلاف ورزی نہیں کرتا“ (ان اللہ لا یخلف المعیاد)۔

اس آیت میں بھی متعدد تاکیدیں نظر آتی ہیں۔ (کلمہ ان جملہ اسمیہ، ”لا ریب فیہ“ اور جملہ ”ان اللہ لا یخلف المعیاد“)۔

## انکارِ معاد عین گمراہی ہے

یہاں تک تو تاکیدات تھیں۔ اس کے بعد پانچ آیات میں قیامت اور معاد کے منکرین کے لئے مختلف تہدیدیں آئی ہیں۔ ہر ایک کی اپنی مخصوص عبارت ہے، مثلاً چھٹی آیت میں فرماتا ہے: ”آگاہ رہنا کہ جو قیامت میں شک کرتے ہیں عین گمراہی میں ہیں (الا ان الذین یمارون فی الساعۃ لفی ضلال بعید)۔

”یمارون“ دراصل ”مرأء“ یا ”مریہ“ سے لیا گیا ہے۔ ”مقایس اللغۃ“ کے مطابق اس کے دو معنی ہیں: ایک جانور کے تھن پر دودھ دوہنے کے لیے ہاتھ پھیرنا اور دوسرا صلابت و استحکام۔ لیکن راغب نے مفردات میں صرف ایک پہلے معنی ہی کو ذکر کیا ہے۔

[۱] فعل ”ساع“ زوال کے معنی میں آیا ہے جس میں زود گزر کا مفہوم پنہاں ہے۔ المنار میں ہے کہ ساعۃ اصل لغت میں چھوٹے سے زمانے کے معنی میں ہے جس کا تعین اس معین عمل کے ذریعے ہوتا ہے جو اس میں واقع ہوتا ہے۔ (ج ۷ ص ۵۹)

[۲] تاج العروس فی شرح القاموس و مفردات راغب۔



بعد ازاں یہ کلمہ تردد و شک کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ اگرچہ راغب کے مطابق اس کا مفہوم شک سے محدود تر ہے (شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ”مریہ“ ایسے شک کو کہتے ہیں جس میں جستجو اور تحقیق پائی جائے، جیسے دودھ دوھنے والا تھن سے دودھ نکالنے کے لیے کوشش و جستجو کرتا ہے)۔

”ہمارا“ بحث میں مجادلہ اور جدال میں اصرار کے معنی میں ہے۔ گویا طرفین میں کوئی نہیں چاہتا کہ جو کچھ دوسرے کی فکر میں ہے اسے نکال لائے۔ یا صاحب مقائیس کے مطابق ان میں سے ہر ایک بحث میں استحکام و خشونت رکھتا ہے اور جیسا کہ اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے ”مریہ“ کے ایک معنی استحکام ہیں۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ ”ضلال بعید“ کی تعبیر قرآن مجید میں دس جگہ آئی ہے جو عموماً کفار، مشرکین اور منکرین معاد کے بارے میں ہے۔ اس تعبیر سے بخوبی ظاہر ہو جاتا ہے کہ عمیق گمراہی اس گروہ کا خصوصی وصف ہے کیونکہ اگر اللہ اور روز جزا پر ایمان ہو تو پھر گمراہی سطحی ہوگی اور ہدایت اور جادۂ حق پر واپسی کا احتمال زیادہ ہوگا۔ لیکن توحید یا معاد کا انکار انسان کو گمراہی کے آخری مرحلے تک لے جاتا ہے اور ہدایت کی حدود یعنی صراطِ مستقیم سے بالکل دور کر دیتا ہے۔ ایک اور تعبیر کے مطابق خدا شناسی اور معاد کے دلائل اتنے روشن ہیں کہ یہ حسی مسائل کی مانند ہیں اور جو ان دو امور میں گمراہ ہو جائے اس کی گمراہی عمیق ہو جائے گی۔

ساتویں آیت میں منکرین معاد کے لئے حبط اعمال (نیک کاموں کا اجر ضائع ہو جانا) کا ذکر ہے۔ فرماتا ہے: ”جنہوں نے ہماری آیات اور ملاقاتِ آخرت کی تکذیب کی ان کے اعمال ضائع ہو جائیں گے۔ جو کچھ وہ عمل کرتے ہیں کیا انہیں اس کے علاوہ سزا ملے گی (والذین کذبوا بآیتنا ولقاء الاخرۃ حبطت اعمالہم هل یجزون الا ما کانوا یعملون)۔“<sup>[۱]</sup> آیات و روایات کی تعبیرات میں یہ لفظ بعض گناہوں کی وجہ سے ثوابِ اعمال ضائع ہو جانے کے معنی میں ہے۔

لسان العرب میں ہے کہ ”حبط“ کے معنی ہیں کہ انسان کوئی کام انجام دے اور پھر اسے باطل کر دے۔ کیا ”حبط“ کلی طور پر طاعات و معاصی میں حکم فرما ہے اور یہ دائماً ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں؟ علم کلام کے علماء کے درمیان اس سلسلے میں جو گفتگو ہوئی ہے، انشاء اللہ متعلقہ مقام پر ہم تفصیل سے اسے بیان کریں گے اور اس کے بارے میں بحث کریں گے۔ البتہ قضیہ جزئیہ کی صورت میں اس کے بارے میں شک نہیں کہ کفر کی مانند بعض امور تمام نیک اعمال کا اجر ضائع کر دیتے ہیں۔ یعنی اگر کوئی شخص بے ایمان دنیا سے چلا جائے تو اس کے تمام اعمال خیر اس طرح محو و نابود ہو جاتے ہیں جیسے تیز ہوا خاکستر کو اڑا کر لے جاتی ہے۔ مندرجہ بالا آیت آیاتِ الہی اور معاد کے منکرین کے بارے میں یہی کچھ کہتی ہے اور یہ بات اس اہمیت پر ایک روشن دلیل ہے کہ جو قرآن مجید کی نظر میں معاد کو حاصل ہے۔

[۱] مقائیس اللغہ (مادہ ”حبط“)

آٹھویں آیت میں آخرت پر ایمان نہ رکھنے والوں کو عذاب الیم کی صریح تہدید کی گئی ہے۔ فرماتا ہے: ”جو لوگ قیامت پر ایمان نہیں لائے ان کے لیے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے (وان الذین لا یؤمنون بالآخرۃ اعتدنا لہم عذابا الیم)۔ ایک طرف تو یہ کہتا ہے کہ یہ جزا بھی سے تیار ہے تاکہ کوئی یہ گمان نہ کرے کہ ایسا وعدہ کیا گیا ہے جس پر عمل درآمد میں تاخیر ہے اور دوسری طرف عذاب الیمی کو الیم اور دردناک قرار دیا گیا ہے۔ تاکہ معاد پر ایمان کی اہمیت کو زیادہ واضح کیا جاسکے۔

”عذاب الیم“ کا کلمہ قرآن مجید کی آیات میں دسیوں بار آیا ہے اور زیادہ تر کافروں اور منافقوں کے بارے میں ہے۔ کہیں کہیں بڑے بڑے گناہوں کے بارے میں اس کا ذکر ہوا ہے، مثلاً جہاد سے کنارہ کشی اختیار کرنا (توبہ ۳۹)، قصاص لینے ہوئے تجاوز کرنا (بقرہ ۱۷۸)، فحشاء کی شہرت کرنا (نور ۱۹) یا ظلم و ستم کرنا (زخرف ۶۹) اور اسی طرح کے دوسرے عظیم اور کبیرہ گناہوں کے بارے میں یہ کلمہ استعمال ہوا ہے۔

نویں آیت میں روزِ قیامت کو بھول جانے والوں کے لئے تین دردناک سزائیں بیان کی گئی ہیں۔ فرماتا ہے: قیامت میں (کافروں سے) کہا جائے گا کہ ہم آج تمہیں بھلا دیں گے جیسے تم نے آج کی ملاقات کو بھلا دیا تھا (وقیل الیوم نנסاکم کما نسیتم لقاء یومکم هذا)۔

اور تمہارا ٹھکانا آگ ہے (وما واکم النار)۔

اور تمہارا کوئی مددگار نہیں (وما لکم من نصرین)۔

درحقیقت قیامت کو بھول جانا ہر طرح کی گمراہی کا سرچشمہ ہے جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے:

إِنَّ الَّذِينَ يَضِلُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ مِّمَّا نَسُوا يَوْمَ

الْحِسَابِ ﴿۳۱﴾

”جو لوگ اللہ کے راستے سے بھٹک گئے ہیں ان کے لئے شدید عذاب ہے، اس لئے کہ انہوں نے روزِ حساب کو

فراموش کر دیا۔“ (ص ۲۶) ﴿۳۱﴾

البتہ خدا ہر جگہ حاضر ہے اور ہر چیز اس کے سامنے ہے۔ اس کے لئے بھول جانا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ مراد یہ ہے کہ ایسے بھول جانے والوں کو اپنی رحمت سے یوں بے نصیب کر دیتا ہے گویا وہ بھلا دئے گئے ہوں۔ (غور کیجئے گا)۔

آخر کار دسیوں اور آخری آیت میں منکرینِ معاد کو آگ میں بیٹھکی اور عذاب کی جاودانی کی تہدید دی گئی ہے۔ رسول اکرمؐ کی طرف روئے سخن کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”اگر تو تعجب کرنا چاہے تو ان لوگوں کی بات عجیب ہے جو کہتے ہیں: ”کیا جب ہم خاک ہو جائیں تو نئی خلقت پائیں گے۔“ (وان تعجب فعجب قولہم اذ انکنا ترابا انما لفی خلق جدید)۔

پھر اضافہ فرماتا ہے: ”یہ وہ لوگ ہیں کہ جو اپنے رب کے لئے کفر کرتے ہیں اور وہ طوق و زنجیر ہیں کہ جو ان کی گردنوں میں ہیں اور وہ اہل نار ہیں۔ ہمیشہ اس میں رہیں گے۔“ (اولئک الذین کفروا ابرہم و اولئک الاغلال فی اعناقہم و اولئک اصحاب النار ہم فیہا خلدون)۔

آیت کے شروع میں کفار کے تعجب کا ذکر ہے۔ پھر اس تعجب کو عجائب میں سے شمار کیا گیا ہے۔ یعنی کیا ایسی واضح بات، جس پر اس قدر روشن دلائل موجود ہیں، پر تعجب کیا جاسکتا ہے؟ آیت کے آخر میں ان کا قیدی کی صورت میں تعارف کروایا جا رہا ہے جن کی گردنوں میں طوق و زنجیر ہیں۔ تعصب، جہالت اور ہوا پرستی سے بڑھ کر طوق و زنجیر اور کیا ہو سکتے ہیں جو ان سے ہر طرح کی آزادی فکر چھین لیتے ہیں، یہاں تک کہ اتنا واضح مسئلہ ان کے لئے باعث تعجب بن گیا ہے، صرف اس لئے کہ یہ ان کی ہوائے نفس اور اندھی تقلید کے خلاف ہے۔  
توجہ رکھئے گا کہ یہ نہیں کہتا کہ قیامت میں ان کی گردنوں میں طوق و زنجیر ہوں گے۔ بلکہ ظاہر آیت یہ ہے کہ اس وقت وہ ایسے ہیں جیسا کہ اشعار عرب میں ہے۔

### لہم عن الرشدا غلال و اقیاد

اُن کے طوق و زنجیر انہیں ہدایت سے دور رکھے ہوئے ہیں۔

بعض مفسرین نے آیت کو ان کی قیامت کی حالت کی طرف اشارہ سمجھا ہے، یعنی اس دن ان کی گردنوں میں طوق و زنجیر پڑیں گے [۱] بعض نے ہر دو احتمال ذکر کیے ہیں۔ [۲] لیکن بعض نے اسے دنیا میں ان کی وضع کی طرف اشارہ شمار کیا ہے، جیسا کہ علامہ طباطبائی مرحوم تفسیر المیزان میں کہتے ہیں:

”یہ جملہ مادی دنیا میں گرفتاری، ہوائے نفس پر بھروسہ، جہالت کی قید اور انکار کی زنجیروں کی طرف اشارہ ہے۔“ [۳]

مسلم ہے کہ ایسے طوق و زنجیر جو انسان اس دنیا میں اپنے اختیار سے اپنے ہاتھ، پاؤں اور گردن میں ڈال لیتا ہے، قیامت میں آتشیں طوق و زنجیر کی صورت میں تجسم اختیار کر لیں گے اور ایسے انسان کو پروردگار کے مقام قرب کی طرف بڑھنے سے روک دیں گے۔

نتیجہ

مندرجہ بالا آیت سے مجموعی طور پر اور دیگر آیات سے جو آئندہ مباحث میں آئیں گی، سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ قرآن مجید کس

[۱] مجمع البیان، سورہ رعد، آیت ۵ کے ذیل میں، تفسیر قرطبی ج ۵ ص ۵۱۳

[۲] فخر الدین رازی، ج ۱۹ ص ۹

[۳] تفسیر المیزان، ج ۱۱ ص ۳۲۹

حد تک معاد پر ایمان کو اہمیت دیتا ہے اور کس طرح سے اسے ایمان کا ایک پایہ اور رکن قرار دیتا ہے۔ قرآن کی نظر میں اس ایمان کے نہ ہونے کا نتیجہ عمیق گمراہی اور ضلالِ بعید ہے۔ اس سے انسان حق سے دور ہو جاتا ہے، عذابِ الیم کا مستحق ٹھہرتا ہے اور اس کا نتیجہ دوزخ میں دائمی طور پر رہنا ہے۔ اس کا انکار آزادیِ فکر نہ ہونے اور جہل، عناد اور ہٹ دھرمی کی زنجیروں میں قید ہونے کی نشانی ہے۔ بالکل اسی دلیل کی بناء پر قرآن میں توحید اور خدا شناسی کی بحث کے بعد یہ گفتگو سب سے زیادہ وسعت رکھتی ہے۔

## معاد کے لیے قرآنی تعبیرات

### اشارہ

قرآن مجید میں معاد کے بارے میں سینکڑوں آیات ہیں جن میں بالکل متنوع تعبیرات آئی ہیں۔ ہر تعبیر معاد کے مفہوم کے کسی ایک پہلو کی طرف اشارہ ہے۔ مجموعی طور پر یہ تعبیرات اس مسئلے کی گہرائی اور موت کے بعد کی زندگی کے اہداف بیان کرتی ہیں۔ معاد کے بارے میں متنوع قرآنی تعبیرات ہماری آنکھوں کے سامنے اس اہم اعتقادی مسئلے کے تازہ افق پیش کرتی ہیں۔ اس حوالے سے ہم ان کی وضاحت کرتے ہیں۔

اس مسئلے کے بارے میں قرآن کی اہم ترین اور نمایاں ترین تعبیرات آٹھ ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

- ۱۔ ”قیام الساعة“ (قیامت)
  - ۲۔ ”احیاء موتی“ (مردوں کو زندہ کرنا)
  - ۳۔ ”بعث“ (اٹھانا)
  - ۴۔ ”حشر“ (جمع کرنا)
  - ۵۔ ”نشر“ (پھیلانا)
  - ۶۔ ”معاد“ (اللہ کی طرف بازگشت)
  - ۷۔ ”لقاء رب“ (دیدار پروردگار)
  - ۸۔ ”رجوع“ (اس کی طرف لوٹ جانا)
- اس اشارے کے بعد ہم قرآن کی طرف لوٹتے ہیں اور ان مندرجہ بالا تعبیرات کے کچھ نمونے دیکھتے ہیں۔

### آیات

- (۱) وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ يُبْلِسُ الْمُجْرِمُونَ ﴿١٢﴾ (روم ۱۲)
- (۲) ذَلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ هُوَ الْحَقُّ وَأَنَّهُ يُحْيِي الْمَوْتَىٰ وَأَنَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٦﴾ (حج ۶)
- (۳) وَأَنَّ السَّاعَةَ آتِيَةٌ لَا رَيْبَ فِيهَا ۖ وَأَنَّ اللَّهَ يَبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُورِ ﴿٤﴾ (حج ۴)
- (۴) وَإِنَّ رَبَّكَ هُوَ يُحْشِرُهُمْ ۖ إِنَّهُ حَكِيمٌ عَلِيمٌ ﴿٢٥﴾ (حجر ۲۵)

- (۵) وَاللّٰهُ الَّذِیْ اَرْسَلَ الرِّیْحَ فَتُثْبِتُ سَحَابًا مِّنْهُ اِلٰی بَلَدٍ مَّيِّتٍ فَاُحْيٰی بَاہِ  
الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِہَا ۚ کَذٰلِکَ النُّشُوْرُ ۙ (فاطر ۹)
- (۶) کَمَا بَدَا کُمْ تَعُوْدُوْنَ ۙ (اعراف ۲۹)
- (۷) قَدْ خَسِرَ الَّذِیْنَ کَذَّبُوْا بِلِقَاءِ اللّٰهِ وَمَا کَانُوْا مُهْتَدِیْنَ ۙ (یونس ۴۵)
- (۸) کُلُّ نَفْسٍ ذٰلِقَةٌ لِّلْمَوْتِ ۚ ثُمَّ اِلَیْنَا تُرْجَعُوْنَ ۙ (عنکبوت ۵۷)

ترجمہ

- (۱) جس روز قیامت برپا ہوگی مجرمین ناامیدی اور غم و اندوہ میں ڈوب جائیں گے۔
- (۲) یہ اس لیے ہے تاکہ جان لو کہ اللہ حق ہے اور وہ مردوں کو زندہ کرتا ہے اور ہر چیز پر قادر ہے۔
- (۳) اور یہ ہے قیامت جس میں کوئی شک نہیں اور قبر میں سب آرام کرنے والوں کو وہ زندہ کرے گا۔
- (۴) اور تیرا رب (قیامت میں) سب کو جمع اور محشور کرے گا کیونکہ وہ حکیم و دانایہ۔
- (۵) اللہ وہ ہے جس نے ہواؤں کو بھیجا تاکہ وہ بادلوں کو حرکت دیں، ان بادلوں کو ہم مردہ زمینوں کی طرف لے جاتے ہیں اور ان کے ذریعے زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کرتے ہیں۔ قیامت بھی اسی طرح ہے۔
- (۶) (اور جان لو کہ) جیسے تمہیں ابتداء میں پیدا کیا تھا (قیامت میں پھر اسی طرح) لوٹ جاؤ گے۔
- (۷) جن لوگوں نے لقاء اللہ (اور قیامت) کا انکار کیا تھا انہوں نے نقصان اٹھایا اور ہدایت نہ پائی۔
- (۸) ہر انسان ذائقہ موت چکھے گا، پھر ہماری طرف لوٹ آئے گا۔

## تفسیر و جمع بندی آیات

### ۱۔ قیامت

رستاخیز کے لیے معروف ترین تعبیر ”قیامت“ ہے۔ یہ لفظ ”قیام“ سے لیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں ۷۰ مقامات پر اس عظیم دن کو ”یوم القیامۃ“ کہا گیا ہے۔ بعض آیات میں، جیسے زیر بحث پہلی آیت میں کہا گیا ہے ”جس دن ساعت قائم ہوگی“۔ فرماتا ہے: ”جس دن ساعت

برپا ہوگی، مجرمین ناامید ہو جائیں گے۔ (یوم تقوم الساعة یبلس المجرمون)۔<sup>[۱]</sup>  
گنہگاروں کے لیے لازم ہے کہ اس دن مایوس، غمگین، ساکت اور خاموش ہوں کیونکہ وہ اپنے اعمال کے نتائج دیکھیں گے اور گزرے ہوئے کی تلافی و تدارک کی کوئی صورت نہ ہوگی۔

فخر الدین رازی اپنی تفسیر میں کہتے ہیں:

”مایوسی دو طرح کی ہے:

کبھی انسان کے لیے راحت کا موجب ہوتی ہے اور یہ ایسی صورت میں ہوتی ہے جب یہ ایسے امور سے متعلق ہو کہ انسان کو جن کا انتظار ہو، جب کہ وہ اس کی ضروریات زندگی میں سے نہ ہوں۔ ایسے مواقع پر مایوسی راحت کا باعث ہوتی ہے۔  
لیکن کبھی ایسے امور کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے جن کی انسان کو شدید ضرورت ہو۔ واضح ہے کہ ایسے امور میں یاس حیرت و سرگردانی اور جانکاہ غم و اندوہ کا باعث بنتی ہے۔ کلمہ ”ابلاس“ دوسرے موقع کے لیے استعمال ہوتا ہے (جب کہ کلمہ ”یاس“ کی یہ صورت نہیں)۔  
کبھی فرماتا ہے:

”یوم يقوم الحساب“

”جس دن حساب برپا ہوگا۔“ (ابراہیم ۴۱)

اسی طرح فرماتا ہے:

”یوم يقوم الناس لرب العلمین“

”جس دن لوگ رب العالمین کے حضور کھڑے ہوں گے۔“ (مطففین ۶)

پھر فرماتا ہے:

”یوم يقوم الروح والملائکة“

”جس دن اللہ کا عظیم فرشتہ روح اور دیگر فرشتے قیام کریں گے۔“ (نباء ۳۸)

علیٰ ہذا القیاس فرماتا ہے:

”یوم يقوم الاشهاد“

[۱] ”یبلس“ ”ابلاس“ کے مادہ سے ہے جو راغب کے مطابق دراصل ایسے غم و اندوہ کے معنی میں ہے جو یاس و ناامیدی کی شدت کے سبب ہو۔ بعض نے اس کے معنی یاس کیے ہیں جب کہ بعض مفسرین اور ارباب لغت نے اس کے معنی ایسا سکوت قرار دیے ہیں کہ جو دلیل مطلب نہ ہونے کی وجہ سے ہو (مفردات، صحاح، التحقیق، روح المعانی اور تفسیر المیزان)

”جس دن گواہ کھڑے ہوں گے۔“ (مومن ۵۱)

ہاں یہی دن قیام کا اور اٹھ کھڑے ہونے کا ہے۔

روزِ قیام ساعت، قیام حساب، قیام انسان، قیام ملائکہ، قیام گواہان۔ روزِ قیام یعنی ہر چیز کے قیام کا دن۔ قابلِ توجہ امر یہ ہے کہ ان تعبیرات میں قیام الساعۃ کا ایک خاص مفہوم ہے کیونکہ جیسے ہم کہہ چکے ہیں ساعت کے معنی ہیں زمانہ کا ایک جزء۔ کیا زمانہ بھی اٹھ کھڑا ہوگا؟ بعض کا نظریہ ہے کہ یہ تعبیر اس بات پر دلیل ہے کہ یوم قیامت گویا ایک زندہ موجود ہے جس کے لیے قیام اور اٹھ کھڑے ہونے کا تصور موجود ہے۔ (غور کیجیے گا)

## ۲۔ مردوں کا زندہ ہونا

”مردوں کو زندہ کرنا“ ایک اور ایسا عنوان ہے جو معاد سے مربوط آیتوں میں وسیع طور پر دکھائی دیتا ہے جیسا کہ دلائل معاد کے حصے میں انشاء اللہ آئے گا کہ بہت سے دلائل کا دار و مدار اسی عنوان پر ہے اور طرح طرح سے موت کے بعد مردوں کے زندہ ہونے کا امکان ذکر کیا گیا ہے۔

قرآن مجید کی اس سلسلے میں جو آیت ذکر کی گئی ہے اس میں پہلے تین اہم مسئلے ذکر کیے گئے ہیں (خاک سے انسان کی تخلیق، شکم مادر میں بچے پر رونما ہونے والی تبدیلیاں اور حیات بخش بارش کا نزول) اس کے بعد فرماتا ہے: ”یہ اس لیے تاکہ تم جان لو کہ اللہ حق ہے، وہ مردوں کو زندہ کرتا ہے اور ہر چیز پر قادر ہے۔ (ذلک بأن اللہ هو الحق وانہ یحیی الموتی وانہ علی کل شیء قدير)۔

”حق“ حقیقت اور ثبوت کے معنی میں ہے۔ ”المیزان“ کے مطابق یہ تعبیر نشاندہی کرتی ہے کہ اللہ عین حقیقت ہے۔ ایسا نہیں کہ وہ حامل حقیقت ایک وجود ہو۔ وہ عین ثبوت اور عین حقیقت ہے، بلکہ عالم میں ہر چیز کی حقانیت اور ثبوت اس کے وجود کی برکت ہے۔ [۱]

حق کی ضد باطل ہے جس کی کوئی واقعیت اور ثبوت نہیں، بلکہ خیال، زعم اور سراب سے زیادہ کچھ نہیں۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ اس آیت میں تین مظاہر (انسان کی مٹی سے پیدائش، رحم مادر میں بچے کے تغیرات اور مردہ زمینوں کا زندہ ہونا) بھی مبداء پر دلیل کے طور پر، یعنی اصل وجود خدا کی دلیل کے طور پر بھی ذکر ہوئے ہیں، معاد پر دلیل کے طور پر بھی اور صفات خدا (مثلاً قدر) پر دلیل کے طور پر بھی۔ درحقیقت یہ وسیع تغیرات کہ جو عالم کی تمام چیزوں پر حکم فرما ہیں اس امر پر دلیل ہیں کہ عالم ہستی میں ایک نقطہ ثابت موجود ہے اور یہ عجیب نظام جو متغیر مظاہر پر حاکم ہے اس کے علم اور قدرت کی نشانی ہے اور یہ سب اس امر پر دلیل ہے کہ حیات بعد از موت پوری طرح ممکن ہے۔ یقیناً واقع ہوگی۔

جیسا کہ اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے ”احیاء موتی“ (حیات بعد از موت) کی تعبیر وسیع طور پر آیات معاد میں آئی ہے۔ یہ تعبیر معاد



جسمانی پر ایک واضح دلیل ہے، نہ فقط روح انسانی کی حیات پر۔ یعنی جسم انسانی بھی دوسرے عالم میں پلٹ آئے گا (البتہ ایک بلند تر اور بالاتر حالت میں جس کے بارے میں بعد میں اشارہ کیا جائے گا)۔ اگر معاذ صرف روحانی ہوتی تو حیات بعد از موت کا کوئی مفہوم ہی نہ تھا کیونکہ جسم سے علیحدگی کے بعد روح تو ویسے ہی باقی رہتی ہے۔

فارسی لفظ ”رستاخیز“ حیات بعد از موت کے ہی معنی دیتا ہے، کیونکہ ”رست“ کی بنیادی پہلوی فارسی کا لفظ ”ریستک“ ہے جس کے معنی میں ”مردہ“۔ رستاخیز یا ”رستخیز“ مردوں کے اٹھنے کے معنی میں ہے۔<sup>[۱]</sup> عربی میں اس کا متبادل ”قیامت“ یا ”احیاء موتی“ ہے۔

### ۳۔ ”بعث“ (اٹھنا)

قیامت کے بارے میں قرآن مجید میں آنے والے الفاظ میں سے ایک لفظ ”بعث“ ہے۔ زیر بحث آیات میں جو سورہ حج کی گذشتہ آیت کے بعد ہیں، فرماتا ہے: ”یہ اس لیے ہے کہ جان لو کہ قیامت آئے گی، اس میں کوئی شک نہیں ہے اور اللہ ان سب کو اٹھائے گا جو قبروں میں آرام کر رہے ہیں۔“ (وان الساعة اتیة لا ریب فیہا وان اللہ یمبعث من فی القبور)۔

یہ لفظ قرآن میں اس قدر آیات ہے کہ قیامت کے ناموں میں سے ایک ”یوم البعث“ (اٹھائے جانے کا دن) (روم ۵۶) یا ”یوم یمبعثون“ ہو گیا ہے۔ یہ تعبیر قرآن کی چھ آیتوں میں آئی ہے۔<sup>[۲]</sup>

حتیٰ کہ مشرکین رسول اکرمؐ سے جو سوالات کرتے تھے ان میں بھی یہ تعبیر بار بار دکھائی دیتی ہے، مثلاً:

ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ؕ اِنَّا لَبَعُوْثُوْنَ ﴿۱۶﴾

”کیا جب ہم مرجائیں گے، خاک اور ہڈیاں بن جائیں گے، تو اٹھائے جائیں گے۔“ (صافات ۱۶)<sup>[۳]</sup>

”بعث“ کا لغت میں وسیع مفہوم ہے۔ بعض نے اسے ”بھیجے“ کے معنی میں، بعض نے ”پہنچانے“ کے معنی میں اور بعض نے ”منتشر کرنے“ کے معنی میں تفسیر کیا ہے۔ لیکن جیسا کہ اس کے استعمال کے مختلف مواقع سے معلوم ہوتا ہے اس کا مفہوم وہی ہے جو فارسی کے لفظ ”براہیختن“ (اٹھانا) میں پایا جاتا ہے۔ البتہ اپنے استعمال کے ہر موقع پر موقع کی مناسبت سے اس کا ایک خاص مفہوم ہوتا ہے۔ مثلاً ”تبلیغ کے لیے رسول اللہؐ کی بعثت، جہاد کے لیے لشکر کی بعثت، فرائض کی ادائیگی کے لیے انسان کو نیند سے اٹھانا، حساب کے لیے مردوں کو اٹھانا یا جانور کو

[۱] لغت نامہ دہخدا (مادہ رستاخیز)

[۲] اعراف ۱۴، حجر ۱۶، مومنون ۱۰۰، شعراء ۸۶، صافات ۱۴۲ اور ص ۹

[۳] یہ معنی سورہ بنی اسرائیل ۹۸ و ۹۹، مومنون ۸۲، واقعہ ۴، انعام ۱۲۹ اور مومنون ۷۳ میں آیا ہے۔

حرکت کے لیے اٹھانا۔“ [۱] و [۲]

قیامت کے لیے اس لفظ کا انتخاب اس آغاز حرکت کی وجہ سے ہے جب اللہ مردوں کو قبروں سے اٹھائے گا، پھر انہیں فیصلے اور حساب کے لیے قیامت کی عدالت میں بھیجے گا اور وہاں سے پھر وہ جنت یا دوزخ کی طرف جائیں گے۔ ان میں سے ہر مرحلہ ”بعث“ کا ایک مصداق ہے۔

قرآن کی آیات میں ایک لفظ اور بھی دکھائی دیتا ہے جو کلمہ ”بعث“ سے قریب ہے اور وہ ہے مادہ ”بعثۃ“ (بروزن ”منقبتہ“) یہ لفظ قرآن کی صرف دو آیتوں میں نظر آتا ہے۔

### ”واذا القبور بعثرت“

”جب قبریں الٹ پلٹ ہو جائیں گی (اور مردے حساب کے لیے اٹھائے جائیں گے)۔“ (انفطار ۴)

دوسری جگہ فرماتا ہے:

### ”افلا يعلم اذا بعث ما في القبور“

”کیا انسان نہیں جانتا کہ جب جو کچھ قبروں میں ہے الٹ پلٹ ہو جائے گا اور اٹھایا جائے گا۔“ (عادیات ۹)

لفظ ”بعثۃ“ کو ارباب لغت نے اگرچہ الٹ پلٹ کرنے اور منتشر کرنے کے معنی میں بیان کیا ہے لیکن مفردات میں راغب کے بقول بعید نہیں کہ یہ کلمہ دو الفاظ ”بعث“ اور ”اثیوت“ کا مرکب ہو جن میں سے پہلے کے معنی ہیں ”اٹھانا“ اور دوسرے کے ”منتشر کرنا“۔ لہذا اس میں ہر دو کا مفہوم جمع ہے۔

بیضاوی نے یہی بات ایک اور انداز سے نقل کی ہے، وہ یہ کہ یہ کلمہ ”اثارة“ ”بعث“ اور ”رأی“ کا مرکب ہے۔ [۳]

## ۴۔ حشر

قیامت کے بارے میں ایک اور تعبیر جو قرآن مجید کی بہت سی آیات میں آئی ہے ”حشر“ ہے، جیسا کہ زیر بحث آیت میں فرماتا ہے: تیرا پروردگار ان سب کو محشور کرے گا کہ وہ حکیم و دانہ ہے۔ (وان ربك هو يحشرهم انه حكيم عليهم)۔

اس کی حکمت کا تقاضا ہے کہ انسان کی موت کے ساتھ ہر چیز کا اختتام نہ کیا جائے۔ ورنہ دنیاوی زندگی، نیند، کھانا، پہننا اور پینا کی حیثیت اس سے کہیں کم تر ہے کہ انسان بلند مرتبہ اور اس وسیع جہان کی خلقت کا ہدف ہوں۔ نیز اس کا علم اس امر کا سبب بنتا ہے کہ معاد، حشر و نشر

[۱] مفردات راغب، مقائیس اللغہ اور التحقیق فی کلمات القرآن الکریم

[۲] ہم نے اس جملے میں جہاں ”بعثت“ اور ”اٹھانا“ کے الفاظ استعمال کیے ہیں فارسی میں ان کی جگہ ”برائگستن“ استعمال کیا گیا ہے۔ (مترجم)

[۳] تفسیر بیضاوی انفطار آیہ ۴ کے ذیل میں

اور بندوں کے حساب و کتاب (یعنی انسانی وجود کے ذرات کی جمع آوری اور اسی طرح انسانوں کے اعمال و اقوال کی جمع آوری) میں کوئی مشکل پیش نہ آئے کیونکہ ہمہ چیز کو جاننا ہے اور ہر چیز سے باخبر ہے۔

”حشر“ کی تعبیر تقریباً تیس مرتبہ قیامت کے بارے میں قرآن مجید کی مختلف سورتوں میں استعمال ہوئی ہے۔ یہ وسیع استعمال قرآنی نظر میں اس کی اہمیت کی دلیل ہے۔ ”مقائیس کے مطابق“ حشر کا لفظ اس طرح جمع کرنے کے معنی میں ہے جس کے معنی ساتھ ساتھ چلانا اور حرکت دینا بھی ہیں۔ کبھی یہ ہر طرح سے جمع کرنے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ ”مفردات“ کے مطابق فوجی مرکز سے کچھ تعداد فوج کو میدان جنگ وغیرہ کی طرف بھیجنے کے معنی میں بھی ہے۔ لہذا روایت میں آیا ہے:

”النساء لا يحشرن“

”یعنی عورتوں کو میدان جنگ کی طرف نہیں لے جایا جاتا۔“

”التحقیق“ میں ہے کہ اس کا اصلی ریشہ تین لفظوں کے معانی پر مشتمل ہے: ”بعث“، ”سوق“، (دھکا دینا، چلانا) اور ”جمع“۔  
”حشرات الارض“ کے معنی ہیں چھوٹے چھوٹے متحرک جاندار (کیڑے مکوڑے)۔ انہیں ان کی کثرت، حرکت اور چلائے جانے کی وجہ ہی سے یہ نام دیا گیا ہے۔

معاد اور روز قیامت کے لیے اس تعبیر سے استفادہ اس لیے کیا گیا ہے کہ اس صفحہ ارض پر پوری انسانی تاریخ میں جتنے بھی انسان ہوئے ہیں اس روز جمع ہوں گے، حساب کتاب کے لیے عدالت الہی کی طرف انہیں چلایا جائے گا اور پھر انہیں جنت اور دوزخ کی طرف حرکت دی جائے گی۔

مزید برآں یہ کہ اس روز ہر انسان کے وجود کے ذرات کو جو کرۂ زمین میں ادھر ادھر بکھر چکے ہوں گے حتیٰ کہ اگر سمندروں اور فضاؤں میں بھی منتشر ہو چکے ہوں گے، تو حکم خدا سے باہم جمع ہو جائیں گے اور روح ان میں لوٹ آئے گی۔ وہ خود ہی نہیں بلکہ ان کے اعمال بھی جمع ہو جائیں گے۔ لہذا روز قیامت مختلف حوالوں سے یوم جمع و حشر ہے۔

بلکہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت میں اہل زمین ہی نہیں بلکہ ان کے ساتھ اہل آسمان بھی جمع ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ اسے یوم التلاق (ملاقات کا روز) قرار دیا گیا ہے جو قیامت کے ناموں میں سے ایک ہے اور سورہ مومن آیت ۱۵ میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ حضرت امام جعفر صادق اس سلسلے میں فرماتے ہیں:

”یوم يلتقي اهل السماء و اهل الارض“

”جس دن اہل آسمان اہل زمین سے ملیں گے۔“ [۱]

## ۵۔ نشر

”نشر“ یا ”نشور“ ایک اور تعبیر ہے جو قرآن مجید کی متعدد آیات میں روز قیامت کے لیے استعمال کی گئی ہے۔ یہ درحقیقت موت کے بعد کی انسانی زندگی کے ایک پہلو کی نشاندہی کرتی ہے جیسا کہ زیر بحث پانچویں آیت میں ہم پڑھتے ہیں۔ ”اللہ وہی ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے کہ وہ بادلوں کو حرکت دیں۔ پھر ہم ان بادلوں کو مردہ زمینوں کی طرف چلا لے جاتے ہیں۔ پس اس زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کرتے ہیں۔ (قیامت میں انسانوں کا) نشر اسی طرح ہے۔“ (واللہ الذی ارسل الریاح فتثیر سحاباً ففسقنہ الی بلد مہیت فاحیینا بہ الارض بعد موتہا کذلک النشور)۔

مفردات میں راغب کے کہنے کے مطابق ”نشر“ اور ”نشور“ دراصل پھیلانے اور بچھانے کے معنی میں ہیں جیسے کپڑوں، کاغذ، بادل، نعمتوں اور احادیث کے لیے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔

”مقائیس اللغۃ“ کے مطابق یہ لفظ دراصل اس طرح سے کھولنے کے معنی میں ہے جس کے ہمراہ بکھیرنا بھی ہو۔

یہی وجہ ہے کہ فضا میں پھیل جانے والی خوشبو کو ”نشر“ کہتے ہیں۔

معاد کے لیے اس لفظ کا استعمال، یا تو اس لیے ہے کہ محشر کے مختلف حصوں میں انسان پھیلے ہوئے ہوں گے، جیسا کہ مندرجہ بالا آیت میں بھی اشارہ ہوا ہے، یا پھر اعمال ناموں کے پھیلانے جانے کی وجہ سے، جیسا کہ سورہ تکویر آیت ۱۰ میں ہے:

## ”واذا الصحف نشرت“

## ”جب اعمال کے صحیفے پھیلانے جائیں گے۔“

یہ بات قابل توجہ ہے کہ بعض روایات میں آیا ہے کہ قیامت میں اللہ تعالیٰ زیر عرش سے خاص بارش بھیجے گا۔ جب وہ زمین پر پڑے گی تو مردہ جسموں میں جان پڑ جائے گی اور اسی طرح پودے بھی اگ آئیں گے۔ پھر ان میں روئیں پھونکی جائیں گی۔ پھر زمین پھٹ جائے گی اور وہ مٹی سے باہر آجائیں گے (گویا زمین ان کے لیے رحم مادر ہے)۔ [۱]

ایک اور حدیث میں ہے:

ایک شخص نے رسول اللہ سے پوچھا: ”اللہ مردوں کو کیسے زندہ کرتا ہے؟“

فرمایا: کیا کبھی تم ایسی بالکل خشک اور بے آب و گیاہ زمین سے گزرے ہو کہ جب اس پر سے دوسری مرتبہ گزریے ہو تو وہ سبز

ہوگئی ہو؟

سائل نے کہا: ”جی ہاں۔“

[۱] تفسیر روح البیان، ج ۷، ص ۳۲۳ (کچھ تلخیص کے ساتھ)

فرمایا: ”اللہ مردوں کو بھی یونہی زندہ کرتا ہے۔“

یا فرمایا: ”نشور بھی اسی طرح ہے۔“ [۱]

## ۶۔ معاد

بعض دیگر آیات میں قیامت کے لیے ”عود“ اور انسانوں کے لوٹنے کی تعبیر بھی استعمال کی گئی ہے۔ اس سے مراد حیات نو کی طرف لوٹنا ہے۔ زیر بحث چھٹی آیت میں ہے: ”جیسے تمہیں شروع میں پیدا کیا (قیامت میں ویسے ہی دوسری مرتبہ) لوٹائے جاؤ گے۔“ (کہا بداکم تعودون)

دلائل معاد کی بحث میں انشاء اللہ دیکھیں گے کہ یہ جملہ سب سے چھوٹا ہونے کے باوجود امکان معاد پر روشن ترین دلیل کا حامل ہے۔ اس میں اولین خلقت کے حوالے سے خلقت جدید پر استدلال کیا جا رہا ہے۔ قابل توجہ بات یہ ہے کہ لفظ ”عود“ مشرکین اور منکرین معاد کی زبان تک پر موجود تھا۔ وہ کہتے: ”کون ہمیں نئی زندگی کی طرف لوٹا سکتا ہے؟“ (فسیقولون من یعیدنا)۔ قرآن ان کے جواب میں کہتا ہے:

”قل الذی فطرکم اول مرة“

”کہہ دیجئے: وہی جس نے شروع میں تمہیں پیدا کیا۔“ (بنی اسرائیل ۵۱)

لفظ ”معاد“ بھی یہیں سے لیا گیا ہے۔

ضمناً یہ لفظ معاد جسمانی کے مسئلے پر بھی ایک روشن دلیل ہے کیونکہ درحقیقت روح کے لیے لوٹ آنے کا کوئی مفہوم نہیں، بلکہ موت کے بعد وہ تو باقی رہتی ہے۔ یہ تو جسمانی حیات ہے جو قیامت میں لوٹ آئے گی اور روح اس سے منسلک ہو جائے گی۔

ایک اہم نکتہ جس کا ذکر یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے یہ ہے کہ زیر بحث آیت کی جو تفسیر بیان ہوئی ہے حیات کی اصل بازگشت کے لیے تشبیہ ہے (یہ تفسیر طبری مرحوم نے اپنے کلام کے آغاز میں ذکر کی ہے۔ روح البیان میں بھی اسے تفسیر آیت کے طور پر انتخاب کیا گیا ہے)۔ لیکن تفسیر کبیر میں فخر الدین رازی، المیزان میں علامہ طباطبائی، المنار میں صاحب المنار اور بعض دیگر مفسرین نے کہا ہے کہ یہ تشبیہ اس سلسلے میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شروع میں لوگوں کو دو جماعتوں کی صورت میں پیدا کیا۔ ایک جماعت مومنین کی تھی اور دوسری کافروں کی۔ ایک جماعت نے انبیاء کی ہدایت کے زیر سایہ راہ ہدایت کو انتخاب کیا اور دوسری جماعت نے شیطانی وسوسوں کی وجہ سے گمراہی کا راستہ اختیار کیا۔ قیامت میں بھی یہ دو جماعتوں کی صورت میں ہی محشور ہوں گے، یعنی مومن و کافر، سعادت مند و بد بخت۔ انہوں نے بعد کی آیت کی اس آیت کے لیے شاہد جانا ہے جو یہ ہے:

### فَرِيقًا هَدَىٰ وَفَرِيقًا حَقَّ عَلَيْهِمُ الضَّلَالَةُ ۖ (اعراف ۳۰)

اس سے بھی عجیب تر بات یہ ہے کہ فخر الدین رازی نے اسے جبر اور ذاتی سعادت و بدبختی کی دلیل ٹھہرایا ہے۔ حالانکہ اگر ہم قرآن کی دیگر آیات پر جو اسی جیسی ہیں، نظر دوڑائیں تو جانیں گے کہ یہاں تشبیہ ہدایت بعد از موت کے لیے ہے، نہ کہ دنیا میں ہدایت و گمراہی کے لیے۔ سورہ روم کی آیت ۱۱ میں فرماتا ہے:

### اللَّهُ يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ۝

”اللہ خلقت کا آغاز کرتا ہے، پھر اس کا اعادہ بھی فرماتا ہے اور پھر اسی کی طرف تمہیں لوٹ کر جانا ہے۔“

اسی سورت کی آیت ۲۷ میں ہے:

### وَهُوَ الَّذِي يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ وَهُوَ أَهْوَنُ عَلَيْهِ ۖ

”وہی ہے جس نے خلقت کا آغاز کیا، پھر اس کا اعادہ بھی کرتا ہے اور یہ اعادہ اس کے لیے آسان تر ہے۔“

دیگر آیات بھی یہی مفہوم دیتی ہیں (یونس ۴، ۳۴، نمل ۶۲ اور عنکبوت ۱۹)

ممکن ہے یہاں کہا جائے کہ مسئلہ سعادت و بدبختی کے لیے آیت کی تفسیر اس روایت کے مطابق ہے جو تفسیر علی بن ابراہیم میں ابی الجارود سے نقل ہوئی ہے کہ امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا:

### ”خلقهم حين خلقهم مومنا وكافرا وسعيدا وشقيا وكذلك يعودون“

### يوم القيامة مهتديا وضالا.....“

”جیسے اس نے ابتداء میں ایک جماعت کو مومن اور ایک جماعت کو کافر پیدا کیا، ایک جماعت کو سعادت مند اور

دوسری کو بدبخت بنایا، اسی طرح قیامت میں لوگ جماعتوں میں تقسیم ہو جائیں گے، ایک ہدایت یافتہ اور دوسری

گمراہ۔“ [۱]

لیکن بلاشبہ یہ حدیث متشابہ حدیثوں میں سے ہے۔ اس کا راوی ابوالجارود، جس کا نام زیاد بن منذر ہے، ایسے افراد میں سے ہے جس کی کتب رجال میں شدید مذمت کی گئی ہے، یہاں تک کہ بعض نے اس کا نام ”سرحوب“ رکھا ہے جو شیطان کے ناموں میں سے ہے۔ بعض روایات میں اسے کذاب اور کافر قرار دیا گیا ہے اور اسے ایک منحرف مذہب جارود یہ کا بانی کہا گیا ہے۔ (جو زید یہ کا ایک فرقہ ہے)۔ لہذا صحیح تفسیر وہی پہلی ہے۔

## ۷۔ لقاء اللہ

قیامت و معاد کے لیے قرآن مجید کی متعدد آیات میں استعمال ہونیوالی ایک اور تعبیر ”لقاء اللہ“ یا ”لقاء رب“ ہے۔ ساتویں زیر بحث آیت بھی انہی آیات سے ہے۔ ارشاد ہوتا ہے ”جو لوگ لقاء اللہ کی تکذیب کرتے ہیں یقیناً خسارے میں ہیں اور انہوں نے ہرگز ہدایت نہیں پائی۔“ (قد خسر الذین کذبوا بقاء اللہ وما كانوا مهتدین)۔<sup>[۱]</sup>

”لقاء اللہ“ یا ”لقاء رب“ کی تعبیر جو بار بار آیات قرآن مجید میں آئی ہے، بہت معنی خیز اور عمیق ہے، اگرچہ بعض مفسرین اس سے بہت سادگی سے گزر گئے ہیں۔

کبھی کہتے ہیں ”لقاء اللہ“ سے مراد قیامت میں فرشتوں کی خدا سے ملاقات ہے۔

کبھی کہا ہے کہ حساب اور جزا و ثواب سے ملاقات مراد ہے۔

اور کبھی یہ کہ حکم و فرمان سے ملاقات مراد ہے۔

اس طرح سے ان میں سے ہر کسی نے ایک کلمہ تقدیر میں فرض کیا ہے جب کہ ہم جانتے ہیں کہ ایسا خلاف اصل ہے اور جب تک اس پر کوئی دلیل نہ ہو اس سے پرہیز کرنا چاہیے۔

اس حقیقت کی طرف توجہ رکھتے ہوئے ہم اصلی تفسیر کی جستجو کرتے ہیں۔ بلاشبہ مراد اللہ سے حسی ملاقات نہیں کیونکہ حسی ملاقات صرف اجسام سے ہو سکتی ہے جو مکان و زمان، رنگ اور دیگر کیفیات کے حامل ہوں، اس طرح کہ انہیں ظاہری آنکھ سے دیکھا جاسکے۔

لہذا یہاں مراد اللہ سے شہود باطنی، دیدار روحانی اور ملاقات معنوی ہے۔ کیونکہ قیامت میں حجاب اٹھ جائیں گے۔ آثار الہی اس طرح عرصہ محشر، میدان معاد اور مقامات قیامت میں ظاہر و آشکار ہوں گے کہ سب یہاں تک کہ کافر بھی، اللہ کو چشم دل سے دیکھیں گے اور اس کا دیدار کریں گے (اگرچہ اس دیدار کے بھی مختلف درجے اور صورتیں ہیں)۔

علامہ طباطبائی مرحوم تفسیر المیزان میں لکھتے ہیں:

”بندگانِ خدا ایسے حالات میں ہوں گے کہ ان کے اور ان کے پروردگار کے درمیان کوئی حجاب نہ ہوگا کیونکہ یوم قیامت کی طبیعت ہی حقائق کے ظہور و بروز سے عبارت ہے، جیسا کہ سور نور کی آیت ۲۵ میں آیات ہے:

**وَيَعْلَمُونَ أَنَّ اللَّهَ هُوَ الْحَقُّ الْمُبِينُ ﴿٢٥﴾**

[۱] یہی تعبیر دیگر آیات میں بھی آتی ہے: انعام ۳۱ و ۱۴۵، یونس ۷ و ۱۱ و ۱۵، زمر ۲، کہف ۵ و ۱۰ و ۱۱، فرقان ۲۱، عنکبوت ۵ و ۲۳،

روم ۸، سجدہ ۲۳، حم سجدہ ۵۴ اور سجدہ ۱۰ و ۲۰

”اس دن جان لیں گے کہ اللہ حق آشکار ہے۔“ [۱]

قابل توجہ بات یہ ہے کہ ایک تفصیلی حدیث میں ہے کہ ایک شخص حضرت امیر المومنین علیؑ کی خدمت میں آیا اور عرض کی: ”مجھے قرآن مجید کے بارے میں شک ہو گیا ہے۔“

حضرت نے فرمایا: ”کیوں؟“

اس نے عرض کی: ”بہت سی آیات میں دکھائی دیتا ہے کہ قرآن قیامت میں ملاقات پر وردگار کے بارے میں بات کرتا ہے جب کہ دوسری طرف فرماتا ہے:

لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ ۚ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ ۚ

”آنکھیں اسے نہیں دیکھ سکتیں جب کہ وہ آنکھوں کو دیکھتا ہے۔“ (انعام ۱۰۳)

یہ آیات آپس میں کس طرح سے ہم آہنگ ہیں؟“

حضرت نے فرمایا:

”اللقاء هنا ليس بالروية واللقاء هو البعث فافهم جميع ما في كتاب

الله من لقاءه فانه يعني بذلك البعث۔“

”لقاء سے مراد آنکھوں سے دیکھنا نہیں ہے، بلکہ لقاء سے مراد ستائیز اور مردوں کا اٹھایا جانا ہی ہے۔ لہذا قرآن

میں لقاء اللہ کے معنی ”بعث“ سمجھنا چاہئیں۔“ [۲]

درحقیقت امیر المومنین علیؑ نے مسئلہ لقاء اللہ کو ایسی چیز سے تفسیر کیا ہے کہ شہود پر وردگار جس کے لوازم میں سے ہے۔ ہاں روز قیامت حجابوں کے برطرف ہونے اور پردوں کے اٹھنے، آیات حق کے ظہور اور قلوب پر اللہ کی تجلی کا دن ہے۔ امامؑ کے اس کلام سے ہر شخص اپنے ظرف کے مطابق مطلب اخذ کر سکتا ہے اور جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں قیامت میں اولیاء اللہ کا شہود باطنی عام لوگوں کی نسبت بہت متفاوت اور مختلف ہے۔

## ۸۔ رجوع الی اللہ

ایک اور تعبیر جو بہت زیادہ (دسیوں بار) قیامت کے بارے میں قرآن مجید کی آیات میں استعمال ہوئی ہے، وہ اللہ کی طرف رجوع اور بازگشت یا ”رد الی اللہ“ وغیرہ ہے۔ ان میں سے ایک آخری زیر بحث آیت ہے۔ فرماتا ہے: ”ہر انسان موت کو چکھے گا اور پھر تم ہماری طرف لوٹ آؤ گے۔ (کل نفس ذائقة الموت ثم الینا ترجعون)

[۱] تفسیر المیزان، ج ۱۵ ص ۱۰۳ و ج ۱۰ ص ۶۹

[۲] توحید صدوق ص ۲۶۷ (تلخیص کے ساتھ)



یہ تعبیر جیسا کہ ہم نے کہا مکرر آیات میں دکھائی دیتی ہے۔ کبھی فرماتا ہے:

**إِلَى اللَّهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيعًا**

”تم سب کی بازگشت اللہ کی طرف ہے۔“ (مائدہ ۸۸)

کبھی نفس مطمئنہ اور کمال یافتہ روح کو مخاطب کر کے فرماتا ہے:

**ارْجِعْ إِلَىٰ رَبِّكَ**

”اپنے رب کی طرف لوٹ آ۔“ (فجر ۲۸)

کبھی قدرت الہی کا ذکر کرتے ہوئے قرآن مجید فرماتا ہے:

**إِنَّهُ عَلَىٰ رَجْعِهِ لَقَادِرٌ**

”وہ قادر ہے کہ انسان کو واپس بلا لے۔“ (طارق ۸)

کبھی بعض مومنین کی زبانی نقل کرتا ہے:

**إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ**

”ہم اللہ ہی کی طرف سے ہیں اور ہمیں اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔“ (بقرہ ۱۵۶)

اور کبھی فرماتا ہے:

**إِنَّا إِلَىٰ رَبِّكَ الرَّجْعِي**

”یقیناً سب کی بازگشت تیرے رب ہی کی طرف ہے۔“ (علق ۸)

یہ تعبیرات جن کی نظیریں قرآن مجید میں بہت زیادہ ہیں نشاندہی کرتی ہیں کہ رستاخیز اور قیامت قرآن کی نظر میں ایک طرح کی بازگشت اور واپسی ہے یعنی کوئی چیز ایک جگہ سے آئی ہو اور پھر وہیں لوٹ جائے۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ معنی قیامت پر کس طرح منطبق ہوتے ہیں، کس طرح ہم اللہ کی طرف سے آئے ہیں کہ ہمیں اسی کی طرف واپس جانا ہے؟

بعض مفسرین نے اس سوال کا جواب دینے کے لیے ایک کلمہ آیت میں تقدیر میں فرض کیا ہے اور کہتے ہیں کہ مفہوم یہ ہے:

**إِلَىٰ حَكْمِهِ تَرْجِعُونَ**

”اس کے حکم کی طرف تمہیں لوٹ جانا ہے۔“

جیسے کبھی کہا جاتا ہے:

## ”رجع امر القوم الی الامیر“

”لوگوں کا کام امیر کی طرف لوٹا گیا ہے۔“ [۱]

لیکن کیا یہ درست ہوگا کہ ان تمام آیات میں ہم ایسا کوئی کلمہ محذوف سمجھیں؟ اصولاً تقدیر میں لینے اور حذف کے قائل ہونے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ یقیناً قرآن کی اس تعبیر میں کوئی خاص نکتہ ہے جسے جستجو اور کوشش سے تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔ اس سوال کا جواب پانے کے لیے بہتر ہوگا کہ ہم آغاز خلقت انسان کی طرف لوٹ جائیں۔

قرآن کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

فَإِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُوحِي فَقَعُوا لَهُ سَاجِدِينَ ﴿۲۹﴾

”جب ہم نے جسم آدم کو بنادیا اور اس میں اپنی روح پھونک دی (تو اے فرشتو!) اسے سجدہ کرو۔“ (حجر ۲۹)

روح خدا سے مراد یقیناً ایسی روح نہیں جو اس کی ذات پاک سے جدا ہوئی ہو، کیونکہ وہ واجب الوجود ہے۔ وہ ہر لحاظ سے بسیط اور اجزاء ترکیبی سے پاک ہے۔ مراد یہ ہے کہ ایک عظیم روح جو اللہ کی اشرف المخلوقات ہے، اس میں پھونکی گئی (اصطلاح میں اس اضافہ کو ”اضافہ تشریفیہ“ کہتے ہیں)۔

اس لحاظ سے انسان کی بلند روح اس عالم بالا سے جہانِ خاکی کی طرف لائی گئی اور اس کا پیوند اس خاک تیرہ سے جوڑا گیا تاکہ کمال کے درجات طے کر سکے اور پھر اس سے جدا ہو کر عالم بالا کی طرف جو اقرب حق میں لوٹ جائے۔

یہ صحیح ہے کہ معاد جسمانی کی رو سے قیامت میں جسم اور روح دونوں لوٹ جائیں گے، لیکن توجہ رہے کہ وہاں روح جسم کی طرف لوٹ کر نہ آئے گی بلکہ جسم روح کی طرف جائے گا اور بلندی و کمال پائے گا۔ لہذا دیناوی جسم کے نقائص وہاں اس میں نہ ہوں گے۔ خرابی، بڑھاپا، فنا پذیری، درد، بیماری، تھکاوٹ اور خستگی، وہاں کچھ بھی نہ ہوگا (غور کیجیے گا)۔

روح کے بدن کی طرف نزول اور پھر عالم بالا کی طرف واپسی کے بارے میں بعض علماء نے ایک خوبصورت تشبیہ ذکر کی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

وہ روح انسانی کو ایک غوطہ خور سے تشبیہ دیتے ہیں جو سمندر کی گہرائی میں جانے اور گراں بہا جواہرات کو نکال لانے کے لیے اپنے پاؤں سے بھاری بوجھ باندھتا ہے تاکہ اس بوجھ کی مدد سے سمندر میں اتر سکے۔ جب سمندر کی تہہ میں جا پہنچتا ہے، گراں بہا جواہر جمع کر لیتا ہے تو بھاری بوجھ اپنے پاؤں سے کھول دیتا ہے اور سطح سمندر پر واپس آ جاتا ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ ”رجوع“ کے یہی معنی ہیں۔ (غور کیجیے گا)۔

نتیجہ

ہم اب جملہ مطالب کو جمع کرنے کی منزل پر آ پہنچے ہیں، وہ اس طرح کہ واپسی کے دن کے مختلف مراحل اور منازل ہیں۔ قرآن مجید میں ہر ایک کے لیے ایک الگ تعبیر لائی گئی ہے۔

پہلے ”قیامت ساعت“ آغاز قیامت اور عالم کے تغیر کا مرحلہ ہے۔

پھر ”احیاء موتی“ اور مردوں کے زندہ ہونے کی منزل ہے۔

اس کے بعد اللہ انہیں اٹھائے گا، یعنی ”بعث“ کا مرحلہ شروع ہوگا۔

پھر اللہ جمع کرے گا۔ ”یہ حشر“ کا معاملہ ہے۔ پھر انہیں پھیلانے گا اور اس مرحلے کو ”نشر“ کہتے ہیں۔

پھر وہ اللہ کی طرف لوٹ جائیں گے اور یہ ”معاد“ کا مرحلہ ہے۔

پھر ”لقاء رب“ کا مرحلہ ہے، جسے ”لقاء اللہ“ کا مرحلہ بھی کہا جاتا ہے۔

پھر اس وجودِ لاتناہی اور کمالِ مطلق کی طرف بڑھنے کی منزل ہے۔ یہ مرحلہ پروردگار کی طرف ”رجوع“ کا ہے۔

## قرآن میں قیامت کے ستر نام

اشارہ

قرآن مجید میں ”معاذ“ کے بارے میں کئی تعبیرات کے ذکر کے بعد اب ہم دیگر نام جو قرآن میں اس بارے میں آئے ہیں، ذکر کرتے ہیں۔ یہ نام اس عظیم دن کے اوصاف کی جزئیات کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ قرآن مجید قیامت کو ہمیشہ ایک نام سے یاد نہیں کرتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قیامت میں بہت مختلف اور طرح طرح کے واقعات رونما ہوں گے۔ ان میں سے ہر واقعہ اس روز کے ایک رخ کی نشاندہی کرتا ہے۔

قرآن ان خصوصیات کی نشاندہی کے لیے جن کے مسلمان غیر معمولی تربیتی آثار ہیں، مختلف ناموں سے استفادہ کرتا ہے تاکہ مجموعی طور پر آیات میں اس عظیم دن کے بارے میں اور اس کے غیر معمولی اور ہلا کر رکھ دینے والے واقعات کو دقیق طور پر ترسیم کر سکے۔

البتہ ”نام“ یہاں پر اسم خاص (یا عربی ادبیات کی تعبیر میں ”علم شخص“) کے معنی میں نہیں بلکہ یہاں اس کے معنی وسیع تر ہیں جس میں توصیفی نام بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ یعنی یہ ایسے عناوین ہیں جو اس دن کے اوصاف اور اس دن کی زندگی کی خصوصیات پر منحصر ہیں۔

اس اشارے کے بعد اب ہم قرآن میں موجود قیامت کے ناموں کا سراغ لگاتے ہیں۔ قارئین کی توجہ ایک بار پھر ہم اس نکتے کی طرف دلاتے ہیں کہ ان ناموں پر غور و خوض گہرے تربیتی آثار کا باعث ہے اور یہ بیداری، آگاہی، تہذیب نفوس، اصلاح قلوب، دعوت تقویٰ اور برائیوں سے روکنے کے لیے بہتر موثر ہے۔

فیض کاشانی مرحوم ”محجۃ البیضاء“ میں کہتے ہیں:

”قیامت کے ہر نام میں ایک راز پنہاں ہے اور اس کی ہر توصیف میں ایک اہم معنی بیان کیا گیا ہے۔ ان معانی کو سمجھنے کی کوشش کرنا اور ان اسرار تک رسائی حاصل کرنا چاہیے۔“

اس کے بعد انہوں نے قیامت کے سونام ذکر کیے ہیں۔ ☆ البتہ یہ سب نام قرآن مجید میں نہیں ہیں بلکہ ان میں سے کچھ احادیث سے حاصل کیے گئے ہیں۔ ایسے نام ہماری تفسیری بحث سے خارج ہیں۔ ہم فی الحال قیامت کے ان ناموں کی جستجو کرتے ہیں جو قرآن میں آئے ہیں۔

دوسری جانب جناب فیضؒ نے جو نام بیان کیے ہیں ان میں سے بعض بالصرحت قرآن مجید میں موجود ہیں اور روایات میں بلکہ اجمالاً کتاب و سنت سے ایک استنباط ہیں۔ لہذا بہتر یہ ہے کہ جن ناموں کا قرآن مجید میں بالصرحت ذکر ہے ہم انہی کی طرف توجہ دیں (چاہے وہ اسم خاص کا پہلو رکھتے ہوں جن کی تعداد محدود ہے یا اس روز کی توصیف اور خصوصیات کے ذکر کا)۔

ان ناموں کو تین حصوں میں خلاصہ کیا جاسکتا ہے:

## پہلا حصہ

اس میں ایسے نام ہیں جن میں ایک لفظ سے پہلے لفظ ”یوم“ کا اضافہ کیا گیا ہے۔ ایسے نام اس دن کے کسی ایک پہلو اور خصوصیت کی خبر دیتے ہیں۔ پہلے ہم ایسے ناموں کا ذکر کرتے ہیں۔

## ۱۔ یوم القیامۃ

یہ روز جزا کا مشہور ترین نام ہے۔ قرآن مجید میں ستر مرتبہ اس نام کا ذکر ہے۔ ان آیات میں ایک یہ ہے:

وَنُضَعُ الْمَوَازِينَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيَمَةِ  
”ہم عدل کے ترازو روز قیامت نصب کریں گے۔“ (انبیاء ۷۷)

اس روز کو روز قیامت اور اٹھ کھڑا ہونے کا دن کیوں کہا گیا ہے؟ قرآن مجید نے اس سوال کے جواب سے خود پردہ اٹھایا ہے:

يَوْمَ يَقُومُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿۶﴾  
”اس روز لوگ عالمین کے رب کے حضور کھڑے ہوں گے (اور اس کی عدالت میں حاضر ہوں گے)۔“  
(مطفین ۶)

نیز اس لیے کہ اس دن اللہ کا سب سے بڑا فرشتہ جس کا نام ”روح“ ہے اور دیگر سب ملائکہ ایک صف میں قیام کریں گے تاکہ فرمانِ الہی کا اجرا کر سکیں۔ جیسا کہ قرآن کہتا ہے:

يَوْمَ يَقُومُ الرُّوحُ وَالْمَلَائِكَةُ صَفًّا ﴿۳۸﴾  
علاوہ ازیں اس دن انسانی اعمال پر شہادت دینے کے لیے شاہد و گواہ ٹھہیں گے:

وَيَوْمَ يَقُومُ الْأَشْهَادُ ﴿۵۱﴾ (مومن ۵۱)  
اور جس دن حساب و کتاب کا قیام ہوگا:

يَوْمَ يَقُومُ الْحِسَابُ ﴿۴۱﴾ (ابراہیم ۴۱)

عدالتوں کا یہ معمول ہے کہ جس وقت عدالت کے فیصلے کے اعلان کا وقت ہوتا ہے، سب حاضرین، بشمول ملزمان اور جج صاحبان، اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ پھر آخری فیصلے کا اعلان ہوتا ہے۔ یہ کھڑا ہونا عدالت کے فیصلے کے احترام اور اسے تسلیم کرنے کی دلیل ہے۔ اس سے صرف نظر، جس وقت انسان کسی کام کو پکے ارادے سے انجام دینا چاہتا ہے تو اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور اسے انجام دینے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ اسی جہت سے ”قیام“ فیصلے، محکم ارادے، تیار ہونے اور کسی کام کے لیے احترام کی دلیل ہے۔ شاید اسی وجہ سے لفظ ”قیامت“ کی

قرآن مجید میں اس قدر تکرار اور تاکید ہے۔

مزید برآں یہ کہ قبروں سے مردوں کا قیام بھی یہ نام رکھنے کے دلائل میں سے ایک ہے۔  
حضرت امام علی بن الحسینؑ سے ایک حدیث اس طرح مروی ہے:

اشد ساعات ابن ادم ثلاث ساعات:

الساعة التي يعاين فيها ملك الموت والساعة التي يقوم فيها من قبره

والساعة التي يقف فيها بين يدي الله تبارك وتعالى

”انسان کے لیے تین گھڑیاں نہایت شدید ہیں:

پہلی وہ گھڑی جب ملک الموت کو اپنے سامنے دیکھتا ہے۔

دوسری وہ گھڑی جب وہ قبر سے اٹھے گا۔

تیسری وہ گھڑی جب وہ اللہ تبارک و تعالیٰ کے سامنے کھڑا ہوگا۔“ [۱]

## ۲۔ الیوم الآخر

ایک اور نام جو بہت مشہور و معروف ہے اور قرآن مجید میں کئی بار آیا ہے: الدار الآخرة اور ”الیوم الآخر“ یا مختصراً ”الآخرة“ ہے۔ قرآن مجید کی مختلف سورتوں میں یہ نام ایک سو چالیس بار آیا ہے۔

بقرہ ۷۷ میں نیکو کاری کے معنی کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتا ہے:

وَلَكِنَّ الْإِبْرَءَمَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ

وَالنَّبِيِّنَ ۖ.....

”نیکو (نیک لوگ) وہ ہیں جو اللہ، یوم آخر، فرشتوں، آسمانی کتاب اور نبیوں پر ایمان لائے ہیں۔“

دوسری جگہ سورہ قصص آیت ۸۳ میں فرماتا ہے:

تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِينَ لَا يُرِيدُونَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ وَلَا فَسَادًا ۖ

”اس دار آخرت کو ہم نے (صرف) ان لوگوں کے لیے قرار دیا ہے جن کا زمین پر برتری اور فساد کا کوئی ارادہ نہیں۔“

پھر ایک اور تعبیر میں سورہ بقرہ ۴ میں فرماتا ہے:

**وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ ﴿۴﴾**

”حقیقی مومن وہ ہیں جو آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔“

”الیوم الآخر“ یا ”الدار الآخرۃ“ یا ”الآخرۃ“ کی تعبیر دنیا کے مقابل ہے کہ جسے ”نشئۃ اولیٰ“ کہا گیا ہے۔ جیسا کہ قرآن میں ہے:

**وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْأَةَ الْأُولَىٰ فَلَوْلَا تَذَكَّرُونَ ﴿۶۲﴾**

”تم نے عالم اول کو جانا ہے تو کیونکر متوجہ نہیں ہوتے ہو (کہ ایک عالم اس کے بعد بھی ہے)۔“ (واقعہ ۶۲) سورہ ضحیٰ کی آیت ۴ میں ہے:

**وَلِلْآخِرَةِ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْأُولَىٰ ﴿۵﴾**

”تیرے لیے عالم آخرت پہلے عالم سے بہتر ہے۔“

ارباب لغت کے مطابق ”آخر“ ”اول“ کا متضاد ہے اور آخر (جس کا معنی ہے دوسرا) ”واحد“ کا متضاد ہے۔ طبری مرحوم مجمع البیان میں فرماتے ہیں:

آخرت کو اس لیے آخرت کہا گیا ہے کہ یہ دنیا کے بعد ہے اور دنیا کو اس لیے دنیا کہا گیا ہے کہ یہ لوگوں کے نزدیک ہے (مادہ ”دو“ سے)۔ بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ آخرت کے مقابلہ میں اس کی دنائت یعنی پستی کی وجہ سے اسے دنیا کہا جاتا ہے۔<sup>[۱]</sup> اسی سے ملتی جلتی بات تفسیر روح البیان اور تفسیر فخر الدین رازی میں بھی آئی ہے۔<sup>[۲]</sup>

ضمنی طور پر یہ تعبیر اس حقیقت کو بھی بیان کرتی ہے کہ انسان کے کمال کا سفر اس جہان سے شروع ہوتا ہے اور جاری رہتا ہے۔ جہان آخرت اس سفر کا آخرین مرحلہ ہے۔ دنیا راستہ میں پڑنے والی منزل کی طرح ہے اور آخرت، آخری اور ابدی ٹھکانا ہے۔ یہ بات تمام انسانوں کے لیے ایک صدائے بیدار باش ہے کہ دنیا کو سرائے جاوداں نہ سمجھیں، اس سے دل نہ باندھیں، اسے آخری ہدف قرار نہ دیں اور اپنی ساری صلاحیتیں اسی پر صرف نہ کر دیں بلکہ اسے ایک گزرگاہ سمجھیں، جس سے جہان دیگر تک پہنچنے کے لیے استفادہ کیا جائے۔

[۱] مجمع البیان، ج ۱ ص ۴۰

[۲] روح البیان، ج ۱ ص ۴۱ و تفسیر فخر الدین رازی، ج ۲ ص ۳۲

### ۳۔ یوم الحساب

قیامت کا ایک اور مشہور نام ”یوم الحساب“ ہے۔ یہ نام قرآن مجید کی پانچ آیتوں میں آیا ہے۔ یہ نام رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ انسان کے تمام اعمال کا بدون استثناء اس روز محاسبہ کیا جائے گا، وہ چھوٹے ہوں یا بڑے، جزئی ہوں یا کلی، روحانی ہوں یا مادی، بدنی ہوں یا روحانی۔ قرآن حضرت موسیٰ بن عمران کی زبانی کہتا ہے:

وَقَالَ مُوسَىٰ إِنِّي عُذْتُ بِرَبِّي وَرَبِّكُمْ مِّنْ كُلِّ مُتَكَبِّرٍ لَا يُؤْمِنُ بِيَوْمِ

الْحِسَابِ ﴿٢٥﴾

”موسیٰ نے آل فرعون سے کہا: میں اپنے اور تمہارے پروردگار کی پناہ چاہتا ہوں ہر متکبر سے جو یوم حساب پر

ایمان نہیں رکھتا۔“ (مومن ۲۷)

کبھی اسے ”یوم یقوم الحساب“ (جس دن حساب برپا ہوگا) کہا گیا ہے۔ (ابراہیم ۴۱)

مقائیس اللغہ نے مادہ ”حساب“ کی چار بنیادوں کا ذکر کیا ہے جو یہ ہیں: گننا، کفایت کرنا، ”حسان“ (جس کا معنی ہے چھوٹا ٹکڑا) اور ”احسب“، یعنی جس کے جسم کی کھال بیماری کی وجہ سے سفید ہوگئی ہو اور بال گر گئے ہوں۔

بعض ارباب لغت نے اس کے زیادہ معنی بھی ذکر کیے ہیں حتیٰ کہ سات تک معانی بیان کیے گئے ہیں جن میں سے ایک جزا و

عذاب بھی ہے۔ [۱]

لیکن ظاہر یہ ہے کہ سب مذکورہ بالا معانی، جیسا کہ مفردات راغب سے معلوم ہوتا ہے، ایک ہی معنی کی طرف لوٹ جاتے ہیں اور وہ ہے حساب کرنا۔ اگر یہ لفظ کفایت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ مرحلہ کفایت تک پہنچنے کے لیے ایک محاسبے اور حساب کی ضرورت ہوتی ہے۔ جزا و عذاب کے معنی میں بھی یہ لفظ اس لیے استعمال ہوتا ہے کہ ایسا حساب کے بعد انجام پاتا ہے۔ دیگر معانی بھی اسی طرح اس معنی کی طرف لوٹ آتے ہیں (مثلاً کسی خاص بیماری پر اس کا اطلاق عذاب الہی سے شبہات کی وجہ سے ہے جو حساب کے بعد واقع ہوتا ہے اور شاید چھوٹے ٹکڑے کو ”حسان“ اس لیے کہا گیا ہے کہ حساب کرنے والے ایسا کرتے وقت اس سے کام لیتے ہیں)۔

بہر حال ایک واضح ترین کام جو قیامت میں انجام پائے گا اور اصولاً قیام قیامت جس کے لیے ہے وہ حساب الہی ہے اس کی کیفیت انشاء اللہ منازل آخرت کی بحث میں آئے گی۔



## ۴۔ یوم الدین

یہ نام بھی کئی مرتبہ قرآن میں آیا ہے۔ جن آیات میں ”یوم الدین“ آیا ہے ان کی تعداد تیرہ ہے جن میں مشہور تر اور زبان زد خاص و عام سورہ حمد کی آیت ہے: ”مَلِكِ يَوْمِ الدِّينِ“ (وہ مالک روزِ جزا ہے)۔  
(بعض ارباب لغت کا نظریہ ہے کہ اصل لفظ ”دین“ خضوع، تسلیم اور اطاعت کے معنی میں ہے اور اگر یہ لفظ جزا کے معنی میں استعمال ہوا ہے تو ایسا اس وجہ سے ہے کہ اس کے سامنے مطیع رہنا چاہیے یا اس لیے کہ جزا اطاعت کا نتیجہ ہے)۔  
بعض روایات میں اس کا معنی یوم حساب بھی کیا گیا ہے۔ یہ درحقیقت معلول کا ارادہ کر کے علت بیان کرنے کا انداز ہے، کیونکہ حساب جزا کے لیے ایک مقدمہ ہے۔

## ۵۔ یوم الجمع

یہ اصطلاح قرآن مجید میں دو مرتبہ آئی ہے۔ ایک مرتبہ سورہ تغابن کی آیت ۹ میں ہے:

يَوْمَ يَجْمَعُكُمْ لِيَوْمِ الْجَمْعِ ذَلِكِ يَوْمُ التَّغَابُنِ ط

”یاد کریں کہ وہ تم سب کو ”روزِ اجتماع“ جمع کرے گا۔ یہ وہ دن ہے کہ جب معلوم ہو جائے گا کہ کون لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں؟“

سورہ شوریٰ آیت ۷ میں ہے:

لِنُنْذِرَ أُمَّ الْقُرَىٰ وَمَنْ حَوْلَهَا وَنُنْذِرَ يَوْمَ الْجَمْعِ

”قرآن اس لیے نازل ہوا ہے کہ تو ام القریٰ اور اس کے گرد اگر دلوگوں کو ڈرائے اور اس دن سے ڈرائے جس میں سب مخلوقات جمع ہوں گی۔“

وہ دن یوم الجمع کیوں نہ ہو جب کہ تمام اولین و آخرین، سب جن و انس حتیٰ کہ ملائکہ مقررین بھی اس دن جمع ہوں گے۔ وہ خود ہی جمع نہ ہوں گے بلکہ ان کے تمام اعمال بھی جمع ہو کر عدالت الہی میں پیش ہونے کے لیے تیار ہوں گے۔  
یہی نام ایک اور صورت میں سورہ ہود کی آیت ۱۰۳ میں بھی آیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

ذَلِكِ يَوْمَ هُجُوعٍ ۚ لِلَّهِ النَّاسُ

”وہ ایسا دن ہے کہ جب سب انسانوں کو جمع کیا جائے گا۔“

## ۶۔ یوم الفصل

روزِ قیامت کا ایک اور نام ”یوم الفصل“ (روزِ جدائی) ہے۔ یہ نام قرآن مجید میں چھ مرتبہ آیا ہے۔<sup>[۱]</sup> ان میں سے ایک مرتبہ سورہ بنا کی آیت ۱۷ میں اس طرح سے ہے:

إِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِيقَاتًا

”جدائی کا دن سب کے لیے مقرر ہے۔“

یہ ایک نہایت معنی خیز تعبیر ہے کہ جو اس عظیم دن کی جدائیوں کی حکایت کرتی ہے: حق کی باطل سے جدائی اور امتیاز، کفاروں اور مجرموں کی صفوں سے مومنین اور صالحین کی جدائی اور علیحدگی، بھائی کی بھائی سے جدائی، ماں باپ کی اولاد سے جدائی، اچھوں کے انجام کی بروں سے جدائی۔

یہ تعبیر کبھی ”یوم القضاء“ اور فیصلے کے دن کے معنی میں بھی بروئے کار لائی جاتی ہے کیونکہ قاضی اپنے فیصلے کے دن تنازعے کو ختم کرتا ہے لہذا فیصلے اور قضاوت کو ”الفصل“ کہا جاتا ہے کیونکہ یہ تنازعات کے خاتمے کی علت ہوتا ہے۔

## ۷۔ یوم الخروج

یہ نام قرآن مجید کی صرف ایک آیت میں آیا ہے۔ سورہ ق کی آیت ۴۲ میں دوسرے صورت پھونکنے کے دن کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے:

ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُرُوجِ

”یہ وہ دن ہے کہ جب سب مردے زندہ ہو جائیں گے (اور قبروں سے) باہر نکلیں گے۔“

ہاں! وہ دن موت سے حیات کی طرف لوٹنے کا دن ہے، یہ عالم برزخ سے عالم آخرت کی طرف، اندرون سے بیرون کی طرف اور پنہاں سے آشکار کی طرف نکلنے کا دن ہے۔

یہی معنی ایک اور شکل میں سورہ معارج آیت ۴۳ میں بھی آئے ہیں۔ جہاں فرمایا گیا ہے:

يَوْمَ يَخْرُجُونَ مِنَ الْأَجْدَاثِ سِرَّاءَ كَانَتْهُمْ إِلَىٰ نُصُبٍ يُوفِصُونَ

”جس کا ان سے وعدہ ہے وہ وہی ہے کہ جس دن وہ قبروں میں سے تیزی سے نکلیں گے، گویا وہ اپنے بتوں کی

## طرف دوڑ رہے ہوں۔“ [۱]

یہ تعبیر نشاندہی کرتی ہے کہ آغاز کار میں قیامت کے واقعات غیر معمولی تیز رفتاری سے انجام پائیں گے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بت پرستوں اور بت پرستی کے لیے ایک طعن و تمسخر بھی ہے، وہی بت پرستی جو ان بت پرستوں کی زندگی کا اہم ترین حصہ تھی اور ان کم ذہنوں کی سب سے زیادہ توجہ جس کی طرف ہوتی تھی، اس قدر کہ بتوں کی طرف ان کے دوڑنے کو ”تیز رفتاری“ کے ایک واضح نمونے کے طور پر ذکر کیا ہے۔ کسی جشن کے دن غم کے روز یا سفر سے واپسی پر وہ بتوں کی طرف دوڑتے اور تیزی کرتے تھے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ آیت میں ایک لطیف نکتہ پوشیدہ ہے۔

## ۸۔ الیوم الموعود

یہ نام بھی قرآن کی صرف ایک آیت میں آیا ہے۔ سورہ بروج کے آغاز میں دوسری آیت میں ایک اہم قسم کھاتے ہوئے فرماتا ہے:

## ”والیوم الموعود“

## ”یوم موعود کی قسم“

یوم موعود یعنی وہ دن کہ جس کا سب سے وعدہ کیا گیا ہے اور سب نبیوں نے جس کا وعدہ کیا ہے۔ بعض مفسرین نے قبروں سے نکلنے کے دن کو یوم موعود قرار دیا ہے، یا وہ دن جو شفاعت پیغمبر کے وعدے کا دن ہے، جب کہ یہ سب معانی پہلے معنی میں جمع ہیں۔ [۲]

یہ بات قابل توجہ ہے کہ قرآن مجید میں اس دن کی قسم کو اس آسمان کی قسم کے بعد لایا گیا ہے جس میں بہت سے برج ہیں:

## ”والسبأ ذات البروج“

یہ اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ اس دن کی عظمت آسمان کی عظمت کی طرح ہے یا اس طرف اشارہ ہے کہ اگر وہ یوم موعود نہ ہو تو اس عظیم آسمان کی اس پر حکم فرما اس دقیق نظام کے ساتھ خلقت بے کار اور بے مقصد ہوگی، کیونکہ دنیا کی چند روزہ زندگی کی کوئی اہمیت نہیں کہ جس کی

[۱] ”سراع“ (بروزن ”ظراف“) ”سریع“ (بروزن ”ظریف“) کی جمع ہے۔ اس کے معنی ہیں ایسی چیز جو سرعت سے حرکت کرتی ہے۔ ”نصب“ ”نصب“ کی جمع ہے جب کہ ”نصب“ بھی ”نصب“ (بروزن ”کسب“) کی جمع ہے۔ اس کا معنی دراصل ایسی چیز ہے جو کسی جگہ نصب ہوئی ہو۔ لہذا بتوں کو بھی کہتے تھے جو کسی جگہ نصب ہوتے تھے۔ بعض کا کہنا ہے کہ اس کا صنم سے فرق یہ ہے کہ ”صنم“ ایک خاص شکل و صورت کا ہوتا تھا لیکن نصب پتھر کا بے شکل ٹکڑا ہوتا تھا جس کا احترام کیا جاتا تھا اور خداؤں کے لیے کی جانے والی قربانی کا خون اس پر ڈالا جاتا تھا۔

[۲] روح المعانی، ج ۳ ص ۸۶

خاطر ایسا عظیم و وسیع نظام تخلیق کیا جائے۔

اس سے ملتا جلتا ایک نام سورہ زخرف آیت ۸۳ میں بھی آیا ہے:

**فَذَرَهُمْ يَخْوضُوا وَيَلْعَبُوا حَتَّى يُلْقُوا يَوْمَهُمُ الَّذِي يَوْمُهُمْ عَدُونَ ﴿٨٣﴾**

”انہیں چھوڑ دے کہ وہ اپنے باطل میں غوطہ زن رہیں اور کھیل میں مشغول رہیں، یہاں تک کہ اس دن سے ملاقات کریں جس کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے۔“ [۱]

## ۹۔ یوم الخلود

یہ اصطلاح قرآن میں صرف ایک مرتبہ دکھائی دیتی ہے۔ فرماتا ہے:

**ادْخُلُوْهَا بِسَلَامٍ ۚ ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُلُوْدِ ﴿٣٣﴾**

”اس روز جاوداں کو اس (بہشت جاوداں) میں سلامتی کے ساتھ داخل ہو جانا۔“ (ق ۳۴)

اس آیت سے پہلے کی آیات میں اسی سورت ”ق“ میں بہشت کی توصیف کی گئی ہے۔ اس بات کی طرف توجہ رکھی جائے تو واضح ہوتا ہے کہ یہ نام اس عظیم نعمت الہی، نیکوکاروں کی اس عظیم جزا اور بہشت کی تمام نعمتوں کی ابدیت بیان کرنے کے لیے ہے۔ درحقیقت یوم الخلود کا آغاز بہشت میں داخل ہونے کے بعد ہوتا ہے۔

جو بات ہم پہلے بیان کر چکے ہیں یہ تعبیر واضح طور پر اس کی تائید کرتی ہے، وہ یہ ہے کہ قیامت کا ہر نام اور وصف اس کے کسی ایک پہلو کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ یہاں ابدیت کے بارے میں بات ہو رہی ہے۔ البتہ خلود فقط بہشت کی نعمتوں کے لیے نہیں ہے۔ دوزخ کے عذاب بھی ایسے ہی ہیں۔ تاہم قرآن میں ”یوم الخلود“ کی اصطلاح صرف اسی ایک موقع کے لیے بروئے کار لائی گئی ہے اور دوزخ کے لیے اس سے ملتی جلتی تعبیر ”دار الخلد“ استعمال ہوئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

**ذٰلِكَ جَزَاءُ اَعْدَاءِ اللّٰهِ النَّارُ لَهُمْ فِيْهَا دَارُ الْخٰلِدِ**

”اللہ کے دشمنوں کی جزاء آگ ہے اور وہ دوزخیوں کا دائمی گھر ہے۔“ (حم سجدہ ۲۸)

## ۱۰۔ یوم عظیم

قیامت کی یوم عظیم سے بھی قرآن مجید کی متعدد آیات میں توصیف کی گئی ہے۔ ان میں سے سورہ مریم کی آیت ۳۷ میں ہے:

**فَوَيْلٌ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ مَّشْهَدِ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿٣٧﴾**

[۱] اس سے ملتی جلتی تعبیر سورہ معارج ۴۲ اور سورہ ذاریات ۶۰ میں بھی آئی ہے۔

”افسوس ہے کافروں پر ان کے یوم عظیم کے مشاہدے پر۔“<sup>[۱]</sup>

البتہ ”عذاب یوم عظیم“ کی تعبیر آیات قرآن میں کبھی اہم دنیاوی عذابوں کے لیے بھی آئی ہے۔ ایسے موارد کا عذاب روزِ قیامت سے فرق قبل و بعد کی آیات کو دیکھ کر جاننا چنداں مشکل نہیں ہے۔

بہر حال اس دن کی عظمت سے توصیف ان بہت سے اہم امور کی وجہ سے ہے کہ جو اس عظیم دن میں واقع ہوں گے۔ پاداش و جزائے عظیم، عدالت و حساب عظیم، خلاق کی اس دن عظیم حاضری، اس دن کے طولانی ہونے کی عظمت، خوف و ہراس اور وحشت کی عظمت قیامت کے آغاز کی حرکتوں کی عظمت، خلاصہ یہ کہ تمام جہات کی عظمت۔

## ۱۱۔ یوم الحسرة

یہ نام جو قرآن مید کی طرف ایک آیت میں آیا ہے، روزِ قیامت کے لیے ایک ہلا کر رکھ دیئے والی تعبیر ہے۔ یعنی وہ دن روزِ حسرت و تاسف و ندامت ہے۔ سورہ مریم کی آیت ۳۹ میں فرماتا ہے:

وَأَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ إِذْ قُضِيَ الْأَمْرُ ۖ وَهُمْ فِي غَفْلَةٍ وَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ<sup>(۳۹)</sup>

”انھیں یوم حسرت سے ڈرا، وہ دن کہ جب ہر چیز ختم ہو جائے گی اور آخری حکم صادر ہو جائے گا، یہ ایسی حالت میں ہوگا کہ وہ ابھی غفلت میں ہیں اور ایمان نہیں لائے ہیں۔“

”حسرة“ مادہ ”حسر“ سے ہے۔ مفردات، مقائیس اور بعض دیگر اہل لغت کے مطابق یہ آشکار کرنے کے معنی میں ہے۔ لہذا کہا جاتا ہے:

## حسرت عن الزراع

”یعنی میں نے آستین کو چڑھا لیا ہے اور اپنے بازو کو ظاہر کر دیا ہے۔“

بعد ازاں لفظ حسرت کا اطلاق ہاتھ سے چلے جانے والے امور، آنے والے غم و اندوہ پر ہونے لگا۔ گویا انجام شدہ عمل کے ضرر کے بارے میں انسان کی جہالت و نا آگاہی ختم ہو جاتی ہے اور حقیقت آشکار ہو جاتی ہے۔

بعض کہتے ہیں دراصل اس کے معنی پیچھے کرنے کے ہیں۔ مثلاً جب دریا پیچھے ہٹتا ہے تو فطری طور پر پہلے کے زیر آب ساحل ظاہر ہو جاتے ہیں، یا جب انسان اپنی آستین الٹتا ہے تو بازو ظاہر ہو جاتے ہیں۔ البتہ یہ امور پہلے ہی معنی کے لوازم میں سے ہیں۔<sup>[۲]</sup>

بہر حال غم افسوس اور ندامت اس کے مفہوم کے لوازم سے ہیں اور روزِ قیامت واقعاً شدید اندوہ و ندامت و حسرت کا دن ہے، نہ

[۱] اسی سے تشابہ تعبیر یونس ۱۵، انعام ۱۵، اعراف ۵۹، شعراء ۵۳، احقاف ۲۱، زمر ۱۳ اور مطففین ۵ میں بھی آئی ہے۔

[۲] التحقیق، ج ۲

صرف بدکاروں کے لیے بلکہ نیکو کاروں تک کے لیے کیونکہ جب وہ اللہ تعالیٰ کی عظیم جزاؤں کو دیکھیں گے تو افسوس کریں گے کہ انہوں نے زیادہ اور بہتر نیک کام کیوں انجام نہیں دیئے۔ یہ وہ بات ہے جس کی بعض مفسرین<sup>[۱]</sup> نے تصریح کی ہے۔ لیکن فخر الدین رازی کہتے ہیں کہ صرف بروں کو حسرت ہوگی اور اہل بہشت کے لیے کوئی حسرت نہیں کیونکہ ممکن نہیں کہ وہاں کوئی غم و اندوہ موجود ہو۔<sup>[۲]</sup> لیکن کہنا چاہیے کہ ایسا غم ایک طرح کا کمال ہے اور روحانی تکلیف و عذاب کا باعث نہیں۔ لہذا بہشت میں بھی اس کا ہونا قابل اشکال نہیں۔ (غور کیجیے گا)

البتہ دنیا میں اگر افسوس و حسرت ہو تو قابل تلافی ہے لیکن وہاں تلافی کا کوئی راستہ نہیں۔ لہذا اس دن کو حقیقی یوم حسرت اور عظیم یوم حسرت کہنا چاہیے۔ یہی بات سورہ زمر کی آیت ۵۶ میں ایک اور صورت میں آئی ہے۔ فرماتا ہے:

”أَنْ تَقُولَ نَفْسٌ لِّحَسْرَتِي عَلَى مَا فَرَّطْتُ فِي جَنْبِ اللَّهِ  
”یہ خبردار کرنا اور ڈرانا اس لیے ہے کہ مبادا کوئی روز قیامت کہے، وا حسرتا! ان کوتاہیوں پر جو میں نے حکم الہی کی اطاعت میں کی ہیں۔“<sup>[۳]</sup>

## ۱۲۔ یوم التغابن

یہ نام قرآن مجید میں صرف ایک بار آیا ہے، وہ بھی سورہ تغابن کی نویں آیت میں:

”يَوْمَ يَجْمَعُكُمْ لِيَوْمِ الْجَمْعِ ذَلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ ط  
”یوم اجتماع جس دن تم سب کو جمع کرے گا وہ یوم تغابن ہے۔“

”تغابن“ ”غبن“ کے مادہ سے ہے اور یہاں پر غبن آشکار ہونے کے معنی میں ہے۔ یعنی اس دن ظاہر ہوگا کہ کون مغبون ہے۔<sup>[۴]</sup> طبری مرحوم مجمع البیان میں کہتے ہیں:

یہ مادہ جس وقت بات تفاعل (بغابن) میں استعمال ہو تو شر کو لے لینے اور خیر کو چھوڑ دینے کے معنی میں ہے۔ یا خیر کو اپنا لینے اور شر کو چھوڑ دینے کے معنی میں ہے۔

مومنین اپنے دنیاوی مفاد سے چشم پوشی کر لیتے ہیں اور مفاد آخرت کی طرف توجہ کرتے ہیں، اس طرح یہ کام خیر کو اپنا لینے اور شر کو

[۱] تفسیر مجمع البیان ج ۶ ص ۵۱۵، روح البیان ج ۵ ص ۳۳۵ اور روح المعانی ج ۱۶ ص ۸۵

[۲] تفسیر فخر رازی، ج ۲۱ ص ۲۲۱

[۳] سورہ انعام آیہ ۳۱ میں بھی اس سے ملتا جلتا مفہوم آیا ہے۔

[۴] مفردات راغب

چھوڑ دینے کا مصداق ہوگا۔ لہذا انہیں ”غابن“ کہا جاتا ہے، جب کہ کفار مفادِ آخرت کو چھوڑ دیتے ہیں اور مفادِ دنیا کو اپنا لیتے ہیں۔ یہ کام خیر کو چھوڑ دینے اور شر کو اپنا لینے کا مصداق ہے۔ لہذا وہ ”مغیون“ ہیں۔ حاصلِ کلام یہ کہ اس روز ”غابن“ اور ”مغیون“ ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں گے۔

صحاح اللغہ میں ہے کہ ”غبن“ کے معنی ہیں ”مکرو فریب“، ”مغیون“ کے معنی ہیں فریب خوردہ۔ جب یہ مادہ تفکر کے سلسلے میں استعمال ہو تو اس کے معنی ضعف و ناتوانی ہوتے ہیں۔ لہذا ”غبنین“ کے معنی ہیں ”ضعیف الفکر“۔

بہر حال قیامت میں پردے اٹھ جائیں گے۔ اعمال، عقاید اور نیتوں کے نتائج آشکار ہو جائیں گے۔ انسان اپنے آپ کو اپنے اعمال کے نتائج و آثار کے سامنے پائے گا۔ وہاں برے اعمال کرنے والے اپنی شکست و زیاں اور شیطان کے مکرو فریب کو جانیں گے۔ وہاں انہیں معلوم ہوگا کہ وہ عظیم سرمایہ کھو چکے ہیں، سعادت ابدی سے محروم ہو چکے ہیں اور عذاب الہی کے چنگال میں گرفتار ہو چکے ہیں۔

### ۱۳۔ یوم التناد

یہ نام بھی قرآن مجید میں ایک بار آیا ہے۔ سورہ مؤمن کی آیت ۳۲ میں ہے کہ مؤمن آل فرعون جب فرعونوں دنیا و آخرت کے عذاب الہی سے ڈرا رہا تھا تو اس نے کہا:

وَيَقُولُ إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ يَوْمَ التَّنَادِ ﴿٣٢﴾

”اے قوم! میں تمہارے بارے میں اس دن سے ڈرتا ہوں جب لوگ ایک دوسرے کو صدا دیں گے (اور مدد کے لیے پکاریں گے لیکن کوئی ان کی مدد کو نہ آئے گا)۔“

”التناد“ دراصل ”التنادی“ تھا۔ اس کی یاء حذف ہو گئی ہے اور دال کا سرہ جو اس یاء کے لیے دلیل ہے، باقی ہے۔ یہ لفظ ”نداء“ کے مادہ سے ہے جو آواز دینے کے معنی میں ہے۔

بہت سے مفسرین کا نظریہ ہے کہ ”یوم التناد“ قیامت کے ناموں میں سے ہے۔ [۱] ہر کسی نے قیامت کا یہ نام رکھنے کی کوئی نہ کوئی دلیل ذکر کی ہے۔

کسی کا کہنا ہے کہ اس نام کی وجہ یہ ہے کہ دوزخی اور بہشتی ایک دوسرے کو آواز دیں گے۔ دوزخی کہیں گے: جنت کا تھوڑا سا میٹھا پانی، یا اللہ نے جو تم کو روزی دی ہے، اس میں سے کچھ ہمیں عنایت کر دو۔ قرآن کے الفاظ ہیں:

وَنَادَىٰ أَصْحَابُ النَّارِ أَصْحَابَ الْجَنَّةِ أَنْ أَفِيضُوا عَلَيْنَا مِنَ الْمَاءِ أَوْ مِمَّا رَزَقَكُمُ اللَّهُ ط

[۱] فخر الدین رازی نے اپنی تفسیر میں کہا ہے کہ اس بات پر مفسرین کا اجماع و اتفاق ہے۔ (ج ۲ ص ۶۱)

”اہل بہشت جواب میں کہیں گے:

**قَالُوا إِنَّ اللَّهَ حَرَّمَهُمَا عَلَى الْكَافِرِينَ ۝**

”اللہ نے یہ کافروں پر حرام کر دی ہے۔“ (اعراف ۵۰)

”معانی الاخبار“ کی ایک حدیث میں یہ معنی امام جعفر صادق سے روایت ہوئے ہیں۔

بعض کہتے ہیں کہ یہ نام رکھنے کا سبب یہ ہے کہ میدانِ محشر میں لوگ ایک دوسرے کو آواز دیں گے اور مدد کے لیے پکاریں گے۔

یا یہ نام اس لیے رکھا گیا ہے کہ فرشتے لوگوں کو حساب کے لیے آواز دیں گے اور لوگ فرشتوں کو مدد کے لیے پکاریں گے۔

یا اس لیے کہ مومن جب اپنا نامہ اعمال دیکھیں گے تو شوق سے پکار اٹھیں گے:

**هاؤم اقرءوا کتابیہ**

”یہ ہے میرا نامہ اعمال، آؤ لوگو اسے پڑھو۔“ (حاقہ ۱۹)

جب کہ کافروں کو جس وقت ان کا نامہ عمل تھا یا جائے گا تو وہ شدت و حشت سے چیخیں گے:

**یلیتنی لم اوت کتابیہ**

”اے کاش! مجھے میرا نامہ اعمال نہ پکڑا یا جاتا۔“ (حاقہ ۲۵)

البتہ اس کی اور بھی وجوہ بیان کی گئی ہیں۔ بعض تفاسیر میں آٹھ تک وجوہات شمار کی گئی ہیں لیکن ان میں بعض کمزور لگتی ہیں۔ یہ نکتہ بھی

قابل ذکر ہے کہ ممکن ہے یہ تمام معانی مفہومِ آیت میں جمع ہوں کیونکہ یہ ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں۔

## ۱۴۔ یوم التلاق

کہ یہ نام بھی قرآن مجید میں صرف ایک بار سورہ (مومن ۱۵ میں) آیا ہے:

**يُلْقِي الرُّوحُ مِنْ أَمْرِهِ عَلَى مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ لِيُنْذِرَ يَوْمَ التَّلَاقِ ۝**

”اللہ روح کو اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے اپنے فرمان سے القاء کرتا ہے تاکہ وہ انسانوں کو ’یوم التلاق‘

سے ڈرائیں۔“

دوسری آیات کے قرینے سے ظاہر ہوتا ہے کہ القاء روح سے مراد وحی اور کتب آسمانی ہی ہیں۔ جیسا کہ سورہ شوریٰ ۵۲ میں رسول

اکرمؐ سے خطاب کرتے ہوئے فرماتا ہے:

**وَكَذَلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحًا مِنْ أَمْرِنَا ۝**

”جیسے ہم نے گذشتہ نبیوں پر وحی بھیجی تھی پر بھیجی اپنے امر سے ہم نے روح کو وحی کیا۔“



اس لحاظ سے قرآن مجید اللہ کی جانب سے ایک روح ہے کہ جو انسانی معاشرے کے جسم میں پھونکی گئی ہے۔  
مفردات میں راغب کا کہنا ہے کہ قرآن کو اس لیے روح کہا گیا ہے کہ یہ حیات روحانی کا سبب ہے۔ اس روح کے القاء کا مقصد اس  
عظیم روز کی ملاقات سے ڈرانا اور خوف دلانا ہے۔

اس روز مختلف ملاقاتیں ہوں گی جو سب مفہوم آیت میں جمع ہیں اگرچہ مفسرین نے کبھی ان میں سے بعض کا ذکر کیا ہے۔  
یہ وہ دن ہے جب بندے اپنے پروردگار سے ملاقات کریں گے:

يَا أَيُّهَا الْإِنْسَانُ إِنَّكَ كَادِحٌ إِلَىٰ رَبِّكَ كَدًّا فَمُلِّقِيهِ ۖ (انشقاق ۶)

یہ وہ دن ہے جب انسان حساب اور جزا و سزا کے لیے فرشتوں سے ملاقات کریں گے:

وَتَتَلَقَّوهُمْ الْمَلٰٓئِكَةُ ط (انبیاء ۱۰۳)

یہ وہ دن ہے جب انسان اس عدالت عدل میں اپنے اعمال و گفتار کے حساب سے ملاقات کرے گا:

إِنِّي ظَنَنْتُ أَنِّي مُلَاقٍ حِسَابِيَّةٍ ۖ (حاقة ۲۰)

وہ دن جب گذشتگان اور آئندگان باہم ملاقات کریں گے۔

وہ دن جب حق اور باطل کے پیشوا اپنے پیروکاروں سے ملیں گے۔

وہ دن جب ظالم و مظلوم ایک دوسرے سے ملیں گے۔

وہ دن جب اہل بہشت اہل دوزخ سے ملاقات کریں گے۔

ہاں! انبیاء کے آنے اور کتب آسمانی کے نزول کا مقصد یہی تھا کہ بندوں کو اس عظیم دن کی ملاقات سے خبردار کریں اور اس دن کے  
لیے یہ نام اور اس کا وسیع اور ہلادینے والا مفہوم کتنا عجیب ہے۔

## ۱۵۔ یوم ثقیل

یہ ان ناموں میں سے ہے جو فقط ایک بار قرآن میں آئے ہیں۔ سورہ دھر کی آیت ۲۷ میں ہے:

إِنَّ هَٰؤُلَاءِ يُجِبُّونَ الْعَاجِلَةَ وَيُنْذِرُونَ وَرَأٰهُمْ يَوْمًا ثَقِيلًا ۖ

”وہ (مجرم) دنیا کی زودگز زندگی سے محبت کرتے ہیں جب کہ سخت و سنگین دن انہوں نے اپنے پیچھے کر  
رکھا ہے۔“

اس دن کے لیے ”ثقیل“ کی صفت ایک وسیع اور پر معنی توصیف ہے۔ وہ دن ثقیل ہے محاسبوں کے لحاظ سے، سنگین ہے جزاؤں  
سزاؤں کے اعتبار سے، سخت ہے رسوائیوں کے حوالے سے، ثقیل ہے محشر کی شدتوں کے پیش نظر، سنگین ہے سخت ذمہ داریوں کی بناء پر اور سخت

ہے مجرموں کے کندھوں پر گناہوں کے بار کے لحاظ سے۔

قرآن میں ”یذرون ورائہم“ (پیچھے ڈال رکھا ہے) فرمایا گیا ہے جب کہ قاعدتا ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ”انہیں یوم ثقیل درپیش ہے۔“ ایسا اس لیے ہے کہ مجرموں نے اس دن کو یوں بھلا رکھا ہے گویا انہوں نے اسے پیچھے ڈال رکھا ہو۔

## ۱۶۔ یوم الازفة

قیامت کا ہر نام اپنے ساتھ ایک خاص پیغام رکھتا ہے۔ ان میں سے ایک نام ”یوم الازفة“ بھی ہے جو قرآن مجید میں صرف ایک مرتبہ آیا ہے۔ اگرچہ لفظ ”الازفة“ دو مرتبہ آیا ہے لیکن ”یوم الازفة“ ایک ہی مرتبہ ہے۔ سورہ مؤمن کی آیہ ۱۸ میں ہے:

وَأَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْآزِفَةِ إِذِ الْقُلُوبُ لَدَى الْحَنَاجِرِ كُظُمِينَ ۝

”انہیں ”روز نزدیک“ سے ڈراؤ۔ یہ وہ دن ہے جب وحشت کے مارے دل حلق میں اٹک جائیں گے اور انسان کا سارا وجود غم و اندوہ سے بھر جائے گا۔“

”ازفة“ ”ازف“ (بروزن صدف) کے مادہ سے ہے۔ مقائیس اللغت، مفردات، مصباح اللغت اور دیگر کتب میں ہے کہ اس کا معنی ہے ”نزدیک ہونا“۔ البتہ بعض کا کہنا ہے کہ اس کے معنی ایسی نزدیکی ہیں جس کے ساتھ وقت کی تنگی بھی ہو۔

یہ نام رکھنا اس حقیقت کا عکاس ہے کہ قیامت لوگوں کی سوچ سے کہیں قریب تر ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ بے خبر لوگ یہ نہ کہیں کہ ابھی بہت وقت پڑا ہے اور قیامت کا وعدہ تو ایک ادھار ہے، بلکہ وہ روز نزدیک ہے بھی ایسا کہ جس کی شدت وحشت سے دل گویا حلقوم میں آٹکیں گے اور جان لب پر آجائے گی۔ خوف کے ساتھ غم ایسا ہوگا کہ لوگوں کے گلے گھٹ رہے ہوں گے اور سانس لینا دشوار ہو جائے گا۔ پس ایسے دن کے لیے ہر لحظہ تیار رہنا چاہیے۔

یہی بات قرآن نے ایک اور انداز سے سورہ انبیاء کی آیت میں بیان فرمائی ہے:

اِقْتَرِبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِي غَفْلَةٍ مُّعْرِضُونَ ۝

”لوگوں کا روز حساب ان کے بہت نزدیک آن پہنچا ہے۔ لیکن وہ غفلت کی وجہ سے منہ موڑے ہوئے ہیں۔“

توجہ رہے کہ ”اقترب“ میں ”قرب“ کی نسبت زیادہ تاکید ہے۔ یہ اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ حساب یوم قیامت بہت نزدیک ہے۔

قیامت اس قدر نزدیک اور یقینی ہے کہ قرآن نے اپنی بہت سی تعبیرات میں اسے فعل ماضی کے صیغوں سے یاد کیا ہے، جیسے سورہ فرقان کی آیت ۶۵ و ۶۶ میں فرماتا ہے:

إِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا ۝ إِنَّهَا سَاءَتْ مُسْتَقَرًّا وَمُقَامًا ۝

”عذاب جہنم بہت سخت اور دائمی تھا اور دوزخ برا ٹھکانا اور قیام گاہ تھی۔“

ایسی اور بھی بہت سی آیات ہیں۔

## ۷۔ یوم عسیر

یہ تعبیر قرآن مجید میں دو مرتبہ آئی ہے۔ سورہ مدثر کی آیت ۱۹ اور سورہ فرقان کی آیت ۲۶ میں۔ پہلی آیت میں ہے:

فذلک یومئذ یوم عسیر

وہ دن ایک سخت دن ہے۔“

دوسری آیت میں ہے:

وکان یوما علی الکافرین عسیرا

”یوم قیامت کافروں پر ایک سخت دن ہوگا۔“

البتہ ایک بار ”عسر“ (بروزن ”خشش“) بھی آیا ہے۔ سورہ قمر کی آیت ۸ میں ہے:

یقول الکافرون هذا یوم عسر

”کافر کہیں گے: آج بہت سخت دن ہے۔“<sup>[۱]</sup>

یقیناً وہ روز کافروں کے لیے بہت طاقت فرسا، مصیبت بار اور دردناک ہے، اس قدر کہ ان میں طاقت ور ترین بھی گھٹنے ٹیک دے گا اور عاجز، بیچارہ اور ناتوان ہو کر رہ جائے گا۔

فخر الدین رازی اپنی تفسیر میں کہتے ہیں:

کافروں پر اس دن کی سختی اس جہت سے ہے کہ ان سے سخت حساب لیا جائے گا۔ ان کے اعمال نامے ان کے بائیں ہاتھ میں تھمائے جائیں گے۔ ان کے چہرے سیاہ ہوں گے، ان کے بدن نیلے اور ان کی آنکھیں ناپید ہوں گی۔ ان کے جسم کے اعضاء لوگوں کی موجودگی میں ان کے گناہوں پر گواہی دیں گے اور ان کے لیے باعث رسوائی ہوں گے۔<sup>[۲]</sup>

یہ تو محشر کی سختیوں کا ایک مرحلہ ہے جب کہ اس کے بعد کے مراحل تو سخت تر اور زیادہ مصیبت آفرین ہوں گے۔ جب انہیں جہنم کی طرف بھیج لے جایا جائے گا، پھر وہ مختلف طرح کے عذاب میں مبتلا ہوں گے اور غضب الہی کی آتش قہر میں گرفتار ہوں گے۔ وہ دن تو مومنین کے لیے بھی کوئی روز آسان نہیں ہے۔ تمام اعمال کا حساب دینا تو بجائے خود، ذرہ بھر سختی کو بھی برداشت کرنا بہت مشکل ہوگا۔

[۱] ”عسیر“ اور ”عسر“ دونوں صفت مشبہ ہیں۔

[۲] تفسیر فخر الدین رازی، ج ۳۰، ص ۱۹۷

## ۱۸۔ یوم الیم

یہ نام بھی آیات قرآن مجید میں دوبار آیا ہے، اگرچہ لفظ ”الیم“ عذاب قیامت کی توصیف کے طور پر دسیوں مرتبہ قرآن کی مختلف سورتوں میں دکھائی دیتا ہے۔

ایک بار سورہ ہود کی آیت ۲۶ میں اللہ کے نبی حضرت نوحؑ کی زبانی نقل ہوا ہے کہ انہوں نے اپنی بت پرست قوم سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

انی اخاف علیکم عذاب یوم الیم

”میں تم پر دردناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔“

دوسری بار سورہ زخرف کی آیت ۶۵ میں وحی الہی کی زبان میں یوں آیا ہے:

فویل للذین ظلموا من عذاب یوم الیم

”وایہ ظلم کرنے والوں پر، دردناک دن کے عذاب سے۔“

اس دن کو دردناک صرف اس لیے نہیں کہا گیا ہے کہ اس دن کا عذاب الیم و دردناک ہے، بلکہ علاوہ ازیں وہ دن بہت پہلوؤں کے اعتبار سے باعث درد و رنج ہے۔ رسوائیوں کے لحاظ سے، ندامتوں اور پشیمانیوں کے اعتبار سے دیگر بہت سی روحانی تکلیفوں کی وجہ سے۔ مثلاً انسان دیکھے گا کہ دوسرے اس کے وسیلے سے اہل بہشت ہو گئے ہیں اور وہ خود دوزخی بن گیا ہے۔ اس لحاظ سے دردناک ہوگا کہ اس روز بازگشت کی کوئی صورت نہ ہوگی اور اس اعتبار سے کہ اس دن کا عذاب و رنج دائمی ہوگا۔

یہ بات توجہ طلب ہے کہ مذکورہ بالا دو آیتوں میں سے ایک میں مشرکوں کا ذکر ہے اور دوسری میں ظالموں کا اور ہم جانتے ہیں کہ شرک ایک طرح کا ظلم ہے جب کہ ظلم و ستم بھی شرک جلی و خفی کے محرکات میں سے ہے۔

## ۱۹۔ یوم الوعید

یہ نام بھی پورے قرآن مجید میں صرف ایک مرتبہ آیا ہے۔ سورہ ق کی آیت ۲۰ میں ہے:

ونفخ فی الصور ذلک یوم الوعید

”وحشت ناک وعدوں پر عمل کے اس دن صور پھونکا جائے گا۔“

البتہ لفظ ”وعید“ قرآن میں بہت مرتبہ آیا ہے اگرچہ ”یوم الوعید“ کی تعبیر ایک ہی دفعہ آئی ہے۔

کلمہ ”وعید“ ”وعد“ کے مادہ سے لیا گیا ہے۔ راغب نے مفردات میں کہا ہے کہ ”وعد“ خیر و شر ہر دو مواقع کے لیے استعمال ہوتا

ہے جب کہ ”وعید“ صرف عذاب و سزا کے وعدوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ لہذا ابن منظور نے لسان العرب میں اس کا معنی ”تہدید“ کیا ہے۔ کلمہ ”ایعاد“ بھی اسی معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

بہر حال یہ نام روز قیامت کی تمام سزاؤں کی طرف ایک پر معنی اشارہ ہے۔ اس میں محشر اور عدالتِ عدل الہی کی مشکلات بھی شامل ہیں، دوزخ کی سزائیں بھی اور مادی و روحانی سزائیں بھی مثلاً خلاق کی موجودگی میں رسوائی اور فیضِ قرب الہی سے دوری۔ مفسرین کے درمیان اس مسئلے میں بحث ہے کہ کیا اس آیت میں نفخِ صور سے مراد موت کا اور دنیا کے خاتمے کا صور ہے یا زندگی اور آغازِ آخرت کا۔ لیکن اس کے بعد کی آیت کہتی ہے:

### وجاءت کل نفس معها سائق وشہید

”ہر انسان اس عالم میں واردِ محشر ہوگا کہ چلانے والا اور گواہی دینے والا اس کے ہمراہ ہوگا۔“

یہ آیت اس امر کی دلیل ہے کہ یہاں دوسرا صور مراد ہے اور یومِ وعید بھی وہی دن ہے۔<sup>[۱]</sup>

## ۲۰۔ الیوم الحق

یہ نام بھی قرآن مجید میں ایک بار سورہ نبا کی آیت ۳۹ میں آیا ہے۔ قیامت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

### ذلك الیوم الحق

”وہ دن یومِ حق ہے۔“

ہاں وہ ایک انکارنا پذیر حقیقت ہے۔ ایک ایسی حقیقت ہے کہ جو تمام عالمِ آفرینش کو با معنی بناتی ہے۔ اگر وہ دن نہ ہوتا تو اس جہان کی حقیقت کا کچھ مفہوم نہ ہوتا۔

اصولاً دنیا ایک سراب سے زیادہ کچھ نہیں۔ دراصل یہ مجاز ہے نہ کہ حقیقت، فنا ہے نہ کہ بقاء موت ہے نہ کہ حیات۔ واقعاً حقیقت، واقعیت اور حیات کا اصلی مفہوم قیامت میں ہی ظاہر ہوگا۔ قرآن کے الفاظ ہیں:

### وان الدار الاخرة لہی الحیوان

”دارِ آخرت ہی حیاتِ حقیقی ہے۔“ (عنکبوت ۶۴)

بعض مفسرین نے اس دن کے حق ہونے کی تفسیر میں تین نکتوں کی طرف اشارہ کیا ہے:

۱۔ وہ دن حق ہے اور اس کے سوا سب کچھ باطل۔ کیونکہ دنیا کے دنوں کا باطل ہونا ان کے حق ہونے سے زیادہ ہے۔

[۱] بہت سے مفسرین مثلاً ابوالفتوح رازی، علامہ طباطبائی، فخر الدین رازی، روح المعانی میں آلوسی اور مراغی نے اپنی تفسیر میں مندرجہ بالا آیات کے تحت اس معنی کو قبول کیا ہے۔

۲۔ حق وجود ثابت کے معنی میں ہے۔ اسی لیے اللہ کو حق کہتے ہیں کیونکہ اس کے لیے فنا کا کوئی تصور نہیں ہو سکتا۔ یوم قیامت بھی ایسا ہی ہے، لہذا حق ہے۔

۳۔ وہی وہ دن ہے جسے ”دن“ کہا جاسکتا ہے کیونکہ اس روز روشن میں اسرار مخفی آشکار ہوں گے، جب کہ دنیا میں لوگوں کے احوال (رات کی طرح) چھپے ہوئے اور نامعلوم ہیں۔ [۱]

## ۲۱۔ یوم مشہود

یہ توصیف بھی قرآن مجید میں صرف ایک بار سورہ ہود کی آیت ۱۰۳ میں آئی ہے۔ عذابِ آخرت کی طرف اشارہ کرنے کے بعد اس روز کا ذکر کرتے ہوئے قرآن فرماتا ہے:

### وذلك يوم مشهود

”اور وہ ایسا دن ہے جس کا نیک اور بد بلا امتیاز مشاہدہ کریں گے۔“

نہ فقط مخلوقات میں سے اولین و آخرین اس روز کا مشاہدہ کریں گے بلکہ وہ اپنے اعمال، حساب، عدالتِ عدل الہی اور اپنے اعمال کی جزا و سزا کا بھی اس روز مشاہدہ کریں گے۔

طبری مرحوم نے مجمع البیان میں اور علامہ طباطبائی مرحوم نے المیزان میں کہا ہے کہ اس آیت کا مطلق ہونا اس امر پر گواہ ہے کہ فقط انسان نہیں بلکہ جن اور فرشتے بھی اس روز حاضر و ناظر ہوں گے، کیونکہ وہ سب کے عمومی اجتماع کا دن ہے۔ [۲]

قرطبی بھی کہتے ہیں کہ اہل آسمان بھی اس دن کے شاہد و ناظر ہیں۔  
البتہ ہر دن کا مشاہدہ ہوتا ہے، لیکن قیامت کے لیے اس توصیف کا انتخاب ایک طرف تو اس دن کے قطعی ہونے کی طرف اشارہ ہے اور دوسری طرف اس دن اور اس کے واقعات کی اہمیت کی طرف اشارہ ہے اور اس کی طرف بھی کہ اس روز سب خلایق حاضر ہوں گے۔

## ۲۲۔ یوم معلوم

یہ تعبیر بھی قرآن مجید میں ایک بار سورہ واقعہ کی آیہ ۵۰ میں کافروں کے سوال کے جواب میں آئی ہے۔ ان کا سوال حیات بعد از موت کے بارے میں تھا۔ ارشاد ہوتا ہے:

قُلْ إِنَّ الْأَوَّلِينَ وَالْآخِرِينَ ﴿٣٥﴾ لَمَجْمُوعُونَ ﴿٣٦﴾ إِلَىٰ مِيقَاتٍ يَوْمٍ مَّعْلُومٍ ﴿٣٧﴾

[۱] تفسیر کبیر، ج ۳۱ ص ۲۵

[۲] المیزان، ج ۱۱ ص ۷، مجمع البیان ج ۵ ص ۱۹۱۔ مراغی نے بھی اپنی تفسیر میں یہی بات قبول کی ہے۔

”کہہ دے کہ اولین و آخرین سب کو مقررہ یوم معلوم کو جمع کیا جائے گا۔“

اس دن کے معلوم ہونے کی دو تفسیریں ہو سکتی ہیں:

- ۱۔ مراد ”علم تفصیلی“ ہے یعنی اس دن اور اس کی دقیق تاریخ کا علم۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ علم اللہ سے مخصوص ہے اور اس کے بارے میں کوئی بھی، یہاں تک کہ انبیاء مرسلین اور ملائکہ مقررین بھی آگاہ نہیں ہیں۔ لیکن اللہ کے نزدیک وہ دن ثابت، قطعی اور ہر لحاظ سے معلوم ہے۔
- ۲۔ مراد ”علم اجمالی“ ہو یعنی اس بات کا علم کہ ہم سب کو ایک ایسا دن درپیش ہے اور جیسا کہ آئندہ انشاء اللہ آئے گا، یہ علم ہماری فطرت کی گہرائیوں سے پھوٹا ہے۔ علاوہ ازیں عقلی و نقلی متعدد دلائل اس پر موجود ہیں جس کی وجہ سے ایک عالم بھی اور عام آدمی بھی اجمالاً اس کا علم حاصل کر سکتا ہے۔ مزید برآں یہ کہ تمام انبیاء اور پیغمبران الہی نے اس کی خبر دی ہے۔ لہذا وہ روز معلوم، قطعی اور مسلم ہے، اگرچہ اس کی حتمی تاریخ نہ جانتے ہوں۔

یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے ہم سب یقینی طور پر جانتے ہیں کہ آخر کار ہمیں مرجانا اور دنیا سے چلے جانا ہے، اگرچہ کوئی بھی اپنی زندگی کے خاتمہ کی تاریخ نہیں جانتا۔

زیادہ تر مفسرین نے پہلے معنی کو ہی اختیار کیا ہے، لیکن بعض نے دوسرے معنی پر زیادہ زور دیا ہے اور کلمہ ”قل“ کو اس علم کے عمومی ہونے پر دلیل قرار دیا ہے کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ سب سے یہ بات کہہ دے۔<sup>[۱]</sup>

البتہ ان دونوں تفسیروں کا آیت کے مفہوم میں جمع ہونا بھی کاملاً ممکن ہے۔

ضمنی طور پر ”یوم معلوم“ کی تعبیر یہ پیغام دیتی ہے کہ ہمیں اس دن کے بارے میں سنجیدہ ہونا چاہیے، اپنے آپ کو اس دن کی ملاقات کے لیے تیار کرنا چاہیے اور یقین رکھنا چاہیے کہ قیامت اپنے تمام تر آثار و نتائج کے ساتھ ہر حال آئے گی۔ یہ علم و یقین غیر معمولی تربیتی اثر رکھتا ہے۔

## ۲۳۔ یوما عبوسا قمطیراً

یہ نام بھی قرآن مجید میں ایک ہی مرتبہ دکھائی دیتا ہے۔ سورہ ہر آیت ۱۰ میں ابرار<sup>[۲]</sup> کی زبانی بیان کیا گیا ہے:

انا نخاف من ربنا یوما عبوسا قمطیراً

”ہم عبوس اور سخت دن کے بارے میں اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں۔“

واضح ہے کہ ”عبوس“ انسانی صفات میں سے ہے اور ایسے شخص کو کہتے ہیں جو منہ بسورے ہوئے ناراض ہو۔ اس دن کی یہ توصیف

[۱] تفسیر فخر الدین رازی، ج ۲۹، ص ۱۷۲

[۲] ہم جانتے ہیں کہ یہ سورت حضرت علی، فاطمہ، حسن، حسین سلام اللہ علیہم اجمعین کے بارے میں نازل ہوئی جو ابرار کی صف اول میں ہیں۔

اس کی وحشت ناک وضع کی طرف واضح کنایہ ہے، یعنی اس دن کے واقعات اس قدر سخت اور تکلیف دہ ہیں کہ نہ صرف انسان اس روز عیوس ہوں گے بلکہ وہ دن بذات خود گویا منہ بنائے ہوئے ناراض ہوگا۔

بہت سے مفسرین کے مطابق ”قطریر“ کا معنی ہے ”سخت و شدید“ یا ایسا انسان جو ترش و اور عیوس ہو۔ لہذا اس کا مفہوم ”عیوس“ کے معنی کے نزدیک ہی ہے۔ یہ مادہ ”قطر“ (بروزن ”قفل“) سے لیا گیا ہے اور اس میں میم زائدہ ہے۔ ایک اور قول کے مطابق یہ ”قطر“ (بروزن خنجر) سے لیا گیا ہے۔

بہر حال یہ تعبیر نشاندہی کرتی ہے کہ اس دن کے حوادث اس قدر سخت، شدید، دشوار اور دردناک ہوں گے کہ اس کے آثار انسانوں کے اندر سے ان کے چہروں پر منتقل ہو جائیں گے، ہر کوئی سر تا پا وحشت و اضطراب میں گھرا ہوگا، کیونکہ کوئی اپنے انجام سے باخبر نہ ہوگا اور سب حساب اور لطف الہی کے انتظار میں ہوں گے۔  
بعض مفسرین کا کہنا ہے:

”سبحان الله ما اشد اسمہ وهو من اسمہ اشد“

”سبحان الله! یوم قیامت کا نام کس قدر شدید و سخت ہے اور وہ دن خود اس سے بھی شدید تر ہے۔“

## ۲۴۔ یوم البعث

یہ تعبیر قرآن مجید میں دو مرتبہ آئی ہے اور دونوں مرتبہ سورہ روم کی آیت ۵۶ میں ہی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَقَالَ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ وَالْإِيمَانَ لَقَدْ لَبِثْتُمْ فِي كِتَابِ اللَّهِ إِلَى يَوْمِ

الْبَعْثِ فَبَهَذَا يَوْمِ الْبَعْثِ وَلَكِنَّكُمْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ﴿۵۶﴾

”جنہیں علم اور ایمان دیا گیا ہے وہ قیامت میں مجرموں سے کہیں گے تم نے اذن خدا سے (عالم برزخ میں) یوم

بعث تک توقف کیا ہے اور اب یوم بعث (مردوں کے اٹھنے کا دن) ہے، لیکن تم نہیں جانتے ہو۔“

البتہ مردوں کے زندہ ہونے کو ”بعث“ سے تعبیر کرنا (اور اس سے مشتق افعال کا استعمال) آیات قرآن میں بہت زیادہ ہے جس کی طرف قبل ازیں اشارہ کیا جا چکا ہے۔ یہ سب اس حقیقت کا ترجمان ہے کہ وہ دن موت کے بعد عمومی حیات کا دن ہے۔ اس سلسلے میں چونکہ حسب ضرورت گفتگو ہو چکی ہے لہذا یہاں ہم بیشتر وضاحت سے اپنے تئیں بے نیاز سمجھتے ہیں۔

قیامت کے ناموں کا پہلا حصہ یہاں تمام ہوتا ہے۔

اس حصے میں جو نام، صفات اور مختلف تعبیرات آئی ہیں ان سے یہ حقیقت بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن نے انسانوں کی بیداری، تعلیم و تربیت اور کمال و بلندی کی طرف لے جانے کے لیے معاد کو مختلف روپ میں پیش کیا ہے۔ اس کے لیے طرح طرح کے ناموں کا انتخاب کیا



ہے جن میں سے ہر نام اس بے مثال دن کے عظیم اور ہلادینے والے حوادث کے کسی ایک پہلو کی نشاندہی کرتا ہے۔  
 ان میں سے ہر نام یا بالفاظ دیگر، ان اوصاف میں سے ہر وصف اس روز کے حوالے سے اپنے ساتھ ایک خاص پیغام رکھتا ہے، ایک پیغام، سب نسلوں کے لیے اور سب زمانوں کے لیے۔  
 ایک ایسا پیغام جس کی طرف توجہ گمراہیوں، برائیوں، گناہوں، جرموں، آلودگیوں اور ظلموں سے بچنے کے لیے ایک طاقت ور سبب ہے۔  
 ایک ایسا پیغام جس کا مطالعہ مختلف حوالوں سے، خصوصاً تربیتی مسائل میں قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت کے پہلوؤں کو واضح و آشکار کرتا ہے اور جو راہ حق کے راہیوں اور قرب خدا کے راستے کے مسافروں کے لیے راہنما ہے۔ (غور کیجیے گا)

## دوسرا حصہ

اب ہم قیامت کے ناموں کے دوسرے حصے کی جستجو کرتے ہیں جس میں قیامت کے اوصاف ایک لفظ میں نہیں بلکہ ایک جملے میں بیان کیے گئے ہیں۔

### ۲۵۔ یَوْمَ نَطْوِي السَّمَاءَ كَطَيِّ السِّجْلِ لِلْكِتَابِ

ان ناموں میں سے بعض ان حوادث کے بارے میں بتلاتے ہیں کہ جو دنیا میں قیامت کے نزدیک رونما ہوں گے، جب کہ بعض اس دن انسانوں کے حال سے متعلق مسائل کے بارے میں ہیں اور بعض انجام کار کی خبر دیتے ہیں۔ وہ تعبیرات جو ”مقدمات قیامت“ سے مربوط ہیں ان میں سے مندرجہ بالا تعبیر بھی ہے۔ سورہ انبیاء میں نیکوں اور بدوں کی کچھ جزا و سزا کی طرف اشارے کے بعد آیت ۱۰۴ میں فرمایا گیا ہے:

يَوْمَ نَطْوِي السَّمَاءَ كَطَيِّ السِّجْلِ لِلْكِتَابِ ۖ كَمَا بَدَأْنَا أَوَّلَ خَلْقٍ تُعِيدُهُ ۖ  
وَعَدًا عَلَيْنَا ۖ إِنَّا كُنَّا فَاعِلِينَ ﴿۱۰۴﴾

”جس روز ہم آسمان کو بساط کی طرح لپیٹ دیں گے اور پھر جس طرح سے ہم نے خلقت کا آغاز کیا تھا اسے لوٹائیں گے۔ یہ وعدہ ہم نے کیا ہے اور اسے لازماً انجام دیں گے۔“

”سجل“، ”سجل“ (بروزن ”سطل“) کے مادہ سے ہے جو بڑی اور بھری ہوئی بالٹی کے معنی میں ہے۔ اس کے مادہ کو بکھیرنے اور منتشر کرنے کے لیے جمع کرنے اور ذخیرہ کرنے کے معنی میں قرار دیا گیا ہے۔ اسی لیے بڑی بالٹی کو ”سجل“ کہا گیا ہے اور سجل ان اوراق کو کہتے ہیں جن پر مطالب لکھے جاتے ہیں اور کبھی انہیں طومار اور بساط کی صورت میں لپیٹ دیا جاتا ہے۔ اس موقع پر ”طی السجل“ کہا جاتا ہے۔

بعض سمجھتے ہیں کہ سجل کے معنی ہیں ایسی کتابیں جن میں عدالتی اور فضائی احکام اور دعووں کی صورت وغیرہ مرتب کی گئی ہو۔ لہذا ”تسجیل“ ثبت کرنے، قرار دینے اور ثابت کرنے کے معنی میں آتا ہے۔ [۱]

بہر حال ظاہر آیت یہ ہے کہ اس دنیا کے اختتام پر قیامت کے قریب تمام آسمانوں کو باہم سمیٹ لیا جائے گا جیسے شروع میں ایک ڈھیر کی صورت میں تھے۔ یہ وہ بات ہے جس کی عصر حاضر کے علم نے صراحت کی ہے۔ اس کے مطابق عالم ہستی شروع میں ایک ڈھیر کی صورت میں تھا۔ بعد ازاں نامعلوم علل کے باعث اپنے گرد گردش کرنے لگا اور مرکز گریز قوت کے زیر اثر اس کے اجزاء ایک دوسرے سے دور ہونے لگے۔

[۱] قاموس مفردات، التحقیق اور کتب دیگر۔

اب بھی کائنات پھیل رہی ہے لیکن احتمال یہ ہے کہ پھیلاؤ کی آخری حد تک پہنچ کر بازگشت شروع ہو جائے گی اور پھر سرعت سے مرکز عالم کی طرف حرکت شروع ہو جائے گی۔ آخر کار آسمان باہم سمیٹے جائیں گے اور ایک ہی ڈھیر بن جائیں گے اور یہی اس دنیا کا آخر ہوگا۔ پھر حرکت نوکا بار دیگر آغاز ہوگا۔ نئے زمین و آسمان وجود میں آئیں گے جن سے جہان دیگر تشکیل پائے گا۔ اس مفہوم کے مطابق ضرورت نہیں رہتی کہ ہم آیت کی کنائی تفسیر کریں، اگرچہ بہت سے مفسرین نے کنائی معنی کی جستجو کی ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ اس زمانے میں یہ تفسیر پیش نظر نہ تھی۔

البتہ بہر صورت آسمانوں کے جمع ہونے کے یہ معنی نہیں کہ وہ بالکل ہی نابود ہو جائیں گے اور عالم مادہ ختم ہو جائے گا کیونکہ قرآن متعدد آیات میں صراحت سے کہتا ہے کہ انسان قبروں سے اٹھیں گے اور بوسیدہ ہڈیاں لباس حیات پہنیں گی۔ جسموں کے بوسیدہ ہو جانے کی وجہ سے جو خاک بن چکی ہوگی وہ جمع ہوگی اور نئی زندگی کا آغاز کرے گی۔

## ۲۶۔ یوم تبدل الارض غیر الارض والسبوت

سابقہ گفتگو میں جو کچھ کہا گیا ہے اس سے قیامت کے بارے میں اس قرآنی تعبیر کا مفہوم بھی واضح ہو جاتا ہے۔ یہ نام قرآن مجید کی ایک ہی آیت (سورہ ابراہیم ۴۸) میں آیا ہے۔ یہ ظالموں اور مجرموں سے انتقام الہی کی طرف اشارہ ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

### یوم تبدل الارض غیر الارض والسبوت

”ایسا اس روز ہوگا جب یہ زمین دوسری زمین سے بدل جائے گی اور آسمان بھی دوسرے آسمانوں سے بدل جائیں گے۔“

پہلے تو سب آپس میں تہ ہو جائیں گے۔ پھر عالم ہستی میں معمار ایک نئے منصوبے کے تحت نئے زمین و آسمان ایجاد کرے گا جو بالاتر اور والاتر ہوں گے، ایسے جیسے یوم قیامت کی طبیعت متقاضی ہوگی۔

سوال یہ ہے کہ کیا زمین کی ظاہری صورت و کیفیت تبدیل ہوگی یا پھر اس کی ذات میں کوئی تبدیلی آئے گی؟ اس سلسلے میں مفسرین کے مابین بحث ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ تمام پہاڑ، جنگل وغیرہ درگوں ہو جائیں گے۔ زمین چاندی رنگ کی سی سفید نکل آئے گی، ایسی زمین جس پر کبھی کوئی خون نہ بہا ہوگا اور جس پر کوئی گناہ انجام نہ دیا گیا ہوگا۔ آسمان بھی اسی طرح سے متغیر ہو جائیں گے۔

بعض کا کہنا ہے کہ یہ زمین و آسمان بالکل ناپید ہو جائیں گے اور نئے زمین و آسمان ان کی جگہ لیں گے۔ لیکن جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے، یہ احتمال قرآن کی دیگر آیات سے ہم آہنگ نہیں ہے جن کے مطابق انسانی قبریں اور مٹی اسی طرح باقی رہے گی اور اگر کہا جائے کہ زمین کی یہ تبدیلی انسانوں کی نئی زندگی کے بعد ہوگی، تو یہ بات آیت کے دوسرے حصے کے منافی ہے، جو کہتا ہے:

### وبرزوا اللہ الواحد القہار

”اور وہ سب اللہ واحد القہار کی بارگاہ میں حاضر ہوں گے۔“  
کیونکہ اس کا ظاہر یہ ہے کہ خلائق کا ظہور و بروز زمین کے تغیر و تبدل کے بعد ہوگا۔

## ۲۷۔ یوم تمور السبأ مورا

یہ نام بھی قرآن مجید میں فقط ایک بار سورہ طور آیہ ۹ میں آیا ہے۔ قبل ازیں وقوع عذاب الہی کا ذکر ہے اور یہ کہ کوئی چیز اسے دفع کرنے والی نہیں ہے:

ان عذاب ربك لواقع ماله من دافع

اس کے بعد فرماتا ہے:

یوم تمور البأ مورا وتسیر الجبال سیرا

”جس دن آسمان تیزی سے حرکت میں آجائیں گے اور پہاڑ اکھڑ کر چلنے لگیں گے۔“

”مور“ (بروزن ”موج“) کے ارباب لغت کے مطابق مختلف معانی ہیں:

دورانی حرکت (دائرے کی صورت میں)،

موج،

تیز رفتاری،

آمد و رفت،

ایسا گرد و غبار ہوا جسے ہر طرف اڑائے لیے جاتی ہے۔<sup>[۱]</sup>

اس مقام پر مناسب ترین معنی حرکت سر بلع ہیں۔ ممکن ہے یہ عالم ہستی کے خاتمے کے موقع پر مرکز جہان کی طرف سر بلع حرکت ہی ہو جس کی طرف گذشتہ صفحات میں اشارہ ہوا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ عالم کی دورانی حرکت مراد ہو، انبساط اور انقباض پر دو صورتوں میں (دنیا کے پھیلنے اور سمٹنے ہوئے کی دورانی حرکت)۔

فخر الدین رازی اس آیت کے ذیل میں کہتے ہیں:

وتسیر الجبال سیرا (پہاڑ تیزی سے حرکت کریں گے)، یہ جملہ آسمانوں کی حرکت کے لیے ایک وضاحت ہے، ایسے ہی جیسے انسان کشتی میں سوار ہو کر تیزی سے ساحل کے ساتھ ساتھ جاتا ہے تو ایسا لگتا ہے جیسے تمام زمین اور درخت حرکت میں ہیں۔ اسی طرح اس دن

[۱] لسان العرب، مفردات راغب، مجمع البیان، ج ۹ ص ۱۶۳ اور روح البیان، ج ۹ ص ۱۸۹

جب پہاڑ اور ان کے ہمراہ انسان حرکت میں ہوں گے تو ایسا لگے گا جیسے سب آسمان حرکت میں آگئے ہیں۔<sup>[۱]</sup>  
اس کا مطلب یہ ہوا کہ آسمان درحقیقت حرکت نہیں کریں گے بلکہ دیکھنے والے کو یوں لگے گا جیسے وہ حرکت کر رہے ہیں، لیکن یہ تفسیر آیت کے ظاہر کے خلاف ہے۔

## ۲۸۔ یوم تشق السبأ بالغمام

## ۲۹۔ یوم تشق الارض عنہم سرعاً

یوم قیامت کے بارے میں یہ دو تعبیریں جو فرقان ۲۵ اور ق ۴۴ میں آئی ہیں ایک جہت سے باہم شبہت رکھتی ہیں۔  
پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے:

### یوم تشق السبأ بالغمام

”اس دن کو یاد کرو جب آسمان بادلوں کے ساتھ پھٹ جائیں گے۔“

دوسری آیت میں فرمایا گیا ہے:

### یوم تشق الارض عنہم سرعاً

”مردے اس دن زندہ ہوں گے جب زمین ان کے اوپر سے پھٹ جائے گی اور وہ تیزی سے (قبروں سے) نکل آئیں گے۔“

انسانوں کے اوپر سے زمین کے پھٹ جانے کا مفہوم واضح ہے۔ یہ قیامت کے زلزلے کی طرف اشارہ ہے جو قبروں میں شگاف ڈال دے گا، انسان حکم الہی سے زندہ ہو جائیں گے اور حساب و جزا کے لیے تیزی سے نکل کھڑے ہوں گے۔  
البتہ ابر کے ساتھ آسمانوں کا پھٹ جانا۔ ممکن ہے ان عظیم دھماکوں کی طرف اشارہ ہو جو دنیا کے اختتام پر کرات آسمانی میں رونما ہوں گے۔ ان دھماکوں سے پیدا ہونے والے بادل صفحہ آسمان پر چھا جائیں گے۔ (یہ اس صورت میں ہے جب ”بالغمام“<sup>[۲]</sup> میں با اصطلاحی لحاظ سے باء ملا بست ہو، یعنی بادلوں کے ساتھ ساتھ ہمراہ)۔

یاد رہے کہ آسمان، یعنی کرات آسمانی، ان بادلوں کے سبب پھٹ جائیں گے جن میں ایٹمی یا کسی اور توانائی کی عظیم اور طاقتور لہریں ہوں

[۱] تفسیر کبیر ج ۲۸ ص ۲۴۳

[۲] ”غمام“ ”غم“ کے مادہ سے ہے جس کے معنی ہیں ڈھانپنا۔ بادل چونکہ آسمان کو ڈھانپ دیتے ہیں اس لیے انہیں غمام کہتے ہیں اور رنج و اندوہ چونکہ انسان کے دل پر چھا جاتا ہے اس لیے اسے غم کہتے ہیں۔

گی۔ (اس صورت میں باء سبیت کے لیے ہوگی)۔ [۱]

علامہ طباطبائی مرحوم اس آیت کے ذیل میں کہتے ہیں:

بعید نہیں کہ یہ بات جہل و نادانی کے بادل چھٹ جانے، عالم غیب کے ظاہر ہونے، فرشتوں کے ظہور، زمین یعنی وہ سرزمین جہاں انسان بستے ہیں، پران کے نزول کے لیے کنایہ ہو۔ [۲]

لیکن کنائی معنی پر محمول کرنے کے لیے چونکہ کسی خاص قرینہ کی ضرورت ہے جو آیت میں موجود نہیں ہے، اس لیے پہلی تفسیر ہی زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے، جیسا کہ دوسری آیت میں زمین کا شگافتہ ہونا بھی ظاہری معنی ہی میں ہے نہ کہ کنائی اور روحانی معنی میں۔ دوسرا شاہد یہ ہے کہ قرآن مجید کی بہت سی آیات ایسی ہیں جو نشاندہی کرتی ہیں کہ قیامت کے نزدیک عالم مادہ کے تمام پہلوؤں میں ایک بہت بڑی تبدیلی اور ایک شدید انقلاب رونما ہوگا اور یہ آسمان، زمین، پہاڑ اور سمندر سب پر محیط ہوگا۔

### ۳۰۔ یوم تکون السماء کالمهل

یہ روز قیامت اور عالم میں رونما ہونے والے شدید تغیرات کی ایک اور توصیف ہے۔ یہ توصیف قرآن میں صرف ایک بار سورہ معارج کی آیت ۸ میں آئی ہے۔ فرماتا ہے:

#### یوم تکون السماء کالمهل

”قیامت کے حوادث اس دن رونما ہوں گے جب آسمان پگھلی ہوئی دھات کی مانند ہوں گے۔“

”مهل“ (بروزن ”قفل“) کبھی پگھلی ہوئی دھات کے معنی میں تفسیر ہوا ہے، کبھی ایسی تلچھٹ کے معنی میں جو گھی یا کسی اور چیز کے برتن کی تہ میں بیٹھ جائے، کبھی پگھلی ہوئی چاندی کے معنی میں اور کبھی بروزہ یا تارکول کے فضلہ کے معنی میں۔ [۳] البتہ دیگر آیات جو روز قیامت کے واقعات کے بارے میں ہیں، کی طرف توجہ کی جائے تو پہلے معنی زیادہ مناسب معلوم ہوتے ہیں۔

آسمان سے یہاں مراد یا کرات آسمانی ہیں یا صفحہ آسمان جو کرات کے پھٹ جانے کی صورت میں پگھلی ہوئی دھات کی مانند ہو جائے گا۔

بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ یہ احتمال بھی ہے کہ بہت سے کرات آسمانی اس وقت بھی ایسی گیسوں پر مشتمل ہیں جن کے سالمات دباؤ

[۱] بعض مفسرین نے ”باء“ کو ”عن“ کے معنی میں لیا ہے۔ یعنی بادل آپس میں پھٹ کر آسمان سے ایک طرف ہٹ جائیں گے اور یہ معنی بہت بعید ہے۔

[۲] المیزان، ج ۱۵ ص ۲۱۹

[۳] مجمع البیان، تفسیر کبیر، المیزان اور دیگر تفاسیر، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

کے تحت قریب ہو گئے ہیں۔ اس دن پگھلے ہوئے ڈھیر کی صورت اختیار کر لیں گے اور یہ ان گیسوں کی ایک نئی شکل ہوگی جو عالم قیامت کے لیے ایک مقدمہ ہوگی۔<sup>[۱]</sup>

### ۳۱۔ یوم ترجف الارض والجبال

روز قیامت کے بارے میں یہ توصیف قرآن مجید کی دو آیتوں میں کچھ فرق کے ساتھ نظر آتی ہے۔ سورہ مزمل کی آیت ۱۴ میں فرمایا گیا ہے:

يَوْمَ تَرْجُفُ الْأَرْضُ وَالْجِبَالُ وَكَانَتِ الْجِبَالُ كَثِيبًا مَّهِيلًا<sup>(۱۴)</sup>

”قیامت کی جزاؤں اور دردناک عذاب کا دن وہ ہے جب زمین اور پہاڑوں پر سخت لرزہ طاری ہوگا اور پہاڑ نرم ریت کے ٹیلے بن جائیں گے۔“  
سورہ نازعات کی آیت ۶ میں ہے:

#### یوم ترجف الراجفة

”جس دن وحشت ناک زلزلے ہر چیز کو لرزاکر رکھ دیں گے۔“

جب ہول انگیز زلزلے ساری زمین کو لرزادیں گے اور پہاڑیوں ریزہ ریزہ ہو جائیں گے کہ نرم ریت کے ٹیلوں میں بدل جائیں گے، ظاہر ہے کہ ضعیف و ناتواں انسان کی کیا حالت ہوگی۔

یہ سب باتیں ان حوادث سے مربوط ہیں کہ جن کا نتیجہ اس دنیا کا خاتمہ ہوگا۔ اس کے بعد نئی دنیا کا آغاز ہوگا۔ قرآن مجید نے دونوں کو ملا کر اور ایک دوسرے کے ساتھ بیان کیا ہے۔

ایک طرف تو انسانی کی ناتوانی کا ذکر ہے، دوسری طرف اس دنیا کے خاتمے پر رونما ہونیوالے ہول انگیز تغیرات کا تذکرہ ہے اور تیسری طرف قیام قیامت کے روز اس دنیا کی دگر کوئی اور شور و محشر کی خبر ہے۔ یہ سارے تغیرات انسان کی تربیت کے لیے ہیں اور بار بار اس کی بیداری کے لیے صدائے ہوشیار باش ہیں۔

”ترجف“ اور ”راجفة“ ”رجف“ کے مادہ سے ہے جو زور سے ہلنے کے معنی میں ہے۔ لہذا پر موج دریا کو ”بحر جاف“ کہتے ہیں ”ار جاف“ بے بنیاد افواہیں پھیلنے کو کہتے ہیں جو معاشرے کو ہلا کر رکھ دیتی ہے۔ ”اراجیف“ فتنہ و فساد کی جڑوں کو کھاتا ہے۔ مندرجہ بالا آیت میں ”راجفہ“ کے معنی میں مختلف احتمالات ذکر کیے گئے ہیں مثلاً واقعہ، بڑی چنگھاڑ وغیرہ لیکن دوسری آیت کے قرینہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے معنی ہیں: زمین جو اس روز سخت لرزہ بر اندام ہوگی۔

”کشیب“ (اکٹھی ریت) کے معنی میں ہے اور بعض کے نزدیک اس کے معنی ہیں ”ریت کا بڑا قطعہ“ ”مہیل“ کا معنی ہے۔ بہت نرم ریت جس پر پاؤں رکھا جائے تو پھیل جائے اور جب ایک طرف سے کچھ اٹھالی جائے تو باقی نیچے آ پڑے۔ لہذا بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنی ہیں: سیال ریت۔ [۱]

### ۳۲۔ یوم یسمعون الصیحة بالحق

### ۳۳۔ یومہم الذی فیہ یصعقون

مندرجہ بالا دو تعبیرات جو باہم قریب الائق ہیں، بھی اس عظیم دن کی حکایت کرتی ہیں۔ پہلی سورت کی ۴۲ ویں آیت ہے۔ فرمایا ہے: جس دن قیامت کی چنگھاڑ حق کے ساتھ سنیں گے وہ یوم خروج ہے: (یوم یسمعون الصیحة بالحق ذلک یوم الخروج)۔ ہم جانتے ہیں کہ اس دنیا کے اختتام اور قیامت کے آغاز پر دو بڑی چنگھاڑیں ہوں گی جنہیں قرآن مجید نے ”صیحة“ کہا ہے۔ کبھی اسے صورت پھونکنا بھی کہا گیا ہے۔ پہلی چیخ دنیا کی خاموشی اور عمومی موت کے لیے ہوگی اور دوسری حیات نو اور معاد کی آواز ہوگی۔ مندرجہ بالا آیت میں دوسری چنگھاڑ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اس کا قرینہ یہ ہے کہ آیت کے آخر میں ہے: ذلک یوم الخروج۔ اس سلسلے میں کہ یہ عظیم آواز کیسی ہوگی، کس وسیلے سے ہوگی اور مردوں کے احیاء میں اس کی تاثیر ہوگی۔ کیا صحیح طور پر کچھ معلوم نہیں لیکن قرآن نے اس کی طرف ایک جمالی اشارہ کیا ہے اور کچھ رمزیہ انداز میں اس کا ذکر کیا ہے۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ اس دن کی حقیقت ہم پر واضح نہ ہو کیونکہ قیامت کی ہر چیز اس زندگی سے مختلف ہے۔ ابہام کے ایک ہالے نے اسے چھپا رکھا ہے جیسے ماں کے پیٹ میں موجود بچے کے لیے ممکن نہیں کہ اس دنیا کی زندگی کو سمجھ سکے، اگرچہ فرض کر لیا جائے کہ وہ بڑی عظیم قوت فکر رکھتا ہو۔ دوسری سورہ طور کی آیت ۴۵ ہے۔ فرماتا ہے: انہیں رہنے دے یہاں تک کہ اس روز ملیں جب ان پر چنگھاڑ پڑے گی۔ (فذرہم حتی یلاقوا یومہم الذی فیہ یصعقون)

”یصعقون“ ”اصعاق“ کے مادہ سے ہے جو خود دراصل ”صاعقه“ سے ہے۔ ”صاعقه“ چونکہ صدائے عظیم کی بھی حامل ہوتی ہے اور ہلاکت کا سبب بھی ہو جاتی ہے، لہذا اس جملے کی تفسیر دونوں معانی کے لحاظ سے کی گئی ہے۔ اگر ہلاکت کے معنی میں ہو تو پھر پہلی پھونک کی طرف اور اس جہان کے خاتمہ کی طرف اشارہ ہے۔ جیسے سورہ زمر کی آیت ۶۸ میں ہے:

وَنُفِخَ فِي الصُّورِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ  
 ”صور پھونکا جائے گا اور آسمانوں اور زمین میں موجود سب ہلاک ہو جائیں گے۔“

[۱] مفردات راغب، مجمع البیان، تفسیر کبیر اور زیر بحث آیت کے ذیل میں دیگر تفاسیر



اگر آواز کے معنی میں ہو تو ممکن ہے پہلی پھونک یا دوسری پھونک کے معنی میں ہو جبکہ دوسری پھونک معاد کی ہے۔ اس صورت میں یہ آیت پہلی آیت کی مانند ہوگی۔

بہت سے مفسرین نے پہلے معنی کو ترجیح دی ہے اگرچہ دوسرے احتمال کو بھی انہوں نے نظر انداز نہیں کیا۔<sup>[۱]</sup> یہ جو بعض نے احتمال ذکر کیا ہے کہ مراد جنگ بدر میں بعض مشرکات کی ہلاکت ہے، بہت بعید معلوم ہوتا ہے (اس ادعا پر شاہد سورہ زمر کی آیت ۶۸ ہے، جو اوپر ذکر کی گئی ہے)۔

## ۳۴۔ یوم ینفخ فی الصور

یہ تعبیر قرآن مجید میں چار مرتبہ آئی ہے۔ سورہ انعام ۷۳، طہ ۱۰۲، نمل ۸۷ اور بناء ۱۸ میں۔ پہلی آیت میں فرماتا ہے: جب صور پھونکا جائے گا اس روز حکومت اس کی ہے (وله الملك یوم ینفخ فی الصور) دوسری آیت میں فرماتا ہے: یہ جزا و سزا اس روز ہوگی جس دن صور پھونکا جائے گا اور اس دن ہم مجرموں کو نیلے جسموں کے ساتھ جمع کریں گے۔ (یوم ینفخ فی الصور ونحشر المجرمین یومئذ ذرقات)۔ تیسری آیت میں فرماتا ہے: اس دن کا سوچو جب صور پھونکا جائے گا اور سب آسمان اور زمین والے وحشت میں ڈوب جائیں گے، مگر وہ کہ جنہیں خدا چاہے گا (و یوم ینفخ فی الصور ففزع من فی السموت ومن فی الارض الا من شاء اللہ)۔ چوتھی آیت میں فرماتا ہے: وہی دن جب صور پھونکا جائے گا، تم گروہ درگروہ محشر میں وارد ہو گے (یوم ینفخ فی الصور فتاتون افواجا)

جیسا کہ انشاء اللہ ”نفخ صور“ کی بحث میں آئے گا، قرآن مجید دو نفخ صور کی خبر دیتا ہے۔ پہلے نفخ کے موقع پر زمین و آسمان کی سب زندہ موجودات مرجائیں گی۔ دوسرا نفخ کی جو نفخہ حیات ہے اس کے موقع پر سب زندہ اور حساب و کتاب کے لیے آمادہ ہو جائیں گے۔ البتہ مندرجہ بالا چار آیتیں تمام یا بیشتر نفخہ دوم سے مربوط ہیں جو قیامت میں نفخہ حیات ہے۔ بہر حال قرآن کی طرف سے قیامت کی یہ توصیف اس روز کے آغاز پر وقوع پذیر ہونے والے بہت سے حوادث کو نظروں کے سامنے مجسم کرتی ہے۔ یہ نہایت معنی خیز تعبیرات میں سے ایک ہے جو اس دن کے سخت اور وحشت ناک حوادث کو چشم دل کے سامنے سے گزرتی ہے اور اسے آگاہ کرتی ہے۔

”صور“ اور ”نفخ“ کے معنی اور دیگر خصوصیات کے بارے میں انشاء اللہ اپنے مقام پر بحث ہوگی۔ صرف یہ جاننے کے لیے کہ یہ تعبیر کیا مفہوم و موضوع رکھتی ہے۔ ہم رسول اکرمؐ کی صرف ایک حدیث کا ذکر کرتے ہیں جو سورہ نباء کی اٹھارہویں آیت کے ذیل میں مروی

[۱] مجمع البیان، ج ۹ ص ۱۶۹، قرطبی، ج ۹ ص ۶۲۴، روح المعانی، ج ۲ ص ۳۴، المیزان، ج ۱۹ ص ۲۳ اور روح البیان، ج ۹ ص ۲۰۵

ہے، جس میں ان حوادث کے صرف ایک گوشہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

معاذ بن جبل کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہؐ سے ”یوم ینفخ فی الصور فتاتون افواجا“ کی تفسیر پوچھی۔

رسول اللہؐ نے فرمایا: ”تم نے بہت بڑی بات پوچھ لی ہے۔“

یہ کہا اور پھر آپؐ کی مبارک آنکھوں سے سیلاب اشک بہہ نکلا۔

پھر فرمایا: ”یہ گروہ جو نفخ صور کے وقت وارد محشر ہوں گے ان میں میری امت کے وہ دس گروہ ہوں گے جنہیں اللہ مسلمانوں کے گروہوں سے جدا کر دے گا۔ ان میں سے ایک گروہ بندروں کا ہوگا۔ یہ وہ لوگ ہوں گے جو لوگوں میں سخن چینی اور تجسس کرتے ہیں۔ دوسرا گروہ سوروں کی شکل میں ہوگا، یہ لوگ حرام مال والے ہوں۔ ایک گروہ کوالٹے پاؤں لٹکا دیا جائے گا، یہ سود خور ہوں گے۔ ایک گروہ ناپیناؤں کا ہوگا، یہ لوگ عدالت کے وقت ظلم کرنے والے ہوں گے۔ ایک گروہ بہرہ اور گونگا وارد محشر ہوگا، یہ لوگ اپنے اعمال میں عجب اور نخوت میں مبتلا ہوں گے۔ ایک گروہ کے لوگ اپنی زبانوں کو دانتوں میں چبا رہے ہوں گے، یہ وہ علماء و خطباء ہوں گے کہ جن کی گفتار اور اعمال میں اختلاف ہوگا۔ ایک گروہ آئے گا جس کے ہاتھ پاؤں کٹے ہوں گے، یہ ہمسایوں کو آزار پہنچانے والے ہوں گے۔ ایک گروہ کو آتش دوزخ کی شاخوں پر رسولی پر لٹکایا جائے گا، یہ لوگوں میں چغل خوری کرنے والے اور ظالم بادشاہ ہوں گے۔ ایک گروہ ایسے افراد کا ہوگا جن سے مردار سے بھی بری بدبو آ رہی ہوگی، یہ وہ لوگ ہوں گے جو اس دنیا میں شہوات نفسانی میں غرق ہیں اور اپنے اموال میں سے اللہ کا حق نہیں دیتے۔ آخر کار ایک گروہ ایسے لباس والوں کا ہوگا جو (آگ بھڑکانے والے مادے) قطران سے آلودہ ہوگا۔ یہ لباس ان کے جسموں سے چسپاں ہوگا اور یہ تکبر و غرور کرنے والے لوگ ہوں گے۔<sup>[۱]</sup>

### ۳۵۔ یوم کان مقدارہ خمسين الف سنة

دو مقامات پر قرآن مجید قیامت کا ذکر کرتے ہوئے اسے ایک نہایت طولانی دن کے طور پر پہنچواتا ہے۔ ایک جگہ فرماتا ہے: جس دن کا طول پچاس ہزار سال ہے، اس دن فرشتے اور روح اس کی طرف عروج کریں گے۔ (تَعْرُجُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ إِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ خَمْسِينَ أَلْفَ سَنَةٍ) (معارج ۴)

دوسری جگہ فرماتا ہے: اللہ اس جہان کے امور کو آسمان سے زمین کی طرف تدبیر کرتا ہے۔ پھر جس دن کی مقدار تمہارے سال کے حساب کے مقابلے میں ہزار سال ہے اس روز تم اس کی طرف لوٹ جاؤ گے (اور دنیا ختم ہو جائے گی اور آخرت شروع ہو جائے گی)۔ (يَكُونُ الْاَمْرُ مِنَ السَّمَاءِ إِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ إِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ أَلْفَ سَنَةٍ مِمَّا تَعُدُّونَ) (سجدہ ۵)

بلاشبہ پہلی آیت یوم قیامت کے بارے میں ہے۔ بعد کی تمام آیات اوصاف قیامت کے بارے میں ہیں۔ نیز مجرموں کے لیے

[۱] یہ حدیث بہت سے مفسرین نے نقل کی ہے مثلاً ابوالفتوح رازی، قرطبی اور روح البیان۔ ہم نے اس کا مخلص ذکر کیا ہے۔

عذاب اور اسی طرح اوصاف دوزخ بھی بیان کرتی ہیں۔

البتہ دوسری آیت کے بارے میں مفسرین کے درمیان بحث ہے۔<sup>[۱]</sup> بعض کا خیال ہے کہ یہ آیت اسی دنیا میں تدبیر امر الہی کی توس نزولی و صعودی کی طرف اشارہ ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس عالم میں تدبیر الہی کے دورانیوں کی طرف اشارہ ہے، جن میں سے ہر دورانیہ ایک ہزار سال ہے اور فرشتے حکم الہی سے اس تدبیر تکوینی کا اجراء کرتے ہیں۔ ایک دورانیے کے بعد دوسرا شروع ہوتا ہے۔

لیکن اگر قرآن کی دیگر آیات کی طرف توجہ کی جائے تو وہ آسمان وزمین کے لپیٹ لیے جانے کی بات کرتی ہیں اور اسی طرح اس آیت کی تشریح کے بارے میں مروی روایات پر نظر کی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ روز قیامت کے بارے میں ہے۔ لہذا علامہ طباطبائی مرحوم نے المیزان میں دیگر احتمالات کا ذکر کرنے کے بعد اس تفسیر کو ترجیح دی ہے۔<sup>[۲]</sup>

تاہم یہ سوال یہاں سامنے آتا ہے کہ پہلی آیت میں اس دن کی طوالت ہمارے سالوں کے حساب سے پچاس ہزار سال بیان کی گئی ہے جب کہ دوسری آیت میں ایک ہزار سال، ایسا کیونکر ہے؟

اس سوال کا جواب شیخ طوسی مرحوم کی امالی میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ایک حدیث میں بہت واضح طور پر بیان کیا گیا ہے۔ آپؑ نے فرمایا:

”ان فی القیامة خمسین موقفاً کل موقف مثل الف سنة، مما تعدون ثم

تلا هذه الآية: فی یوم کان مقداره خمسین الف سنة۔“

”قیامت میں پچاس موقف (بندوں کے اعمال کے حساب کی جانچ کے لیے توقف کے مقامات) ہیں۔ ہر موقف آپ کے سالوں کے حساب سے ہزار سال کا ہے۔ پھر امامؑ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: جس دن کی طوالت پچاس ہزار سال کے برابر ہے۔“

یہاں پر ہزار اور پچاس ہزار سال کا ذکر تعداد و شمار بتانے کے لیے ہے، یا تکثیر اور کثرت بتانے کی غرض سے، اس سلسلے میں دو احتمال ہیں لیکن ان آیات سے جو پیغام کانوں تک پہنچتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ دن نہایت سخت اور مشکل ہوگا۔ وہ بہت دقیق اور پیچیدہ دن ہوگا جس سے کوئی بھی آسانی سے نہیں گزر سکتا۔ سب کو چاہیے کہ ایسے خطرناک طولانی دن کے لیے اپنے آپ کو تیار کریں۔

یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ دن تو ایک کرہ کے اپنے ہی محور کے گرد گردش کے دورانیے کا نام ہے، جب کہ تمام آسمانی کرات کی گردش کے یہ دورانیے آپس میں مختلف ہیں۔ کرہ زمین اپنے محور کے گرد ۲۴ گھنٹے میں ایک بار گردش کرتا ہے۔ کرہ ماہ اپنی گردش وضعی تقریباً ایک ماہ میں مکمل کرتا ہے۔ (اس کا دن تقریباً دو ہفتے کا ہے اور رات بھی تقریباً دو ہفتے کی ہوتی ہے۔) منظومہ شمسی کے دیگر کرات بھی اسی طرح اپنی رات اور دن

[۱] روح المعانی میں آلوسی نے اس آیت کی سات تفسیریں بیان کی ہیں۔ ان میں ایک قیامت ہے۔ (ج ۲۱، ص ۱۰۷)

[۲] المیزان، ج ۱۶، ص ۲۶۱۔ یہی معنی تفسیر فی ظلال القرآن میں بھی بیان کیا گیا ہے۔ (ج ۶، ص ۵۱۱)

ایک خاص مدت میں مکمل کرتے ہیں۔۔۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس جہان ہستی میں ایسے کرات بھی ہوں جن کی گردش کا ایک دورانیہ سینکڑوں یا ہزاروں سال کا ہو۔ لہذا اس میں تعجب نہیں کہ قیامت کا ہر دن پچاس ہزار سال کے برابر ہو۔  
ہم یہ بات پھر دہراتے دیتے ہیں کہ قرآن کا اصلی مقصد ایک تربیتی پیغام ہے جو ایسی تعبیرات میں نہاں ہے۔

## تیسرا حصہ

## ۳۶۔ یوم یكون الناس كالفرأش المبثوث

اس وقت تک جو کچھ اس دن کی توصیف کے بارے میں پڑھا ہے وہ ان ہلا دینے والے حوادث کی خبر تھی جو اس دن کے نزدیک عالم ہستی میں وقوع پذیر ہوں گے۔ ان میں سے ہر ایک کسی خصوصی پیغام کا حامل ہے۔ آخری صفت یہ بیان کی گئی تھی کہ وہ دن بہت طویل ہوگا۔ یہ امر بھی ایک خاص پیام رکھتا ہے۔

اب ہم ایسی توصیفات کی جستجو کرتے ہیں جو اس مشخص دن میں انسانوں کی حالت بیان کرتی ہیں۔ ان میں سے ہر تعبیر دوسری سے بڑھ کر سبق آموز ہے۔ گویا قرآن انسان کا ہاتھ تھام لیتا ہے، اسے میدانِ محشر میں لے چلتا ہے، اسے اس کے گوشے گوشے کی سیر کرواتا ہے اور انسانی آنکھ کے سامنے اس عظیم دن کے حوادث کو مجسم کر کے پیش کرتا ہے۔

زیر بحث توصیف قرآن مجید میں صرف ایک بار سورہ قارعہ کی آیت ۴ میں آئی ہے۔ اس میں اس روز انسان کی اضطراب انگیز حالت کو پیش کیا گیا ہے۔ فرماتا ہے: جس روز انسان بکھرے ہوئے پتنگوں کی طرح ادھر ادھر حرکت میں ہوں گے (یوم یكون الناس كالفرأش المبثوث)

یہی تعبیر کچھ فرق کے ساتھ سورہ قمر آیت ۷ میں بھی آئی ہے۔ فرماتا ہے:

”کانہم جراد منتشر“

”گویا لوگ ٹڈی دل کی طرح بکھرے ہوں گے۔“

یہاں لوگوں کو پروانوں سے تشبیہ کیوں دی گئی ہے۔ اس سلسلے میں مفسرین نے مختلف تفسیریں کی ہیں۔ مجموعی طور پر ان کا کہنا ہے کہ اس تشبیہ کی وجہ لوگوں کی کثرت، اضطراب، وحشت، ادھر ادھر ان کی حرکت، ناتوانی اور سرگردانی ہے۔

اس تعبیر میں ہو سکتا ہے یہ نکتہ بھی پوشیدہ ہو کہ پروانے عموماً شمع اور چراغ کی لو سے دیوانہ وار لکراتے ہیں اور اپنے آپ کو جلاتے ہیں۔ آتش دوزخ کے ساتھ مجرموں کا بھی یہی حال ہوگا اور یہ سب کچھ اس دن کی شدید حیرت و سرگردانی، اضطراب اور عظیم توہم کی حکایت کرتا ہے۔

بہر حال یہ ایک بہت ہی منہ بولتی تعبیر ہے۔ جو اس روز انسانوں کی عجیب حالت کی ترسیم کرتی ہے جسے قرآن مجید ایک چھوٹی سی تشبیہ کے ذریعہ بیان فرماتا ہے۔ بعض کا نظریہ ہے کہ پروانہ شمع کے گرد چکر لگاتا ہے تاکہ اپنے آپ کو آگ میں ڈال لے۔ یہ اس لیے ہے کہ وہ حافظے سے محروم ہوتا ہے۔ شعلے کے قریب ہوتا ہے تو اس کی حرارت کو محسوس کرتا ہے اور بھاگ جاتا ہے لیکن فوراً بھول جاتا ہے اور پھر شعلے کے نزدیک ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ اپنے تئیں آگ میں ڈال دیتا ہے اور جلا لیتا ہے۔

بدعمل مجرم بھی اس روز اس قدر پریشان خاطر اور مضطرب ہوں گے، گویا وہ اپنا حافظہ گنوا بیٹھیں گے اور پروانوں کی طرح اپنے آپ کو دوزخ کی آگ میں گرائیں گے۔

ارباب لغت اور مفسرین نے ”فراش“ کے متعدد معانی ذکر کیے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ ٹنڈی دل ہیں جو آسمان میں پھیلے ہوتے ہیں اور اکٹھے ہوتے ہیں۔ بعض کا کہنا ہے کہ اس کا مطلب وہ مجھڑ ہیں جو گروہ درگروہ اڑتے ہیں۔ لیکن زیادہ تر اہل لغت اور مفسرین نے اس کا معنی پٹنگے ہی کیا ہے۔ خصوصاً خلیل بن احمد کتاب ”العين“ میں کہتا ہے:

”الفراش التي تطير طالبة للضوء“

”فراش وہ ہے جو روشنی کی طلب میں اڑتا ہے۔“

صحاح اللغة میں بھی ہے:

”فراش“ ”فراشة“ کی جمع ہے اور یہ وہ پرندہ ہے جو اڑتا ہے اور خود سے آگ میں جا گرتا ہے۔

### ۳۷۔ یوم تبلی السر اثر

### ۳۸۔ یوم ہم بارزون

ان دو جملوں میں اس روز کی ایک حقیقت ذکر کی گئی ہے۔ ایک سورہ طارق کی نویں آیت اور دوسری سورہ مومن کی سولہویں آیت ہے۔ یہ ایک ایسا ہلادینے والا مطلب ہے کہ جس پر ایمان انسانوں کی تربیت میں بہت موثر ہے۔

پہلی آیت میں فرماتا ہے: ”اس دن اسرارِ نہاں آشکار ہو جائیں گے۔“ (یوم تبلی السر اثر)

دوسری آیت میں کہتا ہے: ”اس دن تمام پردے اٹھ جائیں گے اور سب انسان اپنے تمام ظاہر و باطن اسرار کے ساتھ نمایاں ہو جائیں گے۔“ (یوم ہم بارزون)

اس دن کوئی چیز مخفی نہ رہے گی کیونکہ ایک طرف تو مادی رکاوٹیں، مثلاً پہاڑ اور ٹیلے ختم ہو جائیں گے اور زمین ”قاعاً صفصفا“ (ہموار بیابان) کی طرح ہو جائے گی۔ (طہ ۱۰۶)

دوسری طرف انسان قبروں سے نکل پڑیں گے اور زمین کے اندر جو کچھ ہوگا وہ اسے اگل دے گی: (واخرجت الارض اثقالها) (زلزال ۲)

علاوہ ازیں انسانوں اور امتوں کے اعمال نامے کھل جائیں گے اور ان کا مضمون سب پر آشکار ہو جائے گا: (واذا الصحف نشرت) (تکویر ۱۰)

ہاتھ پاؤں اور جسم کے دیگر اعضاء، حتیٰ کہ کھال بھی کلام کرے گی۔ سب اعضاء بات کریں گے اور راز افشاں کریں گے۔ زمین و

آسمان بات کریں گے۔ اعمال کے گواہ انسانوں کے اعمال کی گواہی دیں گے۔ اعمال ہی کی نہیں بلکہ انسانوں کی نیتیں اور عقائد بھی اس روز کھل جائیں گے۔ واقعاً وہ دن بروں کے لیے عجیب رسوائی کا دن ہوگا اور نیکیوں کے لیے بڑے افتخار کا۔

توجہ رہے کہ ”تبلی“، ”بلاء“ کے مادہ سے امتحان کے معنی میں ہے۔ البتہ آزمائش کے موقع پر چونکہ چیزوں کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے اس لیے یہاں اس لفظ کی آشکار ہونے کے معنی میں تفسیر ہوئی ہے۔

”معاذ بن جبل“ کی حدیث میں ہے کہ انہوں نے کہا:

میں نے رسول اللہ سے پوچھا کہ ”سراڑ“ سے کیا مراد ہے جن کے بارے میں آخرت میں بندگانِ خدا کی آزمائش ہوگی؟

آپؐ نے فرمایا:

تمہارے ”سراڑ“ تمہارے اعمال، ہیں، جیسے نماز، روزہ، زکوٰۃ، وضو، غسل جنابت اور دیگر ہر واجبِ عمل۔ کیونکہ سب اعمال پنہاں ہیں۔ ممکن ہے انسان کہے میں نے نماز پڑھی ہے اور اس نے نہ پڑھی ہو، کہے میں نے وضو کیا ہے اور اس نے نہ کیا ہو۔ یہ ہے اس روز اسرار کے آشکار ہونے کا معنی۔<sup>[۱]</sup>

توجہ رہے کہ جو کچھ اس حدیث میں بیان کیا گیا ہے وہ کلی حقیقت کے لیے مثالوں کی حیثیت سے ہے، ورنہ آیت شریفہ تو تمام عقائد، نیات اور اعمال پر محیط ہے، چاہے وہ نیک ہوں یا بد۔

یہاں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس دنیا میں مخفی، ہتھکنڈوں سے جو جھوٹی شخصیتیں بن جاتی ہیں، وہ طوفانِ محشر کا سامنا نہ کر سکیں گے۔ ان کے ڈھول کا پول وہاں کھل جائے گا اور عظیم رسوائی ان کے حصے میں آئے گی۔ ایسے خوش ظاہر بد باطن افراد کا یہ زوال کتنا عجیب ہوگا۔ کہاں اوجِ عزت و آبرو اور کہاں قعرِ ذلت و رسوائی! کب کہ مخلص و بے ریا مومنین کی شوکت آبرو کتنی حسین ہوگی کہ جن کا اس جہان میں اللہ سے خاص پنہاں رابطہ تھا کہ جو اس دن آشکار ہوگا اور وہ عزت و عظمت کے تخت نشین ہوں گے۔

یہ وہ پیغام ہے جو قیامت کی مندرجہ بالا توصیف، ہم سب کو دیتی ہے اور عالم و جاہل ہر انسان کے لیے ایک صدائے ہوشیار باش ہے

گر پردہ زردی کارِ ما بردارند  
معلوم شود کہ درچہ کاریم ہمہ

یعنی:

کوئی جو پردہ ہمارے عمل سے سرکائے  
تو اپنی ساری حقیقت کا بھید کھل جائے

## ۳۹۔ یوم ينظر المرء ما قدمت يداه

## ۴۰۔ یوم تجد کل نفس ما عملت من خیر محضرا وما عملت من

## سوء

یہ دو اوصاف بھی ایک ہی حقیقت کو دو مختلف انداز میں بیان کرتے ہیں۔ ایک سورہ نباء کی چالیسویں آیت ہے اور دوسری آل عمران کی تیسویں آیت ہے۔ ان میں اس عظیم دن کی ایک اور ایسی اہم حقیقت بیان کی گئی ہے جو جسموں کو لرزادیتی ہے، دلوں کو دہلا دیتی ہے اور انسان کو گہری سوچ میں ڈال دیتی ہے۔

پہلی آیت میں قرآن کریم فرماتا ہے: ”عذاب الہی کا وہ دن ہوگا جب انسان وہ کچھ دیکھے گا جو اپنے ہاتھوں سے آگے بھیج چکا ہوگا۔ (یوم ينظر المرء ما قدمت يداه)

تجسم اعمال اور انسان نے جو کام اس دنیا میں کئے ہیں، ان سب کے اس عظیم دن دیکھے جانے کو قبول کرنا چونکہ بہت سے مفسرین کے لیے گراں تھا، لہذا کبھی انہوں نے ينظر کو ینظر کے معنی میں تفسیر کیا ہے اور کہا ہے کہ مراد یہ ہے کہ انسان اس دن اپنے اعمال کی جزاء کے انتظار میں ہوگا اور کبھی اعمال دیکھنے کو اعمال نامہ یا ان کی جزا و پاداش دیکھنے کے معنی میں تفسیر کیا ہے۔

اس سب کی وجہ یہ ہے کہ اس زمانے میں مفسرین نے حضور و تجسم اعمال کے بارے میں کم سوچا تھا و اگر نہ ایسی توجیہوں اور مفروضوں کی ضرورت نہیں، کیونکہ قرآن کہتا ہے: اس دن انسان نے جو کچھ آگے بھیجا ہوگا اسے اپنی آنکھ سے دیکھے گا: یعنی اس کے اعمال جو ظاہر نظام خلقت میں محو ہو گئے ہیں، ختم نہیں ہوئے اور پھر سے زندہ ہو جائیں گے اور مناسب صورتوں میں مجسم ہو جائیں گے۔ صرف انجام دینے والے ہی نہیں بلکہ اہل محشر بھی انہیں دیکھیں گے جیسا کہ یہی مطلب زیادہ وضاحت سے سورہ کہف آیت ۴۹ میں آیا ہے:

## ووجدوا ما عملوا حاضرا

”جو کچھ انہوں نے انجام دیا ہوگا اسے حاضر پائیں گے۔“

دوسری آیت میں بھی یہی مفہوم وضاحت سے آیا ہے۔ فرماتا ہے: جس دن ہر کسی نے جو کچھ بھی نیک کام انجام دیا ہوگا اسے دیکھے گا اور چاہے گا کہ اس کے اور اس کے انجام دیئے ہوئے برے کاموں میں زیادہ فاصلہ ہو۔ (یوم تجد کل نفس ما عملت من خیر محضرا وما عملت من سوء تو دلو ان بینہا و بینہا امدابعدا)

یہ بات قابل توجہ ہے کہ طبری مرحوم مجمع البیان میں دوسری آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں:

انسان کے اعمال چونکہ اعراضی ہیں اور انجام دہی کے بعد نابود ہو جاتے ہیں اور ان کی بازگشت ممکن نہیں، محال ہے کہ وہاں حاضر ہوں۔



یہ کہنے کے بعد وہ دوسری تفسیریں ذکر کرتے ہیں۔ ایک اعمال ناموں کا حاضر ہونا ہے اور دوسری اعمال کے ثواب و عقاب کا حاضر ہونا۔ لیکن جیسا کہ ہم نے تفسیر نمونہ میں بھی کہا ہے: عمل انسان دنیا کو دیگر توانائیوں کی طرح ایک توانائی ہے، لہذا قطعاً باقی رہنے والی ہے۔ اس کی فقط شکل تبدیل ہوتی ہے، نابود نہیں ہوتی۔

نیز ہم یہ بھی کہہ چکے ہیں کہ مادہ کا توانائی میں اور توانائی کا مادہ میں بدل جانا، دونوں سائنسی اعتبار سے ممکن ہیں۔ لہذا کوئی مانع نہیں کہ انسان کے اعمال باقی رہیں اور اس دن مادہ میں تبدیل ہو جائیں اور ہر عمل اپنی مناسب شکل میں ظاہر ہو۔ بنا بریں مذکورہ آیات درحقیقت قرآن کے عملی معجزات میں سے ہیں کیونکہ نزول قرآن کے زمانے میں کسی کو یہ بات معلوم نہ تھی۔ آج سائنسی انکشافات کی وجہ سے یہ بات ہم پر آشکار ہوئی ہے۔

یہ امر جاذب نظر ہے کہ اسلامی روایات میں بھی بار بار برزخ اور قیامت میں تجسم اعمال کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ لیکن معلوم نہیں مفسرین کی توجہ اس امر کی طرف کیوں مبذول نہیں ہوئی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اعمال کو ”اعراض“ کا حصہ سمجھتے تھے، ان کی نابودی کا اعتقاد رکھتے تھے اور عادیہ معدوم کو محال سمجھتے تھے، جب کہ آج ہم جانتے ہیں کہ یہ استدلال بالکل قابل اعتبار نہیں (اس بات کی مزید وضاحت ہم تجسم اعمال کی بحث میں کریں گے)۔

## ۴۱۔ یوم تتقلب فیہ القلوب والابصار

### ۴۲۔ لیوم تشخیص فیہ الابصار

قیامت کے جو دو اوصاف مندرجہ بالا آیت میں آئے ہیں، باہم بہت شباهت رکھتے ہیں۔ یہ اوصاف اس عظیم دن کے اسرار سے ایک اور پردہ اٹھاتے ہیں اور سب انسانوں کو کچھ تازہ قیام دیتے ہیں۔

پہلی آیت میں فرماتا ہے: ”الہی انسان اس دن سے ڈرتے ہیں کہ جن دن دل اور آنکھیں زیروز بر جائیں گے۔“ (یخافون یوما تتقلب فیہ القلوب والابصار) (نور ۷۳)

دوسری آیت میں فرماتا ہے: ”اللہ نے ظالموں (کی جزا) کو اس دن تک کے لیے موخر کر دیا ہے جس دن آنکھیں (مارے وحشت و خوف کے) ٹھہر جائیں گی (انما یؤخر ہم لیوم تشخیص فیہ الابصار) (ابراہیم ۴۲)

عرصہ محشر کئی لحاظ سے نہایت ہولناک ہے، ان بلا دینے والے حوادث کی وجہ سے جو قیام قیامت کے وقت رونما ہوں گے، گواہوں کی موجودگی میں فرشتگان الہی کے بندوں کے حساب کے لیے تیار ہونے کے لحاظ سے، ان اعمال ناموں کے کھل جانے کے اعتبار سے کہ جن میں عمر انسانی کے تمام چھوٹے بڑے کام درج ہوں گے، دوزخ اور عذاب الہی کی نشانیاں آشکار ہونے کے لحاظ سے، تلافی اور بازگشت کے عدم امکان کی جہت سے اور کسی دوست اور فریادرس کے نہ ہونے کے حوالے سے۔ ان میں سے ہر بات تنہا ہی انسانی دل کو زیروز بر کر دینے کے لیے کافی

ہے۔ جب کہ یہ توبہ واقعات وقوع پذیر ہوں گے اور انسان ان میں اس طرح سے گھر جائے گا کہ کبھی اس کی آنکھیں بے ارادہ ہی حرکت کرنے لگیں گی اور وہ مضطرب و متمسک ادھر ادھر دیکھے گا جسے قرآن نے اسے زیرِ روزِ ہونے سے تعبیر کیا ہے اور کبھی بالکل حرکت ہی نہیں کریں گی اور پلکیں تک نہیں جھپکے گا اور وہ یوں ہو جائے گا جیسے روح اس کے جسم سے نکل گئی ہو۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ پہلی آیت مردانِ الہی کے بارے میں ہے اور دوسری آیت ظالموں کے بارے میں ہے۔ اس سے یہ بات بخوبی ظاہر ہوتی ہے کہ اس ہولناک دن میں سب وحشت میں ہوں گے، نیک بھی اور بد بھی، کیونکہ کسی کو بھی اپنی عاقبت کا رکاعلم نہ ہوگا۔ حساب الہی کی سخت گیری اور دقیق ہونے کی وجہ سے کوئی بھی درست طور پر اپنے انجام سے آگاہ نہیں ہوگا۔

”تتقلب“ کا معنی ہے زیرِ روزِ ہونا اور دگرگوں ہونا۔ اس کی تفسیر میں مفسرین نے مختلف باتیں کی ہیں جو سب اس غیر معمولی وحشت و اضطراب کی حکایت کرتی ہیں جو داخلی و خارجی طور پر اور انسان کے دیدہ و دل پر اس دن حکم فرما ہوگا۔

”تشخص“ ”شخص“ کے مادہ سے آنکھ اور پکلوں کے رک جانے اور ایک نقطے پر ٹھہر جانے کے معنی میں ہے۔ اس لفظ کا اصلی ریشہ یعنی ”شخص“ (بروزن ”خلوص“) بلند ہونے اور نکلنے کے معنی میں ہے۔ ”شخص“ کو بھی اس لحاظ سے شخص کہتے ہیں کہ وہ دور ہی سے برجستہ انداز سے نمایاں ہو جاتا ہے۔ انسان کے ایک جگہ سے نکل کر دوسری جگہ جانے کو بھی ”شخص“ کہتے ہیں۔

”شخص“ بھی اسی مادہ سے ہے جو بلند چیز کے معنی میں ہے جسے تعین وقت وغیرہ کے لیے کام میں لایا جاتا ہے۔<sup>[۱]</sup> تعجب و تعجب کے وقت یوں لگتا ہے جیسے انسان کی آنکھ نکل کر باہر آ رہی ہو۔ لہذا یہ تعبیر ایسے مواقع کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ عرصہٴ محشر میں انسانوں کی وحشت کا یہ عالم ہوگا کہ ان کی آنکھیں حرکت کرنا بند کر دیں گی اور یوں خیرہ ہو جائیں گی گویا باہر نکلا چاہتی ہوں۔ موت کے نزدیک بھی کبھی کبھی ایسی حالت انسان پر طاری ہو جاتی ہے۔

مسلم ہے کہ مجرموں اور گنہگاروں میں یہ حالت نہایت شدید ہوگی۔ لہذا قرآن مجید کہتا ہے:

**وَاقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ فَإِذَا هِيَ شَاخِصَةٌ أَبْصَارُ الَّذِينَ كَفَرُوا ط**

”وعدہ حق نزدیک ہو رہا ہے اور اس وقت کافروں کی آنکھیں ٹھہر جائیں گی اور خیرہ ہو جائیں گی۔“ (انبیاء ۹۷)

## ۴۳۔ یومِ یثد کر الانسان ماسعی

یہ بھی بہت سبق آمیز تعبیر ہے جو قرآن مجید کی سورہٴ نازعات آیہ ۳۵ میں ایک بار آئی ہے۔ فرماتا ہے: اس روز انسان کو اپنی سب تک و دو یاد آئے گی۔ (یومِ یثد کر الانسان ماسعی)

یہ یاد آوری یا نامہٴ اعمال دیکھنے کی وجہ سے ہے یا خود اعمال کے تجسم و حضور کی وجہ سے، یا اعضاء جسم کی گواہی کے سبب، یا اللہ کے

حضور فرشتوں کی شہادت کے باعث، یا انسانی قلب و روح سے حجابوں کے اٹھ جانے کی خاطر اور غفلت و بے خبری کے عوامل ختم ہو جانے کی وجہ سے۔ لہذا تمام پوشیدہ حقائق آشکار و نمایاں ہو جائیں گے اور انسان کو اپنی تمام تر تگ و دو اور سعی و کوشش یاد آ جائے گی لیکن افسوس کہ خطاؤں، کوتاہیوں، تقصیروں اور غفلتوں کی تلافی کا اب کوئی راستہ نہ ہوگا۔

یہی تعبیر ایک اور انداز سے سورہ فجر کی آیہ ۲۳ میں بھی آئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَجَاءَ يَوْمَئِذٍ بِجَهَنَّمَ ۚ يَوْمَئِذٍ يَتَذَكَّرُ الْإِنْسَانُ وَأَنَّى لَهُ الذِّكْرَى ﴿٢٣﴾  
 ”اس دن جہنم کو (کافروں کی طرف) لے جایا جائے گا اور اس روز انسان کو اپنے اعمال یاد آئیں گے لیکن اب اس یاد کا اسے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔“  
 مزید فرماتا ہے:

يقول يليتني قدمت لحياتي

”اے کاش! میں نے اپنی زندگی کے لیے کچھ بھیجا ہوتا۔“

ایسا تاسف و حسرت کہ جس کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ البتہ اس سے دردورنج ضرور بڑھ جائے گا۔

”لحیاتی“ کی تعبیر قابل توجہ ہے۔ یہ تعبیر نشان دہی کرتی ہے کہ زندگی تو آخرت کی زندگی ہی ہے۔ حیات دنیا کی تو اتنی بھی اہمیت نہیں کہ اسے حیات کہا جائے۔ قرآن کی تعبیر میں تو یہ لہو و لعب سے زیادہ کچھ نہیں۔ مقصد یہ ہے کہ ایسی تنگ گھاٹی میں گرفتار ہو جانے سے پہلے انسان کو خبردار کیا جائے تاکہ وہ جو موقع موجود ہے اس سے استفادہ کر لے، کیونکہ اس روز توجہ اور بیداری ہوئی تو پھر بہت دیر ہو چکی ہوگی۔

## ۴۴۔ یوم تاتی کل نفس تجادل عن نفسها

یہ نام اس عظیم دن کا ایک اور رخ پیش کرتا ہے۔ فرماتا ہے: اس دن کو یاد کرو کہ جب ہر کوئی صرف اپنا ہی دفاع کر رہا ہوگا۔ (یوم تاتی کل نفس تجادل عن نفسها) (نحل ۱۱۱)

ہاں! وہ ایسا ہی دن ہوگا کہ عذاب و سزائے الہی کا خوف انسان کے سارے وجود پر یوں چھایا ہوگا کہ وہ اپنے عزیز ترین عزیزوں کو بھی بھول جائے گا۔ نہ اولاد کی فکر ہوگی، نہ بیوی اور شوہر کی، نہ ماں باپ کی اور نہ قریب ترین دوستوں کی۔ ہر کوئی بس اپنی ہی فکر میں ہوگا۔ حدیث میں ہے کہ ہر کوئی قیامت کے دن کہہ رہا ہوگا: نفسی! نفسی! (ہائے میں! ہائے میں!) ایسا روز قیامت کے خوف کی شدت کے باعث ہوگا۔ صرف حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہوں گے کہ جو اپنی امت کو بچانے کے لیے اٹھیں گے۔ حدیث کے الفاظ یوں ہیں:

”کل احد يقول يوم القيامة نفسي! نفسي! من شدة هول يوم القيامة  
سوى محمد فانه يسئل في امته۔“ [۱]

## ۴۵۔ یوم يقوم الناس لرب العلمین

یہ نام جو قیامت کے نام کے لیے ایک وضاحت کی حیثیت رکھتا ہے، سورہ مطفقین کی آیہ ۶ میں آیا ہے۔ فرماتا ہے: یہ وہ دن ہوگا کہ جب سب لوگ رب العالمین کے حضور کھڑے ہوں گے۔ (یوم يقوم الناس لرب العلمین)  
یہ کھڑا ہونا اس دن کے مسائل کے قطعی ہونے، ایک عظیم عدالت میں پیش ہونے اور سب اعمال کی چھان بھٹک ہونے کی علامت ہے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ قرآن مجید نے یہ تعبیر سورہ مطفقین میں کم فروشوں کو بیدار کرنے کے لیے بیان کی ہے اور کہتا ہے: ”کیا انہیں گمان نہیں کہ وہ روزِ عظیم کو اٹھائے جائیں گے؟“ پھر اضافہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”وہ دن کہ جب سب لوگ رب العالمین کے حضور قیام کریں گے۔“ (یوم يقوم الناس لرب العلمین)۔

یعنی اگر انہیں ایسے دن کے ”حضور“ اور ”قیام“ کا یقین ہوتا تو ایسا غلط راستہ ہرگز اختیار نہ کرتے۔ لیکن افسوس کہ جب دنیا، غفلت، غرور اور طول آرزو نے ان کی فکر اور قلب و جان پر ایسا منحوس اور تاریک سایہ ڈال رکھا ہے کہ وہ حقائق کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ روایات میں ہے کہ رسول اللہ کے ایک صحابی سورہ مطفقین کی تلاوت کر رہے تھے۔ جب اس آیت پر پہنچے تو اتنا روئے کہ باقی سورہ کی تلاوت نہ کر سکے۔ [۲]

## ۴۶۔ یوم يقوم الاشهاد

## ۴۷۔ یوم يقوم الروح والملائكة صفا

مندرجہ بالا اوصاف اس عظیم دن کے ایک اور پہلو کی طرف متوجہ کرتے ہیں جس کے اخلاقی آثار انسان پر بہت گہرے ہوتے ہیں اور اس کا خصوصی پیغام جان و دل میں جاگزیں ہو جاتا ہے۔  
پہلی توصیف میں کہا گیا ہے: وہ دن کہ جب گواہ اٹھ کھڑے ہوں گے۔ (و یوم يقوم الاشهاد) (مومن ۵۱)

[۱] تفسیر قرطبی، ج ۶ ص ۳۸۰۹

[۲] تفسیر فخر الدین رازی، ج ۳ ص ۹۰ و تفسیر قرطبی، ج ۱ ص ۷۰۶

”اشہاد“ ”شاہد“ یا ”شہید“ کی جمع ہے (جیسے ”اصحاب“ ”صاحب“ اور ”اشرف“ ”شریف“ کی جمع ہے)۔ یہاں روزِ قیامت کے گواہوں کی طرف اشارہ ہے۔ بعض مفسرین نے اسے صرف اعمال کی نگرانی کرنے والے فرشتوں کی طرف اشارہ سمجھا ہے اور بعض نے اسے صرف انبیاء کی طرف اشارہ قرار دیا ہے لیکن ظاہر یہ ہے کہ ”اشہاد“ کا مفہوم وسیع ہے جس میں فرشتگانِ الہی بھی شامل ہیں، انبیاء بھی اور مومنین بھی۔

بعض نے اس احتمال کا ذکر کیا ہے کہ انسانی جسم کے اعضاء بھی اس میں شامل ہیں جو اس کے اعمال کی گواہی دیں گے لیکن ”یقوم“ (اٹھ کھڑے ہوں گے) کی تعبیر کی طرف توجہ کی جائے تو یہ تفسیر بعید نظر آتی ہے۔

ایسے مواقع پر ”قیام“ کی تعبیر ایک خاص کیفیت کی طرف اشارہ ہے جو عدالتوں میں ہوتی ہے کہ شہادت دیتے وقت گواہ کھڑے ہو جاتے ہیں تاکہ گواہی دینے میں اپنے سنجیدہ ہونے، عدالت کی قانونی حیثیت کو قبول کرنے اور اس کے احترام کا اظہار کریں۔ بہر حال اس روز ایک گواہ نہیں، بلکہ بہت سے گواہ اس عظیم عدالت میں شہادت دیں گے۔ ایسی گواہی جو مومنین کے لیے افتخار و آبرو کا سبب ہوگی اور مجرموں کے لیے ذلت و رسوائی کا باعث ہوگی۔ ایسی گواہی جو ہر چیز پر محیط ہوگی اور کوئی چیز اس عدالت کی نظرِ شہود سے مخفی نہیں رہے گی۔ ایسی گواہی جس کا مجرم کسی طور انکار نہ کر سکے گا۔ اس کے ہمراہ ایسے قرائن ہوں گے کہ قبول و تسلیم کئے بغیر کوئی چارہ ہی نہ ہوگا۔ اس سے سمجھا جاسکتا ہے قیامت کے لیے اللہ کی طرف سے اس توصیف کا پیغام کس قدر وسیع اور موثر ہے۔

دوسری آیت میں روزِ قیامت کو ایسا دن قرار دیا گیا ہے: ”جس دن روح اور فرشتے ایک صف میں قیام کریں گے۔“ (یوم یقوم الروح والملائکۃ صفا) (نباء ۳۸)

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ لفظ ”صف“ چونکہ مصدری معنی رکھتا ہے اس کا مفرد اور جمع ایک ہی ہے، لہذا ممکن ہے یہاں ملائکہ کی مختلف صفوف کی طرف اشارہ ہو یا کم از کم دو صفوں کی طرف اشارہ ہو جن میں سے ایک میں ”روح“ ہوگا اور دوسرے میں فرشتے۔ ایک سوال یہاں پر یہ پیدا ہوتا ہے کہ ”روح“ سے کیا مراد ہے؟ اس سلسلے میں بہت سے اقوال ہیں جو کل آٹھ یا اس سے زیادہ ہیں۔ البتہ ان میں سے چند ایک مشہور تر ہیں:

- ۱۔ روح ملائکہ مقرب الہی میں سے ایک ہے۔ ایسا فرشتہ جو سب فرشتوں سے بالاتر ہے یہاں تک کہ جبریل سے بھی برتر اور وہی انبیاء اور ائمہ معصومین کے ہمراہ تھا۔
  - ۲۔ مراد جبریل امین ہیں جو وحی خدا کے لانے والے ہیں۔
  - ۳۔ مراد انسانوں کی روحیں ہیں، البتہ جسموں سے ملحق ہونے سے پہلے۔
  - ۴۔ مراد ایک با عظمت مخلوق ہے جو نہ انسان ہے اور نہ فرشتہ۔
  - ۵۔ مراد قرآن مجید ہے اور اس کے قیام کا معنی عرصہٴ محشر میں اس کے آثار کا ظہور ہے۔
- البتہ ان میں سے ہر تفسیر کے لیے قرآن کی بعض آیات سے استدلال کیا گیا ہے۔

اگرچہ قرآن کی مختلف آیات میں لفظ ”روح“ متعدد معانی میں استعمال ہوا ہے، تاہم یہاں پر جو معنی سب سے مناسب معلوم ہوتا ہے وہ پہلا ہے۔ معصومین کی بعض روایات میں بھی یہ تفسیر صراحت سے بیان ہوئی ہے۔  
امام جعفر صادق علیہ السلام کی ایک حدیث میں ہے:

”هو ملك اعظم من جبرائيل وميكائيل“

”وہ جبریل اور میکائیل سے بھی بڑا فرشتہ ہے۔“ [۱]

ابن عباس سے بھی منقول ہے:

”اللہ نے عرش کے بعد روح سے بزرگ تر کوئی مخلوق پیدا نہیں کی۔ قیامت کے دن وہ تنہا ایک صف میں ہوگا اور فرشتے سب ایک صف میں ہوں گے۔“ [۲]

## ۴۸۔ یوم لا ینفع مال ولا بنون

## ۴۹۔ یوم لا بیع فیہ ولا خلل

ان دو آیات سے بھی اس عظیم دن کے حالات کے بارے میں دو قریب الاق پیغام حاصل ہوتے ہیں۔ پہلی آیت میں فرماتا ہے: وہ دن جب مال و اولاد کوئی فائدہ نہ دیں گے۔ (یوم لا ینفع مال ولا بنون) مگر وہ جو بارگاہ الہی میں قلب سلیم لے کر آئے (الا من اتی اللہ بقلب سلیم) (شعر ۸۸۱-۸۹)

دوسری توصیف میں فرماتا ہے: وہ ایسا دن ہے جس میں نہ خرید و فروخت ہے اور نہ ہی دوستی کے رشتے (یوم لا بیع فیہ ولا خلل) (ابراہیم ۳۱)

در اصل دنیا کا اہم سرمایہ تین چیزیں ہیں: مال و ثروت، آبرو مند اولاد اور با وفا دوست، لیکن محشر کی مشکلات اور ہولناک مصیبتیں ایسی نہیں جنہیں مال و ثروت، اولاد اور دوستوں کی مدد سے برطرف کیا جاسکے۔ اگر فرض کر لیا جائے کہ دنیا کا سب مال، ساری اولاد اور سب دوست بھی انسان کو وہاں میسر آجائیں، پھر بھی وہ وہاں مشکلات کی کوئی گرہ نہ کھول سکیں گے کیونکہ وہاں کا معیار کوئی اور چیز ہے۔ محشر کا حلال مشکلات ایمان، عمل صالح اور قلب سلیم ہے، ایسا دل جو ہر قسم کے شرک و ریا اور غیر خدا سے پاک ہو۔

اس دنیا میں بیشتر مشکلات مال و دولت کے ذریعے، کچھ دے دلا کر، نقصان پورا کر کے، رشوت دے کر اور ایسے ہی دیگر جائز اور

[۱] مجمع البیان، ج ۱۰ ص ۷۲

[۲] تفسیر قرطبی، ج ۱۰ ص ۶۹

ناجائز طریقوں سے حل ہو سکتی ہیں۔ اسی طرح بہت سی مشکلات افرادی قوت خصوصاً محبت کرنے والی اولاد اور مخلص دوستوں کے ذریعے حل ہو سکتی ہیں۔ بہر حال اس دنیا کی بیشتر مشکلات ان وسائل سے حل ہو جاتی ہیں جب کہ وہاں ان چیزوں کا کوئی عمل دخل نہیں۔

البتہ مال و اولاد سے یہاں مراد ایسا مال اور ایسی اولاد نہیں جس سے رضائے الہی کے حصول کے لیے کام لیا گیا ہو یا ایسے دوست بھی مراد نہیں جو خدا کے حضور شفاعت کر سکتے ہوں، بلکہ مراد یہ ہے کہ اگر یہ سرمایہ وہاں منتقل ہو جائے تو کسی کام کا نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ زخرف ۶۷ میں ہے:

أَلَا خَلَاءُ يَوْمَئِذٍ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ إِلَّا الْمُتَّقِينَ ﴿٦٧﴾  
 ”دوست اس روز ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے مگر متقین۔“

۵۰۔ یوما لا تجزی نفس عن نفس شیئاً

۵۱۔ یوم لا تملك نفس لنفس شیئاً

۵۲۔ یوما لا یجزی والد عن ولده

اس دنیا میں سزا سے بچنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ کوئی کسی دوسرے کی ذمہ داری قبول کر لے اور اپنے آپ کو اس کی جگہ پیش کرے۔ اس کے مالی جرمانے کی ادائیگی قبول کر لے اور اس کے جرم کی سزا اپنے اوپر چھیل لے۔

مندرجہ بالا آیات ہیں جو قیامت کے توصیفی نام بیان کرتی ہیں، قرآن اعلان کرتا ہے کہ اس طرح کے کام اس عظیم الہی عدالت میں ہرگز ممکن نہیں۔ ہر کوئی اپنے کام کا خود ذمہ دار ہے۔ خود ہی اپنے اعمال کی سزا بھگتے گا اور اپنے جرائم کا جرمانہ خود ادا کرے گا۔

پہلی آیت جو قرآن مجید میں دومرتبہ آئی ہے، میں فرمایا گیا ہے: اس دن سے ڈرو جس دن کوئی بھی دوسرے کے حصے کی جزا نہ پائے گا۔ (وَاتَّقُوا يَوْمًا لَا تَجْزِي نَفْسٌ عَنْ نَفْسٍ شَيْئًا) (بقرہ ۳۸ و ۱۲۳)

یہی مفہوم دوسری آیت میں کچھ تفاوت کے ساتھ آیا ہے۔ فرماتا ہے: وہ ایسا دن ہے جب کوئی بھی دوسرے کے انجام کار کا مالک نہ ہوگا: (يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا) (انفطار ۱۹)

تیسری آیت میں ایک خاص موقع کی نشاندہی کی گئی ہے۔ فرماتا ہے: اس روز سے ڈرو جب نہ باپ بیٹے کے اعمال کی جزا قبول کرے گا اور نہ ہی بیٹا باپ کی جزا میں سے کچھ قبول کرے گا۔ (وَإِخْشَوْا يَوْمًا لَا يَجْزِي وَالِدٌ عَنْ وَلَدِهِ وَلَا مَوْلُودٌ هُوَ جَازٍ عَنْ وَالِدِهِ شَيْئًا) (لقمان ۳۳)

والد کا اولاد سے ربط جذب و محبت کی بنیاد پر ہوتا ہے اور اولاد کا باپ سے تعلق احترام و محبت کی اساس پر۔ درحقیقت انسان کے



جذب و احساس کے رشتوں میں یہ دورا بطے نزدیک ترین اور قوی ترین ہیں لیکن قیامت کا خوف وحشت اس قدر زیادہ اور دہلا دینے والا ہے کہ یہ سارے تعلق ٹوٹ کے رہ جائیں گے اور ختم ہو جائیں گے اس طرح سے کہ ہر کوئی بس اپنی فکر میں ہوگا۔

چند مفسرین نے مندرجہ بالا آیات کی تفسیر میں تصریح کی ہے کہ ”لا تجزی“ ”لا تغنی“ کے معنی میں آیا ہے جس کے معنی ہیں ”بے نیاز نہیں کرے گا۔“ [۱]

مفردات میں راغب کا کہنا ہے کہ جزا دراصل بے نیازی اور کنایت کے معنی میں ہے۔ پاداش اور سزا کو اس لیے جزا کہا جاتا ہے کہ وہ انجام شدہ عمل کی تلافی کے لیے کفایت کرتی ہے۔ یہی معنی مقانکس اللغہ میں بھی آئے ہیں۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ پہلی دو آیتوں میں مخاطب بنی اسرائیل ہیں جو قومی اور نسلی تعصب میں دنیا میں ضرب المثل ہیں۔ قرآن انہیں خبردار کرتا ہے کہ اس یوم عظیم میں تم بھی اپنے سوا ہر چیز کو فراموش کر دو گے جب کہ ایک دوسرے کے ساتھ تمہارا رابطہ اس قدر زیادہ ہے۔

ان آیات کا پیغام بالکل واضح ہے کیونکہ یہ آیات اس حقیقت کو بڑی وضاحت سے ثابت کرتی ہیں کہ شدا اند قیامت اور اس دن کے سخت حوادث کی اس دنیا میں کوئی مثال نہیں۔ اس دنیا میں بہت سے ایسے لوگ ہیں جو جذباتی تعلقات کی بناء پر اپنے آپ کو دوسرے پر فدا کر دیتے ہیں، لیکن قیامت میں کسی بھی مورد میں کوئی انسان دوسرے کے لیے ایسا نہیں کرے گا۔

### ۵۳۔ یوم تبیض وجوہ و تسود وجوہ

یہ نام جو قرآن مجید میں ایک بار آیا ہے اس عظیم دن کے ایک اور پہلو کو بیان کرتا ہے اور اس میں میدانِ محشر کا ایک اہم پیغام مضمر ہے۔ فرماتا ہے: ”نفاق پیدا کرنے والوں کے لیے عذاب عظیم اس دن ہوگا جب کچھ چہرے سفید اور کچھ چہرے سیاہ ہو جائیں گے۔“ (یوم تبیض وجوہ و تسود وجوہ) (آل عمران ۱۰۶)

نورانی چہرے ان کے ہوں گے نور ایمان جن کے درونِ جان سے قیامت کے یوم ظہور ہونے کی وجہ سے چہروں پر نمایاں ہو جائے گا۔ اسی سبب سے وہ اللہ کی رحمت میں غرق ہوں گے اور وہاں ہمیشہ رہیں گے (وَأَمَّا الَّذِينَ ابْيَضَّتْ وَجُوهُهُمْ فَبِئْسَ الْوَسِيلَۃُ إِلَى اللَّهِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ) (آل عمران ۱۰۷)

لیکن تاریک دل بے نور، بے ایمان کافر اور سیاہ دل مجرم ہوں گے جن کے اندر کی ظلمت باہر آ جائے گی۔ یہ رو سیاہ عذاب الہی میں غرق ہوں گے اور ان سے کہا جائے گا:

فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ ﴿۵۳﴾  
”اپنے کفر کی وجہ سے اب تم عذاب الہی کا مزہ چکھو۔“ (آل عمران ۱۰۶)



مذکورہ بالا تعبیر دوسری صورتوں میں بھی قرآن مجید کی آیات میں آئی ہے۔ ایک جگہ فرماتا ہے:

**كَأَنَّمَا أُغْشِيَتْ وُجُوهُهُمْ قِطْعًا مِّنَ اللَّيْلِ مُظْلِمًا ۖ**

”ان (پے درپے گناہوں کا ارتکاب کرنے والوں) کے چہروں کو گویا شب سیاہ کے تاریک ٹکڑوں نے ڈھانپ

دیا ہے۔“ (یونس ۲۷)

ایک اور جگہ فرماتا ہے:

**وَجُوهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ۖ ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ ۝۳۹**

”اس روز چہرے کشادہ و نورانی اور خنداں و مسرور ہوں گے۔“ (عبس ۳۸ و ۳۹)

نیز

**وَوُجُوهُ يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ۖ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ۝۴۰**

”اور (کچھ) چہرے اس روز غبار آلود ہوں گے اور دھوئیں اور تاریکی نے انہیں ڈھانپ دیا ہوگا۔“ (عبس ۴۰ و ۴۱)

کس موقع پر کچھ چہرے نورانی اور کچھ تاریک ہو جائیں گے؟ بعض کہتے ہیں کہ جب صفیں ایک دوسرے سے جدا ہوں گی۔ بعض کہتے ہیں جب نامہ اعمال کا مشاہدہ ہوگا اور بعض کہتے ہیں جب لوگ قبروں سے اٹھیں گے یا جب عدل الہی کی میزان کے سامنے پیش ہوں گے۔

لیکن اس لحاظ سے کہ وہ لوگوں کے حقائق اور اعمال کے ظہور کا دن ہے، معلوم ہوتا ہے کہ ایسا قبور سے نکلتے ہی ہو جائے گا اور پھر باقی رہے گا۔

کن افراد کے چہرے نورانی اور کن کے سیاہ ہوں گے، اس سلسلے میں مفسرین نے مختلف احتمالات ذکر کیے ہیں۔ کبھی تو اس کو معین افراد کے لیے محدود قرار دیا گیا ہے۔ لیکن ظاہر یہ ہے کہ تمام اہل ایمان اور نیک عمل افراد سفید رو ہوں گے اور تمام کافر و مجرم سیاہ رو افراد کی صف میں ہوں گے۔

آخری بات یہ ہے کہ بعض مفسرین نے ان دو تعبیروں کو مجازی مفہوم پر محمول کرنا چاہا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ سفیدی سرور و مسرت کی طرف اور سیاہی غم و اندوہ کی طرف اشارہ ہے۔<sup>[۱]</sup>

لیکن اس خلاف ظاہر کے ارتکاب کے لیے کوئی موجب نہیں ہے، بلکہ آیت کو اسی حقیقت معنی پر محمول کیا جانا چاہیے۔ قرآن تو یہ بھی کہتا ہے:

### يَسْعَى نُورُهُمْ بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَبِأَنْمَاءِهِمْ

”ان کا نور عرصہ محشر میں ان کے سامنے اور دائیں طرف چلے گا۔“ (حدید ۱۲)

جب ایسا ہے تو پھر اس میں کون سا تعجب ہے کہ کچھ چہرے سفید اور نورانی ہوں اور کچھ صورتیں سیاہ و تاریک ہوں؟ واقعاً وہ دن کس قدر وحشت ناک ہے کہ جب جو کچھ انسان کے قلب و روح میں ہے، اس کے چہرے پر نمایاں ہو جائے گا، سیاہ دلوں کے لیے بڑا رسوائی کا دن ہوگا اور روشن دلوں کے لیے بڑے افتخار کا دن ہوگا۔ یہی امر سبب بنے گا کہ عرصہ محشر میں آغاز ہی سے مومنین کا احترام و اکرام ہوگا اور کافرین و مجرمین کے حصے میں لعن و نفرین آئے گی۔

### ۵۴۔ یوما کان شرہ مستطیرا

یہ تعبیر قرآن میں ایک ہی دفعہ آئی ہے۔ اس میں نیکوں کی تعریف کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”وہ اس دن سے ڈرتے ہیں جس کا عذاب وسیع اور بہت زیادہ ہوگا۔“ (و یخافون یوما کان شرہ مستطیرا) (دھرے)

”مستطیر“ ”طیران“ کے مادہ سے ہے جو ”پرواز“ کے معنی میں ہے۔ یہاں اس کے معنی ہیں منتشر اور وسیع۔ لہذا بعض نے اس کے معنی ”غیر معمولی وسعت یافتہ“ کیے ہیں۔ صبح کی سفیدی جب سارے افق پر چھا جاتی ہے اس کے لیے یہ کلمہ استعمال ہوتا ہے: فجر مستطیر۔

”شر“ سے یہاں مراد روز قیامت کا عذاب یا اس دن کا خوف و وحشت ہے اور اس کی وسعت اس قدر ہوگی کہ تمام زمین و آسمان پر محیط ہوگا، یہاں تک کہ فرشتے بھی وحشت میں ہوں گے۔ نہ فقط وہ بد عمل مجرم بلکہ نیک پاک افراد بھی، جو اپنے انجام کار سے بے خبر ہوں گے، اس وسیع وحشت و اضطراب میں حصہ دار ہوں گے۔

یہ بات جاذب نظر ہے کہ مندرجہ بالا آیت میں ایسے دن سے خوف کو ابرار اور نیک لوگوں کی صفات پسندیدہ اور مثبت اخلاقی نکات میں شمار کیا گیا ہے کیونکہ ایسا خوف ہر طرح کے گناہ سے پرہیز اور پروردگار کی اطاعت مطلق کا سبب بنتا ہے۔

### ۵۵۔ یوم یفر المرء من اخیہ

یہ تعبیر بھی قرآن مجید میں صرف ایک بار آئی ہے۔ یہ منظر قیامت کی ایک اور واضح تصویر ہے۔ فرماتا ہے: اس دن بھائی اپنے بھائی سے بھاگے گا، یہاں تک کہ اپنے ماں باپ سے بھی اور اپنے بیوی بچوں سے بھی (کیونکہ) اس روز ہر ایک ایسی کیفیت سے دوچار ہوگا کہ بس اسی میں کھو کے رہ جائے گا۔ الصَّاحَّةُ ۝ يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ أَخِيهِ ۝ وَأُمُّهُ وَأَبِيهِ ۝ وَصَاحِبَتُهُ وَبَنِيهِ ۝ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ يُغْنِيهِ ۝ (عبس ۳۴ تا ۳۷)

ظاہر ہے کہ ہر انسان کے نزدیک ترین اور محبوب ترین افراد اس کے بھائی، ماں باپ اور بیوی بچے ہی ہوتے ہیں۔ عجیب بات یہ ہے

کہ قرآن یہ نہیں کہتا کہ اس دن ان سے غافل ہو جائے گا بلکہ کہتا ہے ان سے گریز کرے گا۔ ماں، جس سے بہت محبت کرتا تھا، باپ جس کا بہت احترام کرتا تھا، بیوی جس سے شدید محبت کرتا تھا اور اولاد جو اس کے دل کا قرار اور آنکھوں کا نور تھی۔ وہاں سب سے گریزاں ہوگا۔ یہ وہ لوگ ہیں اس دنیا کی مشکلات میں ہمیشہ جن کی طرف رجوع کرتا تھا اور مصیبتوں میں یہ لوگ اس کی تسلی خاطر کا سامان تھے۔ لیکن وہاں کیا عالم ہوگا کہ ان سے گریزاں ہوگا۔

ہاں! قیامت کی چنگھاڑ جسے قرآن نے ”صاخۃ“ کہا ہے اور جس کا ذکر قبل ازیں آچکا ہے، اس قدر عظیم ہوگی کہ تمام رشتوں کو منقطع کر کے رکھ دے گی۔ اس کی صدائے گوش خراش اور بہرا کر دینے والی آواز، انسان کو اپنے سوا ہر کسی سے بیگانہ کر دے گی۔

انسان گریزاں کیوں ہوگا؟

کیا اپنے نزدیک ترین افراد کے سامنے رسوائی کے خوف سے؟

یا شاید اس لیے کہ ممکن ہے ان کے ایسے گناہ ہوں جن کی سزاؤں سے یہ ڈرتا ہو۔

یا شاید ان کے کچھ حقوق اس سے ضائع ہو گئے ہوں اور اس میدان میں اس تہی دامن سے وہ ان کا مطالبہ کر بیٹھیں؟

یائیں، بلکہ محشر کا خوف و وحشت اس قدر زیادہ اور سنگین ہوگا کہ انسان کو اس کے تمام محبوب افراد سے جدا کر دے گا اور اسے اپنے آپ میں مگن کر دے گا۔ وہ ان سے گریزاں ہوگا تاکہ فقط اپنے بارے میں سوچ سکے۔ ان سے بھاگے گا تاکہ اپنی نجات کا راستہ تلاش کر سکے اور ان سے فرار کرے گا تاکہ اپنے انجام کو پاسکے؟

ان چاروں میں سے کوئی مسئلہ بھی ہو ہر ایک تنہا ہی بھاگنے اور گریز کرنے کے لیے کافی ہے جب کہ یہ تو سب امور وہاں پر جمع ہوں گے۔

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ کے خاندان کے ایک فرد نے آپ سے پوچھا:

”کیا قیامت میں انسان کو اپنا عزیز دوست یاد آئے گا؟“

آپ نے جواب میں فرمایا:

تین مقامات ایسے ہیں جہاں کوئی بھی کسی کو یاد نہیں کرے گا:

اول: میزانِ عمل کے پاس، تاکہ دیکھے اس کا میزانِ عمل بھاری ہے یا ہلکا؟

دوم: صراط پر، تاکہ دیکھے کہ وہاں سے گزر سکتا ہے یا نہیں؟

سوم: جب انسان کو نامہ اعمال تھا دیا جائے گا تاکہ دیکھے کہ اسے یہ دائیں ہاتھ میں تھا یا جاتا ہے یا بائیں میں۔

ان تین مواقع پر کوئی کسی دوسرے کی فکر میں نہ ہوگا۔ نہ عزیز دوست، نہ یار مہربان، نہ قریبی، نہ مخلص چاہنے والے، نہ اولاد، نہ ماں

باپ اور یہی فرمایا ہے اللہ تعالیٰ نے:

لکل امریٰ منہم یومئذ شان یغنیہ  
”اس روز ان میں سے ہر کوئی اپنے آپ میں کھویا ہوگا۔“ [۱]

## ۵۶ یوماً يجعل الولدان شیباً

یہ توصیف جو قرآن مجید میں ایک مرتبہ آئی ہے، اس یوم عظیم کے وحشت ناک حوادث کی ایک اور صورت پیش کرتی ہے۔ کافروں اور مشرکوں کی طرف روئے سخن کرتے ہوئے فرماتا ہے: جب کافر ہو جاؤ (اور اپنے کفر پر باقی رہو) تو عذاب الہی سے اپنے آپ کو اس دن کیسے بچا سکو گے جس روز بچے بوڑھے ہو جائیں گے تَتَّقُونَ اِنْ كَفَرْتُمْ يَوْمًا يَجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيبًا ﴿۵۶﴾ (مزل ۱۷) [۲] و [۳]  
یہ ایک ایسی گویا ترین اور رساترین تعبیر ہے جو اس دن کے ہولناک حوادث سے پردہ اٹھاتی ہے۔ یہ حوادث جیسے ہی عالم طبیعت پر اثر انداز ہوں گے، پہاڑوں اور صحراؤں پر تاکید کریں گے اور انہیں زیر و بروز کر کے رکھ دیں گے۔ اس طرح اس انسان خاکی پر بھی ایسا اضطراب اور وحشت طاری کر دیں گے جو بچوں کو بوڑھا بنا دے۔

بعض مفسرین نے اس تعبیر کو اس کے حقیقی معنی پر محمول کیا ہے یعنی عرصہ محشر میں واقعات بچوں پر بھی پیری کے آثار ظاہر ہوں گے جب کہ بچے کا بڑھاپے سے فاصلہ بہت زیادہ ہوتا ہے۔ ان مفسرین نے اس تفسیر کے لیے شواہد بھی نقل کیے ہیں، مثلاً اس دنیا میں بھی ہمیں ایسے افراد مل جاتے ہیں جن کے سیاہ بال کسی سنگین حادثے کی وجہ سے ناگہاں چند دنوں میں بلکہ بعض اوقات چند گھنٹوں میں سفید ہو گئے ہوں۔ اگر اس دنیا کے حوادث انسان پر ایسے اثرات ڈال سکتے ہیں تو حوادث محشر تو ان سے کہیں زیادہ شدید اور سخت تر ہوں گے۔ لہذا یقینی طور پر ایسا اثر کر سکتے ہیں۔

لیکن بعض نے آیت کو کنائی معنی پر محمول کیا ہے کیونکہ یہ عربی زبان میں اور دوسری زبانوں میں بھی رائج ایک کنایہ ہے کہ کسی حادثے کی عظمت کو بیان کرنے کے لیے کہتے ہیں: ”اس واقعے نے تو مجھے بوڑھا کر دیا ہے۔“  
آیت کی دونوں تفسیریں ممکن ہیں۔ البتہ یہ جو بعض نے احتمال ذکر کیا ہے کہ بچے اس لیے بوڑھے ہو جائیں گے کہ وہ دن بڑا طولانی

[۱] تفسیر برہان ج ۴ ص ۴۲۹ حدیث ۱

[۲] چند مفسرین کے نزدیک مذکورہ بالا آیت میں ”یوماً“ ”تتقون“ کے لیے ”طرف“ ہے۔ لیکن یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ اسی فعل کے لیے ”مفعول بہ“ ہو اور اس صورت میں کلمہ ”عذاب“ کو تقدیر میں فرض کیا گیا ہے۔ لہذا اس لحاظ سے تقدیر میں آیت یوں ہوگی:

فكيف تتقون ان كفرتم عذاب يوم يجعل الولدان شيباً

[۳] ”شيب“ ”أشيب“ کی جمع ہے جس کا معنی ہے بوڑھا۔ اسے مادہ ”شيب“ (بروزن ”عیب“) سے لیا گیا ہے جس کے معنی ہیں بال سفید ہونا۔

ہوگا، بہت بعید نظر آتا ہے کیونکہ یہ آیت دیگر بہت سی آیات جو قیامت سے مربوط ہیں، کی طرح اس دن کے حوادث کی سختی کو بیان کر رہی ہے۔ نیز اس سے پہلے آنے والی آیات بھی اس پر شاہد ہیں جن میں پہاڑوں کے بکھر جانے کا ذکر ہے۔

## ۵۷۔ یوم لا ینطقون

یہ توصیف بھی صرف ایک بار سورہ مرسلات میں آئی ہے۔ فرماتا ہے: یہ وہ دن ہے جس میں بات نہ کریں گے۔“..... (مرسلات ۳۴ تا ۳۶)

کیا قیامت کا عظیم خوف اور وحشت ان کی زبانوں سے بات کرنے کی طاقت چھین لے گا جیسے دنیا میں بھی کبھی انسان کی زبان کسی بڑے حادثے کے سبب بند ہو جاتی ہے؟

یا اصولاً انسان کے پاس کہنے کو کوئی بات ہی نہ ہوگی، نہ کوئی دلیل اور نہ کوئی عذر؟  
یا پھر مندرجہ ذیل آیت کے پیش نظر زبانیں حکم الہی سے بیکار ہو جائیں گی اور اعضاء بدن انسان کے اعمال کے گواہ ہو جائیں گے:

اَلْیَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰی اَفْوَاهِهِمْ وَتُغْلِقُ اٰیْدِیْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا

یَكْسِبُوْنَ ﴿۶۵﴾

”آج ان کے منہ بند کر دیں گے، ان کے ہاتھ ہم سے باتیں کریں گے اور ان کے پاؤں ان کے انجام دئے ہوئے اعمال کی گواہی دیں گے۔“ (یس ۶۵)

ممکن ہے تینوں تفاسیر مفہوم آیہ میں جمع ہوں، اگرچہ تیسری تفسیر زیادہ روشن معلوم ہوتی ہے۔ بہر حال یہ امر اس سے مانع نہیں کہ قیامت کے بعض مقامات پر انسان حکم خدا سے بات کرے کیونکہ قیامت کے مختلف مراحل ہیں۔ مجموعی طور پر قرآن کی آیات نشانہ دہی کرتی ہیں کہ بعض مقامات پر مجرم گونگے اور منہ بند ہوں گے اور حکم الہی سے بعض مقامات پر بات کریں گے۔

## ۵۸۔ یوم یکشف عن ساق ویدعون الی السجود فلا یتطیعون

یہ بھی اپنی نوعیت کی ایک ہی تعبیر ہے جو اس یوم عظیم کے وحشت ناک چہرے کی ایک اور تصویر پیش کرتی ہے۔ فرماتا ہے: اس دن کا سوچو جب پنڈلیاں وحشت کے باعث برہنہ ہو جائیں گی اور (مجرموں کو) سجدوں کو کہا جائے گا لیکن ان میں اس کی طاقت ہی نہ ہوگی۔ ”یَوْمَ یُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ وَیُدْعَوْنَ اِلَی السُّجُوْدِ فَلَا یَسْتَطِیْعُوْنَ“ (قلم ۴۲)

”یکشف عن ساق“ (پنڈلیاں برہنہ ہو جائیں گی)، یہ تعبیر بہت سے مفسرین کے نظریے کے مطابق سختی کا اور شدت خوف و وحشت کے لیے کنایہ ہے کیونکہ گذشتہ زمانے میں معمول تھا کہ کوئی مشکل کام پیش آتا تو آستینیں الٹ لیتے تھے اور دامن لباس کو کمر سے باندھ لیتے تھے تاکہ مسئلے سے نبرد آزما ہونے کے لیے بہتر طور پر تیار ہو سکیں۔ طبعی سی بات ہے کہ ایسی صورت میں پنڈلیاں برہنہ ہو جائیں۔

بعض مفسرین نے آیت کی تفسیر میں ایک اور احتمال بھی ذکر کیا ہے اور وہ یہ کہ ”ساق“ کے معنی اصل اور اساس ہیں (جیسے ”ساقۃ الشجر“) اس بنا پر جملہ ”یکشف من ساق“ اس دن اشیاء کے حقائق کے آشکار و ظاہر ہونے کی طرف اشارہ ہے۔<sup>[۱]</sup>

بہر حال اس ہولناک دن عظمت پروردگار کے حضور سجدہ کی دعوت دی جائے گی۔ مومنین سجدہ زیر ہو جائیں گے اور شاید یہ سجدہ ہی ان کے قلب و روح کا قراء رہے، لیکن جو کفر و گناہ سے آلودہ ہوں گے ان میں سجدے کی طاقت ہی نہ ہوگی۔

امام علی بن موسیٰ رضا کی ایک حدیث میں ہے:

”اس دن نور الہی سے پردہ ہٹ جائے گا اور سب مومنین سجدہ ریز ہو جائیں گے، لیکن منافقوں کی پشت یوں

خشک ہو چکی ہوگی کہ ان میں کمر خم کرنے اور سجدہ کرنے کی طاقت نہ ہوگی۔“<sup>[۲]</sup>

بعض کا کہنا ہے کہ ”یکشف عن ساق“ سے مراد نور الہی کا ظاہر ہونا ہی ہے۔

## ۵۹۔ یوم لا ینفع الظالمین معذرتہم

یہ توصیف بھی اس دن کے دردناک حوادث میں سے ایک کو بیان کرتی ہے۔ فرماتا ہے: وہ دن کہ جب ظالموں کی عذرخواہی بے سود ہوگی، ان کے لیے (اللہ کی) لعنت ہے اور ان کے لیے برا ٹھکانا ہے۔ ”یَوْمَ لَا یَنْفَعُ الظَّالِمِیْنَ مَعْذِرَتُهُمْ وَلَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوءُ الدَّارِ“ (مومن ۵۲)

معمولاً اس دنیا میں سزا سے بچنے اور نجات کا ایک طریقہ معذرت خواہی اور معافی ہے لیکن روز قیامت کا مزاج ایسا ہے کہ اس دن ظالموں کا کوئی عذر قبول نہیں کیا جائے گا کیونکہ اصولاً وہ محصول بد جزائے عمل کے حصول کا مقام ہے نہ کہ گذشتہ کی تلافی کا جو خود ایک طرح کا عمل ہے۔

گذشتہ آیات میں ہم نے پڑھا ہے کہ اس روز نہیں عذرخواہی کی اجازت نہیں دی جائے گی اور بعض میں یہ بھی ہے کہ اگر انہوں نے عذرخواہی کی بھی تو وہ بے سود ہوگی۔ لہذا ان کے لیے اللہ کی لعنت اور برا ٹھکانا ہی ہے۔

اس نام کا پیغام، جو سب کے لیے ہے، یہ ہے کہ آج ممکن ہے کہ خدا کے حضور توبہ کے ذریعے اپنے گناہوں کے داغ دھوئے جاسکیں اور مظلوموں کو ان کا حق دے کر آثارِ ظلم کو مٹایا جاسکے۔ لہذا اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیے ورنہ اس مقامِ عظیم اور عدالتِ عالی میں نہ عذرخواہی کا کوئی فائدہ گا، نہ ندامت و پشیمانی کا اور نہ گریہ و زاری کا۔ بقول شاعر:

[۱] روح المعانی، ج ۲۹ ص ۳۵ و قرطبی، ج ۱۰ ص ۶۷۸

[۲] نور الثقلین، ج ۵ ص ۳۹۵ حدیث ۴۹

کنونت کہ چشم است اشکی بیار  
 زبان دردہان است عذری بیار  
 کنون بایدت عذر تقصیر گفت  
 نہ چوں نفس ناطق زگفتن بخفت  
 کنون وقت تخم است تا روی  
 گر امید داری کہ خرمن بری  
 کنون باید ای خفته بیدار بود  
 چومرگ، اندر آیدز خوابت، چہ سود

”اس وقت تیرے پاس آنکھ ہے آنسو بہا لے، تیرے دہن میں زبان ہے عذر خواہی کر لے۔  
 ابھی اپنی تقصیر پر عذر کر لے اور نفس ناطق کی طرح چپ نہ رہ  
 اس وقت بچ بونے کا وقت ہے، بولے، اگر تجھے کل فصل کاٹنے کی امید ہے۔  
 اے سونے والے! ابھی بیدار ہو جا۔ موت سوئے پڑے آگئی تو کیا فائدہ۔“<sup>[۱]</sup>

## ۲۰۔ یوم یعض الظالم علی یدیہ

یہ بھی ان ہلا دینے والی تعبیرات میں سے ہے جو ایک بار قرآن مجید کی آیات میں آئی ہیں۔ فرماتا ہے: اس دن کے بارے میں سوچو  
 جب ظالم اپنے دونوں ہاتھوں کو (شدت حسرت سے) چبائے گا، یہ کہتے ہوئے کہ اے کاش! میں نے اللہ کے رسولؐ کی راہ اپنائی ہوتی ویوہ  
 یَعْصُ الظَّالِمُ عَلَى يَدَيْهِ يَقُولُ يَلَيْتَنِي اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُولِ سَبِيلًا ﴿۲۸﴾  
 پھر مزید کہے گا: افسوس ہے مجھ پر، اے کاش! میں نے فلاں (گمراہ شخص) کو اپنا دوست نہ بنایا ہوتا یو لیتنی لیتنی لہم اتَّخَذْتُ  
 فَلَا تَاْخِلِيْلًا ﴿۲۹﴾ (فرقان ۲۸ و ۲۹)

کبھی انسان اپنے گزشتہ کاموں پر شدید ندامت و پشیمانی اور افسوس کے عالم میں اپنی انگلیوں کو کاٹتا ہے اور کبھی اپنے ہاتھوں کی پشت  
 کو چباتا ہے۔ ندامت و حسرت غیر معمولی ہو تو پھر دونوں ہاتھوں کو یکے بعد دیگرے چباتا ہے۔ یہ افسوس، ندامت اور پشیمانی کے لیے انتہائی رسا  
 تعبیر ہے۔

ظالم اس یوم عظیم میں پیہم اپنے ہاتھوں کی پشت کو کاٹیں گے اور ہم جانتے ہیں کہ اس دن کے ناموں میں سے ایک ”یوم الحسرة“

[۱] بوستان سعدی، باب ۹۔ آخری شعر مشہور حدیث ”الناس نیام اذا ماتوا انتبهوا“ کی طرف اشارہ ہے۔

ہے۔ (مریم ۳۹)

لیکن کیا فائدہ؟ کیا ہاتھوں کو دانتوں سے زخمی کرنے سے کوئی مشکل حل ہو جائے گی؟ الٹا یہ تو اپنے آپ سے ایک طرح سے انتقام لینا ہے۔ یا کیا اس سے کوئی چین ملے گا؟ بلکہ اس کے برعکس اس سے تو ظالموں کی تکلیف میں اضافہ ہی ہوگا اور ان کی رسوائی اس سے اور بڑھے گی۔ تفسیر ”المیزان“ میں ہے کہ اس آیت میں لفظ ”ظالم“ ہر ظالم کے لیے ہے جیسے ”رسول“ بھی ہر پیغمبر کے لیے ہے، ہر چند تو جو اس امت کے ظالموں کی طرف ہے اور رسول اللہ بھی محمد بن عبد اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہیں۔

البتہ مختلف تفاسیر میں اس آیت کی شان نزول بھی ذکر ہوئی ہے جس کی شرح طولانی ہے، لیکن ہم جانتے ہیں کہ شانہائے نزول مفہوم آیات کو محدود نہیں کرتیں۔<sup>[۱]</sup>

## ۶۱۔ یوم یعرض الذین کفروا علی النار

## ۶۲۔ یوم تقلب وجوہہم فی النار

یہاں بھی اس عظیم دن کی دو مشابہ اور ایک دوسری سے نزدیک توصیفات نظر آتی ہے۔ پہلی توصیف سورہ احقاف میں دوبار آئی ہے، آیہ ۲۰ اور ۳۴ میں فرماتا ہے: اس دن کا سوچو جب کافروں کو آتش دوزخ کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ (یوم یعرض الذین کفروا علی النار)۔

پہلی آیت میں اس کے بعد فرمایا گیا ہے: ”تم نے دنیا کے لذائذ و طیبات سے اپنا حصہ پالیا (اور ان کے مزے لوٹ لیے) لیکن آج ذلت ناک عذاب پاؤ گے، اس غرور کی وجہ سے جو تم زمین پر ناحق کرتے تھے، ان گناہوں کی وجہ سے جو تم نے انجام دیے ہیں۔ دوسری آیت میں فرماتا ہے: ”جب انہیں آتش دوزخ کے سامنے پیش کیا جائے گا تو ان سے کہا جائے گا کیا یہ حق نہیں ہے۔“ (تم تو قیامت کو ہمیشہ اگلوں کی کہانیاں سمجھا کرتے تھے۔ کیا آج بھی تمہارا وہی خیال ہے؟) لیکن وہ کہیں گے: ”ہاں! ہمیں ہمارے پروردگار کی قسم یہ حق ہے۔“

درحقیقت دوسری آیت میں ان اعتقادی پہلوؤں کی طرف اشارہ ہوا کہ جو دوزخیوں کی بربادی کا سبب ہیں اور پہلی آیت میں عملی پہلوؤں کی طرف اشارہ ہے یعنی ناجائز لذتیں اور نعمات الہی سے حرام استفادہ۔

یہ بات جاذب توجہ ہے کہ قرآن کی بعض آیات میں آیا ہے کہ قیامت کے دن دوزخ کو مجرموں کی طرف لے جائیں گے:

وَجَائِءَ يَوْمَئِذٍ مِّنْهُمْ<sup>۲۳</sup> (فجر ۲۳)

[۱] مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ ج ۱۵ ص ۶۸ (فارسی) کی طرف رجوع کریں۔



لیکن زیر بحث آیت میں فرمایا گیا ہے: کافروں کو آتش دوزخ کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ گویا ان دونوں کے درمیان کوئی قوت جاذبہ کارفرما ہے۔ ایک طرف جہنم ان کی طرف کھینچے گی اور دوسری طرف وہ جہنم کی طرف جذب ہوں گے۔

دوسری تعبیر میں قیامت کے دردناک عذابوں میں سے ایک اور کا ذکر ہے۔ اس دن کو اسی نام سے یاد کرتے ہوئے فرماتا ہے: جس دن ان کی صورتیں (جہنم کی) آگ میں دگرگوں ہو جائیں گی، وہ کہیں گے: اے کاش! ہم نے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کی ہوتی یَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوهُهُمْ فِي النَّارِ يَقُولُونَ يَلَيِّنَتْنَا اللَّهُ وَآطَعْنَا الرَّسُولَ ﴿٦٦﴾ (احزاب ۶۶)

اس سلسلے میں مفسرین نے مختلف باتیں کی ہیں کہ اس دن صورتوں کے دگرگوں ہونے سے کیا مراد ہے۔ کبھی کہا گیا ہے کہ مراد چہرے کے رنگوں کا متغیر ہونا ہے، یعنی کبھی زرد اور پڑمر دہ ہو جائے گا، کبھی سرخ اور آتشیں ہو جائے گا اور کبھی تاریک و سیاہ ہو جائے گا۔ بعض کہتے ہیں کہ مراد یہ ہے کہ جیسے آگ پر کسی چیز کو بھوننے کے لیے اسے الٹ پلٹ اور ادھر ادھر کیا جاتا ہے، مجرموں کے چہروں کی حالت بھی اس روز آتش دوزخ میں ایسی ہی ہوگی۔

کبھی کہا گیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ انہیں چہروں کے بل آتش دوزخ میں پھینکا جائے گا۔ البتہ ”وجہ“ کا ذکر اس لیے ہے کہ چہرہ انسان کے اعضاء میں سب سے اشرف ہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ آیت کے مفہوم میں یہ تینوں تفسیریں جمع ہوں اگرچہ پہلی اور دوسری تفسیر زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔ بہر حال آیت ایک عظیم حادثے اور ایسے بہت بڑے عذاب کی خبر دیتی ہے جو کافر، مجرم اور دشمنِ گروہ کے انتظار میں ہے۔

اس آیت کا پیغام یہ ہے کہ اس روز ”اے کاش“ کہنے سے پہلے جس کی نہ کوئی تاثیر ہوگی اور نہ فائدہ، کیوں آج ہی اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا راستہ اختیار نہ کر لیا جائے؟ آج شیطان صف بندوں اور زمانے کے طاغوتوں کی اطاعت کو خدا کی اطاعت پر مقدم کیوں کیا جائے؟ خصوصاً ایسے کاموں کو کیوں نہ ترک کر دیا جائے جو قیامت میں ندامت و پشیمانی کا باعث ہوں گے؟

### ۶۳۔ یَوْمَ يَدْعُونَ إِلَى نَارِ جَهَنَّمَ دَعَاً

یہ تعبیر بھی گذشتہ آیات میں بیان ہونے والی تعبیروں سے کافی شبہات رکھتی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

يَوْمَ يَدْعُونَ إِلَى نَارِ جَهَنَّمَ دَعَاً ﴿١٣﴾

”روزِ قیامت وہی دن ہے کہ جب وہ سختی کے ساتھ دوزخ کی آگ میں دھکیلے جائیں گے۔“ (طور ۱۳)

هَذِهِ النَّارُ الَّتِي كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُونَ ﴿١٤﴾ اَفَسِحْرُ هَذَا اَمْ اَنْتُمْ لَا تُبْصِرُونَ ﴿١٥﴾

”اور ان سے کہا جائے گا کہ یہ وہی آگ ہے جسے تم جھٹلایا کرتے تھے۔ کیا یہ جادو ہے یا تمہیں دکھائی نہیں دیتا۔“

(طور: ۱۴ و ۱۵)

مفرد میں راغب کے بقول ”یدعون“ ”دغ“ کے مادے سے ہے جس کا معنی ”سختی سے دھکیلنا“ ہے۔ اس تعبیر سے پتہ چلتا ہے کہ روز قیامت دوزخیوں کا جہنم کی طرف لے جایا جانا بھی انتہائی سختی اور وحشت و خوف کے ساتھ انجام پائے گا۔ یہ ایک ایسی تعبیر ہے جس کا تصور بھی انسان کو لرزاکر رکھ دیتا ہے، سخت فکر میں ڈال دیتا ہے اور درپیش ذمہ داریوں کی اہمیت کو واضح کر دیتا ہے۔ دوزخیوں اور بہشتیوں میں کس قدر فرق ہے، حتیٰ کہ انہیں ان کی اصل جگہ پر منتقل کرنے میں بھی۔ قرآن بہشتیوں کے بارے میں فرماتا ہے:

سَلَامٌ عَلَيْكُمْ ۖ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿۳۱﴾

فرشتے ان پر درود بھیجتے ہیں اور کہتے ہیں:

”درود و سلام ہو آپ پر۔ جنت میں داخل ہو جائیں، ان اعمال کی بناء پر جو آپ نے انجام دیئے۔“ (نحل ۳۲)  
ایک اور جگہ پر ہے کہ ملائکہ ان سے کہتے ہیں:

سَلَامٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَبِعَمَلِ عُقَبَى الدَّارِ ﴿۳۳﴾

”درود و سلام ہو آپ پر اس صبر و استقامت کے بدلے جو آپ نے انجام دیا اور کیا ہی اچھی عاقبت اس دنیا میں آپ کو نصیب ہوئی ہے۔“ (رعد ۲۴)

## ۶۴۔ یوم نبطش البطشة الكبرى

## ۶۵۔ یوم لا مرد له من الله

اس روزِ عظیم کے بارے میں پہلی تعبیر تو لرزادینے والی ہے، کیونکہ خداوند بزرگ اپنی بے انتہا قدرت کے ساتھ سخت ترین لہجے میں مجرم کافروں کو دھمکی دیتا ہے اور فرماتا ہے:

يَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرَى ۖ إِنَّا مُنْتَقِمُونَ ﴿۱۶﴾

”اس دن انہیں ہم اپنی عظیم قدرت کے ساتھ پکڑیں گے اور ان سے ضرور انتقام لیں گے۔“ (دخان ۱۶)

”بطش“ کی تعبیر سختی سے پکڑنے اور حملہ کے معنی میں ہے۔ ”کبڑی“ کے ساتھ اس کی صفت لانا اس کے عظیم ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ ”اننا منتقمون“ کی تعبیر جملہ اسمیہ بھی ہے اور انا کے ساتھ تاکید بھی کی گئی ہے۔ آیت کی ان تعبیرات کے جزء جزء پر جب انسان غور کرتا ہے تو لرزہ بر اندام ہو جاتا ہے کہ وہ رحیم و غفور خدا اور وہ قادر و قادر پروردگار ایسی دھمکی دے رہا ہے۔ مفسرین کی ایک جماعت نے کہا ہے یا اس بات کا احتمال ذکر کیا ہے کہ ممکن ہے آیت اشارہ ہو اس سخت ترین سزا کی طرف کہ جو

جنگ بدر میں مشرکین کے نصیب میں آئی۔ لیکن آیت کی تعبیرات ایک بڑے شدید تر اور وسیع تر عذاب کے ساتھ مناسب رکھتی ہیں اور یہ ماسوائے آخرت کے کسی اور پر صادق نہیں آتیں۔

علاوہ ازیں اس سے پہلے والی آیات میں بھی ایسی تعبیرات موجود ہیں جو جنگ بدر کے ساتھ کوئی مناسبت نہیں رکھتیں۔ دوسری تعبیر میں اس دن کی طرف ایک نئے انداز سے اشارہ کیا گیا ہے:

### یوم لا مردلہ من اللہ

”وہ دن کہ جس میں اللہ کی طرف سے واپسی نہیں ہے۔“ (شوری ۷۷)

نہ تو تلافی کا کوئی راستہ موجود ہے، نہ ہی اس دنیا میں پلٹنے کی کوئی راہ ہے اور نہ ہاتھ سے گئی چیزوں کے تدارک کا کوئی طریقہ ہے۔ بعض مفسرین سمجھتے ہیں کہ جملہ اس دن کے قطعی اور یقینی ہونے کی طرف اشارہ ہے چونکہ ارشاد ہے: ”خدا کی طرف سے اس دن واپسی نہیں ہے۔“ یعنی ایسا دن جو ضرور اور حتماً واقع ہونے والا ہے۔ اس تفسیر کے مطابق اس کا مفہوم قیامت کے بارے میں آنیوالے جملے (الاریب فیہ) کے نزدیک تر ہے۔ لیکن آیت کے بعد والے جملوں کے مطابق پہلی تفسیر مناسب دکھائی دیتی ہے اور وہ جملے یہ ہیں ”اس دن نہ تمہارے لیے کوئی پناہ گاہ ہے اور نہ کوئی دفاع کرنے والا۔“

اس احتمال کا بھی امکان ہے کہ اس سے مراد یہ ہو کہ اس دن کوئی اس امر کی طاقت نہیں رکھتا کہ عذاب الہی کو ٹال سکے اور یہ معنی آیت کے بعد والے حصے کے ساتھ زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔

ہم ان تفاسیر میں سے جس ایک کا بھی انتخاب کر لیں سختی اور سنگینی کا پیام ہمراہ لیے ہوئے ہے۔

### ۶۲- یوم یدع الداع الی شیء نکر

یہ نام جو قرآن میں ایک بار آیا ہے، سر بستہ اور خوفناک تعبیر ہے جو انسانی فکر کو اس دن کے حوادث کے بارے میں مختلف مسائل کی طرف متوجہ کرتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

### یوم یدع الداع الی شیء نکر

”اس دن کو یاد کرو جب خدائی دعوت دہندہ لوگوں کو ایسے وحشت ناک امر کی طرف دعوت دے گا جس سے لوگ بے خبر ہیں۔“ (قمر ۶)

اس بارے میں کہ یہ ”خدائی دعوت دہندہ“ کون ہے، مفسرین نے کئی ایک احتمالات کا ذکر کیا ہے۔ کیا وہ خود خدا ہے یا اس کے مقرب فرشتے مثلاً جبرائیل یا اسرافیل کہ جو صور پھونک کر لوگوں کو قیامت کی دعوت دیں گے۔ درج ذیل آیہ کو مد نظر رکھتے ہوئے پہلا معنی مناسب تر محسوس ہوتا ہے اگرچہ بعد والی آیات فرشتگان اور حساب و کتاب کے مامورین سے زیادہ مناسبت رکھتی ہی:

### يَوْمَ يَدْعُوكُمْ فَتَسْتَجِيبُونَ بِحَمْدِهِ

”یاد کرو اس دن کو جب خدا تمہیں (قبروں میں سے) بلائے گا اور تم اس کی حمد و ثناء کے ساتھ اس کی دعوت قبول کرو گے۔“ (بنی اسرائیل ۵۲)

”شیء نکر“ (ناشناختہ مطلب) سے کیا مراد ہے؟

کیا اس سے مراد وہ وحشت ناک عذاب ہیں جو انسان کے لیے ناشناختہ ہیں، یا پھر اعمال کا وہ دقیق ترین حساب کتاب جس کے اس حد تک دقیق ہونے میں کسی کو بھی یقین نہیں تھا، یا یہ سب کچھ مقصود ہے؟ البتہ جو بھی ہو یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو انتہائی وحشت ناک، خوف ناک اور بہت دردناک ہے۔

### ۶۷۔ یوم یسحبون فی النار علی وجوہہم

قیامت کے اس نام کا یہ خوف ناک پیغام واقعاً عجیب ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وہ دن جب مجرمین اوندھے منہ دوزخ کی آگ میں گھسیٹے جائیں گے اور ان سے کہا جائے گا جہنم کی آگ کا مزہ چکھو!

### يَوْمَ يُسْحَبُونَ فِي النَّارِ عَلَى وُجُوهِهِمْ ۖ ذُوقُوا مَسَّ سَقَرَ ۝۳۸ (قمر ۳۸)

ہم جانتے ہیں کہ چہرہ بدن کے لطیف ترین اور اہم ترین حصے میں سے ہے جس میں آنکھ، منہ اور ناک جیسے انتہائی اہم اعضاء موجود ہیں۔ دوسری طرف ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ دوزخ کی آگ اس دنیا کی آگ سے کہیں زیادہ ہے بلکہ یہ دنیاوی آگ تو اس کے سامنے ایک مذاق ہے۔

اب سوچیں (اگر کسی کو منہ کے بل اس آگ میں گھسیٹا جائے تو) کیا ہوگا؟ علاوہ ازیں یہ عمل خود غرض مستکبرین کی سخت تحقیر کی علامت ہے۔ اس طرح روحانی اور جسمانی ہر دو عذاب اس میں یکجا ہو جاتے ہیں۔

”سقر“ (بروزن سفر) خود دوزخ کے معنی میں ہے یا پھر اس کا وہ خاص حصہ مراد ہے جس کی تپش اور حرارت غیر معمولی ہے اور جو متکبروں کا ٹھکانا ہے؟ اس بارے میں دو احتمال موجود ہیں۔ دوسرے مطلب کی امام جعفر صادق علیہ السلام سے نقل ہونے والی حدیث تائید کرتی ہے۔ فرماتے ہیں:

”ایسا درہ ہے جو متکبرین کا ٹھکانا ہے اور یہ جب بھی سانس لیتا ہے تو دوزخ کو جلا دیتا ہے۔“ [۱]

## ۲۸۔ یوم نقول لجنہم هل امتلات

یہ تعبیر قرآن مجید میں ایک بار آئی ہے اور قیامت کے ناموں میں سے شمار ہوتی ہے۔ یہ بھی لرزادینے والی تعبیرات میں سے ایک ہے جو دوزخ کی وسعت اور جہنموں کی کثرت کی حکایت کرتی ہے، ایسی کثرت کہ جو ہر انسان کو خوف زدہ کر دیتی ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ بھی ان کے زمرے میں آجائے۔ فرماتا ہے:

يَوْمَ نَقُولُ لَجَنَّهُمْ هَلِ امْتَلَأَتْ وَتَقُولُ هَلْ مِنْ مَزِيدٍ ۝ (ق ۳۰)

”یاد کرو اس دن کو جب ہم جہنم سے کہیں گے کیا بھر چکی ہو؟ تو وہ کہے گی: کیا کچھ اور بھی ہے؟“

اس آیت کی تفسیر میں دوزاویہ نگاہ موجود ہیں۔ اول یہ کہ ممکن ہے یہ ”استفہام انکاری“ ہو۔ یعنی جہنم اس سوال کے جواب میں کہ آیا بھر چکی ہو؟ کہے گی: آیا کچھ اور بھی ہے؟ اشارہ ہو اس بات کی طرف کہ اب کوئی جگہ باقی نہیں بچی۔

دوم یہ کہ ممکن ہے استفہام تقریری (استفہام تقریری) ہو۔ یعنی کیا مزید افراد بھی ہیں کہ دوزخ میں آئیں اور اس طرح دوزخ بھوکے انسان کی طرح ہمیشہ زیادہ خوراک کا تقاضا کرتی ہے اور کبھی بھی سیر نہیں ہوتی اور دائماً تباہ کاروں اور ستم گروں کی تلاش میں ہے اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ نہ جہنم بدکاروں سے سیر ہوا ورنہ بہشت نیک لوگوں سے سیر ہو۔ لیکن بعض مفسرین نے اس تفسیر پر تنقید کی ہے کہ یہ مندرجہ ذیل آیت کے ساتھ موافق نہیں:

لَا مَلَكَ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ۝

”میں قسم کھاتا ہوں کہ دوزخ کو جن و انس سے بھر دوں گا۔“ (سجده ۱۳)

بنا برائیں پہلی تفسیر ہی مناسب نظر آتی ہے۔ [۱] اگرچہ اس اعتراض کا جواب بھی دیا جاسکتا ہے کہ پر ہو جانے اور بھر جانے کے بھی مختلف درجے ہیں، بالکل اس برتن کی مانند کہ جو خوراک سے پر ہو اور کسی دیا جائے تو وہ تقاضا کرے کہ اس کے اوپر کچھ اور ڈالا جائے۔ دوزخ کے ساتھ یہ سوال و جواب کیسے ہوں گے، بعض نے کہا ہے کہ سوال و جواب دوزخ کے داروغوں اور نگہبانوں سے ہوں گے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ سوال و جواب زبان حال کے ذریعے انجام پائیں گے۔ نیز جیسا کہ قرآن اور روایات کی بعض تعبیرات سے پتہ چلتا ہے دوزخ خود سے ایک زندہ وجود ہے اور گفتگو کرنے پر قادر ہے۔ بنا بریں آیت کی اس کے ظاہری مفہوم کے مطابق بھی تفسیر کی جاسکتی ہے۔ [۲] بہر حال آیت کا پیغام یہ ہے کہ جہنمی بہت زیادہ ہیں اور خداوند تعالیٰ کی دھمکی بھی قطعی و یقینی ہے اور ہر ایک کو خبردار کرتی ہے کہ

[۱] تفسیر فخر رازی، ج ۲۸ ص ۱۷۴، روح المعانی ج ۲۶ ص ۱۷۰، المیزان ج ۱۸ ص ۳۸۴۔ ان تفاسیر میں یہ اعتراض بعض مفسرین کی طرف سے نقل ہوا ہے۔

[۲] تفسیر روح البیان ج ۹ ص ۱۲۷ میں اس معنی سے متعلق مختلف آیات و روایات سے شواہد پیش کیے گئے ہیں۔

کہیں ایسا نہ ہو کہ ان افراد میں سے ایک تم بھی ہو۔ یہی اندیشہ انسان کو بیدار کر سکتا ہے، اسے ہوش میں لا کر بدیوں اور انحرافات جاری رکھنے سے روک سکتا ہے۔

## ۶۹۔ یوم یقول المنافقون والمنافقات...

روزِ قیامت کے بارے میں یہ تعبیر قرآن مجید میں صرف ایک بار استعمال ہوئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ”اس دن منافق مرد اور عورتیں بہت زیادہ دکھ اور حسرت کے ساتھ مومنین سے کہیں گے: ہم پر بھی ایک نگاہ ڈالو تا کہ ہم بھی تمہارے نور میں سے کوئی شعاع لے لیں (یا موقع دیں تا کہ ہم بھی تمہارے نور کی شعاعوں میں حرکت کر سکیں) یَوْمَ يَقُولُ الْمُنْفِقُونَ وَالْمُنْفِقَاتُ لِلَّذِينَ آمَنُوا انظُرُوا نَفْسًا نَّظِيرَنا مِنْ نُّورِكُمْ ؕ (حدید ۱۳)

یہ ایسی حالت میں ہے کہ جب با ایمان مرد اور عورتیں راہِ محشر کو بہشت کی طرف جلدی کے ساتھ طے کر رہے ہوں گے، ایسی حالت میں جب ان کے ایمان کا نور ان کے آگے سے اور دائیں طرف سے ان کے ساتھ حرکت کرے گا اور فرشتے انہیں جنت کی خوشخبری دیں گے۔

یَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ يَسْعَى نُورُهُمْ بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَبِأَيْمَانِهِمْ

بَشِّرْكُمْ الْيَوْمَ جَنَّاتٍ..... (حدید ۱۲)

لیکن منافقین مودبانہ انداز میں مایوسی کے ساتھ ان کی طرف دیکھیں گے اور اپنے اس تقاضا کے جواب میں سنیں گے کہ پلٹ جاؤ اور کسب نور کرو۔

قِيلَ ارْجِعُوا وَرَاءَكُمْ فَالْتَمِسُوا نُورًا ۖ (حدید ۱۳)

قیامت اور میدانِ محشر کسب نور کی جگہ نہیں۔ اس کی جگہ تو دنیا تھی۔ اگر تم جاسکتے ہو تو وہاں پلٹ جاؤ اور ایمان اور عمل صالح کے پر فروغ چراغ سے اپنے لیے نور اور روشنی حاصل کر لو۔

کس قدر دردناک ہے ظلمتوں میں پڑے اندھے دل اور تاریک فکر۔ ان منافقوں کی حالت جب کہ نورِ ایمان اور عمل صالح کس قدر خوبصورت ہے اور کتنا اہم پیغام ان دو گروہوں کی حالت کے فرق میں ہمارے آج کے لیے بیان کیا گیا ہے۔

## ۷۰۔ لیوم لا ریب فیہ

روزِ قیامت کے لیے آخری اور سترواں توصیفی نام یہی متذکرہ بالا تعبیر ہے جو سورہ آل عمران میں دوبار ذکر ہوئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

رَبَّنَا إِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَا رَيْبَ فِيهِ ۖ

”راخِ اعلم مومنین خدا کی بارگاہ میں عرض کرتے ہیں: خدا یا تو ہی لوگوں کو اکٹھا کرنے والا ہے اس دن کہ جس

میں کوئی شک و شبہ نہیں۔“ (آل عمران ۹)

اس سورت کی آیت ۲۵ میں بھی یہ تعبیر کلام پروردگار میں ذکر ہوئی ہے۔ فرماتا ہے:

**فَكَيْفَ إِذَا جُمِعْتُمْ لِيَوْمٍ لَا رَيْبَ فِيهِۖ**

”پھر کیسا ہوگا؟ جب ہم انہیں جمع کریں گے اس دن کہ جس میں کوئی شک و شبہ نہیں۔“

چونکہ قرآن مجید کی نگاہ میں قیامت کے قطعی ہونے سے متعلق بحث کے بارے میں بقدر کافی آیات (اسی جلد میں) بیان کی جا چکی ہیں۔ لہذا اب ہم اس کے تکرار کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ فقط اس ایک نکتہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ اس دن کے قطعی و یقینی ہونے اور اس دن سے متعلق مختلف خدائی وعدے نہ فقط کلام خداوندی میں مسلم اور ہر قسم کے شک و شبہ سے خالی ہیں بلکہ وہ تمام افراد جو اسخ الایمان ہیں، وہ بھی اس کا اعتراف کرتے ہیں اور یہ ایک ایسی بات ہے جس پر سب متفق ہیں۔ قیامت کے باقی نام اس دن پیش آنے والے مختلف حوادث اور واقعات کی خبر دیتے ہیں جب کہ یہ نام قیامت کے قطعی اور یقینی ہونے کی خبر دیتا ہے۔ درحقیقت یہ ان سب کے لیے تاکید ہے۔ اسی دلیل کی بنا پر ہم نے ناموں کے اس سلسلے میں اس کو آخری عنوان کے طور پر منتخب کیا ہے۔

یہ نکتہ قابل ذکر ہے کہ جب مومنین اس عنوان کے ساتھ اس دن کے بارے میں خبر دیتے ہیں تو اس کی دلیل بھی بارگاہ خداوندی میں پیش کرتے ہیں، جیسا کہ پہلی آیت کے ذیل میں بیان ہوا ہے:

**ان الله لا يخلف الميعاد**

”کیونکہ خدا اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔“

یہی دلیل ہے اس دن کے قطعی ہونے کی اور اس میں کسی قسم کا شک و شبہ نہ ہونے کی۔

## نتیجہ بحث

”قرآن میں قیامت کے نام“ کے موضوع پر وسیع گفتگو سے یہ بات واضح ہوئی کہ یوم قیامت کے قرآن میں کم از کم ستر نام ہیں۔ البتہ نام سے یہاں مراد اسم خاص (جسے ادبیات عرب میں ”علم“ کہتے ہیں) نہیں بلکہ وہ توضیحات جو قیامت کے بارے میں قرآن میں آئی ہیں اور کلمہ ”یوم“ سے ان کا آغاز ہوتا ہے، اس میں شامل ہیں۔

تاہم ان ناموں کو ہم نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

۱۔ وہ نام جو صرف ایک لفظ کے ذریعہ خبر دیتے ہیں۔ مثلاً: یوم البعث یوم القيامة، یوم الدين اور یوم الحساب۔ ایسے کل ۲۴ نام ذکر کیے گئے ہیں۔

۲۔ وہ نام جن میں جملے کی صورت میں قیامت کی توصیف کی گئی ہے۔ چوبیس کے علاوہ باقی نام اسی نوعیت کے ذکر کیے



گئے ہیں۔

یہ ستر نام بہت ہی مفید اور معنی خیز ہیں۔ یہ حقیقت روز قیامت کو دیکھنے کے لیے ستر درپچے ہیں۔ ان میں اس دن کے تمام حوادث کی نشاندہی کی گئی ہے۔ مردوں کے زندہ ہونے سے لے کر اہل بہشت کے بہشت میں اور اہل دوزخ کے دوزخ میں جانے تک کے احوال کی طرف ان میں اشارے موجود ہیں۔

یہ ستر نام اس یوم عظیم کا عجیب، ہلادینے والا، واضح اور منہ بولتا نقشہ پیش کرتے ہیں۔ ان میں کہنے کی سب باتیں ہیں اور یہ اس روز مقامات محشر میں سب انسانوں کے انجام کی وضاحت کرتے ہیں۔

ممکن نہیں کہ انسان ان سب ناموں پر غور کرے، انہیں قبولیت کی نظر سے دیکھے اور اس پر غیر معمولی تربیتی اثر نہ ہو۔

درحقیقت مقصد بھی یہی تھا کہ ان تعبیرات کے ذریعے انسان کو بیدار کیا جائے جن میں سے ہر ایک ایک خاص زاویے سے معاد کی تفسیر پیش کرتی ہے۔ مقصد یہ تھا کہ گمراہی سے راہ کی طرف دعوت دی جائے۔ آلودگی سے پاکیزگی، دنیا پرستی سے زہد، فسق سے تقویٰ، ظلمت سے نور، کفر سے ایمان اور شرک سے توحید کی طرف بلایا جائے۔ واقعاً قرآن مجید عجیب سبق آموز کتاب ہے اور اس کا عجیب تربیتی اور حساب شدہ لائحہ عمل ہے۔

ان ناموں کو ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر ایک بار پھر چشم دل سے دیکھیں۔ اس کے ایک ایک حصے پر رکیں اور دیکھیں کہ کیا کہہ رہا ہے اور کیا چاہ رہا ہے اور انسان کے انجام کی کیا تصویر پیش کر رہا ہے؟ پھر اس سے اپنے لیے تربیتی درس حاصل کریں۔

خداوند! ہمیں ایسا ادراک اور ایسی نگاہ عطا فرما کہ ہم آج ہی اس یوم عظیم کو ان مختلف زاویوں سے دیکھ سکیں جو تو نے قرآن میں بیان فرمائے ہیں۔

ان آیات کے پیغام کو سن سکیں۔

ان ناموں کا مفہوم یاد رکھ سکیں۔

اور اس یوم عظیم کے لیے تیار ہو سکیں۔ امین یا رب العالمین

یہ بحث ہم اس سلسلے میں ایک نکتہ پرداز اشعار کے شاعر پر ختم کرتے ہیں:

زخمہ بر ساز دل آدم زند  
از قیامت گوید و احوال آن  
آنچہ می گوید بہ گوش جان شنو  
گوش کن غوغای محشر آشکار  
یا کہ ”تکویر“ و ”قیامت“ ”واقعہ“  
خود ”قیامت“ ز آن سخن برپا کند

بشنواز قرآن چہ نیکو دم زند  
تا کند بیدارش از خواب گران  
باسکو تت نغمہ ی قرآن شنو  
از ”مزل“ از ”نبا“ از ”انفطار“  
سورہ ”زلزال“ و ”طور“ و ”قارعہ“  
چونکہ ہر یک وصف ”محشر“ را کند



این زمین، درآن زمان پر بلا  
از درویش ”اخرجت ائقالها“  
مردگان خیزند برپا ”کلهم“  
هر که دارد ”ذرة خیر ایره“  
آن زمان، خورشید تابان ”کورت“  
آباردر کام دریا ”سجرت“  
پس درآن هنگام ”جنت از لفت“  
نامه کردار و گفتار بشر  
نامه ای باجان او آمیخته  
نامه یا نقش دقیق نفس او  
نامه رد یا قبول بندگی  
حکم عزت یا عذاب هرکس است

### منظومہ ترجمہ

ساز قلب آدمی کو چھیڑ کر  
خواب غفلت سے جگانے کے لیے  
خامشی سے نغمہ قرآن سنو  
از ”زلزال“ از ”نباء“ از ”انفطار“  
سورہ ”زلزال“ و ”طور“ و ”قارعة“  
اس طرح ہے حال محشر کہہ رہا  
یوں زمین پر آئے گا دورِ بلا  
یوں یہ دھرتی ”اخرجت ائقالها“  
اٹھ پڑیں گے مرنے والے ”کلهم“

ناگہاں چوں ”زلزلت زلزالها“  
با تعجب ”قال الانسان مالها“  
تاہمہ مردم ”یروا اعمالهم“  
یا کہ آرد ”ذرة شرایره“  
کوہہای سخت و سنگین ”سیرت“  
آتش دوزخ بشدت ”سعرت“  
خود بدانند ہر کسی ”ما احضرت“  
خود بود روشنگر ہر خیر و شر  
می شود برگردش آو بینتہ  
یا کہ از ہر لحظہ عمرش عکس او  
باسر افزائی، و یا شرمندگی  
خود نمودارِ حسابِ ہرکس است ﴿٣١﴾

کچھ کہے قرآن، ذرا تو کان دھر  
وحشت محشر بتانے کے لیے  
کہہ رہا ہے جو، بہ گوش جاں سنو  
شور محشر کس قدر ہے آشکار  
یا کہ ”تکویر“ و ”قیامت“، ”واقعہ“  
کہ سخن سے خود قیامت ہو بپا  
ہوگی یک دم ”زلزلت زلزالها“  
ہو کے حیراں ”قال الانسان مالها“  
لوگ سب تاکہ ”یروا اعمالهم“

ہوگا جس کا ”ذرة خیر ایرہ“  
 اس گھڑی خورشید تاباں ”کورت“  
 سارے دریاؤں کا پانی ”سجرت“  
 ایسے عالم میں کہ ”جنت ازلفت“  
 نامہ کردار و گفتار بشر  
 نارجس میں جان انسان گندھ گئی  
 زندگی کا ہر نفس تحریر ہے  
 نامہ رد یا قبول بندگی  
 اس کے حصے میں ہے عزت یا عذاب

یا کہ ہوگا ”ذرة شر ایرہ“  
 کوہسار اتنے گراں بھی ”سیرت“  
 آگ دوزخ کی بھدت ”سعرت“  
 جان لے ہر کوئی خود ”ماحضرت“  
 ہوگا کامل ترجمان خیر و شر  
 اس کے حلقے میں ہے گردن آدمی  
 عمر کے ہر لحظے کی تصویر ہے  
 باسرافرازی، ویاشرمندگی  
 اس میں بالکل ہے نمایاں ہر حساب

۱۱ ۱۲ ۱۳

۱۱ اس منظوم ترجمے میں جن مصرعوں کے اردو ترجمے کی ضرورت نہ تھی انہیں من وعن نقل کر دیا گیا ہے۔ نیز شعری تقاضوں کی وجہ سے بعض مصرعوں کے صرف مفہوم کو منتقل کیا گیا ہے۔ (مترجم)

## دلائل معاد

### عناوین

معارف دینی کے اعتبار سے اور تربیتی اثر کے حوالے سے قرآن مجید نے معاد کو جو غیر معمولی اہمیت دی ہے اس کے پیش نظر معاد کے دلائل بیان کرنے کے لیے اس نے بہت سی آیات مختص کی ہیں۔  
یہ دلائل درحقیقت دو اہم حصوں میں تقسیم ہوتے ہیں:

### پہلا حصہ

یہ حصہ ایسے دلائل پر مشتمل ہے جو وقوع معاد اور حیات بعد از ممات کو مختلف طریقوں سے ثابت کرتے ہیں۔

### دوسرا حصہ

اس میں ایسے دلائل ہیں جو دراصل مخالفین کے اعتراضات کا جواب ہیں۔ یعنی وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ تجدید حیات محال ہے اور وہ مختلف تعبیرات کے ذریعے اسے غیر ممکن ظاہر کرتے ہیں۔  
قرآن مجید نے ان کے سامنے عقلی اور حسی و تجربی دلائل پیش کیے ہیں اور ان کے محال ہونے کے دعویٰ کے جواب میں امکان معاد کو بڑی وضاحت سے ثابت کیا ہے۔

بحث کی طبعی تربیت کا تقاضا ہے کہ پہلے ہم امکان معاد کے دلائل کو زیر بحث لائیں اور انکارِ مطلق کے مرحلے سے امکانِ مطلق کے مرحلے کی طرف قدم اٹھائیں۔ بعد ازاں ان دلائل کا ذکر کریں جو لزوم معاد اور وقوع معاد کو ثابت کرتے ہیں تاکہ اس طریقے سے ہم صحیح اور منطقی طور پر معاد کی حقیقت اور اس کے مختلف مراحل سے آشنا ہو سکیں۔

جس نکتے کا یہاں پر تاکید کے ساتھ ذکر ضروری ہے وہ یہ ہے کہ امکان معاد کے بارے میں قرآن کی تمام تر گفتگو ان لوگوں کے بالمقابل ہے جو معاد جسمانی کے منکر تھے اور قرآن اس امر پر تاکید کرتا ہے کہ جہان دیگر میں روح اور جسم دونوں کی باہم بازگشت کا لاممکن ہے کیونکہ اس کے مختلف نمونے ہمیں اس دنیا میں اپنی آنکھوں سے دکھائی دیتے ہیں۔

بہر حال قرآن اس حوالے سے جو راہیں اختیار کرتا ہے وہ بہت متنوع اور دلکش ہیں۔ ان کا خلاصہ چھ عناوین کے تحت یوں کیا جا

سکتا ہے:

۱۔ جہان اور انسان کی اولین خلقت سے متعلق آیات۔

- ۲۔ قدرت الہی کے ہمہ گیر ہونے سے متعلق آیات۔
  - ۳۔ زمینوں کے زندہ ہونے سے متعلق آیات۔
  - ۴۔ جنین کے تغیرات کے بارے میں آیات۔
  - ۵۔ توانائیوں کی بازگشت کے بارے میں آیات۔
  - ۶۔ ایسی آیات جو اس دنیا میں معاد کے عینی و تاریخی نمونے پیش کرتی ہے۔
- اس سے پہلے کہ یہ واضح ہو کہ قرآن کن لوگوں سے مخاطب ہے اور آیات میں کیا نقطہ نظر پیش کیا گیا ہے، ضروری ہے کہ معاد کے مخالفین کی منطق کو آیات قرآن کے حوالے سے پیش کریں۔ یہی منطق آج بھی دہرائی جاتی ہے اور مخالفین آج بھی اس کا سہارا لیتے ہیں۔ اس وضاحت کے ساتھ ہم امکان معاد کے بارے میں گفتگو کا آغاز کرتے ہیں اور پہلے منکرین کی منطق اور طرز تفکر کا ذکر کرتے ہیں۔

## ۱۔ امکان معاد اور منطق مخالفین

اشارہ

ہم کہہ چکے ہیں کہ قرآن مجید اس مسئلے میں فکری فضا ہموار کرنے کے لیے پہلے امکان معاد کے موضوع پر بات کرتا ہے اور پھر مذکورہ چھ مختلف طریقوں سے اس کا اثبات کرتا ہے۔ بعد ازاں وقوع معاد کے دلائل شمار کرتا ہے۔ شاید اس امر کے ذکر کی ضرورت ہو کہ مخالفین معاد کے پاس اپنے مقصد کے اثبات کے لیے کوئی خاص عقلی و منطقی دلیل نہیں ہے۔ وہ عام طور پر اپنی بالکل عامیاندہ بنیت کی وجہ سے صرف اس بات کا سہارا لیتے ہیں کہ تجدید حیات بعد از امکان ہے، یہاں تک کہ حیات بعد از ممات کے نظریہ کو پاگل پن کی علامت، یا خدا پر الزام قرار دیتے ہوئے اس نظریے کے حامل افراد کا تمسخر اڑاتے ہیں۔ اس کے بعد ہم قرآن کی طرف لوٹتے ہیں اور مندرجہ ذیل آیات کو گوش جان سے سنتے ہیں:

(۱) وَقَالُوا ءِذَا كُنَّا عِظَامًا وَرُفَاتًا ؕ اِنَّا لَمَبْعُوثُونَ خَلْقًا جَدِيدًا ﴿۴۹﴾ (بنی

اسرائیل ۴۹)

(۲) وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا هَلْ نَدُلُّكُمْ عَلَىٰ رَجُلٍ يُنْبِئُكُمْ اِذَا مُرِّقْتُمْ كُلَّ

مُرِّقٍ ۚ اِنَّكُمْ لَفِي خَلْقٍ جَدِيدٍ ﴿۵۰﴾ اَفْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَمْ بِهِ جِنَّةٌ ۚ (سبا ۵۰)

(۳) وَقَالُوا إِذَا ضَلَلْنَا فِي الْأَرْضِ أَأَنَّا لَفِي خَلْقٍ جَدِيدٍ ۖ (السجدة: ۱۰)  
 (۴) وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِذَا كُنَّا تُرَابًا وَآبَاءُنَا إِنَّا لَمُخْرَجُونَ ۖ لَقَدْ وَعَدْنَا  
 هَذَا نَحْنُ وَآبَاؤُنَا مِنْ قَبْلُ ۚ إِنْ هَذَا إِلَّا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ ۖ (النمل: ۶۴، ۶۵)  
 (۵) فَقَالَ الْكَافِرُونَ هَذَا شَيْءٌ عَجِيبٌ ۖ إِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ۚ ذَلِكْ رَجْعٌ  
 بَعِيدٌ ۖ

(ق: ۲، ۳)

(۶) أَيْعِدُكُمْ أَنَكُمْ إِذَا مِتُّمْ وَكُنْتُمْ تُرَابًا وَعِظَامًا أَنَّكُمْ مُخْرَجُونَ ۖ  
 هِيَ هَاتِ هَٰهْنَا لِمَا تُوْعَدُونَ ۖ إِنْ هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا  
 نَحْنُ بِمَبْعُوثِينَ ۖ

(مومنون: ۳۵ تا ۳۷)

(۷) إِنَّ هَٰؤُلَاءِ لَيَقُولُونَ ۖ إِنْ هِيَ إِلَّا مَوْتَتُنَا الْأُولَىٰ وَمَا نَحْنُ بِمُنْشَرِينَ ۖ (الذخار

(۳۵، ۳۶)

ترجمہ

(۱) اور کہنے لگے کہ جب ہم بوسیدہ ہڈیاں ہو جائیں گے اور بکھر جائیں گے تو کیا پھر ہماری خلقت جدید ہوگی؟  
 (۲) کافروں نے کہا: کیا ہم تمہیں ایک ایسے شخص کا پتہ بتائیں جو خبر دیتا ہے کہ جب تم بالکل پراگندہ ہو جاؤ گے تو  
 پھر تمہاری خلقت جدید ہوگی؟ کیا وہ اللہ پر جھوٹ باندھتا ہے یا پھر کسی دیوانگی کا شکار ہے؟ (ایسا نہیں ہے) بلکہ  
 جو آخرت پر ایمان نہیں لاتے وہ عذاب اور پرلے درجے کی گمراہی میں ہیں (اور ان کی گمراہی کا ثبوت یہی ان  
 کا شدید انکار ہے)۔

[۱] اس ضمن میں متعدد آیات اور بھی موجود ہیں جن کا مضمون مندرجہ بالا آیات کے قریب قریب ہے۔ مثلاً: واقعہ ۷۷ و ۷۸، صافات ۵۳

- (۳) انہوں نے کہا: کیا جب ہم مرجائیں گے اور زمین میں کھو جائیں گے تو حیات نو پائیں گے؟
- (۴) کافر کہنے لگے: کیا جب ہم اور ہمارے آباء خاک ہو جائیں گے تو پھر ہمیں نکالا جائے گا؟ یہی وعدہ ہم سے اور ہمارے آباء سے قبل ازیں بھی کیا جاتا رہا ہے۔ یہ تو سب پہلوؤں کے افسانے ہیں۔
- (۵) اور کافروں نے کہا: یہ عجیب چیز ہے۔ کیا جب ہم مرجائیں گے اور خاک ہو جائیں گے تو پھر سے زندگی پائیں گے؟ یہ بازگشت تو بہت بعید ہے۔
- (۶) کیا وہ تم سے وعدہ کرتا ہے کہ جب مرجائے گا، خاک اور ہڈیوں میں بدل جائے گا، تو پھر تمہیں نکالا جائے گا؟ پناہ ہے۔ پناہ ہے ایسے وعدوں سے جو تم سے کیے جاتے ہیں۔ ہماری حیات اس حیات دنیوی کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ ہمیشہ ہم میں سے کچھ لوگ مرتے رہتے ہیں اور ان کی جگہ دوسری نسل لے لیتی ہے۔ ہمیں پھر سے نہیں اٹھایا جائے گا۔
- (۷) یہ (مشرکین) کہتے ہیں کہ ہماری موت اسی پہلی موت کے علاوہ کچھ نہیں اور ہم ہرگز پھر سے زندہ نہ ہوں گے۔

## تفسیر و جمع بندی آیات

### کیا خاک پھر سے انسان ہو جائے گی؟

ہرچند ان آیات کے مضامین ایک دوسرے سے مشابہ ہیں لیکن ان کی تعبیرات اور مفہیم میں فرق قابل غور ہے۔ پہلی آیہ میں مشرکین عرب کی طرف اشارہ ہے۔ فرماتا ہے: انہوں نے کہا کہ جب ہم بوسیدہ ہڈیاں ہو جائیں گے اور بکھر جائیں گے تو کیا ہماری خلقت جدید ہوگی۔ (وقالوا اذا كنا عظاما ورفاتا اناللمبعوثون خلقا جديدا) کیونکہ ممکن ہے کہ انسان کا گوشت خاک ہو جائے، ہڈیاں بکھر جائیں اور اس کا ہر ذرہ ادھر ادھر بکھر جائے، پھر اسے جمع کیا جائے اور لباس حیات پہنایا جائے؟ مشیت بھر بوسیدہ اور بکھری ہوئی ہڈیاں کجا اور ایک زندہ و محترک اور قوی انسان کجا؟

”رفات“، ”رفت“ (بروزن، نفث) کے مادہ سے ہے جس کا معنی ہے چور چور کرنا۔ بعض نے لپیٹنا کو بھی اس کے معانی کا جزو شمار کیا ہے۔ بعض کا کہنا ہے کہ ”رفات“ انتہائی چھوٹے بوسیدہ اور کہنہ ذرات کے معنی میں ہے۔ یہ ایک ایسی حالت ہے کہ جو ہڈیاں سالہا سال گزرنے کے بعد اختیار کرتی ہیں۔ بعض سمجھتے ہیں کہ اس کا اصل مفہوم یہ ہے کہ ایک ایسی حالت جو کہنہ و شکستہ ہونے کی بنا پر پیدا ہوتی ہے۔ یہ

تفسیریں آپس میں بہت زیادہ شبہات کی حامل ہیں۔<sup>[۱]</sup>

”روح المعانی“ کی روایت کے مطابق یہ جو بعض مفسرین نے اسے خاک، غبار یا ایسی چیز جسے غیر معمولی طور پر کوٹا اور نرم کیا گیا ہو، کے معنی میں تفسیر کیا ہے۔ یہ درحقیقت اسی کا ایک مصداق ہے۔

## عقل انسان ایسا نہیں کہہ سکتا؟

دوسری آیت میں مشرکوں کا سخت تر اور مغرور تر لہجہ ترسیم کیا گیا ہے۔ فرماتا ہے: کافروں نے کہا: کیا ہم تمہیں ایسے شخص کا پتہ بتائیں جو ہمیشہ تمہیں خبر دیتا ہے کہ جب تم بالکل بکھر جاؤ گے تو حیات تازہ پاؤ گے؟“ (وقال الذین کفرو اهل ندکم علی رجل ینبئکم اذا مزلتکم کل حمزق انکم لفی خلق جدید)

”کیا وہ خدا پر جھوٹ باندھتا ہے (کیونکہ کہتا ہے کہ یہ خبر اللہ کی طرف سے ہے) یا پھر کسی جنون میں مبتلا ہے؟“ (لہذا دیوانگی کی باتیں کرتا ہے) (افتویٰ علی اللہ کذباً اور بہ جنت)

اسی طرح سے وہ رسول خدا کی طرف سے معاد جسمانی کی خبر دینے کو دو امور میں سے کسی ایک کا نتیجہ سمجھتے تھے اور کہتے تھے: یا وہ عاقل اور سمجھدار ہے لیکن سوء استفادہ کے لیے ان باتوں کو جھوٹ موٹ خدا کی طرف منسوب کرتا ہے تاکہ لوگوں کو اپنے گرد جمع کر سکے، یا پھر اس کا کوئی مقصد اور غرض نہیں اور نعوذ باللہ جنون میں مبتلا ہے۔ کیا کوئی عاقل ایسا کہہ سکتا ہے کہ بوسیدہ ہڈیاں اور وہ بھی پرانگندہ خاک، جس کے ذرات موج ہوا کے دوش پر سوار ہو کر ادھر ادھر بکھر چکے ہیں، ایک روز جمع ہو جائیں گے اور از سر نو زندہ ہو جائیں گے؟

دل کے اندھے یہ مغرور جو اس پر بھی تیار نہ تھے کہ پیغمبر اکرم کو ”رجل“ (ایک اجنبی آدمی) کے بجائے کسی نام سے یاد کرتے، اپنی آغا خلقت کو بالکل بھول چکے تھے۔ جہل و غرور کے پردوں نے ان سے حقیقت بینی کو اس طرح چھین لیا تھا کہ وہ اپنی روزمرہ کی زندگی میں رونما ہونے والے معاد کے واقعات کو بھی نہ دیکھ پاتے تھے۔ ان کی وضاحت انشاء اللہ ان آیات کے ذکر کے بعد آئے گی۔

”مزقتم“ ”تمزیق“ کے مادہ سے پارہ پارہ اور ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے معنی میں ہے، یہاں یہ لفظ انسانی وجود کے ذرہ ذرہ ہو کر خاک، آب اور ہوا میں بکھر جانے کے معنی میں ہے۔

اس ضمن میں تیسری آیت میں ایک نئی تعبیر دیکھنے کو ملتی ہے۔ فرماتا ہے: مشرکین نے کہا: ”جب ہم زمین میں گم ہو چکے ہوں گے تو کیا پھر سے حیات نو پائیں گے؟“ (وقالوا اذا ضللنا فی الارض انا لفی خلق جدید)۔ زمین میں گم ہو جانے کی تعبیر ایک تو انسانی بدن کے اجزاء کے خاک ہو جانے اور زمین کے ہمشکل ہو جانے کی طرف اشارہ ہے اور دوسرا اس کا دنیا کے مختلف حصوں میں اس طرح بکھر جانے کی طرف اشارہ ہے کہ اصلاً پہچانا نہ جاسکے۔ اس طرح وہ چاہتے تھے کہ یہ ثابت کریں کہ ایسی بازگشت محال ہے۔

[۱] مفردات راغب، مقائیس اللغۃ، التحقیق و تفسیر روح المعانی

حالانکہ بالکل یہی مسئلہ انسانی خلقت کے آغاز میں پیش آچکا ہے جہاں طبیعت میں بکھرے ہوئے ذرات خدائی قدرت سے اکٹھے ہوئے اور انسانی معرض وجود میں آیا (اور کسی چیز کے امکان پر بہترین دلیل اس کا واقع ہونا ہے)۔

## یہ سب افسانے ہیں؟

چوتھی آیت میں یہی بات کچھ اضافوں کے ساتھ نظر آتی ہے۔ فرماتا ہے: کافروں نے کہا: ”کیا جب ہم اور ہمارے آباء خاک ہو جائیں گے تو پھر زندہ انسانوں کی صورت میں خاک سے نکلیں گے؟ یہ تو ایک (جھوٹا) وعدہ ہے جو ہم سے اور ہمارے آباء سے کیا جاتا رہا ہے۔ یہ سب پہلوں کے افسانے ہیں (وقال الذین کفروا اذا کننا ترابا و اباونا اثنا لمخرجون۔ لقد وعدنا هذا نحن و اباونا من قبل ان هذا الا اساطیر الاولین) [۱]

اس تعبیر سے بخوبی یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ مسئلہ معاد اور وہ بھی جسمانی صورت میں، قرآن اور شریعت اسلام سے مختص نہیں بلکہ گذشتہ انبیاء نے بھی اس کی خبر دی ہے لیکن امتوں کے سرپھروں نے بعض وجوہ کی بنیاد پر کہ جن کا ذکر انشاء اللہ بعد میں آئے گا، اس حقیقت کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کیا اور وہ اسے عقل و منطق سے دور خرافات اور افسانہ قرار دیتے رہے۔

اس تعبیر میں درحقیقت انکارِ معاد کے لیے انہوں نے دو چیزوں کا سہارا لیا ہے۔ ایک تو یہ کہ بعید نظر آتا ہے کہ خاک پھر سے لباسِ حیات پہن لے۔ دوسرا یہ کہ چونکہ سب انبیاء نے اپنی امتوں سے ایسا وعدہ کیا، لیکن اس نے کبھی عملی شکل اختیار نہیں کی، یہ اس امر کی دلیل ہے کہ یہ بات ایک افسانے سے زیادہ کچھ نہیں۔ (گویا ان کا خیال یہ تھا کہ قیامت فوراً برپا ہو جائے گی اور اگر نہ ہو تو پھر یقیناً جھوٹ ہے)۔

پانچویں آیت میں اسی انکار اور اس عقیدے کو بعید قرار دینے کے لیے کافروں کی ایک اور تعبیر مذکور ہے۔ فرماتا ہے: کافروں نے کہا: یہ ایک عجیب چیز ہے! کیا جب ہم مرجائیں گے اور مٹی ہو جائیں تو پھر زندہ ہوں گے؟ یوں لوٹ آنا تو عجیب ہے۔ (فقال الکافرون هذا شیء عجیب اذا متنا و کننا ترابا ذلک رجع بعید)۔ [۲]

[۱] ”اساطیر“ ”اسطورہ“ کی جمع ہے۔ بعض اہل لغت کا کہنا ہے کہ یہ ”اسطار“ کی جمع ہے جو خود ”سطر“ کی جمع ہے اور اس کا معنی ایسی چیز ہے جو جھوٹ لکھی گئی ہو۔ بعض کا کہنا ہے کہ چونکہ ”اسطورہ“ مزید فیہ کے صیغوں میں سے ہے اس لیے سطر طبعی کے زیادہ ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ اس لیے یہ ”سطر مجہول“ کے معنی میں ہے۔ بہر حال ”اسطورہ“ باطل، بے بنیاد اور خرافات پر مبنی مطالب کے معنی میں ہے۔ (مقائیس، مفراوت، مصباح اللغہ و التحقیق)

[۲] بعض مفسرین نے کلمہ ”رجع“ اور ”رجوع“ کو ایک ہی معنی میں لیا ہے، جیسے تفسیر المیزان میں ہے، جب کہ بعض کا خیال ہے کہ ”رجع“ متعدی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور ”رجوع“ لازم کے معنی میں۔ (روح البیان ج ۹ ص ۱۰۳) تفسیر فخر الدین رازی میں بھی آیا ہے کہ ان دونوں میں تفاوت موجود ہے، البتہ زیر بحث آیت میں دونوں معانی کی صلاحیت موجود ہے۔ (ج ۲۸ ص ۱۵۲)



اس طرح انہوں نے شروع کلام ہی میں اسے ”عجیب“ قرار دے دیا اور آخر کلام میں ”بعید“ کہہ دیا، بغیر اس کے کہ اپنی خلقت کے بارے میں غور کریں اور دیکھیں کہ یہ ”عجیب و بعید“ بات تو ان کی ابتدائے خلقت میں بخوبی رونما ہو چکی ہے بلکہ جیسا کہ ہم واضح کریں گے کہ معاد اور تجدید حیات کو ہم ہمیشہ اپنی ان آنکھوں سے اسی زندگی میں دیکھتے رہے ہیں اور دیکھتے رہتے ہیں، کس قدر عجیب و بعید ہے؟

چھٹی آیت میں ہمارا سامنا مخالفین کے اسی انکار سے کسی اور پیرائے میں ہوتا ہے۔ وہ اپنے دوستوں اور ساتھیوں سے بحث کرتے ہوئے پوری قاطعیت اور جسارت سے کہتے ہیں: کیا یہ جو تم جیسا انسان ہے تم سے وعدہ کرتا ہے کہ جب مر جاؤ گے، بالکل مٹی اور ہڈیاں ہو جاؤ گے تو (قبروں سے) نکالے جاؤ گے؟ پناہ ہے، پناہ ہے ان وعدوں سے جو تم سے کئے جاتے ہیں۔ (ایعد کم انکم اذا متم وکتم ترابا و عظاما انکم مخرجون ہیہات ہیہات لما توعدون)

پھر یہ کوردل کسی استدلال کی ضرورت محسوس کئے بغیر بڑی قاطعیت سے مزید کہتے ہیں: اس حیات دنیا کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔ ہمیشہ ہم میں سے کچھ لوگ مرتے رہتے ہیں ان کی جگہ ایک اور نسل آ جاتی ہے اور ہمارے لیے کوئی معاد ہے ہی نہیں، (ان ہی الا حیاتنا الدنیا نموت و نحیا و ما نحن بمبعوثین)۔

”وہ تو صرف ایک جھوٹا آدمی ہے کہ جس نے اللہ پر جھوٹ باندھا ہے اور ہم اس پر ہرگز ایمان نہ لائیں گے۔“ (ان هو الا رجل افتری علی اللہ کذبا و ما نحن له بمومنین)۔

ہٹ دھرم منکروں کا معاد کے خلاف یہ شدید ترین لہجہ ہے بغیر اس کے کہ وہ حیات انسانی کے فلسفے کے بارے میں غور و فکر سے کام لیں اور سوچیں کہ کیا ممکن ہے کہ مصائب و مشکلات سے بھری یہ چند روزہ زندگی تخلیق انسانی کا اصلی ہدف ہو؟ انہوں نے احکام الہی کے فلسفے پر بھی غور نہیں کیا کہ کیا یہ ممکن ہے کہ خدائے عادل اچھوں اور بروں کے ساتھ ایک سا سلوک کرے؟ نہ اس دنیا میں ان کے لیے کوئی خاص فرق ہو اور نہ دوسرے جہان میں۔ اسی طرح انہوں نے اپنی ابتدائے آفرینش پر بھی غور نہ کیا کہ پہلے بھی وہ خاک اور منتشر ذرات ہی تھے۔

آیت مبارکہ میں ”تراب“ کو ”عظام“ پر (یعنی مٹی کو ہڈیوں پر) مقدم رکھا گیا ہے جب کہ انسانی جسم پہلے بوسیدہ ہڈیوں میں اور پھر خاک میں تبدیل ہوتا ہے۔ ممکن ہے یہ اس لیے ہو کہ ”تراب“ گوشت کی طرف اشارہ ہو جو پہلے مٹی بنتا ہے اور ”عظام“ بوسیدہ ہڈیوں کی طرف۔ یا پھر ممکن ہے کہ ”تراب“ گزشتگان اور آباء و اجداد کی طرف اشارہ ہو جو بالکل مٹی ہو چکے ہیں اور ”عظام“ چل بسے والے ماں باپ کی طرف۔ یا پھر چونکہ خاک کا زندگی میں بدلنا ہڈیوں کی نسبت بعید تر ہے، اس لیے اسے انہوں نے اپنی گفتگو میں مقدم رکھا ہے۔ بہر حال یہ بات اس مسئلے میں ان کی شدید مخالفت کی عکاسی کرتی ہے۔

## فقط ایک بار حیات اور ایک بار مرگ

ساتویں اور آخری آیت میں اس سلسلے میں ہم پھر ایک نئی تعبیر کا سامنا کرتے ہیں، وہ یہ کہ مشرکین عرب اور منکرین معاد بوسیدہ ہڈیوں

اور مٹی وغیرہ کا ذکر کئے بغیر ایک بے دلیل ادعا کرتے ہوئے کہتے ہیں: ”ہماری موت اسی پہلی موت کے علاوہ اور کچھ نہیں، ہم ہرگز زندہ و محشور نہ ہوں گے اور اگر تمہارا یہ کہنا سچ ہے کہ موت کے بعد زندگی ہے تو پھر ہمارے آباء کو زندہ کر کے ہمارے پاس لے آؤ تاکہ وہ تمہاری بات کی سچائی پر گواہی دیں۔ (ان ہولاء لبقولون ان ہی الاموت تنالاولیٰ وما نحن بمنشرین فاتوا بالآئنا ان کنتم صدقین) یہ بات قابل توجہ ہے کہ مندرجہ بالا آیت میں ہے کہ ”پہلی موت“ کے سوا کچھ نہیں جب کہ ابتداء میں معلوم ہوتا ہے کہ کہا جاتا ہے ”پہلی حیات“ کے سوا کچھ نہیں۔ ایسا کیوں ہے؟

اس مقام پر ہر مفسر نے ایک طرح سے مندرجہ بالا سوال کا جواب دیا ہے، لیکن سب سے زیادہ مناسب یہ ہے کہ کہا جائے کہ مراد یہ ہے کہ اس دنیا کی زندگی کے بعد یہی موت جو اس کے بعد آئے گی، اس کے سوا کوئی حادثہ رونما ہونے والا نہیں۔ یعنی کوئی حیات مجدد نہیں ہے۔ تفسیر کشاف میں اس اشکال کو بیان کرنے کے بعد زنجیری کہتا ہے: اس آیت کی نظر اس آیت پر ہے جو کہتی ہے:

**أَمْوَاتًا فَأَحْيَاكُمْ ۖ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ**

”تم مردہ تھے۔ اللہ نے تمہیں زندگی دی، وہ تمہیں پھر مارے گا اور پھر زندہ کرے گا۔“ (بقرہ ۲۸)

یعنی جیسے پہلی موت کے بعد (جب انسان خاک تھا) اس جہان میں تم زندہ ہوئے، دوسری موت کے بعد بھی زندہ ہو گے۔ لیکن کافر کہتے ہیں کہ جس موت کے بعد زندگی تھی وہی پہلی موت تھی، یعنی زندگی کے بعد کوئی موت نہیں۔ [۱]

واضح ہے کہ یہ تفسیر بہت پر تکلف ہے۔ اصولاً اس کی ضرورت ہی نہیں اور بہتر وہی پہلی تفسیر ہے۔ (غور کیجیے گا)

دوسرا سوال جو اس آیت کے بارے میں درپیش ہے یہ ہے کہ ہر ”پہلے“ کا ”دوسرا“ ہونا چاہیے۔ لہذا ”پہلی موت“ کیسے ”دوسری موت“ کے بغیر ممکن ہے؟

اس سوال کا جواب واضح ہے کیونکہ ضروری نہیں کہ ہر اول کا ثانی بھی ہو۔ مثلاً ایک شخص نذر مانتا ہے کہ اللہ جو اسے پہلا بیٹا دے گا اس کا نام ”محمد“ رکھے گا اور بہت ممکن ہے کہ اس کے ہاں صرف ایک ہی بیٹا ہو۔ یا کوئی شخص جو پہلی کتاب لکھے اسے باپ کے نام اہداء کرے اور کیا خبر کہ دوسری کتاب نہ لکھے۔ ہم جانتے ہیں کہ اللہ کے ناموں میں ایک ”اول“ ہے جب کہ اس کا دوسرا کوئی نہیں۔

## نتیجہ کلام

مندرجہ بالا سات آیات سے اور جو ان کے قریب الافق ہیں ان سے مخالفین معاد کی منطق سے ہمیں آشنائی ہوئی۔ خصوصاً عصر نزول قرآن کے مخالفین کی منطق معلوم ہوئی۔ ان کی تمام باتیں جو عموماً معاد جسمانی کے انکار پر مبنی نہیں، انہیں ان کے ادعا کی صورت میں خلاصہ یوں پیش کیا جاسکتا ہے:

[۱] تفسیر کشاف، ج ۴، ص ۲۷۹، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

- (۱) کیسے ممکن ہے کہ بوسیدہ ہڈیاں پھر لباس حیات پہن لیں؟
- (۲) ہمارا گوشت اور ہڈیاں جب خاک ہو جائیں گی، اس خاک کے ذرات ہر سو بکھر جائیں گے اور زمین کے طول و عرض میں نظروں سے محو ہو جائیں گے۔ پھر کس طرح جمع ہو کر حیات نو پالیں گے؟ یہ باتیں یا اللہ پر افتراء ہیں یا پھر جنون کی علامت۔
- (۳) اس دنیا کی حیات اور اس کے بعد موت کے سوا ہماری اور کوئی سر نوشت نہیں ہے۔ کوئی شخص ابھی تک مرکز زندہ نہیں ہوا کہ ہم اس دعویٰ کا اعتبار کریں اور اصولاً یہ ادعا ہے ہی عجیب، محال اور ناقابل قبول۔
- اپنے آپ میں مگن یہ مغرور منکرین ایسے ہیں جو اپنی پہلی خلقت کے بارے میں بھی نہیں سوچتے۔ حیات بعد از موت کے نمونے جو ہمیشہ اس زندگی میں اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں، ان پر بھی غور نہیں کرتے اور اپنی ہٹ دھرمی کی وجہ سے ہمیشہ بے دلیل دعوؤں کا سہارا لیتے ہیں۔ یہ دعوے اس زمانے میں منحصر نہ تھے اور نہ ہیں۔ ایسی باتیں آج بھی ہم دیگر افراد کی زبانی سنتے رہتے ہیں جن میں بعض فلاسفہ یا دانشور حضرات بھی شامل ہیں۔
- بہر حال قرآن نے ان دعوؤں کے قاطع جواب دیئے ہیں، جو آئندہ کی بحثوں میں آئیں گے۔ یہ ایسے جوابات ہیں کہ منکرین معاد علم و دانش کی جس سطح پر بھی ہوں حتیٰ کہ جو بالکل بے علم ہیں سب کے لیے قاطع کنندہ ہو سکتے ہیں، شرط صرف یہ ہے کہ وہ واقعاً حق کی تلاش میں ہوں۔
- اب ہم دلائل امکان معاد کو قرآن مجید کے حوالے سے پیش کرتے ہیں۔

پہلا حصہ

## دلائل امکانِ معاد

### ۱۔ اولین خلقت

اشارہ

قرآن مجید میں امکانِ معاد کے اثبات کے لیے بہت سے طریقے اختیار کیے گئے ہیں۔ ان سب کو منطقی استدلال کی صورت میں پیش کیا گیا ہے اور ان طریقوں کو قرآن نے نہایت لطیف تعبیرات کے ساتھ اختیار کیا ہے۔ ان طریقوں کا خلاصہ، جیسے کہ پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے، چھ موضوعات میں کیا جاسکتا ہے:

۱۔ اولین خلقت

۲۔ اللہ کی قدرتِ مطلقہ

۳۔ جہانِ نباتات میں مکرر موت و حیات

۴۔ جنین کے تحولات

۵۔ توانائیوں کی بازگشت

۶۔ معاد کے عینی نمونے

مندرجہ بالا تمام عناوین میں سے ہر ایک کے بارے میں ایک یا متعدد آیات قرآن مجید میں دکھائی دیتی ہیں۔ ان آیات کا گہرا مطالعہ نہ صرف امکانِ معاد کو ثابت کرتا ہے بلکہ بہت سے دیگر مطالب بھی واضح کر دیتا ہے۔ اس اشارے کے بعد اب ہم قرآن مجید کی طرف لوٹتے ہیں۔ سب سے پہلے ہم اولین اور پہلی خلقت سے مربوط آیات کا ذکر کرتے ہیں:

(۱) وَصَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَنَسِيَ خَلْقَهُ ۖ قَالَ مَنْ يُحْيِي الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيمٌ ﴿۷۸﴾

قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِي أَنشَأَهَا أَوَّلَ مَرَّةٍ ۖ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيمٌ ﴿۷۹﴾ (یس ۷۸، ۷۹)

(۲) أَفَعَيَيْنَا بِالْخَلْقِ الْأَوَّلِ ۖ بَلْ هُمْ فِي لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِيدٍ ﴿۱۵﴾ (ق ۱۵)

(۳) وَهُوَ الَّذِي يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ وَهُوَ أَهْوَنُ عَلَيْهِ ط (روم ۲۷)  
 (۴) أَوَلَمْ يَرَوْا كَيْفَ يُبْدِئُ اللَّهُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ ط إِنَّ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ  
 يَسِيرٌ ۝ (عنکبوت ۱۹)  
 (۵) كَمَا بَدَأَكُمْ تَعُودُونَ ۝ (اعراف ۲۹)

ترجمہ

- (۱) اور ہمارے لیے مثال بیان کی اور اپنی تخلیق کو بھول گیا۔ کہنے لگا: ان ہڈیوں کو کون زندہ کرتا ہے جب کہ یہ بوسیدہ ہو چکی ہیں؟ کہہ دو: وہی انہیں زندہ کرتا ہے جس نے اولین مرتبہ انہیں پیدا کیا اور وہ ہر مخلوق سے آگاہ ہے۔
- (۲) (کیا ہم اولین تخلیق سے عاجز ہوئے؟) کہ آفرینش قیامت پر قادر نہ ہوں؟) لیکن ان سب دلائل کے باوجود وہ پھر بھی خلقت جدید کے بارے میں شک کرتے ہیں۔
- (۳) وہ وہ ہے جس نے آغاز تخلیق کیا، پھر اسے پلٹائے گا اور یہ کام اس کے لیے آسان تر ہے۔
- (۴) کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ اللہ کس طرح تخلیق کا آغاز کرتا ہے، پھر پلٹاتا ہے؟ یہ کام اس کے لیے آسان تر ہے۔
- (۵) جیسے اس نے پہلے تمہیں پیدا کیا (قیامت کے روز پھر) پلٹائے گا بھی۔

## تفسیر و جمع بندی آیات

### تفسیر و جمع بندی آیات

پہلی آیت میں ایک مشہور واقعے کی طرف اشارہ ہے۔ عرب کا ایک مشرک ایک بوسیدہ ہڈی لیے رسول اکرمؐ کے پاس آیا۔ اس کا نام ابی بن خلف، یا عاص بن وائل یا امیہ بن خلف تھا۔ ہڈی کا ایک ٹکڑا اس کے ہاتھ میں تھا۔ کہتا تھا کہ میں اس محکم دلیل کے ساتھ محمدؐ سے جھگڑنے جا رہا ہوں اور معاد کے بارے میں اس کے نظریے کو باطل کروں گا۔

وہ رسول اللہؐ کے پاس آیا اور آواز دی: اس بوسیدہ ہڈی کو کون پھر سے زندہ کر سکتا ہے؟ کون سی عقل اس دعویٰ کو باور کرتی ہے؟ شاید اسی حالت میں اس نے اپنی بات کی تائید کے لیے ہڈی کا کچھ حصہ نرم کر کے زمین پر پھینک دیا (قال من يحيى العظام وهى رميم)

اس پر قرآن رسول اللہ کو حکم دیتا ہے کہ مختلف طریقوں اور مختلف مثالوں کے ذریعے اسے قاطع جواب دو جن میں سے ایک یہی پہلی خلقت کا ذکر ہے جسے قرآن نے نہایت مختصر اور جاذب توجہ پیرائے میں پیش کیا ہے۔ فرماتا ہے: (ونسى خلقه) یہ فراموش کار شخص اپنی پہلی خلقت کو بھول گیا ہے۔

اس کے بعد وضاحت کرتے ہوئے فرماتا ہے: کہو: ”اسے وہی زندہ کرے گا جس نے اولین بار اسے پیدا کیا (قل یحییہا الذی انشاہا اول مرة)۔ اگر تمہارا خیال یہ ہے کہ بوسیدہ ہڈیاں آخر کار پراگندہ ہو جائیں گی اور ان کا ہر ذرہ کسی گوشے میں جا پڑے گا، یا اگر تمہارا خیال یہ ہو کہ ذرات میں پہلی تمام صفات کا لوٹا دینا ممکن نہیں کیونکہ کوئی ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتا، تو یہ ایک بہت بڑا اشتباہ ہے کیونکہ وہ ہر چیز کا خالق ہے اور ہر مخلوق سے آگاہ ہے (وہو بكل خلق علیم)

”انشاہا“ انشاء کے مادہ سے ایجاد اور تربیت کے معنی میں ہے اور یہاں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ وہ خدا جس نے ابتداء میں اسے جب یہ کچھ بھی نہ تھا، وجود بخشا، یقیناً اسے خاک ہو جانے کے بعد بھی زندہ کر سکتا ہے۔

اس آیت میں نسیان خلقت سے کیا مراد ہے؟ اس سلسلے میں دو احتمال موجود ہیں۔ اول یہ کہ انسان نے اپنی خلقت کی ابتداء کو، جو ایک ناچیز نطفے اور بے وقعت قطرہ آب سے ہے، فراموش کر دیا ہے جس کی وجہ سے تجدید حیات کے مسئلہ میں خدائی قدرت کا منکر ہے۔ دوسرا یہ کہ بنی نوع آدم کی خاک سے خلقت کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ ممکن ہے کہ ابتداء میں اسے خاک سے پیدا کرے اور پھر ایسا ہی امر محال ہو جائے، کیونکہ:

### حکم الامثال فیما یجوز وفیما لا یجوز واحد

”یعنی جو چیزیں ایک جیسی ہوں ان کے ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں حکم یکساں ہے۔“

البتہ یہاں پر ”نسیان“ یا تو حقیقی اور واقعی فراموش کاری ہے یا پھر اس فراموش کار شخص کی طرح ہے جو اگرچہ بھولا نہیں ہے لیکن چونکہ اس نے اپنی تشخیص اور آگاہی کے مطابق عمل نہیں کیا اس لیے منکر ہوئے جارہا ہے۔

دوسری آیت میں یہی حقیقت ایک منفرد پیرائے میں بیان کی گئی ہے۔ معاد کے منکرین کے جواب میں فرماتا ہے: کیا ہم اولین خلقت سے عاجز آگئے ہیں؟ (جوروز قیامت خلقت جدید پر قادر نہ ہو سکیں) (افعیینا بالخلق الاول)۔

بعد میں اضافہ کرتا ہے: انہیں پہلی خلقت میں کوئی شک نہیں بلکہ غفلت و فراموش کاری کی بناء پر یا تعصب و ضد کی خاطر یا پھر موجودہ شرائط کی وجہ سے (ایسا ہے) کہ کوئی بھی مردہ زندہ نہیں ہوتا ”کیا انہیں خلقت جدید میں کوئی شک و تردد ہے۔“ (بل ہم فی لبس من خلق جدید)۔

اس طرح انہوں نے اپنے آپ کو ایک ایسے واضح و آشکار تناقض میں پھنسا لیا ہے جس کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں۔ عیینا ”سعی“ کے مادہ سے ہے۔ بعض اوقات عجز و ناتوانی کے معنی میں اور کبھی رنج و سختی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ یہاں پر

مقصود وہی پہلے معنی ہیں۔ یعنی ہم پہلی خلقت سے عاجز نہ تھے۔

”خلق اول“ کی تعبیر ہر انسان کی اولین خلقت یا بالخصوص حضرت آدمؑ کی طرف اشارہ ہے یہ جو بعض مفسرین نے احتمال ذکر کیا ہے کہ خلقت اول سے مقصود جہان ہستی ہے، بحث کے ساتھ کوئی ربط نہیں رکھتا۔

لبس (جسن کے وزن پر) کسی چیز کو ڈھانپنے کے معنی میں ہے۔ لباس کو بھی اسی وجہ سے لباس کہتے ہیں کہ یہ بدن کو ڈھانپتا ہے۔ لیکن بقول راغب کبھی یہ لفظ امور معنوی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور ایسی صورت میں حقیقت کو چھپانے کے معنی میں ہے۔ زیر بحث آیت میں بھی انہی معنوں میں ہے، یعنی وہ قیامت سے متعلق جہالت اور اشتباہ میں ہیں اور تعصب و ضد کی وجہ سے حقیقت ان پر پنہاں ہے۔

تیسری آیت میں اسی ضمن میں ایک دوسری تعبیر دیکھنے کو ملتی ہے اور وہ ”مبدأ“ حیات اور معاد کا موازنہ ہے۔ فرماتا ہے: وہ وہ ہے جو خلقت کا آغاز کرتا ہے اور پھر اسے پلٹا دیتا ہے اور یہ کام اس کے لیے انتہائی آسان ہے۔ (وہو الذی یبدوا الخلق ثم یعیدہ وہو اہون علیہ)

کچھ مفسرین نے جملہ ”یبدأ“ کو ماضی کے معنی میں تفسیر کیا ہے۔ یعنی خداوند تعالیٰ نے ابتداء میں خلقت کو ایجاد کیا۔ لیکن کیا مانع ہے کہ ”یبدأ“ اسی اصل معنی فعل مضارع میں تفسیر ہو؟ اس امر کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ فعل مضارع یہاں استمرار پر دلالت کرتا ہے آیت کے معنی کچھ یوں ہوں گے۔

”خدا دائماً خلقت کو ایجاد کرتا ہے اور پھر پلٹا دیتا ہے۔“

یعنی جہان ہستی ایک رواں دواں حیات و مرگ اور مستمر مبدأ و معاد کا مجموعہ ہے۔ بنا بریں قیامت کے دن امکان معاد کے بارے میں کوئی شک نہیں ہونا چاہیے۔

ہماری دنیا مسلسل مرتی ہے، پھر نئی ہو جاتی ہے اور جدید خلقت پالیتی ہے۔ اس حساب سے تو معاد یا حیات نو کی طرف بازگشت ایک معمولی و عادی امر ہے اور یہ منکروں کے لیے خوبصورت نیا تلا جواب ہے۔

تعبیر (وہو اہون علیہ) ”(اس کے لیے اعادہ آغاز کی نسبت آسان تر ہے)“ سے یہ سوال ابھرتا ہے کہ خدا کی قدرت مطلقہ و بے پایاں کے مقابل تو آسان و مشکل کوئی مفہوم نہیں رکھتا۔ اس کے لیے تو ہر چیز برابر ہے۔ اس کے لیے دنیا کے بڑے بڑے پہاڑوں کو ان کی جگہ سے اکھاڑ پھینکنا اتنا ہی آسان ہے جتنا ایک تنکا اٹھانا۔ اس کی قدرت کے مقابل منظومہ شمسی کی خلقت تو خاک کے ایک ذرے کی خلقت کی مانند ہے کیونکہ اس کی بے انتہا قدرت کے مقابلے میں سخت و آسان کوئی معنی نہیں رکھتا۔ لیکن ہمارے لیے، جو محدود قدرت کے مالک ہیں، کہتے ہیں کہ چھوٹے پتھر کا اٹھانا آسان ہے لیکن بڑے پتھر کا اٹھانا مشکل!

مفسرین نے اس سوال کے کئی ایک جواب دیئے ہیں لیکن مناسب ترین جواب یہ ہے کہ یہ بات لوگوں کی منطق اور ان کی وسعت نظر کے مطابق ہے۔ اگر کوئی کسی کام کو انجام دے تو دوسری بار اس کا انجام دینا آسان تر اور سہل تر ہے، اگرچہ اس قادرِ لایزال کے لیے تمام

چیزیں یکساں ہیں۔<sup>[۱]</sup>

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہاں ”اھون“ تفصیلی معنی میں نہیں ہے بل کہ ”ہین“ یعنی آسان کے معنی میں ہے۔ دیگر توجیہات بھی کی گئی ہیں جو چونکہ مناسب نہ تھیں اس لیے ان کے ذکر سے صرف نظر کیا گیا ہے۔ بہر حال آسان و آسان تر کے مفہوم میں لوگوں کی ایک دوسرے کے ساتھ گفتگو اور سطح فکر کو مد نظر رکھا گیا ہے وگرنہ اس کے لیے تو ہر چیز آسان ہے اور آسان تر کا کوئی وجود نہیں۔ بقول شاعر

چوں قدرت او منزہ از نقصان است  
آوردن خلق و بردن یکساں است  
نسبت بہ من و تو ہرچہ دشوار بود  
در قدرت پر کمال او آسان است

(چونکہ اس کی قدرت عیب و نقص سے پاک ہے لہذا اس کے لیے مخلوق کا لانا اور اسے لے جانا یکساں ہے اور ہر وہ چیز جو میرے اور تمہارے لیے مشکل ہے اس کی باکمال قدرت کے سامنے آسان ہے۔)

جو کچھ گذشتہ آیت میں آچکا تھا چوتھی آیت میں ایک نئے انداز سے بیان ہوا ہے۔ معاد کے منکرین کے جواب میں فرماتا ہے: ”کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ خدا کس طرح خلقت کا آغاز کرتا ہے اور پھر اسے پلٹاتا ہے؟ یہ کام خدا کے لیے آسان و سہل ہے۔“ (اولم یروا کیف یبدی اللہ الخلق ثم یعیدہ ان ذلک علی اللہ یسیر)<sup>[۲]</sup>

فعل مضارع کی صورت میں ”یبدی“ (ابتداء کرتا ہے) اور ”یعیّد“ (پلٹاتا ہے) کی تعبیر ہو سکتا ہے تاکید ہو اس کے لیے کہ جو ماقبل آیت میں کہا گیا ہے کہ خدا ہمیشہ ایجاد و اعادہ کرتا رہتا ہے اور یہ جہاں دائماً نو بہ نو ہوتا اور بدلتا رہتا ہے اور ہر دن مبداء و معاد اور آغاز و تکرار ہے۔

خصوصاً اس انداز سے جو فرمایا گیا ہے کہ:

اولم یروا... (کیا انہوں نے نہیں دیکھا) اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس دائمی و مستمر ایجاد و اعادہ کا مشاہدہ سب کے لیے ممکن پذیر ہے۔

[۱] اس وجہ کو بہت سے مفسرین نے بہترین تفسیر یا ان میں سے ایک قرار دیا ہے۔ (مجمع البیان ج ۸ ص ۳۰۲، روح البیان ج ۷ ص ۲۶، قرطبی، ج ۷ ص ۵۱۰ اور دیگر تفاسیر)

[۲] یاد رکھنا چاہیے کہ یبداء (باب افعال سے) اور یعیّد (مجرد ثلاثی) دونوں کے ایک ہی معنی ہیں، یعنی کسی چیز کی ابتداء کرنا یا اسے واضح کرنا۔



یہ بھی ممکن ہے کہ ”یعین“ فقط روز قیامت ہی سے متعلق ہو۔ ایسی صورت میں آیت کی تفسیر پھر کچھ یوں ہوگی: ”کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ خدا نے مخلوق کو کس طرح پیدا کیا۔ وہ اسی طرح اسے پلٹا بھی سکتا ہے۔“

”ان ذلک علی اللہ یسیر“ کی اصطلاح سے پتہ چلتا ہے کہ خدا کے لیے ہر چیز آسان ہے اور ممکن ہے یہ دلیل ہوان لوگوں کے لیے جنہوں نے گذشتہ آیت میں ”اہون“ کو ”ہین“ (آسان) کے معنی میں بیان کیا ہے۔

بہر حال معاد کے تمام منکرین اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ کس طرح مردہ زمین سے سبزہ پیدا ہوتا ہے؟ کس طرح انسان عرصہ حیات میں قدم رکھتے ہیں؟ کس طرح بے جان درخت سبز پتوں اور پھلوں سے لد جاتے ہیں؟ اور کس طرح اس عالم میں ہر وقت ایک نئی خلقت معرض وجود میں آتی ہے؟

کیا ان تمام موجودات کے خالق کے لیے ان سب کا پلٹنا مشکل ہے جب کہ یہ ہر دو کام اس کی قدرت کے سامنے مساوی ہیں؟ کسی چیز کے امکان کے لیے بہترین دلیل اس کا وجود ہے۔

پانچویں اور آخری آیت میں گفتگو کا لب لباب انتہائی مختصر جامع اور پر معنی جملہ میں بیان کیا گیا ہے۔ فرماتا ہے: جیسے تمہاری ابتداء کی (ویسے) واپس پلٹو گے۔“ (کہا بداء کہم تعدودن)

یہ جملہ سورہ اعراف کی آیت ۲۹ کا کچھ حصہ ہے اور یہ درحقیقت امکان معاد پر قرآن کا مختصر ترین اور روشن ترین استدلال گردانا جاتا ہے۔ فرماتا ہے: ”حیاتِ نو کو پہلی اور اولین حیات پر قیاس کرو۔“ اور یہ ایک عقلی امر میں ایک منطقی قیاس ہے وہ لوگ سخت اشتباہ میں ہیں جو ایسی آیات کو تعبدی احکام میں قیاس کے جواز پر دلیل سمجھتے ہیں کیونکہ قیاس اس میں جائز ہے جب حکم اول کی دلیل اور علت و فلسفہ واضح ہو جائے تاکہ اس کا وجود حکم ثانی میں بھی ثابت ہو سکے، بالکل اسی طرح جیسے متذکرہ بالا آیت میں معاد کی بحث کے ضمن میں اور اسی طرح کی دوسری آیات میں نظر آتا ہے۔

چونکہ ہم جانتے ہیں کہ اولین خلقت کی دلیل قدرتِ خدا ہی ہے اور یہ مفہوم عینا خلقت مجدد میں بھی موجود ہے، لیکن فرعی احکام میں قیاس کوئی معنی نہیں رکھتا کیونکہ نہ تو ان کا فلسفہ واضح ہے اور نہ ہی ان کی علت پر صراحت سے کوئی دلیل بیان ہوئی ہے اور ایسا قیاس ظنی و غمینی ہوتا ہے نہ کہ یقینی و عقلی۔

بہر حال وہ تفسیر جو اوپر بیان ہوئی ہے اسی ضمن میں آنے والی دیگر قرآنی آیات کو ملحوظ نظر رکھتے ہوئے مکمل طور پر واضح ہے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ جیسے ابتداء میں آپ کو خوش بخت، بد بخت، مومن اور کافر پیدا کیا گیا ہے، آپ کا اختتام اور عاقبت کا بھی یہی ہوگا۔<sup>[۱]</sup>

شاید بعض لوگ چاہتے تھے کہ اس طرح مسئلہ جبر میں اپنے فاسد عقیدے کے لیے کوئی دلیل کی راہ تلاش کریں درآں حالیکہ یہاں تو

[۱] فخر رازی نے اپنی تفسیر میں اسے دو احتمالات میں سے ایک احتمال کے طور پر بیان کیا ہے۔ (جلد ۱۴ صفحہ ۵۸)

بات ہی انسان کی اصل آفرینش، اس کی ابتدائی خلقت اور پھر اس کے جدید زندگی کی طرف پلٹ جانے سے متعلق ہے، بالخصوص جب کہ آیت میں اجباری سعادت و شقاوت اور مومن و کافر کی طینت کے مسئلے میں کوئی ہلکا سا اشارہ بھی موجود نہیں۔

## نتیجہ بحث

ان آیات سے بخوبی پتہ چلتا ہے کہ معاد کے مخالفین کے انکار کی اصل وجہ ان کا اس جہان کی اولین آفرینش اور انسانوں کی پہلی خلقت سے متعلق بے توجہی اور غفلت برتنا ہے۔ چونکہ اگر وہ کچھ تھوڑا سا بھی اس کے بارے میں سوچتے تو خود اپنے سوال کا جواب پا لیتے۔ کیا ایسا ممکن ہے کہ انسان کی خلقت ابتداء میں تو خاک سے واقع پذیر ہو لیکن بعد میں ایسا غیر ممکن ہو؟

## توضیحات

### اس دن کہ جب انسان خلق ہوا

سائنس دان کہتے ہیں کہ جب زمین سورج سے جدا ہوئی تو جھلسا دینے والی آگ کی مانند تھی۔ اربوں سال گزرنے کے بعد زمین تدریجاً سرد ہونا شروع ہوئی اور بادلوں کے وہ ٹکڑے جنہوں نے اس کرہء خاکی کو ہر طرف سے گھیرا ہوا تھا، بارش میں تبدیل ہو گئے۔ ان سیلابی بارشوں کا پانی جب اس گرم زمین پر پڑتا تو ابلا شروع ہو جاتا اور پھر سے بادلوں کی صورت میں تبدیل ہو جاتا اور اس طرح یہ کرہء خاکی سرد سے سرد تر ہوتا گیا۔

بالآخر زمین کے پست حصوں میں پانی جمع ہوتا گیا اور سمندر بنتے گئے۔ لیکن کہیں بھی زندگی کا کوئی نام و نشان نہ تھا۔ نہ کوئی سبزہ اگتا تھا۔

نہ کوئی پرندہ اڑتا تھا اور نہ کسی طائر کے چچے تھے اور نہ ہی ان عظیم سمندروں میں کسی زندہ موجود کی حرکت تھی۔ کیونکہ ابھی تک زمین بہت زیادہ گرم تھی اور اس پر زندگی ممکن نہ تھی۔

جب زمین ٹھنڈی ہوئی تو خداوند عالم کی قدرت سے دریاؤں اور صحراؤں میں زندگی کے اولین آثار نمایاں ہونے لگے۔ مختلف نوع کے جاندار ظاہر ہوئے اور آخر کار خدا نے انسان کو خلق کیا۔

بنابریں اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان ابتداء میں خاک سے پیدا ہوا اور پھر دوبارہ خاک میں پلٹ جائے گا، پھر اس میں کیا رکاوٹ ہے کہ وہ دوبارہ خاک سے آفرینش مجدد کا لباس زیب تن کر لے۔

البتہ معمول کی زندگی سے انس، کوتاہ فکری اور انسانی فکر و سوچ پر پڑنے والے ضد و تعصب کے پردے اسے اجازت نہیں دیتے کہ روشن حقیقتوں کو دیکھے، سمجھے یا ان کا اعتراف کرے۔

## ۲۔ اللہ کی قدرت مطلقہ

### اشارہ

نئی زندگی کی طرف بازگشت کے امکان کے اثبات کا دوسرا راستہ اللہ کی بے پایاں قدرت کی طرف توجہ ہے کیونکہ معاد کی بحث توحید اور اللہ کی صفات ثبوتیہ و سلبیہ کو قبول کرنے کے بعد پیش آتی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ اللہ کی صفات ثبوتیہ میں سے ایک اس کی قدرت مطلقہ اور ہر چیز پر اس کا اختیار ہے۔ ہر چیز پر اس کی قدرت کے اثبات کے لیے ایک بات تو یہ ہے کہ وہ واجب الوجود ایک لامحدود ہستی کا حامل ہے اور نتیجتاً اس کی قدرت بھی لامحدود ہے۔ لیکن اس کے علاوہ اس کی قدرت کے اثبات کے لیے جہاں خلقت کی عظمت کو بھی ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

آسمانوں کی وسعتیں، منظومہ، کہکشائیں، ثابت و سیار کواکب کی کثرت و عظمت، طرح طرح کے زندہ موجودات جن میں پودے اور حیوانات بھی شامل ہیں، زندہ خلیوں کی بناوٹ میں عجیب ریزہ کاریاں اور ایٹمی ذرات کی حیران کن تشکیل سب اس کی قدرت بے پایاں پر شاہد ہیں۔ اس بنیاد کو مان لینے کے بعد اس اعتراض کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی کہ بوسیدہ ہڈیوں کو کون زندہ کر سکتا ہے اور یہ کہ کیسے ممکن ہے کہ منتشر خاک پھر سے جمع ہو اور ایک جسم میں ڈھل کر نئے سرے سے لباس حیات پہن لے۔

یہ وہ مطالب ہیں جن کے بارے میں ہم اس حصے میں گفتگو کریں گے۔ قرآن مجید کی متعدد آیات میں ان کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ مزید وضاحت سے پہلے ان آیات کا مطالعہ کرتے ہیں:

(۱) لَخَلَقَ السَّمُوتِ وَالْأَرْضِ أَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا

يَعْلَمُونَ ﴿۵۴﴾ (مومن ۵۴)

(۲) أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّ اللَّهَ الَّذِي خَلَقَ السَّمُوتِ وَالْأَرْضَ قَادِرٌ عَلَى أَنْ يَخْلُقَ

مِثْلَهُمْ وَجَعَلَ لَهُمْ أَجَلًا لَا رَيْبَ فِيهِ ۖ فَأَبَى الظَّالِمُونَ إِلَّا كُفُورًا ﴿۹۹﴾ (بنی

اسرائیل ۹۹)

(۳) أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّ اللَّهَ الَّذِي خَلَقَ السَّمُوتِ وَالْأَرْضَ وَلَمْ يَعْزِ بِخَلْقِهِنَّ

بِقَدْرِ عَلَى أَنْ يُحْيِيَ الْمَوْتَى ۖ بَلَىٰ إِنَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿۳۳﴾ (احقاف: ۳۳)

(۴) أَوَلَيْسَ الَّذِي خَلَقَ السَّمُوتِ وَالْأَرْضَ بِقَدِيرٍ عَلَىٰ أَنْ يَخْلُقَ مِثْلَهُمْ ۚ

بَلَىٰ ۚ وَهُوَ الْخَلَّاقُ الْعَلِيمُ ﴿٨١﴾ (یس ۸۱)  
 (۵) قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ بَدَأَ الْخَلْقَ ثُمَّ اللَّهُ يُنشِئُ النَّشْأَةَ  
 الْآخِرَةَ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٢٠﴾ (عنکبوت ۲۰)

ترجمہ

- (۱) آسمانوں اور زمین کی خلقت انسانوں کی خلقت سے بڑھ کر ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔  
 (۲) کیا وہ نہیں دیکھتے کہ جس اللہ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے ان جیسا اور بھی پیدا کرنے پر قادر ہے  
 (اور انہیں حیات نو کی طرف پلٹا سکتا ہے) اس نے ان کے لیے ایک قطعی انجام قرار دیا ہے، لیکن ظالم لوگ کفر و  
 انکار کے علاوہ کچھ نہیں مانتے۔  
 (۳) کیا وہ نہیں جانتے کہ جس اللہ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے اور ان کی خلقت سے ناتواں نہیں ہو گیا،  
 مردوں کو زندہ کرنے پر قادر ہے؟ ہاں! وہ ہر چیز پر قادر ہے۔  
 (۴) جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے، کیا وہ اس بات کی قدرت نہیں رکھتا کہ ان جیسے (خاک شدہ  
 انسانوں کو) پیدا کر لے؟ ہاں! (وہ ایسا کر سکتا ہے) اور وہ پیدا کرنے والا دانا ہے۔  
 (۵) کہو: زمین میں چلو پھرو اور دیکھو، اللہ نے کس طرح تخلیق کا آغاز کیا۔ پھر (اسی طرح) اللہ جہان آخرت کو  
 پیدا کرے گا۔ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

## تفسیر و جمع بندی آیات

اس کے لیے ہر چیز آسان ہے

پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ مردوں کو زندہ کرنے کا موازنہ تمام آسمانوں اور زمین کی خلقت سے کرتا ہے۔ فرماتا ہے: آسمانوں اور زمین  
 کی خلقت انسانوں کی خلقت سے زیادہ مشکل ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے (لخلق السموات والارض اکبر من خلق الناس و  
 لكن اكثر الناس لا يعلمون)  
 اس آیت کی تفسیر میں فخر الدین رازی کہتے ہیں:

﴿۲۰﴾ دیگر آیات میں بھی یہی مفہوم موجود ہے۔ مثلاً شوریٰ ۹ اور حدید ۲

یہ اس حقیقت کے بیان کے لیے ایک واضح استدلال ہے کہ اللہ حیاتِ انسانی کے اعادہ پر قادر ہے اور واضح کرتی ہے کہ منکرین معاد کسی دلیل و برہان کے بغیر صرف، حسد، جہل، کفر اور تعصب کی بنا پر اختلاف اور انکار کا راستہ اختیار کیے ہوئے ہیں۔<sup>[۱]</sup>

دیگر مفسرین مثلاً طبری نے مجمع البیان میں اور قرطبی نے روح البیان میں بھی تصریح کی ہے کہ اس آیت کا روئے سخن منکرین قیامت کی طرف ہے اور کہتی ہے: جو اہم تر اور بڑے کام پر قادر ہو، مثلاً جیسے باعظمت آسمانوں اور زمین کی خلقت ہے (ان میں موجود اس قدر حیرت انگیز اور حیران کن مخلوقات کے ساتھ) کس طرح سے مردوں کو حیاتِ نو عطا کرنے پر قادر نہیں ہے۔<sup>[۲]</sup>

جملہ ”ولکن اکثر الناس لا یعلمون“ جیسا کہ بعض مفسرین نے کہا ہے، اس معنی میں نہیں ہے کہ واقعاً اکثر لوگ آسمانوں کی خلقت، جس میں اس قدر نظم و حساب موجود ہے، کی انسان کی حیاتِ نو کے مقابلے میں عظمت کو نہیں جانتے، بلکہ یہ اس لیے کہا گیا ہے کہ وہ اس اہم امر سے غفلت کرتے ہیں اور اس پر غور و فکر نہیں کرتے۔ تعصب اور ہوائے نفس کی پیروی کی وجہ سے وہ اس سے معاد کے مسئلے کے لیے ضروری نتیجہ اخذ نہیں کرتے۔ لہذا قرآن انہیں بے خبر جاہلوں کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔<sup>[۳]</sup>

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ اس زمانے میں ابھی آسمانوں کی عظمت اچھے طریقے سے سمجھی نہ گئی تھی۔ کم ہی کوئی ایسا شخص تھا جو ان عظیم اسرار سے آگاہی رکھتا ہو جو آج علم و دانش کے زیرِ سایہ پہچانے گئے ہیں۔ لیکن قرآن جس کا سرچشمہ اللہ کا علم ہے پایا ہے، نے ان اسرار سے پردہ ہٹایا۔

ضمناً یہ توجہ بھی رہے کہ ”الخلق“ کا لام ظاہراً ”لام ابتدا“ ہے اور تاکید کے لیے آیا ہے۔

منکرین معاد کے جو ہڈیوں کے بوسیدہ اور خاک ہو جانے کے بعد انسان کی تخلیق نو کے منکر تھے، ان کا ذکر کرنے کے بعد دوسری آیت میں فرمایا گیا ہے: کیا وہ نہیں جانتے کہ جس اللہ نے آسمانوں اور زمین کو بنایا ہے وہ اس پر قادر ہے کہ انہی جیسے اور پیدا کر لے (اولم یروا ان الله الذی خلق السموت والارض قادر علی ان یخلق مثلہم)

”مثلاً“ کا کلمہ ممکن ہے کہ انسانوں کی تخلیق نو کی طرف اشارہ ہو، کیونکہ ایسا کرنا مثلِ سابق ہے۔ نیز یہ بھی ممکن ہے کہ یہ اس امر کی طرف اشارہ ہو کہ اللہ قادر ہے کہ ان انسانوں کی طرح اور انسان نئے سرے سے پیدا کر لے۔ جب وہ اس پر قادر ہے تو پھر موجود انسانوں کی تجدید حیات آسان تر ہے۔

یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ بدن جو کچھ بھی ہوں بالکل وہی پہلے والے نہیں ہیں، کیونکہ اولین مواد نئی کیفیتوں کے ساتھ لوٹ کر آتا ہے۔ اسی لیے اسے ”مثل“ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ لیکن انسانی روح وہی ہے اور اس کے جسم کے ساتھ تعلق کے بعد ہر لحاظ سے وحدت حاصل ہو

[۱] تفسیر فخر الدین رازی جلد ۲ ص ۷۹

[۲] تفسیر طبری ج ۸ ص ۵۱۰۹، قرطبی ج ۸ ص ۵۶۹، روح البیان ج ۸ ص ۱۹۹

[۳] مجمع البیان، کشاف، روح المعانی زیر بحث آیت کے ذیل میں

جاتی ہے، لہذا انسان تجدید حیات کے وقت گزشتہ کی مثل بھی ہیں اور ایک لحاظ سے وہی بھی۔ (غور کیجیے گا)  
اس کے بعد آیت میں منکرین کے دوسرے سوال کا جواب دیتا ہے وہ کہتے تھے: اگر قیامت حق ہے تو پھر آتی کیوں نہیں؟ قرآن کہتا ہے: اللہ تعالیٰ نے ان کے پلٹنے کے لیے ایک قطعی مدت قرار دی ہے، چاہیے کہ انتظار کریں (وجعل لہم اجلًا لا ریب فیہ)۔  
دوسرے الفاظ میں: اس نے اپنی قدرت کاملہ سے اس کا صحیح وقت متعین کر رکھا ہے اور کسی معمولی سے فرق کے بغیر وہ بالکل اسی وقت رونما ہوگی۔

لیکن ظالم کفر و انکار کے سوا کچھ نہیں مانتے (کیونکہ ہوائے نفس، تعصب اور حق دشمنی نے ان کی فکر پر پردہ ڈال رکھا ہے) (فابی الظالمون الا کفوراً)

یہی مطلب تیسری آیت میں ایک اور انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ فرماتا ہے: کیا وہ نہیں جانتے کہ جس اللہ نے (ایسے عظیم) آسمانوں اور (ایسی شگفت انگیزیوں) کے ساتھ زمین کو پیدا کیا ہے اور ان سے ہرگز عاجز نہیں ہوا مردوں کو زندہ کرنے پر قادر ہے، وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ (اولم یروا ان اللہ الذی خلق السموات والارض ولہم یعی بخلقہن بقادر علی ان یحیی العوتی بلی انہ علی کل شیء قذیر)

”اولم یروا“ (کیا انہوں نے نہیں دیکھا) چشم عقل سے مشاہدے کے معنی میں ہے۔ لہذا مفسرین نے اسے اولم یعلموا (کیا وہ نہیں جانتے) کے معنی میں تفسیر کیا ہے۔ بعض نے علم و آگاہی کے جو بصیرت اور دقت نظر کے ہمراہ ہو، مراد لی ہے۔

”لہم یعی“ ”سعی“ کے مادہ سے عجز و ناتوانی کے معنی میں ہے جو زیادہ چلنے کی وجہ سے انسان کو لاحق ہوتی ہے۔ نیز یہ ہر طرح کی ایسی عجز و ناتوانی کے معنی میں ہے جو کسی کام کی ذمہ داری یا کسی سے بات کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ ”داء عیاء“ کہ جو درد بے درماں کے معنی میں ہے اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ ایسا درد واقعاً تھکا دینے والا ہوتا ہے۔

بعض نے اس کے معنی ”جھل“ بھی کئے ہیں، لیکن یہ معنی اس آیت سے مناسبت نہیں رکھتے۔  
ظاہر ہے کہ خستگی و ناتوانی کا تصور ایسی صورت میں کیا جاسکتا ہے کہ جب کسی شخص کی قدرت محدود ہو۔ لیکن اللہ کہ جس کی قدرت لامحدود ہے، اس کے بارے میں اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

بہر حال ممکن ہے یہ تعبیر یہودیوں کی اس خرافات کی طرف اشارہ ہو کہ وہ کہتے تھے: اللہ آسمانوں اور زمین کو پیدا کر کے تھک گیا ہے اور اس نے ہفتہ کو یوم آرام قرار دیا۔ بعد ازاں یہ معنی ایک روایت کے طور پر باقی رہا۔

اس بات کا باطل ہونا اتنا واضح ہے کہ بحث کی ضرورت نہیں۔

چوتھی آیت میں منکرین معاد کے متعدد سوالوں کا جواب ہے۔ نیز اس شخص کا جواب بھی جو رسول اللہ کی خدمت میں ہاتھ میں بوسیدہ ہڈی لیے آیا تھا اور کہتا تھا: ”من یحیی العظام وہی رمیمہ“ (بوسیدہ ہڈی کو کون زندہ کرے گا)۔ اللہ فرماتا ہے: کیا جس نے آسمانوں اور زمین کو (اس وسعت، عظمت اور تعجب انگیزیوں کے ساتھ) پیدا کیا ہے قادر نہیں ہے کہ ان جیسے انسانوں کو پیدا کرے؟ (اولیس الذی

خلق السموت والارض بقادر علی ان یخلق مثلهم)

ہاں قادر ہے اور وہ خلاق علیم ہے۔ (بلی وھو الخلاق العلیم)

ظاہر ہے جب آسمانوں کا ذکر آتا ہے تو تمام کرات، ستارے اور کہکشاں اس میں آجاتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ سائنسدانوں کے تازہ ترین انکشافات کے مطابق ہمارا منظومہ شمسی MILKY WAY کی معروف کہکشاں کا حصہ ہے۔ کہتے ہیں کہ اس کہکشاں میں ایک سو ارب سے زیادہ ستارے ہیں جن میں سے ہمارا سورج متوسط ستاروں میں سے ایک ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بڑی ٹیلی سکوپس تقریباً ایک ارب کہکشاؤں کا پتہ دے چکی ہیں۔ اگر ہم اس عدد کو آپس میں ضرب دیں تو کرات آسمانی کی حیرت کن تعداد کا اجمالاً اندازہ لگا سکتے ہیں، جب کہ یہ بھی آج کے انسان کی معلومات کی حد ہے۔ شاید کل اور ایسے جہان منکشف ہوں کہ جو کچھ ہم آج جانتے ہیں، یہ دنیا اس کے مقابلے میں حقیر و ناچیز ہو۔

اسی طرح سے جب زمین کہا جاتا ہے تو اس کے تمام اسرار اور تعجب انگیزیوں اس میں آجاتی ہیں۔

جس کسی نے اس عظیم، عجیب اور منظم جہان کو پیدا کیا ہے، کیا وہ انسان کو حیاتِ نوعطا کرنے سے ناتواں ہے؟

”خلاق“ (بہت خلق کرنے والا) ممکن ہے اس طرف اشارہ ہو کہ اللہ ہمیشہ مصروفِ خلقت ہے اور ہر روز نئی موجودات کو پیدا کرتا ہے اور کچھ موجودات کو ختم کر دیتا ہے۔ اس طرح ہر روز ایک احیاءِ جدید اور معادِ تازہ ہے۔ اسی لیے ”خلاق“ کہ جو مبالغے کا صیغہ ہے کا اس پر اطلاق ہوا ہے۔

”علیم“ بھی اس نکتے کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے کہ اگر انسان مرجائیں، خاک ہو جائیں اور ان کے ذرے ہر طرف بکھر جائیں تو ان کی جمع آوری اللہ تعالیٰ کے لیے مشکل نہیں جو عالم و آگاہ ہے، جیسا کہ ان کی عمر بھر کے اعمال کا حساب رکھنا بھی کوئی پیچیدہ معاملہ نہ ہوگا (توجہ رہے کہ ”علیم“ اس مقام پر صفت مشبہ ہے اور چونکہ ”خلاق“ کے ساتھ آیا ہے جو صیغہ مبالغہ ہے، لہذا تاکید کے لیے ہے)۔

زیر بحث پانچویں اور آخری آیت میں منکرینِ معاد کو ایک حسی اور تجربی طریقے سے دعوت دی گئی ہے۔ قرآن رسول اللہؐ سے فرماتا ہے: ان سے کہو: جاؤ اور زمین میں چلو پھرو اور پھر دیکھو کہ اللہ نے آغازِ خلقت کس طرح سے کیا ہے؟ پھر (جان لینا کہ جو اس طرح طرح کی مخلوق پیدا کرنے کی طاقت رکھتا ہے) وہی جہانِ آخرت کو پیدا کرے گا کیونکہ وہ ہر چیز پر قادر ہے (قل سیبروا فی الارض

فانظروا کیف بدا الخلق ثم اللہ ینشی النشاة الاخرۃ ان اللہ علی کل شیء قدیدر)

”سیبروا فی الارض“ اور زمین میں چلنا پھرنا انسان کو اس لحاظ سے آغازِ خلقت سے آگاہ کرتا ہے کہ جب زندگی اس کرہ زمین پر پیدا ہوئی ان اولین ایام سے زندہ موجودات کے آثار اس کے مختلف طبقاتوں میں موجود ہیں اور ان کے مطالعے سے آج دانثور موجودات زندہ کے بہت کے اسرار کا کھوج پالیتے ہیں۔ نیز ممکن ہے کہ کرہ زمین اور اس کے بے جان موجودات کے آغازِ خلقت کے اسرار کا کھوج لگانا مراد ہو کیونکہ زمین کے مختلف طبقات کے مطالعے سے طرح طرح کے عناصر اور مرکبات آشکار ہوتے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ان مکرر تخلیقات کی طرف اشارہ ہو جو ہر روز اس کرہ خاکی پر رونما ہوتی رہتی ہیں۔ بہت سے موجودات زندہ ہر روز عرصہ وجود میں قدم رکھتے ہیں اور بہت



سے چل بستے ہیں۔

وہ خدا جو ان سب تخلیقات اور تحولات حیات پر قادر ہے، مردوں کو زندہ کرنے سے کیونکر عاجز ہوگا؟ اس طرح حق تعالیٰ کی قدرت مطلقہ سے انسان کی حیات مجدد کے امکان کو ثابت کرنے کے لیے استفادہ کیا گیا ہے۔

البتہ یہ احتمال بھی موجود ہے کہ انسان کی اولین خلقت کی طرف اشارہ ہو اور تجدید خلقت پر خلقت اول کے ذریعے قیاس عقلی قائم کیا گیا ہو، اس صورت میں یہ آیت گذشتہ آیات کے گروپ میں قرار پائے گی، لیکن ہر صورت میں اصل مدعا پر ایک شاہد ہے۔

جو کچھ ہم تفسیر میں بیان کر چکے ہیں اس سے اس سوال کا جواب بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ قرآن انسانوں کو زمین میں سیر کی کیوں دعوت دیتا ہے اور انسان کس طرح سے آغاز خلقت کو دیکھیں جب کہ آغاز آفرینش کا زمانہ تو لاکھوں یا کروڑوں سال پہلے کا ہے اور آج قابل مشاہدہ نہیں۔

اس سوال کے جواب میں تین باتیں سطور بالا میں ذکر کی گئی ہیں۔ (غور کیجیے گا)

یہ بات قابل توجہ ہے کہ یہاں معاد کے لیے ”نشأة آخرت“ کی تعبیر استعمال کی گئی ہے اور جیسا کہ راغب نے مفردات میں کہا ہے ”نشأة“ کسی چیز کی ایجاد اور نشوونما کے معنی میں ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قیامت میں آفرینش تازہ بھی ہے اور نمونے جدید بھی۔

## نتیجہ بحث

یہ آیات امکان معاد کے منکرین کی توجہ اس حقیقت کی طرف دلاتی ہے کہ کیا تم اللہ کی قدرت مطلقہ کو مانتے ہو یا نہیں؟ اگر نہیں مانتے تو ایک نظر جہان آفرینش پر ڈالو، آسمان، ثابت و سیار ستارے، کہکشائیں اور منظومے اور ایک نظر زمین پر ڈالو اور اس کے عجائبات کو دیکھو اور دیکھو کہ کس طرح ایک نظم و قانون ان سب پر حکم فرما ہے۔

کیا ممکن ہے کہ قدرت کی ان سب نشانیوں کو دیکھو اور پھر بھی حق تعالیٰ کی قدرت مطلقہ میں شک کرو؟

نیز اگر تمہارا اس کی قدرت مطلقہ پر ایمان ہے تو پھر معاد اور مردوں کے زندہ کرنے کے لیے مسئلے میں کیونکر شک کرتے ہو اور اسے عجیب و غریب و ناقابل قبول قرار دیتے ہو؟



## ۳۔ احیاء ارض

اشارہ

معاد کا ایک اور رخ جسے قرآن مجید نے پیش کیا ہے اور اس مطلب کے اثبات کے لیے اسے ایک خوبصورت علامت قرار دیا ہے اور پھر اسے سب کی آنکھوں کے سامنے رکھا ہے، وہ عالم نباتات میں موت کے بعد پیدا ہونے والی زندگی ہے۔ وہی رخ جو ہر سال ہمارے سامنے لوٹ کے آتا ہے اور یہ منظر ہم جتنے سال جیتے ہیں اتنی دفعہ مشاہدہ کرتے ہیں۔ یہی رخ قیامت عظمیٰ، محشر کبریٰ، احیاء اموات اور زندگی کی طرف پھر سے پلٹ آنے کا ایک نمونہ ہے۔

زندگی اور موت کا قانون ہر جگہ یکساں ہے۔ اگر انسان کا موت اور خاک ہو جانے کے بعد پھر زندگی کی طرف لوٹ آنا محال ہے تو پھر یہ اتنے نباتات جو مر جاتے ہیں، بوسیدہ ہو جاتے ہیں، خاک ہو جاتے ہیں حیات تازہ پا کر پھر عرصہ وجود میں قدم کیوں رکھتے ہیں، مردہ زمینیں حیات بخش بارش کے بعد کیوں کروٹ بدلتی ہیں اور حرکت میں آ جاتی ہیں اور لباس حیات پہن لیتی ہیں۔ پودوں کا اگنا، شگوفوں کا پھوٹنا اور پھولوں کا خندہ کننا ہونا، سب زندگی کی علامتیں ہیں اور یہ سب مل کر شور برپا کر دیتے ہیں۔

قرآن نے سب انسانوں کی توجہ اس مسئلے کی طرف مبذول کروائی ہے۔ اس سلسلے کی اہم آیات کا نمونہ ہم ذیل میں پیش کرتے ہیں اور ان آیات کو گوش جان سے سنتے ہیں:

(۱) وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً مُّبَارَكًا فَأَنْبَتْنَا بِهِ جَنَّاتٍ وَحَبَّ الْحَصِيدِ ۝

وَالنَّخْلَ بَسَقَتْ لَهَا طَلْعُ نَضِيدٍ ۝ رَزَقًا لِلْعِبَادِ ۝ وَأَحْيَيْنَا بِهِ بَلْدَةً مَيِّتًا ۝

كَذَلِكَ الْخُرُوجُ ۝ (ق ۹ تا ۱۱)

(۲) يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَيُحْيِي الْأَرْضَ بَعْدَ

مَوْتِهَا ۝ وَكَذَلِكَ تُخْرَجُونَ ۝ (روم ۱۹)

(۳) فَانْظُرْ إِلَىٰ اثَرِ رَحْمَتِ اللَّهِ كَيْفَ يُحْيِي الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۝ إِنَّ ذَٰلِكَ لَمُحْيِ

الْمَوْتِ ۝ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝ (روم ۵۰)

(۴) وَتَرَىٰ الْأَرْضَ هَامِدَةً فَإِذَا أَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَاءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَأَنْبَتَتْ

مِنْ كُلِّ زَوْجٍ بَهِيجٍ ۝ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّهُ يُحْيِي الْمَوْتٰى وَاَنَّهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿٦﴾ (حج ۵۶)

(۵) وَمِنْ اٰيٰتِهٖ اَنَّكَ تَرٰى الْاَرْضَ خَاشِعَةً فَاِذَا اَنْزَلْنَا عَلٰیهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ ۚ اِنَّ الَّذِيْ اَحْيَاَهَا لَمُبْحٰى الْمَوْتٰى ۚ اِنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۳۹﴾ (حم السجدة ۳۹)

(۶) وَاللّٰهُ الَّذِيْ اَرْسَلَ الرِّیْحَ فَتُثْبِتُ سَحَابًا مِّمَّنْ اِلٰى بَلَدٍ مَّيِّتٍ فَاَحْيٰىنَا بِهٖ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ كَذٰلِكَ النُّشُوْرُ ﴿۹﴾ (فاطر ۹)

(۷) وَهُوَ الَّذِيْ يُرْسِلُ الرِّیْحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ۚ حَتّٰى اِذَا اَقْلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنٰهُ لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ فَاَنْزَلْنَا بِهٖ الْمَآءَ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ۚ كَذٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتٰى لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿۵۴﴾ (اعراف ۵۴)

ترجمہ

(۱) اور آسمان سے ہم نے بابرکت پانی نازل کیا اور اس کے ذریعے ہم نے باغات اور اجناس کو کہ جو بوئے جاتے ہیں، نشوونمادی، اور بلند قامت کھجور کے درختوں کو جن کا پھل باہم ملا ہوا ہوتا ہے۔ یہ سب بندوں کو روزی دینے کے لیے ہے اور ہم نے بارش کے ذریعے مردہ زمین کو زندہ کر دیا۔ قیامت میں مردوں کا جی اٹھنا بھی اسی طرح ہے۔

(۲) وہ زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے اور مردہ کو زندہ سے اور زمین کو موت کے بعد زندگی عطا کرتا ہے۔ اسی طرح روز قیامت تم بھی نکالے جاؤ گے۔

(۳) اللہ کی رحمت کے آثار دیکھو کہ وہ کیسے زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کرتا ہے۔ وہی (جس نے مردہ زمین کو زندہ کیا ہے) قیامت میں مردوں کو زندہ کرنے والا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

(۴) تو زمین کو خشک اور مردہ دیکھتا ہے۔ جب ہم اس پر بارش برساتے ہیں تو اس میں حرکت پیدا ہو جاتی ہے، نمو کرتی ہے اور طرح طرح کے خوبصورت پودے اگتی ہیں۔ یہ اس لیے ہے تاکہ جان لو کہ اللہ حق ہے، مردوں

کو زندہ کرتا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

(۵) اس کی آیات میں سے یہ ہے کہ تو زمین کو خشک اور خاضع دیکھتا ہے، لیکن جب ہم اس پر پانی برساتے ہیں تو وہ حرکت میں آ جاتی ہے اور نمو پاتی ہے۔ وہی جس نے اسے زندگی بخشی، مردوں کو بھی زندہ کرتا ہے، وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

(۶) اللہ وہ ہے جس نے ہواؤں کو بھیجا کہ بادلوں کو حرکت میں لے آئیں۔ ان بادلوں کو ہم مردہ زمین کی طرف چلاتے ہیں اور اس کے وسیلہ سے زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کرتے ہیں۔ قیامت بھی اس طرح سے ہے۔

(۷) وہ، وہ ہے جو ہواؤں کو اس کی (باران) رحمت کی خوشخبری دینے والا بنا کر بھیجتا ہے تاکہ جب وہ بوجھل بادلوں کو (اپنے دوش پر) اٹھائیں اس وقت ہم انہیں مردہ زمینوں کی طرف بھیجیں، اس کے ذریعے سے ہم (حیات بخش) پانی نازل کرتے ہیں اور اس کے ذریعے ہم ہر طرح کا پھل (اندھیری مٹی سے) نکال لاتے ہیں اور ایسے ہی (جیسے ہم نے مردہ زمینوں کو زندہ کیا ہے) مردوں کو (قیامت میں) زندہ کریں گے، تاکہ تم متوجہ ہو۔

## تفسیر و جمع بندی آیات

### قیامت مردہ زمینوں کی نئی زندگی کی طرح ہے

پہلی آیت میں حیات کے اصلی سرچشمہ یعنی بارش کے حیات بخش قطروں کا ذکر ہے۔ فرمایا گیا ہے: ”ہم نے آسمان سے بابرکت پانی نازل کیا اور اس کے ذریعے باغوں اور بوئے جانے والے اناجوں کو اگایا (ونزلنا من السماء ماء مبارکاً فأنبتنا به جنات وحب الحمید)

اس طرح پھلوں کے تمام باغات، اناج کے کھیتوں اور غذائی اجناس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔<sup>[۱]</sup> اس کے بعد قرآن ان میں سے آسمان سے باتیں کرتے ہوئے کھجور کے پھلدار درختوں کی طرف اشارہ کرتا ہے جو اس کا اکمل و اتم نمونہ ہے۔ ارشاد فرماتا ہے: اور اس طرح ہم نے کھجور کے بلند قامت درخت اگائے جس پر پھل باہم ملا ہوا ہے۔ (والنحل بأسقات لها

[۱] توجہ رہے کہ ”حب الحمید“ کے معنی ہیں ایسے دانے کہ جو بوئے جانے کے قابل ہوں ”حصید“ ”محصول“ کے معنی ہے یعنی ”بوئے ہوئے“۔

طلع نصید)۔<sup>[۱]</sup>

یہ امر جاذب توجہ ہے کہ ایک طرف تو کھجور کے بلند قامت درختوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو اسی مردہ زمین سے اگے اور ایک ناچیز دانے سے حیران کن اور ناقابل یقین انداز سے پروان چڑھے ہیں اور دوسری طرف باہم ملے ہوئے ان کے پھل کی طرف جسے وہ آسمان کی بلندیوں کی طرف اپنے ساتھ اٹھالے جاتے ہیں۔ اس کا شیریں، حیات بخش پھل جو ایک اعلیٰ غذا ہے جس میں طرح طرح کا ایسا حیاتیاتی مواد ہے جو انسانی جسم کی ضرورت ہے۔<sup>[۲]</sup>

آخر کار قرآن مجید نتیجہ یوں اخذ کرتا ہے: ہدف یہ ہے کہ ہم بندوں کو روزی عطا کریں (رزقا للعباد)۔ اس (بارش) کے ذریعے ہم نے مردہ زمین کو زندہ کر دیا۔ (واحیینا بہ بلدۃ میتا)۔<sup>[۳]</sup> مردوں کا زندہ ہونا بھی اسی طرح ہے (کذلک الخروج)

یہ آیہ اس حقیقت کو بڑی صراحت سے دہراتی ہے کہ قیامت میں انسانوں کا خروج اسی بنیاد پر ہے جس بنیاد پر پودے پھول، اناج کے دانے اور درختوں کے رنگارنگ پھل نکلتے ہیں اور یہ وہ چیز ہے جسے ہم ہر سال دیکھتے ہیں لیکن چونکہ ہم عادی ہو چکے ہیں اس لیے اسے ایک سادہ سا مسئلہ سمجھتے ہیں اور انسانوں کا پھر سے جی اٹھنا چونکہ ہم نے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا، اس لیے کچھ لوگ اسے پیچیدہ اور بعض محال خیال کرتے ہیں، حالانکہ دونوں پر ایک ہی طرح کے قوانین حکم فرما ہیں۔

دوسری آیت میں اس مسئلے کو ایک اور انداز سے پیش کیا گیا ہے، فرماتا ہے: ”اللہ زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے اور مردہ کو زندہ سے (یخرج الحی من المیت و یمیت من الحی)“

یہ فاصلہ جو آپ کو موت و حیات کے درمیان نظر آتا ہے، اس کی ذات پاک کے لیے کچھ بھی نہیں۔ وہ مسلسل زندوں کو مردوں میں سے اور مردوں کو زندوں میں سے نکالتا ہے (توجہ رہے کہ ”یخرج“ فعل مضارع کا صیغہ ہے جو تسلسل پر دلالت کرتا ہے۔ یعنی یہ اس کا ہمیشہ کا کام ہے)۔

لہذا اس دنیا کے خاتمے کا نمونہ جو حیات سے موت کے نکلنے سے عبارت ہے اور اسی طرح معاد کا نمونہ کہ جو موت سے حیات کے نکلنے سے عبارت ہے، تمہاری آنکھوں کے سامنے دہرایا جاتا رہتا ہے اگرچہ بہت محدود پیمانے پر ہی کیوں نہ ہو۔ لہذا اس میں کون سی تعجب کی بات ہے

[۱] ”باسقات“ ”باسق“ کی جمع ہے، اس کے معنی ہیں مرتفع اور بلند۔

[۲] ”طلع“ کھجور کے درخت کے پھل کو کہتے ہیں، جب کہ وہ شروع میں ظاہر ہوتے ہیں اور ”نصید“ باہم ملے ہوئے اور پے درپے کے معنی میں ہے۔ قابل توجہ امر یہ ہے کہ بلند قامت درختوں کا پھل بہت کم ہی خوشہ دار ہوتا ہے، جب کہ کھجور کے درخت کے بڑے بڑے اور بھاری خوشے بہت ہی تھیر انگیز ہوتے ہیں۔

[۳] اگرچہ ”بلدۃ“ مونث ہے لیکن اس کی صفت ”میتا“ مذکر لائی گئی ہے، کیونکہ ”بلدۃ“ یہاں پر ”مکان“ کے معنی میں ہے۔

کہ اس دنیا کے خاتمہ پر تمام زندہ موجودات مرجائیں اور قیامت کے موقع پر تمام انسان حیات نو پالیں، یعنی وہی موت کے حیات میں بدلنے اور حیات کے موت میں بدلنے کا قانون ایک وسیع پیمانے پر عملی شکل اختیار کر لے۔ البتہ موت کا حیات سے نکلنا تو سب پر واضح ہے لیکن چونکہ ہو سکتا ہے کہ حیات کا موت سے نکلنا بعض کے نزدیک قابل تامل ہو، لہذا آیت کے آخر میں فرماتا ہے: اور وہ زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کرتا ہے اور اسی طرح تم بھی (قیامت کے روز) نکالے جاؤ گے۔ (و یحی الارض بعد موتہا و کذلک تخرجون)

”کذلک تخرجون“ (اسی طرح تم مبعوث کیے جاؤ گے)۔ یہ جملہ بڑی وضاحت سے اس حقیقت کو پیش کرتا ہے کہ پودوں اور مردہ زمینوں کا چھوٹی سطح پر پھر سے جی اٹھنا اور اس عظیم اور وسیع معاد اور پھر سے جی اٹھنے میں کوئی فرق نہیں۔ اس مسئلے پر تھوڑا سا بھی غور و خوض کیا جائے تو ہر طرح کی غلط فکراور شیطانی وسوسے، جو معاد کے بارے میں پیدا ہوتے ہیں، برطرف ہو جائیں۔

ہاں اس عظیم و وسیع جہان میں ہر لحظہ ہزار ہائی کونٹیلیں پھوٹی ہیں اور نئی زندگیاں ظہور پاتی ہیں اور ہر لحظہ اس دنیا کے گوشہ و کنار میں مردہ زمینیں حیات تازہ سے بہرہ ور ہوتی ہیں۔ یہ اللہ کی ہمیشہ کی اور ایک دائمی سنت ہے جو زمینوں کو معاد کی یاد بھی دلاتی ہے۔

تیسری زیر بحث آیت میں ہواؤں اور بادلوں کے آگے پیچھے آنے اور ان کے ساتھ پھر بارش کے وجود میں آنے کا ذکر کرنے کے بعد فرماتا ہے: اب آثار رحمت الہی کو دیکھو کہ کس طرح زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کرتا ہے (فانظر الی آثار رحمت اللہ کیف یحی الارض بعد مرثہا)

”جو یہ کچھ کرتا ہے وہی قیامت میں مردوں کو زندہ کرنے والا ہے۔“ (ان ذلک لمحی الموتی)

ہاں ”وہ ہر چیز پر قادر ہے۔“ (وہو علی کل شیء قدير)

”مقائیس اللغۃ“ کے مطابق ”آثار“ جو ”اثر“ کی جمع ہے، تین معنی میں آیا ہے:

۱۔ مقدم کرنا

۲۔ یاد کرنا اور

۳۔ وہ آثار جو کسی چیز کے باقی رہ جاتے ہیں۔

لیکن بعض اہل لغت نے ان تمام معانی کو تیسرے معنی میں سمودیا ہے کیونکہ کسی چیز کو مقدم کرنا اور اسے یاد کرنا ان آثار فضیلت اور برتری کے عوامل کی وجہ سے ہوتا ہے جو اس میں باقی رہے۔

”رحمۃ اللہ“ کی تعبیر اس مقام پر حیات بخش بارشوں کی طرف اشارہ ہے جو رحمت الہی کا ایک زندہ اور آشکار نمونہ ہے۔ اس کے آثار ہر جگہ ظاہر ہوتے ہیں۔ یہ مردہ زمین کو زندہ کرتی ہے، مردہ دلوں کو زندگی بخشی ہے، آلودہ اور مردہ ہوا کو نشاط حیات عطا کرتی ہے اور انسانی جسم و روح پر نور حیات چھڑکتی ہے۔

”ذلک“ دور کے لیے اسم اشارہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کے لیے اس کا آثار حقیقت اس کے مقام کی اس عظمت کی طرف اشارہ ہے جو فکروں اور عقلوں کی دسترس سے ماوراء ہے۔

”ان“ تاکید کے لیے ”لمحی“ کا ”ل“ بھی تاکید کے لیے ہے اور پھر جملہ اسمیہ بھی تاکید کے لیے آتا ہے۔ یہ سب اس حقیقت کے اثبات کے لیے ہیں جو اپنی بارانِ رحمت کے ذریعے مردہ زمینوں کو زندہ کرتا رہتا ہے۔ وہ یہ طاقت بھی رکھتا ہے کہ مردہ انسانوں کو حیاتِ نوعطا کرے۔

”انظر“ (دیکھ) یہ تعبیر اس لحاظ سے جاذبِ نظر ہے کہ کہتا ہے: معاد ایک حسی اور قابلِ دید مسئلہ ہے اور اسے تم ہمیشہ اپنی آنکھوں سے دیکھتے رہتے ہو۔ تو پھر کیوں اس کا تمسخر اڑاتے ہو یا انکار کرتے ہو؟

چوتھی آیت میں رحمِ مادر میں نطفے کے ارتقائی اور تکمیلی سفر اور جنین کے تغیرات جو امکانِ معاد کے لیے ایک روشن دلیل کی حیثیت رکھتے ہیں، کا ذکر کرنے کے بعد پودوں کے نطفوں کا ذکر کرتا ہے جو رحمِ زمین میں پرورش پاتے ہیں۔ فرماتا ہے: ”توزمین کو (فصلِ سرما میں) خشک اور مردہ دیکھتا ہے۔“ (وتری الارض هامدة) [۱]

جب ہم اس پر بارش کا پانی برساتے ہیں تو وہ انگڑائی لیتی ہے، حرکت میں آتی ہے، نشوونما پاتی ہے اور طرح طرح کے دل انگیز پودے اگتی ہے (فاذا انزلنا علیہا الماء اهتزت وربت وانبتت من کل زوج بہیج)۔

واقعاً قرآن مجید ایک عجیب کتاب ہے۔ جب وہ کسی حقیقت پر تاکید اور اسے افکار و اذہان میں ثبت کرنے کے لیے تکرار کرنا چاہتا ہے تو ایسے طرح طرح کے اور مختلف پیرائے کے لباس میں اسے پیش کرتا ہے کہ انسان ہر بار ایک بالکل نئی بات محسوس کرتا ہے اور وہ اس حقیقت کو ایک نئے روپ میں دیکھتا ہے۔ قرآن کا تکرار نہ ملال انگیز ہے نہ کسی نئی بات سے خالی۔ ہمیشہ کسی نئے درس کا حامل ہوتا ہے۔ اس کا نمونہ ہم مردہ زمینوں کے احیاء کے بارے میں موجود قرآنی آیات میں دیکھ رہے ہیں۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ قرآن خاص طور پر زیر بحث آیت میں، جسے اس نے تغیراتِ جنین کے مسئلے پر عطف کیا ہے، یہ امر یاد دلاتا ہے کہ انسانی، حیوانی اور نباتاتی حیات سب ایک ہی مقولے سے ہیں اور ان میں سے ہر ایک کی معاد کے نمونے جنہیں ہم اس جہان میں اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور لمس کرتے ہیں، معاد دیگر کے امکان پر دلیل ہیں۔

”تری“ (تو دیکھتا ہے) کی تعبیر ”انظر“ (دیکھ) کی طرح جو آیہ ماقبل میں آیا ہے، جہانِ نباتات کی معادِ عظیم کے محسوس ہونے پر تاکید ہے۔

[۱] ”ہامدة“ ”ہمود“ کے مادہ سے ہے۔ ”مفردات“ میں راغب کے بقول یہ دراصل آگ کے بجھ جانے (اور اس کی روشنی اور حرارت ختم ہو جانے) کے معنی میں ہے۔ لیکن بعض ارباب لغت اور مفسرین نے اس کے اور بھی معنی ذکر کیے ہیں۔ مثلاً خشک ہونا، ساکت ہو جانا، مرجانا اور کہنہ ہو جانا۔ زیر بحث آیت میں یہ سب تعبیرات درست ہیں۔ فصلِ سرما میں زمین خشک، خاموش اور ساکت ہو جاتی ہے جب کہ فصلِ بہار میں اس میں جان پڑ جاتی ہے اور وہ حرکت میں آ جاتی ہے گویا بولنے لگتی ہے۔ (مولف محترم نے زمین کے مردہ ہونے کو فصلِ سرما سے جو محض کیا ہے یہ زمین کے ہر خطے کے لیے ضروری نہیں۔ مترجم)

”اھتوت“ ”اتھزاز“ کے مادہ سے ہے اور یہ ”ھز“ سے شدید تحریک کے معنی میں لیا گیا ہے۔ بعض نے اسے پیاری اور اچھی حرکات کے معنی میں تفسیر کیا ہے۔ اس مقام پر یہ ایسے اچھے تغیرات اور ایسی مختلف حرکات کے معنی میں ہے جو انواع و اقسام کے پودوں کے اگنے سے صفحہ زمین پر نمودار ہوتی ہیں۔

”ربت“ ”ربو“ (بروزن غلو) کے مادہ سے ”نمو“ کے معنی میں ہے۔ یہاں مراد زمین کی نمو ہے نہ کہ پودوں کی اور اس کی نمو سے مراد زمین اور مٹی کے مختلف اجزاء سے جڑوں، تنوں اور شاخوں کا نمودار ہونا ہے۔ جن لوگوں نے اسے پودوں کی نمو کی طرف اشارہ سمجھا ہے انہوں نے بعد کے جملے سے غفلت کی ہے کیونکہ فرمایا گیا ہے: ”وانبتت من کل زوج بہیج“ (زمین ہر طرح کے خوبصورت اور خوش منظر پودے کو اگاتی ہے)۔

پانچویں آیت میں وہی ماقبل کی آیت کا مضمون ہے، البتہ دو فرق ہیں، ایک تو یہ کہ آیت مردہ زمینوں کے احیاء کو توحید پر دلیل بھی شمار کرتی ہے اور معاد کے لیے ایک علامت بھی۔ فرماتا ہے: یہ اس کی آیات میں سے ہے کہ تو زمین کو خشوع میں دیکھتا ہے۔ البتہ جب ہم اس پر پانی برساتے ہیں تو وہ حرکت میں آتی ہے اور نمو کرتی ہے (ومن ایتنہ انک تری الارض خاشعة فاذا انزلنا علیہا الماء اھتوت وربت)۔

جس نے اسے زندہ کیا ہے وہی مردوں کو زندہ کرنے والا ہے، کیونکہ وہ ہر چیز کی قدرت رکھتا ہے۔ (ان الذی احیا ہا لمحی الموتی انه علی کل شیء قدير)۔

یہاں مردہ زمینوں کو ”خاشعة“ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ المیزان کے مطابق خشک اور بنجر زمین کو یہاں فقیر اور بے بضاعت شخص سے تشبیہ دی گئی ہے، جو ذلت و حقارت میں گرفتار ہوتا ہے، جب کہ بارش کے نازل ہونے کے بعد وہ ایسی ہو جاتی ہے جیسے کسی کو فراواں دولت ہاتھ آئی ہو، وہ بہترین لباس زیب تن کرتی ہے، اس کی قامت صاف، سیدھی اور پر نشاط ہو جاتی ہے اور یوں وہ حرکت میں آتی ہے، اس طرح سے کہ اس کی صورت سے آثار نعمت نمایاں ہوتے ہیں۔<sup>[۱]</sup>

ایک اور نکتہ جس کا اس تعبیر سے استفادہ کیا جاسکتا ہے، وہ ایک اخلاقی درس ہے۔ وہ یہ کہ جس طرح سے خاشع و خاضع زمین پر رحمت الہی ہوتی ہے، اس میں یہ سب آثار و برکات اور نمو و نشاط پیدا ہوتے ہیں، خاشع و خاضع بندے بھی اس کی وسیع رحمت سے بہرہ یاب ہوتے ہیں، علم و ایمان اور تقویٰ کے شگوفے ان کے صفحہ وجود پر پھوٹتے ہیں۔

چھٹی آیت میں پھر یہی مسئلہ (ایک تازہ تعبیر کے ساتھ) درپیش ہے۔ نزول باران کی کیفیت بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”اللہ وہی ہے جس نے ہواؤں کو بھیجا کہ بادلوں کو حرکت میں لے آئیں، پھر ہم انہیں مردہ زمینوں کی طرف چلاتے ہیں اور اس کے ذریعے ہم زمین کو ان کی موت کے بعد زندگی دیتے ہیں۔“ (واللہ الذی ارسل الریاح فتثیر سحابا فسقناہ الی بلد میت فاحیینا بہ الارض بعد



موتھا۔

مردوں کا محشور ہونا بھی اسی طرح ہے (کذلک الذنور)۔  
درحقیقت یہ آیت مبداء کے اثبات کے لیے بھی دلیل ہے، یعنی اللہ کی پاک ذات کے لیے اور معاد کے لیے بھی دلیل ہے۔  
آیت کے آغاز میں اللہ کی معرفت اس گہرے اور دقیق نظام کے ذریعے کروائی گئی ہے جو ہواؤں کے چلنے، بادلوں کے حرکت کرنے، مردہ زمینوں کی آبیاری اور ان کے احیاء پر حکم فرما ہے۔ آخر میں مسئلہ معاد کی طرف ایک زندہ اور پر معنی اشارہ کیا گیا ہے۔ گویا ایک بات کے ذریعے دو مقصد حاصل کیے گئے ہیں۔

”کذلک الذنور“ میں انسانوں کے احیاء کو مردہ زمینوں کے احیاء سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ جملہ اس معنی کی طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے جیسے ہوائیں بادلوں کے مختلف ٹکڑوں کو آپس میں ملا دیتی ہیں اور انہیں بار آور بناتی ہیں، روز قیامت انسانی ارواح بھی جسموں کی طرف حرکت کریں گی۔ مٹی کے پراگندہ ذرے فرمان الہی سے جمع ہو جائیں گے اور زندگی پالیں گے۔  
رسول اللہ سے مروی ایک حدیث میں ہے کہ آپ کے اصحاب میں سے ایک نے عرض کیا:

**یا رسول اللہ! کیف یحی اللہ الموتی وما ایتہ ذلک فی خلقہ**  
”اللہ کس طرح مردوں کو زندہ کرتا ہے اور خلق میں اس کا نمونہ کیا ہے؟“  
رسول اللہ نے فرمایا:

**اما مررت بوادی اهلك محلا ثم مررت به یہتز خضرا**<sup>[۱]</sup>  
”کیا تم کبھی کسی ایسی زمین سے نہیں گزرے جو مر گئی ہو اور پھر جب تم وہاں سے گزرے ہو تو وہ سرسبز ہو؟“  
اس نے کہا: ”ہاں یا رسول اللہ!“  
فرمایا:

**فکذلک یحی اللہ الموتی وتلك ایتہ فی خلقہ**  
”بس یونہی اللہ مردوں کو زندہ کرتا ہے اور کائنات میں اس کا نمونہ یہی ہے۔“<sup>[۲]</sup>  
ساتویں اور آخری آیت میں بھی ان ہواؤں کے بھیجے جانے کا ذکر ہے جو بارانِ رحمت سے پہلے بشارت بن کر آتی ہیں۔ پھر ان بھاری

[۱] ”محمل“، ”محل“ (بروزن ”نخل“) کے مادہ سے ہے۔ اس کے معنی ہیں، خشک سالی، بارش نہ ہونا اور پودوں کا خشک ہونا (مجمع البحرین، مادہ ”محل“)

[۲] تفسیر قرطبی اور روح البیان، زیر بحث آیہ کے ذیل میں



بادلوں کا تذکرہ ہے کہ جودوش ہوا پر سوار ہو کر مردہ زمینوں کی طرف رواں دواں ہوتے ہیں اور پھر بارش کے حیات بخش قطرے ان سے گرتے ہیں (وہو الذی یرسل الریاح بشر ابین یدی رحمتہ حتی اذا اقلت سحابا ثقالا سقنہ لبلد میت فانزلنا بہ الماء) [۱] اسی مقام پر فرماتا ہے: اس کے ذریعے سے ہم (سیاہ اور مردہ مٹی سے) طرح طرح کے پھل نکالتے ہیں اور اسی طرح ہم (قیامت میں) مردوں کو (قبروں سے) نکالیں گے (فاخر جنابہ من کل الشمرات کذلک نخرج الموتی لعلکم تذکرون)۔ لعلکم تذکرون اس طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ حیران کن منظر اس جہان میں تمہارے سامنے پیش کرتا ہے تاکہ ایک طرف تم اس کی ذات پاک کو سمجھ سکو اور دوسری طرف دوسرے جہان میں معاد اور قیامت کو سمجھ سکو۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ ایک روایت میں رسول اکرمؐ سے مروی ہے:

**ثم یرسل اللہ مطرا کانہ الطل فتبت منہ اجساد الناس**

**ثم یقال: یا ایہا الناس ہلموا الی ربکم وقفوہم انہم مسئلون**

پھر اللہ بارش بھیجتا ہے قطروں کی صورت میں اور اس کے ذریعے لوگوں کے اجسام میں نمود پیدا ہوتی ہے۔

پھر کہا جاتا ہے: اے لوگو! اپنے پروردگار کی طرف آؤ اور انہیں کھڑا کرو کہ وہ اپنے اعمال کے جواب دہ ہیں۔ [۲]

بعض مفسرین کے کلمات سے استفادہ ہوتا ہے کہ وہ بارش ایک عام بارش نہیں ہے، بلکہ نطفہ کے پانی سے شباهت رکھتی ہے جس سے انسان پیدا ہوتا ہے۔ یہ بارش چالیس روز تک جاری رہتی ہے، انسانوں کے بے جان اجزاء پر عجیب تاثر مرتب کرتی ہے اور ان میں زندگی کی روح پھونکتی ہے۔ [۳]

## ایک سوال کا جواب

قرآن مجید میں مندرجہ بالا آیات میں ایک واضح حسی مثال سے استفادہ کرتے ہوئے منکرین معاد کو ایک محکم جواب دیا گیا ہے۔ گویا شاہد کو غیب کی دلیل بنایا ہے اور آج کو کل کا گواہ ٹھہرایا ہے کیونکہ ہر سال کم از کم ایک بار اور کبھی دو یا چند بار مردہ زمینیں بارانِ رحمت الہی کے برسنے سے زندہ ہو جاتی ہیں اور نئی زندگی پاتی ہیں، بلکہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ بات تو دنیا میں ہر روز رونما ہوتی ہے، ہر روز کوئی نیا پودا مردہ زمین سے اگتا ہے اور ہر روز معاد کا منظر انسان کی آنکھوں کے سامنے ظاہر ہوتا ہے۔

[۱] توجہ رہے کہ معنی کے لحاظ سے ”سحاب“ جمع ہے، لہذا اس کی صفت ”ثقال“ آتی ہے۔ البتہ یہ لفظ کے اعتبار سے مفرد ہے، لہذا ”سقناہ“ کی ضمیر مفرد ہے۔

[۲] تفسیر قرطبی ج ۴ ص ۲۶۶

[۳] تفسیر قرطبی ج ۴ ص ۲۶۶

اب یہ سوال پیش آتا ہے کہ عصر حاضر کے علماء اور سائنسدان اس بات پر متفق ہیں اور سب تجربات ظاہر کرتے ہیں کہ موجودات زندہ فقط موجودات زندہ ہی سے پیدا ہوتے ہیں؟ اگر کسی پودے کا بیج یا دانہ زمین میں نہ ہو تو بارش کے برسنے کا کوئی اثر نہیں ہوگا۔

پھر پودوں کے بیج دو حصوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ ان کا بڑا حصہ غذائی مواد کا ہوتا ہے اور چھوٹا حصہ ایک زندہ سیل جس کو جب پرورش کے لیے درکار حالات (خصوصاً پانی) فراہم ہوتے ہیں، تو وہ دانہ میں موجود غذائی مواد سے اور اسی طرح زمین میں موجود غذائی مواد سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نمودار ہوتا ہے اور اگر یہ زندہ سیل (LIFE CELL) نہ ہوتا تو مردہ زمینوں کا زندہ ہونا ممکن نہ تھا۔

اس سوال کے جواب میں ہم یہ کہتے ہیں کہ بلاشبہ زندہ سیل ایک چھوٹا سا ذرہ ہوتا ہے جو مردہ اجزاء کو زمین سے اپنے میں جذب کرتا ہے اور انہیں موجود زندہ کے پیکر میں تبدیل کر دیتا ہے۔ (غور کیجیے گا)

دوسرے الفاظ میں کھجور کا ایک درخت کہ جس کا وزن کبھی کبھی ایک ٹن تک ہوتا ہے آغاز میں کھجور کی گٹھلی کے ساتھ وہ ایک چھوٹا سا سیل ہوتا ہے، جس کا وزن تقریباً ایک ملی گرام ہوتا ہے، پھر وہ زمین، پانی اور ہوا سے تقریباً ایک ٹن مواد جذب کرتا ہے جب کہ یہ سب چیزیں موجودات مردہ ہیں۔ یہ ان سب کو زندگی عطا کرتا ہے۔ یہی درحقیقت مردہ زمینوں کا موجود زندہ میں تبدیل ہونا ہے۔

یہ امر قابل توجہ ہے کہ قرآن کہتا ہے مردہ زمینیں زندہ ہو جاتی ہیں (یہ نہیں کہتا کہ مردہ درخت اور بیج زندہ ہو جاتے ہیں، کیونکہ وہ پوری طرح مرے ہوئے نہیں ہوتے) یعنی یہ مردہ زمینیں پودوں اور درختوں کا حصہ بن جاتی ہیں اور زندہ خلیوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔

البتہ اگر ہم اس کرۂ زمین پر زندگی کی تخلیق کے آغاز پر نظر ڈالیں تو مسئلہ اس سے بھی زیادہ واضح ہو جاتا ہے کیونکہ جب زمین سورج سے جدا ہوئی تو یہ ایک آتشیں اور جلتا ہوا کرہ تھا اور ظاہر ہے کہ کوئی زندہ موجود اس پر نہیں تھا۔

لیکن بعد ازاں جب یہ کافی سرد ہو گئی اور زندہ موجودات کی پرورش کے لیے تیار ہو گئی تو اس پر بہت زیادہ بارشیں ہوئیں جنہوں نے اسے اور بھی نرم اور تیار کر دیا۔

کسی پودے کی زندگی کی پہلی شاخیں اس طرح سے زمین کے مردہ مواد سے پھوٹیں کہ ابھی تک اس کے اسرار سب سائنس دانوں پر مخفی ہیں اور یوں ایک مردہ موجود زندہ ہو گیا۔ (پھر غور کیجیے گا)

## ۴۔ تغیرات جنین

## اشارہ

قرآن کی متعدد آیات میں امکان معاد کے اثبات کے لیے ایک اور راستہ بھی اختیار کیا گیا ہے اور وہ ہے نطفے میں واقع ہونے والے تغیرات، اس وقت سے لے کر جب وہ رحم کی پراسرار اور پیچیدہ دنیا میں ٹھہرتا ہے، اس وقت تک جب وہ متولد ہوتا ہے۔ درحقیقت ان میں سے ہر مرحلہ حیات تازہ اور معاد کا ایک نمونہ ہے۔

ان تغیرات کی کیفیت کا یہ عالم ہے کہ انسان جب ان کا مطالعہ و مشاہدہ کرتا ہے تو حیرت و استعجاب میں کھو جاتا ہے کہ کس طرح ایک ناچیز نطفہ اس چھوٹی سی مدت میں اس طرح کے تحولات سے گزرتا ہے۔

ایک طرف یہ صریح، بے وقفہ اور حیرت انگیز تبدلات مبداء عالم اور اس قادر ذات کے وجود پر دلیل ہیں (جو رحم مادر کی تہری ظلمتوں) میں یوں پانی پر تحریر انگیز نقش بناتا ہے۔ دوسری طرف یہ تحولات حیات بعد از ممات کے مسئلے سے بہت شباهت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید نے دونوں طرح (توحید و معاد) کی گفتگو میں اس کا ذکر کیا ہے۔ حق یہ ہے کہ ایسا واقعہ ایسے استفادے کے لیے شائستگی و لیاقت رکھتا ہے۔

اس اشارے کے ساتھ ہم قرآن کی ان آیات کو گوش جان سے سنتے ہیں کہ جو اس سلسلے میں وارد ہوئی ہیں:

(۱) يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِّنْ تُرَابٍ  
ثُمَّ مِّنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِّنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِّنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَغَيْرِ مُّخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ  
لَكُمْ ۚ وَنُقَرُّ فِي الْاَرْحَامِ مَا نَشَاءُ اِلٰى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ  
طِفْلًا..... ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّهُ يُحْيِي الْمَوْتٰى وَاَنَّهُ عَلٰى  
كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿٦﴾ (حج، ۵، ۶)

(۲) اَلَمْ يَكْ نُطْفِئْهُ مِّنْ مَّنِيٍّ يُمْنٰى ﴿۳۵﴾ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوًى ﴿۳۶﴾ فَجَعَلَ مِنْهُ  
الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ﴿۳۷﴾ اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقَدِيْرٍ عَلٰى اَنْ يُحْيِيَ الْمَوْتٰى ﴿۳۸﴾  
(القيصۃ: ۳۷ تا ۴۰)

(۳) وَاَنَّهُ خَلَقَ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ﴿۳۵﴾ مِّنْ نُّطْفَةٍ اِذَا تُمْنٰى ﴿۳۶﴾ وَاَنَّ عَلَيَّهٖ

النَّشَآةَ الْآخِرَىٰ ﴿٢٤﴾ (نجم: ۲۴ تا ۲۷)

(۳) قُتِلَ الْإِنْسَانُ مَا أَكْفَرَهُ ﴿٢٤﴾ مِنْ أَيِّ شَيْءٍ خَلَقَهُ ﴿٢٥﴾ مِنْ نُطْفَةٍ ۖ خَلَقَهُ فَقَدَرَهُ ﴿٢٦﴾ ثُمَّ السَّبِيلَ يَسَّرَهُ ﴿٢٧﴾ ثُمَّ أَمَاتَهُ فَأَقْبَرَهُ ﴿٢٨﴾ ثُمَّ إِذَا شَاءَ أَنْشَرَهُ ﴿٢٩﴾ (عبس: ۱۴ تا ۲۲)

(۵) وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلَالَةٍ مِّن طِينٍ ﴿١٤﴾ ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِي قَرَارٍ مَّكِينٍ ﴿١٥﴾ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظْمًا فَكَسَوْنَا الْعِظْمَ لَحْمًا ﴿١٦﴾ ثُمَّ أَنْشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ ۖ فَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ ﴿١٧﴾ ثُمَّ إِنَّكُمْ بَعْدَ ذَلِكَ لَمَيِّتُونَ ﴿١٨﴾ ثُمَّ إِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ تُبْعَثُونَ ﴿١٩﴾ (مومنون: ۱۲ تا ۱۶)

ترجمہ

(۱) اے لوگو! اگر تمہیں پھر جی اٹھنے میں شک ہے (تو اس نکتے کی طرف توجہ کرو کہ) ہم نے تمہیں خاک سے پیدا کیا، پھر نطفے سے، پھر جمے ہوئے خون سے اور پھر لوتھڑے سے جن میں سے بعض کی شکل ہے اور بعض بغیر شکل کے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ ہم تم پر واضح کر دیں (کہ ہم ہر چیز پر قادر ہیں) اور جن جنینوں کو ہم چاہتے ہیں ایک مدت معین تک ماؤں کے رحم میں رکھتے ہیں (اور جنہیں چاہتے ہیں ساقط کر دیتے ہیں) پھر تمہیں ایک بچے کی صورت میں نکالتے ہیں..... یہ اس لیے ہے کہ تم جان لو کہ اللہ حق ہے، وہ مردوں کو زندہ کرتا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

(۲) کیا انسان رحم میں ڈالا گیا ایک نطفہ نہ تھا، پھر وہ جما ہوا خون بن گیا، پھر (اللہ نے) اسے پیدا کیا اور موزوں بنایا، پھر اس سے مذکر اور مونث کا جواڑ بنایا۔ کیا وہ ذات اس پر قادر نہیں کہ مردوں کو زندہ کر سکے؟ (۳) وہ وہی ہے جس نے مذکر اور مونث کا جواڑ پیدا کیا، نکلنے والے نطفے سے (جو رحم مادر میں گرتا ہے، اسی طرح) ایجادِ عالم اللہ کے ذمہ ہے (تاکہ عدالتِ ربوہ عمل آئے)۔

(۴) مر جائے یہ انسان! کتنا ناکارہ اور ناشکرا ہے۔ (اللہ نے) اسے کس چیز سے پیدا کیا، ایک ناچیز نطفے سے اسے پیدا کیا، پھر اس نے اسے ایک پیمانہ کے مطابق اور موزوں بنایا پھر اسے مار ڈالا اور قبر میں چھپا دیا، جب

چاہے گا اسے زندہ کرے گا۔

(۵) ہم نے انسان کو مٹی کے جوہر سے پیدا کیا۔ پھر اسے نطفے کی صورت میں مقام مطمئن (رحم) میں رکھا۔ پھر نطفے کو ہم نے علقہ (جما ہوا خون) علقہ کو مضغہ میں بدلا (جو گوش کے لوٹھڑے کی مانند ہوتا ہے)۔ مضغہ کو ہم نے ہڈیوں کی صورت دی، پھر ہم نے اسے ایک نئی خلقت بخشی۔ وہ اللہ بزرگ و پر برکت ہے جو بہترین پیدا کرنے والا ہے۔ اس کے بعد تم مر جاؤ گے اور روز قیامت اٹھائے جاؤ گے۔

## تفسیر و جمع بندی آیات

### قیامت میں شک ہے تو جنین کو دیکھیں

پہلی آیت میں روئے سخن سب انسانوں کی طرف ہے، وہ انسان جو زمان و مکان کی پھیائیوں میں بلا استثناء زندگی بسر کر رہے ہیں۔ فرماتا ہے: اے انسانو! اگر پھر جی اٹھنے اور قیامت میں تمہیں شک ہے تو (اس نکتے کی طرف توجہ کرو کہ) ہم نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا ہے، پھر اس کے بعد نطفہ سے، اس کے بعد علقہ (جھے ہوئے خون) سے اور اس کے بعد مضغہ سے (کہ جو گوشت کے لوٹھڑے سے ملتا جلتا ہے)، ان میں سے بعض کی شکل ہوتی ہے اور بعض کی نہیں مقصد یہ تھا کہ ہم تم پر واضح کر دیں (کہ ہم تو ہر چیز پر قادر ہیں)۔ (یا ایہا الناس ان کنتم فی ریب من البعث فانا خلقنکم من تراب ثم من نطفۃ ثم من علقۃ ثم من مضغۃ مخلقة و غیر مخلقة لنبدین لکم)۔ اس طرح سے مراحل خلقت میں انسان کے چار مرحلوں کی طرف اشارہ کرتا ہے (مٹی کا مرحلہ، نطفہ، علقہ اور پھر مضغہ جن میں سے ہر کوئی اپنی جگہ پر ایک پیچیدہ اور عجیب دنیا ہے)۔

اس کے بعد بات یوں جاری رکھتا ہے: پھر جن جنینوں کو ہم چاہیں (کہ وہ زندہ متولد ہوں) ایک مدت معین تک ماؤں کے رحم میں رکھتے ہیں (تاکہ اپنی تکمیل کا دور پورا کریں اور جنہیں ہم مناسب سمجھتے ہیں، ساقط کر دیتے ہیں) (ونقر فی الارحام ما نشاء الی اجل مسمی)۔

آخر کار یہ نشیب و فراز طے کرنے کے بعد ہم تمہیں ایک مکمل بچے کی صورت میں ماں کے شکم سے نکالتے ہیں۔ (ثم تخرجنکم طفلاً)۔

اس کے بعد دنیا میں حیات انسانی کے مختلف مراحل کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ پھر جہاں نباتات کا رخ کرتا ہے۔ یہاں نباتات کے بیجوں کے رحم زمین میں قرار پائے اور مردہ زمینوں کے بارش کے ذریعے زندہ ہونے کی ایک اور مثال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اضافہ فرماتا ہے: یہ سب اس لیے ہے کہ تم جانتے ہو کہ اللہ حق ہے (اور اس لیے کہ پایہ توحید تمہاری روح میں محکم ہو) نیز تم جان لو کہ وہ مردوں کو زندہ کرتا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے (ذلک بان اللہ هو الحق و انه یحیی الموتی و انه علی کل شیء قدير)۔

یوں اس جہان ہستی کے امور و مظاہر کی طرف کبھی زاویہ توحید سے نگاہ کرتا ہے اور کبھی زاویہ معاد سے۔ اس آیت میں ایسے دقیق و لطیف نکتے ہیں کہ اگر ہم ان کی طرف توجہ کریں تو ان دو اہداف تک پہنچنے میں معاون ہیں، مثلاً:

(۱) منکرین معاد اگرچہ یقینی طور پر معاد کی نفی کرتے ہیں، تاہم قرآن انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے: اگر تمہیں شک و تردید ہو تو..... یہ بات اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ اس حقیقت کی نفی کے لیے کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ تم معاد میں شک کرو اور واضح ہے کہ جو شخص شک میں ہو اسے چاہیے کہ تحقیق کرنے نہ کہ انکار۔

یہ امر قابل توجہ ہے کہ یہاں ”ذریب“ نکرہ کی صورت میں آیا ہے جو ایسے مواقع پر بیانِ حقارت کے لیے ہوتا ہے یعنی اس سلسلے میں تمہارا شک کمزور اور بے حیثیت ہے، کیونکہ دلائل معاد تو شاہد ہیں۔

(۲) اس آیت میں تخلیق انسانی کے پہلے مرحلہ کو مٹی کہا گیا ہے۔ ممکن ہے یہ تعبیر تخلیق آدم کی طرف اشارہ ہو جو مٹی سے تھی، یا پھر سب انسانوں کی خلقت کی طرف اشارہ ہو کیونکہ جسم انسانی کا اہم حصہ جس مواد سے بنتا ہے وہ مٹی ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ بہر حال انسانی پیدائش مردوں کی حیات نو پر ایک روشن دلیل ہے۔

(۳) اس آیت میں خاک سے انسانی خلقت کے ذکر کے علاوہ انسانی تکمیل کے پانچ مراحل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے (نطفہ، علقہ، مضغہ، بعد کا ارتقاء اور ماں کے پیٹ سے تولد)۔ اس کے بعد جسمانی و روحانی بلوغ اور اس کے بعد بڑھاپے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اس طرح سے کل سات مرحلے ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ ہمیں فی الحال پہلے پانچ مراحل سے سروکار ہے جن میں سے ہر ایک حیات نو ہے، تولد جدید ہے اور معاد کے مناظر میں سے ایک منظر ہے۔

(۴) ”لَتَبْدِينَ لَّكُمْ“ (تاکہ تمہارے لیے واضح کریں)، یہ ایک سربستہ تعبیر ہے جو خالق کے علم و قدرت کی طرف بھی اشارہ ہو سکتی ہے، یعنی مسئلہ توحید کی طرف اور حیات بعد از موت یعنی مسئلہ معاد کی طرف بھی۔

(۵) یہ امر جاذب نظر ہے کہ یہ عظیم و عجیب تغیرات جو جنین پر گزرتے ہیں، ان میں تغیرات کے اعتبار سے تو بہت فاصلہ ہے۔ ایک نطفے سے آغاز ہوتا ہے کہ جو ایک ذرہ ناچیز ہے۔ یہ نطفہ تبدیلیوں سے گزرتا رہتا ہے، یہاں تک کہ ایک مکمل انسان بن جاتا ہے۔ لیکن ان سب تبدیلیوں کی مدت زمانی بہت کم ہے، تقریباً ۹ مہینے۔ عالم یہ ہے کہ اگر ان عجائبات و تغیرات کو قلم بند کیا جائے تو بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ ان کے مطالعے کے لیے اس سے زیادہ وقت درکار ہوگا۔

ان روشن نشانیوں کے ہوتے ہوئے کیا کوئی گنجائش ہے کہ کوئی ہمارے حضور امکانِ معاد کے بارے میں شک کر سکے؟ دوسری آیت میں یہی بات ایک اور پیرائے میں بیان کی گئی ہے۔ درحقیقت یہ سورہ قیامت کے آغاز مطلب کی طرف اشارہ ہے جس میں فرماتا ہے:

اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نُّجْمِعَ عِظَامَهُ ﴿۳﴾ (قیامتہ ۳)

”کیا انسان کا یہ خیال ہے کہ ہم اس کی (بوسیدہ) ہڈیوں کو جمع نہیں کریں گے؟“

ان آیات میں فرماتا ہے: یہ کیا خیال اور گمان ہے؟ کیا انسان آغاز میں رحم مادر میں ڈالا جانے والا مٹی کا ایک نطفہ نہ تھا؟ بعد ازاں وہ جما ہوا خون بنا، پھر اللہ نے اسے موزوں و متناسب بنایا اور اس سے مذکر و مونث کا جوڑا پیدا کیا۔ (الم یك نطفة من منی یمنی، ثم كان علقة فخلق فسوی، فجعل منه الزوجین الذکر والانثی)۔

کیا وہ (کہ جو ان تیز رفتار تبدیلیوں اور پے در پے اور عجیب تغیرات کو ظلمت گاہ رحم میں وجود میں لایا ہے اور اس قدر مختصر مدت میں جس نے ایسی عظیم مخلوق کو پیدا کیا ہے) اس بات پر قادر نہیں کہ مردوں کو زندہ کرے؟ (الیس ذلک بقدر علی ان یمنی الموتی) اس آیت میں جنین کے صرف چار مراحل کی طرف اشارہ ہوا ہے، نطفہ، علقة، اعضاء کا ہموار و متناسب ہونا اور اس بات کا ظاہر ہونا کہ جنین بیٹا ہے یا بیٹی؟

بعض ارباب لغت کے بقول ”نطفہ“ کے معنی ہیں آب صاف۔ یہی وجہ ہے کہ ”نطف“، لور لور (موتیوں) کے لیے استعمال ہوتا ہے۔<sup>[۱]</sup> لیکن بعض نے اسے تھوڑے سے پانی کے معنی میں لیا ہے۔ یا جو پانی برتن میں بچ جاتا ہے، اسے اس معنی میں تفسیر کیا ہے۔<sup>[۲]</sup> بعض نے یہ بھی تصریح کی ہے کہ نطفہ کے معنی ہیں صاف پانی، یہ کم ہو یا زیادہ۔<sup>[۳]</sup> بعض نے کہا ہے کہ یہ سب نطفہ کے معانی کا جز ہیں البتہ ”نطفہ“ کا معنی صاف پانی یا تھوڑا سا پانی ہے اور ”نطفہ“ کا معنی ہے موتی۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ بعض سائنس دانوں نے، جو حال ہی میں تحقیق کی ہے، اس کے مطابق یہ تھوڑا سا پانی جس کا نام ”نطفہ“ ہے، بدن انسانی کے مختلف غدودوں سے حاصل ہونے والے متعدد قسم کے پانیوں سے تشکیل پاتا ہے، اس کا کچھ حصہ ان بیضوں سے حاصل ہوتا ہے کہ جو سپرمیٹازائڈ (SPERMATOZOIDE) پر مشتمل ہوتے ہیں۔ اس کا دوسرا حصہ ان تخمی پیکٹس سے حاصل ہوتا ہے جو پراسٹیٹ (PROSTATE) غدود کے پاس ہوتے ہیں۔ تیسرا حصہ خود پراسٹیٹ (PROSTATE) سے حاصل ہوتا ہے۔ مٹی کی ظاہری وضع اور اس کی مخصوص بو اسی سے ہوتی ہے۔ اس کا چوتھا حصہ کوپراور تیرہ کی غدود سے حاصل ہوتا ہے۔ تیرہ پیشاب کی نالی کے قریب ہوتی ہے۔

یہ پانچ پانی ایک دقیق اور حساب شدہ تناسب کے ساتھ آپس میں ملتے ہیں اور اس ملاپ کے نتیجے میں وہ حیات آفرین مادہ تشکیل پاتا ہے۔ یہ بات ایک فرانسیسی سائنسدان نے کہی ہے کہ حال ہی میں اسے قرآن اور اسلام کی طرف بہت رغبت پیدا ہو گئی ہے۔ اس سلسلے میں اس نے کتاب بھی لکھی ہے۔ اس کا نظریہ ہے کہ قرآن مجید میں ”امشاج“ (مخلوط شدہ) کی جو تعبیر استعمال ہوئی ہے وہ اسی دقیق معنی کی طرف اشارہ ہے جب کہ نزول قرآن کے زمانے میں یہ بات دنیا کے لوگوں سے اور ان صدیوں کے علماء کی نظروں سے پوشیدہ و پنہاں تھی۔

[۱] مقائیس اللغة و مفردات راغب

[۲] لسان العرب

[۳] قاموس اللغة و مجمع البحرین، لسان العرب



(اقتباس از کتاب: ”تورات، انجیل اور قرآن کا موازنہ“ از ڈاکٹر یو کامی۔ ترجمہ انجینئر ذبیح اللہ دبیر ص ۲۷۱)

بہر حال اس کلمہ کا اس پانی کے لیے استعمال جو جنسی ملاپ کے وقت مروجہ خارج ہوتا ہے اس کی اس کے اصلی معنی سے واضح نسبت کی وجہ سے ہے۔

”منی“ ”منی“ (بروزن ”منع“) کے مادہ سے ہے۔ اس کا معنی ہے اندازہ لگانا اور تقدیر و سر نوشت کا معین کرنا۔ لہذا موت کو ”منیۃ“ اور آرزوؤں کو ”امنیۃ“ کہا جاتا ہے۔ اس کلمہ کا مرد سے نکلنے والے پانی پر اطلاق اس وجہ سے ہے کہ مقدر ہوا ہے کہ اس سے انسان وجود میں آئے۔<sup>[۱]</sup>

لہذا ”المدیک نطف من منی یمنی“ کا مفہوم یہ ہے کہ کیا وہ آغاز میں ایسا ناچیز پانی نہ تھا جس کے بارے میں مقدر ہو گیا تھا کہ انسان اس سے وجود میں آئے؟<sup>[۲]</sup>

جن چار مراحل کا اس آیت میں ذکر ہے ان میں سے ہر ایک حیات بعد از مرگ کے لیے ایک نیا اور تازہ نمونہ ہے۔ اس سے ایک طرف تو واضح طور پر قدرت خالق ظاہر ہوتی ہے اور دوسری طرف حیات بعد از مرگ اور معاد کا امکان بخوبی واضح ہوتا ہے، خاص طور پر نطفے کی جنس کے مذکر ہے یا مونث، جنین شناسی کے عجیب ترین اور پیچیدہ ترین مسائل میں سے ہے۔ ابھی تک اس پر حکم فرما تو انین سائنسدانوں کی چشم تیز میں سے پوشیدہ ہیں۔ ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ ایک بڑی مدت تک رحم مادر میں جنین کی جنس بالکل نامعلوم اور غیر مشخص رہتی ہے اور آخری مراحل میں ظاہر ہوتی ہے۔ نیز ہم جانتے ہیں کہ ایسے دقیق قوانین اس پر حکم فرما ہیں کہ جو ان دو جنسوں کی تعداد کو ایک حد تک برابر اور ایک دوسرے کے نزدیک رکھتے ہیں۔ البتہ ان مسائل کی جزئیات ابھی تک پردہ الہام میں ہیں۔

آپ سوچیں کہ اگر ہر دس بچوں میں سے نو بیٹیاں ہوتیں اور ایک بیٹا یا اس کے برعکس تو انسانی معاشرے میں کیا عجیب بے نظمی، وحشت ناک غوغا اور شدید جھگڑا پیدا ہو جاتا۔

تیسری آیت میں اللہ کی قدرت نمائی کی طرف اشارہ کرنے کے بعد فرماتا ہے: کیا انسان نہیں جانتا کہ اس نے مذکر اور مونث کا جو جوڑا پیدا کیا ہے اس نطفے سے جو رحم میں گرتا ہے (یا مقدر ہوتا ہے کہ ایک انسان اس سے متولد ہو) اور کیا وہ نہیں جانتا کہ اللہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ عالم دیگر کو پیدا کرے، (تاکہ عدالت کا اجراء ہو سکے)؟ (وانہ خلق الزوجین الذکر والانثی من نطفۃ اذا تمنی وان علیہ النشأة الاخری)

ان آیات میں اگرچہ اس حقیقت کی تشریح نہیں کی گئی کہ عالم آخرت کی پیدائش کو تغیرات جنین کے ساتھ موازنہ کر کے معلوم کیا جاسکتا

[۱] تاج العروس فی شرح القاموس

[۲] لیکن بعض مفسرین نے ”یمنی“ کو تقدیر کے معنی میں نہیں لیا بلکہ اس پانی کے رحم میں ڈالے جانے کے معنی میں تفسیر کیا ہے۔ بہر صورت ”من“ بیانیہ ہے نہ کہ تجزیہ۔



ہے، لیکن آیات کا باہمی ارتباط اور تعلق تقاضا کرتا ہے کہ پہلی دوسری کے لیے دلیل اور شاہد کے طور پر ہو جیسا کہ بعض مفسرین نے بھی اس امر کی طرف توجہ کی ہے۔<sup>[۱]</sup>

”النشأة الاخری“ ”ایجاد دیگر“ (دوسری ایجاد) کے معنی میں ہے اور مفسرین کی اکثریت قاطع کا نظریہ یہ ہے کہ یہ حیات آخرت کے معنی میں ہے۔ لیکن بعض کا اصرار ہے کہ یہ جنین میں روح انسانی کے پھونکنے جانے کے معنی میں ہے۔ انہوں نے مندرجہ ذیل آیت کو اس بات کے لیے دلیل بنایا ہے:

**فَكَسَوْنَا الْعِظْمَ لَحْمًا ۖ ثُمَّ أَنْشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ ۖ**

”ہڈیوں پر ہم نے گوشت چڑھایا۔ اس کے بعد ہم نے جنین کو خلقت نو عطا فرمائی۔“ (مومنون ۱۴)

لیکن اس تعبیر (یا اس سے مشابہ دیگر تعبیرات) کو قرآن کی دوسری آیات میں دیکھا جائے تو بخوبی استفادہ ہوتا ہے کہ یہ روز قیامت کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ سورہ عنکبوت کی آیہ ۲۰ میں ہے:

**قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ بَدَأَ الْخَلْقَ ثُمَّ اللَّهُ يُنشِئُ النَّشْأَةَ الْآخِرَةَ ۖ**

”کہو: زمین میں چلو پھرو اور دیکھو کہ اللہ نے کس طرح خلقت کا آغاز کیا۔ پھر اللہ خلقت دیگر کو ایجاد فرماتا ہے۔“

سورہ واقعہ کی آیت ۶۲ میں ہے:

**وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْأَةَ الْأُولَىٰ فَلَوْلَا تَذَكَّرُونَ ۝۶۲**

”تم نے خلقت اول کو جانا ہے۔ پس متوجہ کیوں نہیں ہوتے ہو (کہ عالم دیگر بھی درپیش ہے)۔“

چوتھی آیت میں چھوٹے چھوٹے اور نہایت عمدہ جملوں میں کسی اور پیرائے میں بیان کیا گیا ہے، فرماتا ہے: مرجائے یہ انسان! کس قدر کافر اور ناشکر ہے۔ اللہ نے اسے کس چیز سے پیدا کیا ہے، ایک ناچیز نطفے سے اسے پیدا کیا اور پھر اسے موزوں اور متناسب بنایا اور پھر اس کے لیے راستے کو آسان کر دیا۔ پھر اسے مارتاے اور پھر اسے قبر میں پنہاں کر دیتا ہے۔ پھر جب چاہتا ہے اسے زندہ کر دیتا ہے۔ (قل الانسان ما اكره) من ای شیء خلقت من نطفة خلقه فقدره ثم السبیل یسرہ ثم اماتہ فأقبرہ ثم اشاء انشرہ

ان آیات میں بھی پہلے اس بات کی طرف ایک مجموعی اشارہ کیا گیا ہے کہ انسان کی خلقت کی بنیاد نطفے سے پڑی اور پھر اس نے جنین کے ارتقائی مراحل طے کیے۔ اس کے بعد موت کا ذکر ہے اور پھر حیات بعد از ممات کا ان باتوں کے درمیان منطقی روابط میں سے ایک یہی ہے

کہ ایک سے دوسری پر استدلال کیا جاسکتا ہے۔

یہاں چند نقطے جاذب توجہ ہیں:

۱۔ ”خلقه قدرۃ“ (اسے پیدا کیا اور اس کی تقدیر معین کی) یہ بہت ہی پر معنی تعبیر ہے جس میں دورانِ جنین کے تمام تر انسانی تغیرات آجاتے ہیں۔ تقدیر معین کرنے سے مراد یہاں اس کے اصل وجود کا تعین، اس کے پیکر کے اعضاء کا تعین، ترکیب اجزاء کا تعین، اس کی مختلف ضروریات اور مختلف زمانی فاصلوں جن میں اسے اپنی تکمیل کے دور سے گزرنا ہے، اللہ تعالیٰ نے معین کر دیا ہے، اسے منظم کر دیا ہے اور موزوں بنا دیا ہے۔

بنابریں ”خلقه“ نطفے سے انسانی پیدائش کے پہلے مرحلے کی طرف اشارہ ہے۔ ”فقدرة“ بعد میں موجود پذیر ہونے والے تمام مراحل کی طرف اشارہ ہے۔

۲۔ ”ثم السبیل یسرۃ“ (پھر اس نے راستہ آسان اور ہموار بنایا)۔ یہ بھی ایک پر معنی اور قابل توجہ جملہ ہے۔ ہو سکتا ہے یہ ان امور کی طرف اشارہ ہو:

تکمیل کے مراحل طے کرنے کے بعد پیدائش کو اس کے لیے آسان بناتا ہے۔ عام حالات میں جنین کا سراو پر کی طرف اور پاؤں نیچے کی طرف ہوتے ہیں۔ اچانک تبدیلی آتی ہے اور وہ بالکل الٹ ہو جاتا ہے تاکہ آسان ولادت کے لیے راہ ہموار ہو سکے۔ ماں کے بھی تمام اعضاء اور اندام نرم پڑ جاتے ہیں اور اس پیدائش کے لیے وہ تیار ہو جاتی ہے۔ رحم کے اندر بچے پر ہر طرف سے سخت دباؤ پڑتا ہے تاکہ وہ باہر کا راستہ اپنائے۔ وہ پر آب تھیلی، بچہ عام حالات میں جس میں تیر رہا ہوتا ہے، ناگہاں پھٹ جاتی ہے اور یوں خروج کا تمام راستہ مرطوب ہو جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ بچے کے کئی دنیا میں آنے کے لیے ہر چیز آمادہ ہو جاتی ہے اور راستہ ہر لحاظ سے ہموار ہو جاتا ہے۔

دوسری طرف اللہ تعالیٰ انسان کو عقل و خرد اور طرح طرح کی جبلی خصوصیات و دیت فرماتا ہے جن میں سے ہر کوئی راہ حیات کی راہنمائی ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اللہ اپنے انبیاء اور آسمانی کتب بھی بھیجتا ہے تاکہ اللہ کی اطاعت و بندگی اور اس کی سعادت کے راستے کو ہموار کرے۔

ضمنیاً یہ تعبیر نشان دہی کرتی ہے کہ انسان فاعل مختار و آزاد پیدا کیا گیا ہے۔ کیونکہ یہ نہیں فرماتا کہ اسے راہ طے کرنے پر ابھارتا ہے بلکہ کہتا ہے کہ راستہ اس کے لیے آسان بنایا ہے لیکن راہ طے کرنا خود اسی کے ذمہ ہے۔

پانچویں اور آخری آیت میں جنین کے تکمیل کے مراحل کا تفصیل سے ذکر ہے، یہاں تک کہ اس سلسلہ کی تمام آیات سے زیادہ بات کی گئی ہے۔ اس میں جزئیات و ریزہ کاریوں کا ذکر فرماتا ہے: ہم نے انسان کو مٹی کے جوہر سے پیدا کیا، پھر اسے مقامِ اطمینان (رحم) میں ایک نطفے کی صورت میں قرار دیا، پھر نطفے کو جے ہوئے خون کی صورت دی اور جے ہوئے خون کو لوتھڑے کی صورت، پھر گوشت کے لوتھڑے کو ہم ہڈیوں کی صورت میں لے آئے اور پھر ہم نے ہڈیوں پر گوشت چڑھا یا (ولقد خلقنا الانسان من سلالة من طین۔ ثم جعلناه نطفة فی قرار مکین۔ ثم خلقنا النطفة علقۃ افلقنا العلقۃ محنۃ فخلقنا المضغة عظاما فکسونا

العظام لحماً)۔

ان پانچ مرحلوں (نطفہ، علقہ، مضغہ، عظام اور لحم) کو بیان کرنے کے بعد آخری اور اہم ترین مرحلے کا ذکر کرتا ہے جو روح انسانی پھونکے جانے کا مرحلہ ہے۔ فرماتا ہے: پھر ہم نے اسے خلقت تازہ عطا کی۔ (ثم انشأناہ خلقاً اخر)  
پس جاوید و بابرکت ہے وہ خدا کہ جو سب خالقین سے بہتر ہے۔ (فتبارک الله احسن الخالقین)  
فکسونا العظام لحماً (ہم نے ہڈیوں پر گوشت چڑھایا) یہ بات جنین کی تکمیل کے مراحل کا ذکر کرتے ہوئے صرف اسی آیت میں آئی ہے۔ اس سے ہڈیوں کی پیدائش کی اہمیت پر سے پردہ اٹھتا ہے۔

آج یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ہڈیاں انسانی ڈھانچے کی حدود و معین کرنے والی کوئی ایسی چیز نہیں ہیں جو فقط بدن اور اعضاء کی حفاظت کے لیے ہو، بلکہ بہت سی زندگی کی اور علم کی اہم حیاتیاتی (BIOLOGICAL) ذمہ داریوں کی ادائیگی ان ہڈیوں ہی کے ذمے ہوتی ہے۔

ہڈیاں فاسفورس، کیلشیم اور نمکیات وغیرہ جیسی بہت سی احتیاجات کو پورا کرتی ہیں۔ یہ ہڈیاں بدن کی زندگی کے اعمال کو منظم کرتی ہیں۔ دل کی دھڑکن اور عضلات کی حرکت کو مرتب کرتی ہیں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ انسان کی پوری زندگی میں خون کے سرخ اور سفید گلبول مہیا کرتی ہیں۔ اتنا جان لینا کافی ہے کہ ہر منٹ میں ۱۸۰ ملین سرخ جراثیم مر جاتے ہیں اور یہ ہڈیاں ہیں جو ان کی جگہ نئے جراثیم بناتی ہیں اور تازہ بہ تازہ اس کمی کو پورا کرتی رہتی ہیں۔<sup>[۱]</sup>

یہ بات جاذب توجہ ہے کہ بعض مفسرین کے مطابق آج یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ جنین میں پہلے ہڈیوں کے خلیے ظاہر ہوتے ہیں اور پھر گوشت کے۔ یہ وہ حقیقت ہے قرآن نے جس پر سے چودہ سو سال پہلے پردہ اٹھایا تھا جب کہ اس زمانے میں یہ بات کسی کو معلوم نہ تھی۔<sup>[۲]</sup>  
گوشت کے لیے ”کسوة“ (لباس) کی تعبیر بہت عمدہ اور پیاری ہے۔ لباس جسم انسانی کو خوبصورتی بھی عطا کرتا ہے اور بدن انسانی کو مختلف نقصانات سے بھی بچاتا ہے۔ اسی طرح اگر عضلات اور گوشت نہ ہوتا تو واقعاً صرف ہڈیاں کتنا برا منظر پیش کرتیں۔ اسی طرح ہڈیوں پر ہر طرف سے جو دباؤ پڑتا اس سے انہیں بہت نقصان پہنچتا۔ یہ تو گوشت اور عضلات کا لباس ہے کہ جو ان کی حفاظت کرتا ہے۔

تکمیل جنین کے آخری مرحلے کے بارے میں فرماتا ہے: پھر ہم نے اسے خلقت تازہ عطا کی (ثم انشأناہ خلقاً اخر)۔ یہ بات بھی صرف اس آیت میں آئی ہے۔ اس عجیب تعبیر سے ظاہر ہوتا ہے کہ ”خلق اخر“ پہلے کے مختلف مراحل سے بالکل مختلف ہے کیونکہ اسے ”آفرینش دیگر“ قرار دیا گیا ہے۔ بیشتر مفسرین کی رائے یہ ہے کہ یہ جملہ خلقت روح کی طرف اشارہ ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں بچہ ماں کے پیٹ میں چار مہینے تک زیادہ تر ایک ایسے پودے سے شباهت رکھتا ہے جو تیزی سے نمو کرتا ہے اور اس میں کوئی حس و حرکت نہیں ہوتی۔ جونہی اس

[۱] قرآن بہ فراز اعضاء ص ۱۸۷

[۲] فی ظلال القرآن ج ۶ ص ۱۶

مرحلہ میں پہنچتا ہے ناگہاں متغیر ہو جاتا ہے اور اس میں حس و حرکت پیدا ہو جاتی ہے۔ مختلف حقائق کا ادراک جن اعضاء کے ذریعہ ہوتا ہے تدریجاً اس میں تیار ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ ایک دم کی یہ تبدیلی ایسی محرمانہ اور پیچیدہ ہوتی ہے کہ کوئی بھی سائنس دان اس سے آگاہ نہیں ہے۔ یہ تو صرف خداوند عالم قادر جانتا ہے کہ جنین پر کیا گزرتی ہے جو اس مرحلے سے اس مرحلے میں منتقل ہوتا ہے۔

بہر حال اس تھوڑی سی مدت میں ان مراحل کا طے ہونا اس اللہ خالق اکبر کی عظمت پر بھی دلیل ہے جو مبداء عالم ہستی بھی ہے، احسن الخالقین بھی اور حیات بعد از ممات کی بھی نشانی ہے جس کی طرف ان آیات کے آخر میں اشارہ کیا ہے۔

### نتیجہ بحث

مندرجہ بالا تمام آیات میں تکمیل جنین کے مختلف مراحل کو حقیقت کے متلاشی انسان کے سامنے مجسم کر کے رکھ دیا گیا ہے۔ ان مراحل میں سے ہر ایک درحقیقت حیات جدید ہے اور معاد کا ایک منظر ہے۔ اس طرح سے منکرین معاد کو واضح جواب دیا گیا ہے، یہاں تک کہ ان مراحل میں سے کسی ایک کی طرف بھی توجہ کی جائے تو اس حقیقت کے اثبات کے لیے کافی ہے۔

## ۵۔ معاد تو انائیوں کی دنیا میں

اشارہ

اس وسیع عالم میں ہمیشہ چیزیں مرقی رہتی ہیں لیکن ان کے بقایا جات باقی رہتے ہیں۔ البتہ ان سب میں تو انائیوں کی موت عجیب ترین چیز ہے کیونکہ ظاہر اُ موت کے وقت وہ فنائے مطلق کو سدھارتی ہیں اور ان کا کچھ باقی نہیں رہتا۔ مثال کے طور پر سورج کی روشنی و حرارت ایک تو انائی ہے جو ہمیشہ ہمارے کرہ اور منظومہ شمسی کے دیگر کرات تک پہنچتی رہتی ہے اور پہنچنے کے بعد نابود ہو جاتی ہے۔ اگر اس کی پیدائش کا مرکز یعنی سورج اس عمل کو مسلسل جاری نہ رکھے تو ہر طرح کی روشنی اور حرارت ختم ہو جائے۔

لیکن آج کی سائنس نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ تو انائیاں بھی پوری طرح نابود نہیں ہوتیں بلکہ ختم ہو کر نئی صورت اختیار کر لیتی ہیں اور جو نبی انہیں نئے مناسب حالات میسر آتے ہیں وہ حیات نو کا آغاز کرتی ہیں اور ایک عظیم معاد رونما ہوتی ہے۔

اس مختصر سے اشارے کے بعد ہم قرآن کی ان آیات کو دیکھتے ہیں جو اس سلسلے میں آئی ہیں تاکہ حقیقت واضح و روشن ہو جائے:

(۱) قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِي أَنْشَأَهَا أَوَّلَ مَرَّةٍ ۖ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيمٌ ﴿۴۹﴾ الَّذِي

جَعَلَ لَكُمُ الشَّجَرِ الْأَخْضَرِ نَارًا فَإِذَا أَنْتُمْ مُنْهُ تُوقَدُونَ ﴿۵۰﴾ (یس: ۴۹،

(۸۰)

(۲) أَفَرَأَيْتُمُ النَّارَ الَّتِي تُورُونَ ﴿۴۸﴾ ۖ أَنْتُمْ أَنْشَأْتُمُ شَجَرَهَا أَمْ نَحْنُ

الْمُنشِئُونَ ﴿۴۹﴾ نَحْنُ جَعَلْنَاهَا تَذْكِرَةً وَتَعَاوَنًا لِلْمُقْوِينَ ﴿۵۰﴾ (واقعة: ۴۸ تا ۴۹)

ترجمہ

(۱) کہہ دو! وہی اسے زندہ بھی کرتا ہے جس نے پہلی بار اسے پیدا کیا تھا اور وہ ہر مخلوق سے آگاہ ہے۔ وہی جس

نے تمہارے لیے سبز درخت سے آگ پیدا کی اور تم اس سے آگ روشن کرتے ہو۔

(۲) کیا یہ جو آگ تم جلاتے ہو اس کے بارے میں تم نے سوچا ہے؟ کیا اس کے درخت کو تم نے پیدا کیا ہے یا ہم

نے پیدا کیا ہے؟ ہم نے اسے (سب کے لیے) توجہ کا ذریعہ اور مسافروں کے لیے وسیلہ حیات قرار دیا ہے۔

## تفسیر

## توانائیوں کی حیات نو کے مظاہر

سورہ یس کے آخر میں معاد کے بارے میں جامع، متنوع اور عمیق گفتگو نظر آتی ہے۔ اس میں توانائیوں کی معاد کے بارے میں ذکر بھی شامل ہے جو لوگ اس امر پر تعجب کرتے تھے کہ بوسیدہ ہڈیاں کس طرح پھر سے زندہ ہو جائیں گی، ان کے جواب میں فرماتا ہے: کہو جس نے آغاز میں اسے پیدا کیا اور جو ہر مخلوق سے آگاہ ہے، وہی اسے زندہ بھی کرتا ہے (قل یحییہا الذی انشاہا اول مرة وہو بکل خلق علیم)

یہ حصہ معاد کے پہلی خلقت سے موازنہ سے مربوط ہے جس کے بارے میں بحث گزر چکی ہے۔ اس کے بعد اضافہ فرماتا ہے: وہی جس نے تمہارے لیے سبز درخت سے آگ پیدا کی اور تم اس کے ذریعہ آگ روشن کرتے ہو (الذی جعل لکم من الشجر الاخضر ناراً فاذا انتم منه توقدون)

یقیناً یہ توصیف مسئلہ معاد کی طرف اشارہ ہے اور منکرین کے لیے ایک اور جواب ہے۔ لیکن کس طرح اور کس انداز سے؟ مفسرین کی اس سلسلے میں مختلف تفسیریں ہیں:

۱۔ بہت سے مفسرین نے آیت کو دو مخصوص درختوں کی طرف اشارہ سمجھا ہے جو عربوں میں ”مرخ“ اور ”عفار“ کے نام سے جانے جاتے تھے۔ آگ جلانے کے لیے دیا سلائی کے بجائے ان سے استفادہ کیا جاتا تھا۔ ایک کو دوسرے پر زور سے مارا جاتا تا کہ اس سے آگ کا شعلہ نکلے۔ درحقیقت قدیم زمانہ میں معمول تھا کہ آگ روشن کرنے کے لیے ایسے پتھروں کو استعمال کیا جاتا تھا جن سے شعلہ نکلتا تھا۔ عرب درحقیقت اس کے بجائے ان درختوں سے استفادہ کرتے تھے۔

قرآن فرماتا ہے کہ جو خدا ان دو سبز لکڑیوں سے آگ نکلتا ہے، مردوں کو زندہ کرنے پر بھی قدرت رکھتا ہے۔ جس نے پانی اور آگ کو آپس میں جمع کر دیا ہے وہ کیونکر موت کے بعد حیات کو پیدا نہیں کر سکتا؟ کیا حیات و موت کا تضاد آب و آتش کے تضاد جیسا نہیں ہے؟

۲۔ بعض نے اس سے آگے قدم رکھا ہے اور کہا ہے کہ درختوں کی لکڑیوں سے آگ جلانے کی خاصیت (مرخ و عفار کی) دو مخصوص لکڑیوں میں منحصر نہیں ہے بلکہ یہ خاصیت تمام درختوں میں پائی جاتی ہے۔ البتہ ان دو مخصوص لکڑیوں میں بہتر اور سریع تر ظاہر ہوتی ہے۔ لہذا عربوں میں ایک قدیم ضرب المثل ہے:

فی کل شجر نار

”ہر درخت میں آگ ہے۔“

مختصر یہ کہ جب درختوں کی لکڑیاں ایک دوسرے پر پڑتی ہیں تو دباؤ پیدا کرتی ہیں یہاں تک کہ سبز درختوں کی لکڑیوں کا بھی یہی حال ہے۔ لہذا بہت دفعہ یہ اتفاق پیش آتا ہے کہ جنگلوں میں وسیع اور وحشت ناک آگ بھڑک اٹھتی ہے، بغیر اس کے کہ کسی تخریب کار انسان کا ہاتھ اس میں کارفرما ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تیز ہوائیں شاخوں کو زور سے ایک دوسرے سے ٹکراتی ہیں اور کبھی کبھی ان سے نکلنے والا شعلہ خشک پتوں پر جا پڑتا ہے اور ان میں شعلہ پیدا کر دیتا ہے۔ پھر تیز ہوائیں ان پر چلتی ہیں اور ہم دیکھتے کہ اچانک وسیع جنگل اور خشک لکڑیاں آگ میں بھڑک اٹھتے ہیں۔

آج کے علم کی روشنی میں اس مسئلے کی توجیہ واضح ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ نہ فقط دو درخت بلکہ کوئی سے دو جسم جب آپس میں زور سے ٹکراتے ہیں تو بجلی پیدا ہوتی ہے۔ یہ وہی آگ ہے جو جہان مادہ کے تمام ذرات میں، یہاں تک کہ سبز درختوں میں بھی چھپی ہوئی ہے۔ واقعاً عجیب بات ہے؟ کیسی قدرت ہے جس نے پانی میں آگ چھپا رکھی ہے اور ان دو دشمنوں کو جس نے آپس میں آشتی سے رکھا ہے، جن میں قدام کے الفاظ میں ایک کی طبیعت سرد اور تر ہے جب کہ دوسرے کی گرم اور خشک۔ کیا ایسی قدرت سے بعید ہے کہ وہ موت و حیات کے درمیان ایسا تعلق قائم کر دے یا ایک کو دوسرے کا جانشین بنا دے؟

دوسرے الفاظ میں جو پانی اور آگ کو اس طرح سے جمع کر سکتا ہے کہ نہ پانی آگ کو بجھا سکے اور نہ آگ درخت کو جلا سکے۔ کیا وہ خشک شدہ درخت کو حیات نو عطا نہیں کر سکتا؟

۳۔ ایک اور تفسیر جو اس آیت کی موجود ہے اور گزشتہ دور میں مفسرین پر مخفی رہی ہے، لیکن علوم کی ترقی کے پیش نظر آج ہم پر واضح ہے اور شاید سب تفسیروں سے زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے، یہ ہے کہ درخت اپنی پوری عمر میں مسلسل سورج کی روشنی اور حرارت جذب کرتے رہتے ہیں اور اسے اپنے اندر ذخیرہ کر لیتے ہیں۔ جب ہم خشک لکڑیوں کو جلاتے ہیں تو جو روشنی اور حرارت انہوں نے سالہا سال ذخیرہ کر رکھی ہوتی ہے، تھوڑی ہی مدت میں خارج کر دیتے ہیں اور ہم اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ یعنی مردہ توانائیاں اس معادِ عظیم میں جان پالیتی ہیں اور اظہار وجود کرتی ہیں۔ بنا بریں جب بھی ہم آگ جلاتے ہیں اپنی آنکھوں کے سامنے معاد کا منظر دیکھ سکتے ہیں۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ جن خلیوں (CELLS) سے درختوں کے اجزا بنتے ہیں، وہ کاربن آکسیجن، اور ہائیڈروجن سے مرکب ہوتے ہیں۔

پودے آکسیجن اور ہائیڈروجن پانی سے حاصل کرتے ہیں اور کاربن ہوا سے۔ یعنی کاربن ڈائی آکسائیڈ جو آکسیجن اور کاربن کا مرکب ہے، اسے حاصل کر کے اس کا تجزیہ کرتے ہیں، حیات بخش آکسیجن کو چھوڑ دیتے ہیں اور کاربن کو اپنے پاس رکھ لیتے ہیں۔ پھر وہ پانی کے ساتھ ترکیب پاتی ہے اور یوں درختوں کی لکڑی بنتی ہے۔

قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ علمِ کیمیا کے معلوم اصول کے مطابق بہت سے کیمیائی مرکبات کسی خاص توانائی کو جذب کیے بغیر ترکیب و تشکیل نہیں پاتے۔ اس اصول کے مطابق درخت جب کاربن حاصل کرتے ہیں تو ضروری ہے کہ سورج کی حرارت اور روشنی سے ایک فعال قوت کی حیثیت سے استفادہ کریں۔ (غور کیجیے گا)



اس لحاظ سے جب درخت نمو کرتے ہیں، ان کے تنے اور شاخیں روز بروز قوی تر اور بڑے ہوتے جاتے ہیں تو ساتھ ساتھ وہ سورج کی بہت سی توانائی کا اپنے اندر ذخیرہ کرتے رہتے ہیں۔ جب لکڑیاں جلتی ہیں تو یہی روشنی اور حرارت ظاہر ہوتی ہے، یعنی وہی ذخیرہ شدہ توانائیاں اور ظاہر اُمرہ دھوپ ایک جاذب نظر نپلی تلی معاد کی صورت میں پھر زندہ ہو جاتی ہیں۔

ایک اہم نکتہ جو اس تفسیر کی تائید کرتا ہے وہ یہ تعبیر ہے جس سے قرآن نے اس مقام پر بیان مطلب کے لیے استفادہ کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ جملہ ”فاذا انتم منه توقدون“ (تم اس سے ”وقود“ حاصل کرتے ہو)۔

دیکھنا چاہیے کہ ”وقود“ کے لغت میں کیا معنی ہیں؟ لغت کی بہت سی کتابوں کی صراحت کے مطابق ”وقود“ کے معنی ہیں ”ایندھن“، یعنی دوسرے لفظوں میں وہ جسم جو آگ پکڑتا ہے اور جلتا ہے جب کہ جس چیز سے آگ لگاتے ہیں اس کے مادے کو ”زند“ یا ”زناد“ کہتے ہیں۔ مقائیس کے مطابق ”زند“ کے معنی دراصل کلائی ہیں۔ اس لفظ کا اس چیز پر اطلاق جس سے لگاتے ہیں اس شباهت کی وجہ سے تھا جو کلائی اور ان چیزوں کے مابین تھی، قدیم زمانے میں جن سے آگ روشن کرتے تھے۔

”قدح“ کی تعبیر عربی زبان میں بھی بات بیان کرنے کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ یہ بات اہم ہے کہ قرآن نے ”وقود“ (ایندھن) کا لفظ استعمال کیا ہے اور ”زند“ یا ”قدح“ کا نہیں، جب کہ گذشتہ تفسیروں میں اس نکتے کی طرف توجہ نہیں کی گئی۔ ان میں آیہ کی تفسیر ”آگ روشن کرنے والی چیز“ سے کی گئی ہے۔ لیکن جو کچھ ہم نے تیسری تفسیر میں بیان کیا ہے وہ ”وقود“ یعنی ”ایندھن“ کے لفظ پر بالکل منطبق ہے۔ (غور کیجیے گا)

صرف ایک سوال یہاں باقی رہ جاتا ہے اور وہ یہ کہ لکڑی کو جب جلانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے تو خشک ہوتی ہے، جب کہ قرآن نے ”الشجر الاخصر“ (سبز درخت) کی تعبیر استعمال کی ہے۔

اس سوال کا دو طریقوں سے جواب دیا جاسکتا ہے:

پہلا: گیلی لکڑیاں بھی جل سکتی ہیں، اگرچہ انہیں جلانا خشک لکڑیوں کی نسبت مشکل ہے۔ مشہور ضرب المثل ہے: آتش کہ گرفت خشک و ترمی سوزد

یعنی: آگ لگے تو پھر خشک و تر سب جل جاتے ہیں۔

یہ اسی بات کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

دوسرا: اس سے قطع نظر، قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ صرف سبز درخت ہی سورج کا نور حرارت جذب کر کے ذخیرہ کر سکتے ہیں اور ہو سکتا ہے قرآن اس تعبیر کے ذریعے اس ظریف نکتے کو بیان کرنا چاہتا ہو کیونکہ درخت جب خشک ہو جاتا ہے تو اس کا کاربن حاصل کرنے کا عمل بالکل رک جاتا ہے اور پھر وہ ہرگز سورج کی توانائی کو اپنے میں ذخیرہ نہیں کرتا۔

بہر حال مندرجہ بالا آیت امکان معاد کے اثبات کے سلسلے میں انتہائی اہم آیت ہے۔ نیز یہ تینوں تفسیریں معاد کا منظر اہل نظر کے سامنے مجسم کرتی ہیں اور اس میں کوئی مانع نہیں کہ یہ تینوں تفاسیر مفہوم آیت میں جمع ہوں، کوئی عوام کے لیے، کوئی خواص کے لیے، کوئی اخص



الحواس کے لیے، کوئی اس دور کے لوگوں کے لیے اور کوئی اس دور کے لیے مفید ہو اور شاید عمیق تر تفسیریں آئندہ کے علماء کے لیے ہوں۔  
 دوسری آیت سورۃ واقعہ کی ہے۔ اس سورہ کا ایک اہم حصہ معاد و قیامت کے دلائل پر مشتمل ہے، خاص طور پر یہ آیت اور اس کے بعد۔ یہاں پر منکرین معاد کی بات کا جواب دیا گیا ہے۔ ان کی بات آیت ۷۴ میں ذکر ہوئی ہے۔ جواب میں سات نکات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جن میں ہر ایک مسئلہ معاد پر ایک دلیل ہے۔<sup>[۱]</sup>  
 زیر بحث آیت دراصل آخری اور ساتویں دلیل ہے۔ فرماتا ہے: کیا جو آگ تم جلاتے ہو اس کے بارے میں کچھ غور بھی کرتے ہو؟  
 (افراء یتھ النار التي تورون)۔<sup>[۲]</sup>

کیا اس درخت کو تم نے پیدا کیا ہے یا ہم نے پیدا کیا ہے؟ (ء انتھ انشأتم شجر تھامر نحن المنشئون)<sup>[۳]</sup>  
 شجرہ اور درخت آتش سے اس آیت میں کیا مراد ہے، اس سلسلے میں دو اہم تفسیریں بیان کی گئی ہیں:  
 پہلی یہ کہ مراد وہی معروف درخت ”مرخ“ اور ”عفار“ ہیں عرب جن کی لکڑیوں کو ایک دوسرے پر مار کر آگ کا شعلہ حاصل کرتے تھے۔ ان کی خبیثیت ماچس کی سی تھی جس سے آگ جلانے کا کام لیا جاتا ہے۔

دوسری یہ کہ مراد سب وہ درخت ہیں جن میں ایندھن بننے اور آگ پکڑنے کی صلاحیت ہے۔<sup>[۴]</sup>  
 ”تذکرۃ“ سے یہاں کیا مراد ہے؟ اس سلسلے میں بھی مفسرین میں بحثیں ہوئی ہیں۔ بعض نے اسے آتش دوزخ کا یاد دلانا قرار دیا ہے جو آتش دنیا کو دیکھنے سے پیدا ہوتی ہے۔ اس صورت میں مسئلہ معاد کے بارے میں آیت میں کوئی استدلال پنہاں نہ ہوگا۔  
 بعض کا کہنا ہے کہ مراد معاد کی طرف توجہ اور اس کی یادآوری ہے کیونکہ جس میں یہ طاقت ہے کہ وہ سبز درختوں میں آتش سوزاں کو ذخیرہ کر دے، وہ مردوں کے بدن میں پھر سے جبلی حرارت لوٹانے سے عاجز نہیں ہے۔ وہ کہ جو آب و آتش جیسی دو متضاد چیزوں کو ایک دوسرے کے پہلو میں باقی رکھ سکتا ہے، وہ درجہ اولی موت و حیات جیسے دو متضاد امور کو یکے بعد دیگرے ایجاد کر سکتا ہے۔

بالفاظ دیگر جو نور و حرارت کی مردہ توانائیوں کو اتنا واضح طور پر لوٹا سکتا ہے وہ مردہ انسانوں کو حیات نو کیوں نہیں دے سکتا!  
 البتہ دوسری تفسیر اس سورہ کی مجموعی آیات سے زیادہ ہم آہنگ ہے کیونکہ اس میں منکرین معاد کے شبہات کا جواب دیا جا رہا ہے اور

[۱] ان سات دلائل کی تشریح تفسیر نمونہ ج ۲۳ میں متعلقہ آیات کے ذیل میں ذکر کی گئی ہے۔

[۲] ”تورون“ ”ایرائی“ کے مادہ سے آگ روشن کرنے کے معنی میں ہے۔ مفردات میں راغب لکھتے ہیں: اس کا اصل ستر اور ڈھاپنے کے معنی میں ہے۔ لہذا ”ورائی“ ”بیچے“ کو کہتے ہیں۔ آگ چونکہ آگ روشن کرنیوالی چیز یا ایندھن میں چھپی ہوتی ہے اس لیے اسے باہر نکلنے کو عرب ”وری“ اور ”ایرائی“ کہتے ہیں۔

[۳] ”مقوین“ ”قوا“ (بروزن کتاب) کے مادہ سے خشک اور خالی خیابان کے معنی میں ہے اور مقوین خشک خالی خیابان میں چلنے والے مسافروں کو کہتے ہیں۔

[۴] یہ دو تفسیریں تفسیر روح المعانی، ج ۲ ص ۱۱۲۹ اور تفسیر فخر الدین رازی، ج ۲۹ ص ۱۸۴ میں زیر بحث آیات کے ذیل میں آئی ہیں۔

الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِرُهَا ثُمَّ نَكْسُوهَا لَحْمًا ۖ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ ۖ قَالَ أَعْلَمُ أَنَّ  
اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٢٥٩﴾ (بقرہ: ۲۵۹)

ترجمہ

کیا تو نے نہیں دیکھا (تو آگاہ نہیں ہے) اس کو جو ایک آبادی کے پاس سے گزر رہا تھا جب کہ اس کی دیواریں اس کی چھتوں پر گری پڑی تھیں (اور اس کے باسیوں کے اجساد اور ہڈیاں ہر طرف بکھری پڑی تھیں۔ وہ اپنے آپ سے) کہنے لگا: اللہ انہیں موت کے بعد کیسے زندہ کرتا ہے؟  
اللہ نے ایک سو سال اسے مارے رکھا اور پھر زندہ کیا۔ پھر اس سے پوچھا: تو کتنی دیر پڑا رہا؟ اس نے عرض کی: ایک دن یا دن کا کچھ حصہ۔

فرمایا: (نہیں) بلکہ تو ایک سو سال پڑا رہا۔ اپنے کھانے پینے کی طرف دیکھ۔ دیکھ کہ ان میں کوئی تبدیلی نہیں آئی اور جان لے کہ اتنی جلدی خراب ہو جانے والی چیزوں کو جس خدا نے اس قدر طویل مدت تک بچائے رکھا، وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ لیکن گدھے کو دیکھ (کہ کیسے بکھر گیا ہے)۔ یہ اس لیے ہے کہ تجھے (معاد کے مسئلے میں) لوگوں کے لیے ہم ایک نشانی قرار دیں۔

اب ذرا (اپنی سواری کی) ہڈیوں پر نظر ڈال کہ ہم انہیں کس طرح اٹھا کر آپس میں جوڑتے ہیں اور پھر ان پر گوشت چڑھاتے ہیں۔ جس وقت (یہ حقائق) اس پر آشکار ہو گئے تو کہنے لگا: ”میں جانتا ہوں کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔“ ﴿۲۶۰﴾

یہاں چند نکلتے قابل غور ہیں:

- ۱۔ یہ شخص کون تھا اور وہ قریہ کہاں ہے (توجہ رکھئے کہ ”قریہ“ یہاں گاؤں کے معنی میں نہیں بلکہ اس کے معنی ہیں لوگوں کے اجتماع کا مرکز، چاہے وہ شہر ہو یا گاؤں ہو)۔ قرآن نے اس کے بارے میں وضاحت نہیں کی۔ آیہ مبارکہ سے بس اتنا ہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی ایسے شخص تھے جن کا وحی الہی سے رابطہ تھا، یعنی انبیاء الہی میں سے ایک نبی تھے۔ لیکن مفسرین نے روایات اور تواریخ کا سہارا لیتے ہوئے ان کا نام معین کیا ہے۔ بہت سی روایات میں اور مفسرین کے کلمات میں آیا ہے کہ وہ بنی اسرائیل کے معروف پیغمبر ”عزیر“ تھے۔ بعض کے مطابق وہ بنی اسرائیل

﴿۲۶۰﴾ جملہ اوکا لڈی مر... بہت سے مفسرین کی تصریح کے مطابق اپنے سے پہلی آیت: الم تر الی الذی حاج ابراہیم... پر عطف ہے، لہذا جملے کے معنی یوں ہوں گے۔

”الم تر الی الذی مر علی قریۃ“

کے ایک اور نبی ”ارمیا“ تھے۔ بعض نے ان کا نام ”خضر“ بتایا ہے اور بعض نے ”اشعیا“۔<sup>[۱]</sup>

البتہ یہ بات مسلم ہے کہ وہ کوئی بھی ہو اس سے آیت کے معنی اور مفہوم پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ لیکن یہ جو بعض نے احتمال ذکر کیا ہے کہ وہ ایک غیر مومن شخص تھا جسے قیامت میں شک تھا، ایک غلط بات ہے، کیونکہ آیت واضح طور پر اس پر دلالت کرتی ہے کہ اس پر وحی نازل ہوتی تھی۔ وہ ”قریہ“ بہت سی روایات کے مطابق بیت المقدس تھا اور یہ واقعہ بخت النصر کے ہاتھوں بیت المقدس کی تباہی کے بعد پیش آیا۔

۲۔ یہ مرد خدا (جو کوئی بھی تھا) کیا واقعی مر گیا تھا یا کیا گہری نیند سو گیا تھا؟ مندرجہ بالا آیت کا ظاہر تو یہی ہے کہ وہ واقعاً دنیا سے چل بسا تھا اور پھر ایک سو سال گزرنے کے بعد اللہ کے حکم سے زندہ ہوا۔ بہت سے مفسرین کا یہی نظریہ ہے جب کہ بعض کا میلان اس طرف ہے کہ ”موت“ کو یہاں ایسی ہی گہری نیند کے معنی میں تفسیر کریں جو شبیہ موت تھی جیسے آج بعض جانداروں میں ایسی ہی گہری نیند دکھائی دیتی ہے۔ مثلاً بعض حیوان تمام موسم سرما میں سوئے رہتے ہیں، بہار آتی ہے تو بیدار ہوتے ہیں اور پھر حرکت کرنے لگتے ہیں۔ ایسی نیند میں زندگی کی حرکات بہت کند ہو جاتی ہیں اور درکار توانائی غیر معمولی طور پر کم ہو جاتی ہے لیکن بہر حال شعلہ حیات خاموش نہیں ہوتا۔

”المنازل“ کے مصنف، اسی طرح مراغی نیز ”اعلام قرآن“ کے مصنف نے اسی احتمال کا انتخاب کیا ہے۔ اعلام قرآن میں یہ ہے کہ ”مائتہ عام“ کے معنی ضروری نہیں کہ ایک سو سال ہی ہو بلکہ ممکن ہے مراد سو دن یا گھنٹے ہوں۔

یہ روشن فکر افراد کا گروہ ہے جن پر غیر معمولی امور کا قبول کرنا گراں ہوتا ہے۔ لہذا جب بھی ایسے امور کا سامنا کرتے ہیں تو ان کی توجیہ کی کوشش کرنے لگتے ہیں، جب کہ اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

قرآن مجید اور مسلم اسلامی روایات، ایک کلمہ میں کہا جاسکتا ہے کہ مذاہب آسمانی کا مضمون و مفہوم طرح طرح کے غیر معمولی امور سے مملو ہے جن کا انکار نہیں کیا جاسکتا اور نہ ان کی توجیہ کی ضرورت ہے۔ اگر ہم غیر معمولی امور پر اللہ تعالیٰ کی قدرت کو قبول کر لیں تو ان امور کو قبول کرنا بہت آسان ہے۔ تاہم اس سلسلے میں ہم ہرگز مبالغہ کا راستہ اختیار نہیں کرتے نہ ہی حد سے تجاوز کرتے ہیں اور ہر کام کو ہم اعجاز یا خوارق عادات سے نسبت نہیں دیتے ہیں۔

مادی علماء کی نظر میں بھی بہت سے خوارق عادات ایسے ہیں جو معلوم علمی ذرائع سے قابل تفسیر نہیں ہیں۔ لہذا کیا ضرورت ہے کہ جب بھی ہم کسی خوارق عادت یا غیر معمولی امر کا سامنا کریں تو اسے اس کی اصل صورت سے نکال کر مسخ کر دیں۔

مندرجہ بالا واقعے میں ایک تو اس مرد خدا کے مرنے اور پھر زندہ ہونے کا ذکر ہے اور مقصد قیامت میں مردوں کے زندہ ہونے کا نمونہ پیش کرنا ہے، اس سے قطع نظر سواری کے جانور کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ قرآن کہتا ہے: وہ مر گیا تھا اور اس کی ہڈیاں بکھر چکی تھیں۔ آیت تقریباً صراحت سے کہتی ہے کہ اللہ کے حکم سے ہڈیاں جمع ہوئیں، گوشت ان پر پھر چڑھ آیا اور وہ زندہ ہو گیا۔ کیا پھر ان سب باتوں کی بھی توجیہ کرنا پڑے گی؟

[۱] تفسیر برہان، نور الثقلین، مجمع البیان، روح المعانی، فخر رازی و قطربی۔ زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

۳۔ یہ بات کہ یہ واقعہ کون سی سرزمین پر پیش آیا، بہت سوں کا نظریہ ہے کہ یہ بیت المقدس میں رونما ہوا اور ایسا بخت النصر کے حملے اور تباہی کے بعد ہوا۔ ایسی تباہی ہوئی کہ قرآن جسے ”خاویۃ علی عروشہا“ (یعنی چھتیں گری پڑی تھیں اور دیواریں ان کے اوپر آگری تھیں) کہتا ہے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ بیت المقدس کے نزدیک ایک اور جگہ تھی اور اس مرد خدا نے اپنے آپ سے یہ جو سوال کیا کہ اللہ انہیں کیسے زندہ کرتا ہے، انکار کی بناء پر نہ تھا بلکہ تعجب اور شک کی بناء پر بھی نہ تھا بلکہ اس کی خواہش تھی کہ شہود عینی کے طور پر مردوں کو زندہ ہوتے دیکھوں جیسا کہ حضرت ابراہیمؑ نے اللہ تعالیٰ سے چاہا تھا۔ حضرت ابراہیمؑ کا واقعہ بھی ذکر کیا جائے گا۔

نیز یہ بھی ممکن ہے کہ یہ تقاضا اس لیے ہو کہ منکرین یا شک کرنے والوں کے سامنے ایک عینی نمونہ پیش کیا جائے کیونکہ بعض اوقات عقلی دلائل کچھ لوگوں کو قانع نہیں کرتے یہاں تک کہ وجدان کی آواز بھی ان کے لیے اطمینان بخش نہیں ہوتی۔ ان کا اصرار ہوتا ہے کہ وہ عینی نمونوں کو دیکھیں تاکہ مسئلہ حسی صورت اختیار کر لے اور قلب و روح سے تمام وسوسے ختم ہو جائیں۔

۴۔ ایک سوال یہی ہے کہ ان کے پاس کھانے پینے کی کیا چیز تھی؟ قرآن نے اس بارے میں صراحت سے کچھ نہیں کہا۔ لیکن قرآن میں ہے ”لہدیتسنہ“ اور یہ ”سنہ“ کے مادہ سے ہے۔ اس کے معنی ہیں ”سال“۔ مطلب یہ ہوا کہ سالہا سال گزرنے کے باوجود وہ خراب نہ ہوا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کھانے پینے کی دونوں چیزیں خراب ہو جانے والی تھیں۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ ان کے پاس کھانے کی چیز انجیر اور انگور تھے اور پینے کے لیے کسی پھل کا عرق یا دودھ تھا۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کے اظہار کے لیے اس جلد خراب ہو جانے والے مواد کو اس کی اسی حالت پر باقی رکھا، جب کہ سواری کا جانور اپنی تمام تر مضبوطی کے باوجود بکھر گیا تا کہ وہ اس بات کی علامت بنے کہ ایک سو سال کی مدت گزر گئی ہے۔ نیز اس طرح اس کا وجود امکانِ حیات بعد از موت پر ایک اور دلیل بھی بنے تا کہ وہ مرد خدا ہر دو حصوں میں اس حقیقت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لے (اپنے وجود میں بھی اور اپنی سواری کے وجود میں بھی)۔

۵۔ ”ولجعلک ایتۃ للناس“ (ہدف یہ ہے کہ تجھے لوگوں کے لیے آیت اور نشانی قرار دیں)۔ یہ جملہ نشاندہی کرتا ہے کہ اس واقعے کا فائدہ صرف اس مرد خدا کے لیے نہ تھا بلکہ اس کا فائدہ عام تھا کیونکہ لوگوں نے مختلف قرائن کے ذریعے ”عزیر“ کو پہچان لیا اور یقین کر لیا کہ انہوں نے سو برس کے بعد حیات نو پائی ہے۔ ان کی معاصر نسل اگر دنیا سے چل بسی تھی تو بعد کی نسلوں نے حقیقت پالی اور اپنے بزرگوں سے جو معلومات انہیں نے حاصل کی تھیں ان کی مدد سے حقیقت امر سے واقف ہو گئے۔

## ۲۔ ابراہیمؑ اور مسئلہ معاد

جن تاریخی و عینی نمونوں کا قرآن مجید نے ذکر فرمایا ہے ان میں سے ایک حضرت ابراہیمؑ اور ”پیور اربعہ“ (چار پرندوں) کا واقعہ ہے۔ یہ واقعہ داستانِ عزیر کے فوراً بعد قرآن پاک میں آیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ ارْنِي كَيْفَ تُحْيِي الْمَوْتَىٰ ۖ قَالَ أَوَلَمْ تُؤْمِنْ ۖ قَالَ بَلَىٰ  
وَلَكِن لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِي ۖ قَالَ فَخُذْ أَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ إِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ  
عَلَىٰ كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَأْتِينَكَ سَعْيًا ۖ وَاعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ  
حَكِيمٌ ﴿٢٦٠﴾ (بقرہ: ۲۶۰)

ترجمہ

یاد کرو جب ابراہیمؑ نے کہا: پروردگار! مجھے دکھا کہ تو کیسے مردوں کو زندہ کرتا ہے؟

فرمایا: کیا تیرا (معاد) پر ایمان (کامل) نہیں؟

عرض کیا: ہاں، ایمان تو ہے لیکن میں دل کا اطمینان چاہتا ہوں، (ایسا اطمینان جو حس اور مشاہدے کے ذریعے پیدا ہوتا ہے)۔

فرمایا: پس چار قسم کے پرندے انتخاب کر، پھر انہیں (ذبح کرنے کے بعد) ٹکڑے ٹکڑے کر (اور آپس میں ملا دے) پھر (اپنے اطراف میں موجود) ہر پہاڑ پر اس کا کچھ حصہ رکھ دے۔ پھر انہیں آواز دے (وہ اللہ کے حکم سے زندہ ہو جائیں گے اور) تیزی سے تیری طرف آئیں گے اور جان لے کہ اللہ توانا وحکیم ہے۔

اگر ہم پہلے سے کیے گئے فیصلوں سے قطع نظر کرتے ہوئے ظاہر آیت کو دیکھیں اور تمام مختلف القانات کا اثر قبول نہ کریں تو آیت پوری وضاحت سے نشاندہی کرتی ہے کہ ابراہیمؑ چاہتے تھے کہ مردوں کے پھر سے زندہ ہونے کا منظر اطمینان قلب کی خاطر اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔ اس پر انہیں حکم دیا گیا کہ فرمان خدا کے تحت اس کا ایک نمونہ اپنے ہاتھوں سے انجام دیں۔ اس نمونہ میں چار پرندوں کے اجزاء بدن آپس میں یوں ملا دیئے گئے جیسے انسانی خاک کے ذرات ملے ہوئے ہر طرف بکھر جاتے ہیں۔ اسی طرح پرندوں کے اجزاء بھی پھیلا دے گئے۔ پھر فرمان الہی سے وہ گوشہ و کنار سے جمع ہو گئے اور جامعہ حیات پہن لیا۔

بہت سے مفسرین نے جو شان نزول اس آیت کی ذکر کی ہے وہ بھی اس دعویٰ پر شاہد ہے۔ وہ ایک دریا کے پاس سے گزر رہے تھے۔ انہوں نے ایک مردار کو دیکھا جس کا ایک حصہ پانی میں تھا اور ایک خشکی پر۔ ایک طرف سے پرندے اسے کھا رہے تھے اور دوسری طرف سے دریائی جانور۔ ابراہیمؑ سوچ میں پڑ گئے کہ اس کے منتشر اجزاء پھر سے کیونکر جمع ہو کر زندہ ہوں گے جب کہ ممکن ہے کہ یہ بہت سے دوسرے جانداروں کے بدنوں کا حصہ بن گیا ہے۔

ظاہر ہے کہ حضرت ابراہیمؑ مقام نبوت پر فائز تھے اور ان کا وحی سے رابطہ تھا، اس لیے ہر چیز پر ان کا ایمان تھا، ایسا ایمان جو عقلی استدالات سے حاصل کردہ ایمان سے بالاتر ہوتا ہے۔ لیکن وہ چاہتے تھے کہ اس بارے میں انہیں شہود حسی حاصل ہو جائے۔ لہذا اللہ نے

ان کے لیے اسے مجسم کرنے کا سامان کر دیا تاکہ وہ معاد جسمانی کو اس کے دقیق معنی کے لحاظ سے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں اور ان کا دل مطمئن ہو جائے۔

## قابل توجہ نکات

۱۔ ”فصرھن“ بعض ارباب لغت اور بعض مفسرین کی تصریح کے مطابق مادہ ”صور“ (بروزن ”قول“) سے ہے۔ اس کے معنی ہیں تقطیع اور ٹکڑے کرنا۔ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ ابراہیمؑ مامور تھے کہ چاروں پرندوں کو ذبح کریں اور پھر انہیں ٹکڑے ٹکڑے کر کے آپس میں ملا دیں۔

لیکن بعض ارباب لغت نے اسے مائل کرنے کے معنی میں لیا ہے (خصوصاً جب ”الی“ کے ساتھ متعدی ہو)۔ اسی وجہ سے بعض نام نہاد روشن فکر مفسرین کا اصرار ہے کہ ابراہیمؑ نے پرندوں کو ٹکڑے ٹکڑے ہرگز نہیں کیا، بلکہ وہ مامور تھے کہ انہیں اپنے آپ سے مانوس کریں اور پھر ان میں سے ہر ایک کو کسی پہاڑ پر رکھ دیں، پھر آواز دے کر اپنی طرف بلائیں، پھر اسے مردوں کے زندہ ہونے پر ایک مثال قرار دیں اور جان لیں کہ جیسے یہ کام آسان ہے کہ وہ پرندوں کو آواز دیں اور پرندے ان کی طرف آجائیں، مردوں کے احیاء کا مسئلہ بھی قدرت الہی کے لیے اسی طرح آسان ہے۔ [۱]

انہوں نے گویا یہ فراموش کر دیا ہے کہ اولاً حضرت ابراہیمؑ نے مردوں کے احیاء کا مشاہدہ کرنے کا تقاضا کیا اور اللہ نے ان کے تقاضے کو قبول کرنے کا حکم اس طریقے سے دیا اور فرمایا: ”تاکہ ابراہیمؑ کا دل مطمئن ہو جائے“۔ اگر مسئلہ یہیں ختم ہو جائے کہ لوگ پرندوں کو پکڑیں، تربیت کریں، آواز دیں اور وہ آجائیں تو نہ صرف یہ کہ ابراہیمؑ کی احیائے اموات کے مشاہدے کی خواہش پوری نہ ہو اور ان کے دل کو اطمینان حاصل نہ ہو، بلکہ اس فرمان کا اس درخواست سے کوئی ربط ہی نہیں۔ اگر ایسی درخواست کا ایسا جواب کسی عام فرد کی طرف سے ہو تو یہ ناموزوں اور غلط دکھائی دیتا ہے، چہ جائے کہ ایسا جواب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو، وہ بھی قرآن جیسے کلام فصیح میں۔

ثانیاً ”جزئی“ سے چار پرندوں میں سے ایک ایک مراد لینا بہت ہی نامناسب معلوم ہوتا ہے۔

ثالثاً اس آیت کی جو شان نزول ذکر ہوئی ہے اور کتب حدیث میں جو متعدد روایات آئی ہیں کوئی بھی اس معنی سے مناسبت نہیں رکھتی۔ بلکہ ان سے یہ حقیقت پوری صراحت سے سامنے آتی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے چار پرندوں کو پکڑا، ان کے سر کاٹے، ان کے اجزاء کو

[۱] یہ بات دراصل مفسرین میں سے ”ابو مسلم“ سے مربوط ہے۔ صاحب المنار نے اسی سے لی ہے اور اس کے دفاع پر کمر بستہ ہو گیا ہے۔

آپس میں ملایا، پھر ان کے کچھ حصے کیے۔ پھر ہر حصے کو ایک پہاڑ پر رکھا۔<sup>[۱]</sup>

البتہ ”فصرھن“ چاہے ٹکڑے کرنے کے معنی میں ہو اور چاہے مائل کرنے کے معنی میں ہو، آیت کے مضمون پر کوئی اثر نہیں پڑتا کیونکہ آیت بہر حال فرمان خدا سے احیائے اموات کی کیفیت بیان کرنے کے بارے میں ہے۔

جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں جو لوگ آیات قرآن کی ایسی تفاسیر کے درپے ہیں ان کی بڑی مشکل یہ ہے کہ وہ خوارق عادات کو قبول نہیں کرتے کیونکہ یہ امر مادی مکاتب فکر کے حامی کے ذوق سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ اسی وجہ سے وہ ایسی سنگلاخ وادیوں میں جا پڑتے ہیں، حالانکہ معجزہ اور خوارق عادات کا وجود تمام مذاہب کی واضحات میں سے ہے یہاں تک کہ عالم طبعی میں بھی بہت سے خوارق عادات نظر آئے ہیں جن کی تفسیر کرنے سے آج کا علم عاجز ہے (غور کیجیے گا)۔

۲۔ چار پرندے کون کون سے تھے، اس سلسلے میں مشہور ہے کہ وہ کبوتر، مرغ، مور اور کوا تھے۔ ان میں سے ہر ایک خصوصی جذبات اور صفات کا مظہر ہے۔ کبھی کبھی انسانی حرکات کو ان سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ مور، بڑائی اور خود نمائی کا مظہر ہے۔ کبوتر، لہو و لعب اور بازی گری کے لیے مشہور ہے۔ مرغ، شدید جنسی خواہشات کو ظاہر کرتا ہے۔ کوا طولانی آرزوؤں کا اظہار کرتا ہے۔

البتہ تفاسیر میں متعدد دیگر احتمالات بھی ذکر ہوئے ہیں۔ مختلف مفسرین نے ہد، الو، شاہین اور کرگس کا نام بھی لیا ہے۔<sup>[۲]</sup> ظاہر ہے کہ مذکورہ پرندوں کی خصوصیات کا اصل مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں۔ اسی قدر کافی ہے کہ مختلف قسم کے پرندے تھے تاکہ یہ مختلف انسانوں کی مٹی کے ایک دوسرے سے مل جانے کی ایک نشانی بن جائے۔

جن پہاڑوں پر ان پرندوں کا گوشت رکھا گیا تھا روایات میں ان کی تعداد دو بیان کی گئی ہے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ حضرت ابراہیمؑ کے شام میں آنے کے بعد پیش آیا کیونکہ سرزمین بابل پر کوئی پہاڑ نہیں ہے۔

### ۳۔ داستان اصحاب کھف

سورہ کھف میں چودہ آیات میں ایک داستان بیان کی گئی ہے جس میں فرمایا گیا ہے:

وَكَذٰلِكَ اَعْتَرْنَا عَلَيْهِمْ لِيَعْلَمُوْۤا اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّاَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيْبَ فِيْهَاؕ

[۱] ان روایات کے بارے میں مزید اطلاع کے لیے تفسیر نور الثقلین، ج ۱ ص ۲۷۵ تا ۲۸۲ اور تفسیر در المنثور، ج ۱ ص ۳۳۵ کی طرف رجوع فرمائیں۔

[۲] مجمع البیان، قرطبی، فخر الدین رازی اور تفسیر نور الثقلین زیر بحث آیت کے ذیل میں۔



ترجمہ

”اور اس طرح ہم نے لوگوں کو ان (اصحاب کہف) کے حال سے آگاہ کیا تاکہ جان لیں کہ اللہ کا وعدہ حق ہے اور قیامت اور معاد میں کوئی شک نہیں۔“ (کہف ۲)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس حبیب اور طولانی نیند، جو موت سے بہت مشابہت رکھتی ہے، کامل از کم ایک مقصد یہ تھا کہ یہ منکرین معاد کے لیے اور ان افراد کے لیے درس ہو جو اس سلسلے میں شک و شبہ میں مبتلا تھے۔

خاص طور پر یہ کہ ”اذیتنا زعون بینہم امر ہم“ سے استفادہ کیا گیا ہے کہ اس زمانے کی اقوام کا مسئلہ معاد (معاد جسمانی) کے بارے میں باہم نزاع و اختلاف تھا۔ مخالفین چاہتے تھے کہ اصحاب کہف کی نیند اور بیداری کا واقعہ جلد فراموش ہو جائے اور اس مسئلہ کے حامیوں کے ہاتھوں سے وہ یہ روشن برہان لے لیں (اس کی تفسیر میں جو متعدد احتمالات ذکر کیے گئے یہ ان میں سے ایک ہے)۔

فخر الدین رازی نے اس کی تفسیر میں پانچ دیگر احتمالات بھی ذکر کیے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ اختلاف اور تنازعہ اصحاب کہف کی تعداد کے بارے میں تھا اور ان کے ناموں کے بارے میں یا ان کی نیند کی مدت کے بارے میں یا اس بارے میں اختلاف تھا کہ غار کے پاس ایک عبادت گاہ معبد کفار کے قریب تعمیر کریں یا معبد موحدین کے قریب۔<sup>[۱]</sup>

اس سورہ کی آیت میں قرآن مجید صراحت کے ساتھ فرماتا ہے کہ وہ تین سو نو سال سوئے رہے۔ قرآن پاک کے الفاظ ہیں:

**وَلَبِثُوا فِي كَهْفِهِمْ ثَلَاثَ مِائَةٍ سِنِينَ وَازْدَادُوا تِسْعًا** (کہف ۲۵)

کوئی شک نہیں کہ ایسی طولانی نیند موت کی شبیہ ہے اور اس کے بعد بیداری حیات بعد از موت کی مانند ہے۔ لہذا یہ واقعہ معاد کے لیے تاریخی اعتبار سے بخوبی ایک عینی نمونہ ہو سکتا ہے۔

کچھ وضاحتیں

اس داستان کے حوالے سے بہت کچھ کہا گیا ہے۔ ہماری بحث سے صرف چند نکات متعلق ہیں:

(۱) واقعے کا خلاصہ

قرآن مجید اور مشہور روایات میں جو کچھ آیا ہے اس کے مطابق واقعہ کچھ یوں ہے کہ ایک ظالم بادشاہ تھا جس کا نام دقیا نوس تھا جو ایک بت پرست قوم پر حکمرانی کرتا تھا۔ بعض نے اس کا نام ”دسیوس“ لکھا ہے۔ اس کا زمانہ پہلی سے تیسری صدی عیسوی کے درمیان تھا۔ اس کے پایہ تخت کا نام ”افسوس“ تھا۔ اس کے کچھ وزراء تھے۔ ایک واقعہ کی بناء پر وہ بت پرستی کے بے اساس ہونے کی طرف متوجہ ہوئے۔ انہوں نے



اپنے مقام و منصب پر اس خرافاتی مذہب کے چنگل سے آزادی کو ترجیح دی۔ وہ لوگ خفیہ طور پر اپنے شہر سے نکلے اور ایک نامعلوم منزل کی طرف چل پڑے۔ ایک عرصے کے بعد وہ ایک غارتگ پہنچے جسے انہوں نے اپنی پناہ گاہ قرار دیا۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے ایک عجیب طولانی نیند ان پر مسلط فرمادی۔ وہ سینکڑوں برس سوتے رہے۔ جب وہ اس خواب گراں سے بیدار ہوئے تو ایک دوسرے سے اپنی نیند کے بارے میں سوال کرنے لگے۔ انہوں نے خیال کیا کہ ان کی نیند ایک دن یا دن کے کچھ حصے سے زیادہ نہ تھی۔ لیکن غار کے اطراف کے قرائن و شواہد اور ان کے اپنے چہرے مہرے نشاندہی کر رہے تھے کہ بات اس سے مختلف ہے۔ لہذا وہ شک میں پڑ گئے۔

انہیں چونکہ بھوک لگ رہی تھی لہذا انہوں نے اپنے میں سے ایک شخص کو شہر کی طرف بھیجا کہ ان کے لیے چپکے سے کھانا لے کر آئے۔ لیکن انہوں نے کھانا خریدنے کے لیے جو سکے دیے ان سے ان کا راز فاش ہو گیا۔ ان کا طرز عمل بھی لوگوں کی عادات و رسوم سے مختلف تھا۔ اس پر مستزاد کہ لوگوں نے سن رکھا تھا کہ ایک مدت پہلے چند جوان جو صاحب منصب اور عالی مقام تھے، غائب ہو گئے تھے۔ یہ سب امور نشاندہی کر رہے تھے کہ یہ لوگ وہی ہیں۔

لوگوں کو پتہ چل گیا اور وہ ان کے گرد جمع ہو گئے۔ لیکن وہ شخص اپنی غار میں واپس آ گیا اور ہمیشہ کے لیے اس دنیا سے آنکھیں موند لیں۔ لوگوں نے اس جگہ ان کے احترام میں ایک معبد تعمیر کر دیا۔

### اصحاب کہف کا واقعہ - تاریخی کتب میں

سوال یہ ہے کہ کیا یہ واقعہ قرآن مجید کے علاوہ بھی کہیں نقل ہوا ہے اور موجودہ تو رات اور انجیل میں اس کی طرف کوئی اشارہ ملتا ہے؟ پہلے سوال کا جواب مثبت ہے اور دوسرے کا منفی کیونکہ مورخین کے مطابق یہ واقعہ ولادت مسیح کے طویل عرصہ کے بعد رونما ہوا۔ بعض نے اس کی تاریخ ۲۴۹ تا ۲۵۱ عیسوی کے مابین ذکر کی ہے۔ لہذا ممکن نہیں کہ تو رات یا انجیل میں اس کے بارے میں کوئی اشارہ ہو۔ ”اعلام قرآن“ میں ہے:

یورپیوں نے اصحاب کہف کا واقعہ بطور خلاصہ یوں نقل کیا ہے:

”دقیانوس جو عیسائیوں پر سخت ظلم کرتا تھا، اس کے زمانے (۲۴۹ تا ۲۵۱) میں اشراف کے سات جوانوں نے غار میں پناہ لے لی۔ دقیانوس نے حکم دیا کہ غار کے دبانے پر ایک دیوار تعمیر کر دی جائے تاکہ وہ بھوک اور پیاس کی وجہ سے مرجائیں۔ لیکن وہ ساتوں غار میں گہری نیند میں چلے گئے۔ ۱۵۷ سال بعد ڈیوڈ دوم کے زمانے میں وہ بیدار ہوئے۔ یورپیوں نے اصحاب کہف کو ”افسوس کے ساتھ سونے والے“ کا نام دیا ہے۔“

اس کتاب کے ایک اور حصے میں آیا ہے:

اصحاب کہف کا واقعہ پہلی بار پانچویں صدی عیسوی میں ساروک کے رہنے والے ”زاک“ نے اپنے ایک سریانی رسالے میں بیان کیا

ے۔ ثاک کلیسائے شام کا خلیفہ تھا گو یوس نامی شخص نے جلال شہداء کے زیر عنوان اس رسالے کا سریانی سے لاطینی میں ترجمہ کیا۔<sup>[۱]</sup>  
تواریخ اسلامی اور مشرق و مغرب کی ادبیات میں اس واقعے کی وسیع بازگشت سائی دیتی ہے، یہاں تک کہ روس اور حبشہ کے ادبی آثار میں بھی اس واقعے کی بازگشت اور اس کی طرف اشارے موجود ہیں۔<sup>[۲]</sup>  
بنابریں مذکورہ واقعہ صرف قرآن مجید میں ہی بیان نہیں ہوا بلکہ دوسروں کے تاریخی آثار میں بھی اس کی طرف اشارے پائے جاتے ہیں۔

## اصحاب کہف کی غار کا محل وقوع

مشہور یہ ہے کہ یہ غار ”افسوس“ نامی ایک شہر کے پاس واقع تھا۔ جو ایشیائے کوچک کے شہروں میں سے ایک مشہور شہر ہے۔ (ایشیائے کوچک یعنی موجودہ ترکی جو قدیم مشرقی روم کا ایک حصہ ہے) یہ دریائے کایس کے نزدیک از میر سے جنوب مشرق میں تقریباً چالیس میل کے فاصلے پر واقع تھا۔<sup>[۳]</sup>  
”افسوس“ اپنے معروف عبادت خانہ اور بت خانہ اوطامیس کی وجہ سے عالمی شہرت رکھتا ہے کیونکہ یہ دنیا کے سات عجائبات میں سے ہے۔<sup>[۴]</sup>

لیکن بعض کے خیال میں اصحاب کہف کا غار شام کے نزدیک ”طرطوس“ کے علاقے میں ہے۔<sup>[۵]</sup>  
اس وقت بھی دمشق میں ایک محلہ موجود ہے جو غار اصحاب کہف کے نام سے مشہور ہے اور لوگ اسے دیکھنے جاتے ہیں۔  
لیکن پہلی تفسیر زیادہ مشہور ہے۔

## اصحاب کہف کا واقعہ۔ موجودہ علم کی روشنی میں

سوال یہ ہے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ کسی شخص کی عمر چند سو سال ہو جائے، خواہ یہ عمر بیداری میں گزرے یا گہری نیند میں؟ اگر یہ مان لیں کہ بیداری میں ممکن ہے تو بھی نیند میں ایسا مکان بیشتر مشکلات کا حامل ہے، کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان بغیر کچھ کھائے پئے تین سو سال زندہ رہے جب کہ عام حالات میں اتنی مدت میں شاید ایک انسان کو ایک سو ٹن غذا اور ایک لاکھ لیٹر پانی سے زیادہ کی ضرورت ہوگی۔

[۱] اعلام قرآن، ص ۱۷۱ و ص ۱۷۲

[۲] اعلام قرآن، ص ۱۸۱

[۳] فرہنگ قصص قرآن ص ۳۱۵

[۴] قاموس مقدس ص ۸۷

[۵] دائرة المعارف وھد امادة اصحاب کہف

یہ وہ سوالات ہیں جو سائنسی اعتبار سے اس واقعہ کے بارے میں پیدا ہوتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ جوان سوالات کے جواب کے لیے کوئی دلیل نہیں پاسکے انہوں نے فوراً انکار کا راستہ اختیار کیا ہے اور اس واقعہ کو ایک دیومالائی داستان قرار دیا ہے۔ یہ اس حال میں ہے جب کہ سائنسدانوں کے تازہ ترین مطالعات ایک طرف اور زندہ موجودات کی زندگی کے بارے میں انکشافات دوسری طرف کہہ رہے ہیں کہ بات اتنی آسان نہیں ہے۔

عصر حاضر کے سائنسدانوں کے اس بارے میں طرزِ تفکر کو اجمالی طور پر جاننے کے لیے ہم حال ہی میں سائنسی مطبوعات میں شائع ہونے والی تحقیقات کا ایک نمونہ پیش کرتے ہیں۔

ان مطبوعات میں سے ایک میں اس عنوان کے تحت کہ کیا انسان موت پر قابو پالے گا، بیان کیا گیا ہے:

مثالینکف، جو معروف بیالوجسٹ تھا، نے ۱۹۳۰ء میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ خود عالمِ طبعی میں صلاحیت کے اعتبار سے حیات ابدی موجود ہے۔ سائنس کی ذمہ داری یہ ہے کہ حیات جاوید کے اسرار تک رسائی حاصل کرے۔

وہ مزید کہتا ہے کہ سادہ جانور جو مثلاً ایک خلیے<sup>[۱]</sup> پر مشتمل ہوتے ہیں، درحقیقت مرگ ناپذیر ہیں، کیونکہ وہ لامتناہی طور پر خلیوں کی تقسیم کے طریق پر زندہ رہتے ہیں۔ لہذا کیا تجب ہے کہ عالی تر موجودات میں کہ جولاکھوں خلیوں سے تشکیل پاتے ہیں، صلاحیت کے اعتبار سے حیاتِ جاوید کا مصداق موجود ہو۔ ہم سائنسدانوں کو چاہیے کہ ان کے اسرار تک رسائی حاصل کریں۔

اس مقولہ کے بارے میں ایک اور جگہ ”چھ سو ملین سالہ نیند“ کے زیر عنوان بیان کیا گیا ہے کہ ایسے افکار پختہ ہوتے رہے، یہاں تک کہ پروفیسر ایٹنجر نے اس کے عملی مفہوم کے بارے میں بیان کیا۔ وہ کہتا ہے کہ اب ہم حیات ابدی کے بارے میں بات کر سکتے ہیں کیونکہ نظریات کی دنیا میں حیاتِ جاوید کا امکان ثابت ہو چکا ہے اور تکنیک کے حوالے سے ہم ایسے مقام پر پہنچ گئے ہیں جہاں اس نظریے کو عملی شکل دے سکیں۔

اس کے بعد تسلسل حیات کے بارے میں بحث کرتے ہوئے اضافہ کرتا ہے:

جب بدن کا درجہ حرارت بہت نیچے آجاتا ہے تو زندگی کی رفتار اتنی سست پڑ جاتی ہے کہ تقریباً زمانہ کی دسترس سے نکل جاتی ہے۔ جب ہمارے بدن کا درجہ حرارت صفر مطلق<sup>[۲]</sup> کے نزدیک پہنچ جاتا ہے تو عام حالات میں ایک سیکنڈ زندگی کے لیے توانائی کی جس مقدار کی ضرورت ہوتی ہے وہ صدیوں کی زندگی کے لیے کافی ہو سکتی ہے۔

اس کے بعد نمک کی قلموں کے بارے میں بات کرتا ہے، جو سو ملین سال قبل سے مربوط ہیں۔ ان میں اس زمانے کے جراثیم (BACTERIAS) کے آثار اور بقایا جات موجود تھے۔ وہ مناسب فضا میں آئے اور زندہ ہو گئے اور ان کی نسل بڑھی (یعنی درحقیقت یہ

[۱] (PROTOZO'AS)

[۲] صفر مطلق عام صفر سے ۲۷۰ درجہ سنی گریڈ کم ہوتا ہے۔ (ABSOLUTE ZERO)

جرثومے سولین سال کے بعد نیند سے بیدار ہوئے ہیں)۔ پروفیسر ایٹنجر نے اس واقعے کے بعد ان قلموں (CRYSTALS) کو جو علاقے میں چھ سولین سال قبل سے موجود ہیں ان کے سمیت دنیا کے مختلف علاقوں سے جمع کیا اور ان جرثوموں کے بقایا جات کو بویا اور نہایت تعجب سے دیکھا کہ وہ بھی خواب گراں سے اٹھ بیٹھے ہیں۔ اس طرح سے اس نے ان چھوٹے چھوٹے موجودات کے لیے چھ سولین سال کی ریکارڈ عمر ثابت کی۔

اس کا نظریہ ہے کہ سائنسی اعتبار سے ایسا انسان کے لیے بھی ہو سکتا ہے۔ یہ انجماد بالکل موت سے قبل کے لمحے میں ہوتا ہے اور خاص حالات میں ایسا ہوتا ہے۔ اس طرح سے بدن کے اعضاء (ORGANS) کو کوئی نقصان نہیں ہوتا۔<sup>[۱]</sup> ہمارا ہرگز یہ ادعا نہیں کہ اصحاب کھف انجماد کی حالت میں زندہ تھے۔ ہم صرف یہ کہتے ہیں کہ اگر نیند بہت گہری ہو اور جسم کے نظام غیر معمولی طور پر آہستہ روی سے کام کریں تو بدن کی ضروریات اتنی کم ہو جاتی ہیں کہ ممکن ہے بدن میں موجود ذخیرہ صدیوں کی زندگی کی ضروریات بھی پوری کر دے، چونکہ یہ کوئی معمول کی طبعی نیند نہ تھی۔ یہ حکم خدا سے استثنائی حالت میں آئی تھی اور فضا ایسی مخصوص تھی کہ قرآن کے مطابق وہاں دھوپ ہرگز نہ پڑتی ہے۔

### وَتَرَى الشَّمْسَ إِذَا طَلَعَتْ تَزْوُرُ عَنْ كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْيَمِينِ وَإِذَا غَرَبَتْ تَقْرِضُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ (کھف ۱۷)

طولانی نیند کا مسئلہ ہمارے زمانے میں حل ہو چکا ہے (بہت سے جانداروں کے بارے میں یہ بات تسلیم ہو چکی ہے کہ وہ پورے موسم سرما میں سوئے رہتے ہیں)۔ ایسی نیند میں زندگی کی فعالیت تقریباً رک جاتی ہے اور انتہائی معمولی سی حرارت باقی رہ جاتی ہے۔ دل کی دھڑکن اس قدر خفیف ہو جاتی ہے کہ محسوس ہی نہیں ہوتی۔ ایسے مواقع پر انسانی جسم کو ایسے بڑے آتش دان سے تشبیہ دی جاسکتی ہے جس میں آگ خاموش ہو جائے تو ایک چھوٹا سا شعلہ بھڑکتا رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک دن میں ایک بڑے آتش دان کو پوری طرح سے جلنے کے لیے جس قدر توانائی کی ضرورت ہوتی ہے ممکن ہے کہ چھوٹے چھوٹے شعلوں کی صدیوں کی ضرورت اس سے پوری ہو جائے۔

سائنسدان کہتے ہیں کہ نہ صرف بعض خون سرد جاندار موسم سرما میں سو جاتے ہیں بلکہ بعض خون گرم جاندار بھی ایسا کرتے ہیں۔ اس دوران ان کی زندگی کی رفتار بہت سست پڑ جاتی ہے اور انکے بدن کی چربی کا ذخیرہ بتدریج صرف ہوتا رہتا ہے۔<sup>[۲]</sup>

ہمارا مقصد اصحاب کھف کی نیند کی کیفیت بیان کرنا نہیں بلکہ دو امور کا بیان کرنا مقصود ہے:  
ایک یہ کہ ان کی نیند اجمالاً ایک عام اور معمولی نیند نہ تھی۔ خصوصاً اس لیے کہ قرآن فرماتا ہے:

[۱] مجلہ دانستہا۔ آذر ماہ ۱۳۶۱ (ہجری شمسی) شمارہ ۸۰

[۲] دائرة المعارف ”فرہنگ نامہ“ مادہ ”زمستان خوابی“

لَوِ اَظْلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا وَلَمْلَمْتَ مِنْهُمْ رُغْبًا ۝۱۸  
 ”اگر تو انہیں اس حال میں دیکھتا تو بھاگ جاتا اور بہت ڈرتا۔“ (کہف ۱۸)

دوسرا یہ کہ ایسی نیند میں معمول کی نیند کا حساب حکم فرمانہیں ہوتا اور ممکن ہے کہ جسم کی ضروریات اس قدر کم ہو جائیں کہ تغذیہ کی مشکل بالکل باقی ہی نہ رہے۔

## بنی اسرائیل کے فرار کا واقعہ

اس سلسلے کا ایک اور نمونہ قرآن کی سورہ بقرہ میں آنے والا ایک واقعہ ہے یہ واقعہ ایک جماعت کے بارے میں ہے جو ہزاروں افراد پر مشتمل تھی۔ موت کے خوف سے ان لوگوں نے اپنا گھر بار چھوڑ دیا اور فرار ہو گئے۔ لیکن اس فرار کے باوجود وہ نجات نہ پاسکے۔ اللہ کے حکم سے وہ سب موت کے پنجے میں گرفتار ہوئے۔ بعد ازاں اللہ نے انہیں پھر سے زندہ فرمایا۔ ارشاد ہوتا ہے:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌۭ ۙ حَذَرَ الْمَوْتِ ۖ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ۖ ثُمَّ اَحْيَاهُمْ ۗ ط (بقرہ ۲۴۳)

مفسرین کے مطابق یہ بنی اسرائیل کی ایک جماعت تھی۔ یہ لوگ کسی وبا یا طاعون کے خوف سے اپنے علاقے سے بھاگ گئے لیکن زیادہ دیر نہ گزری کہ اسی بیماری کے باعث دنیا سے چل بسے۔ بنی اسرائیل کے ایک نبی حضرت حزقیل کا وہاں سے گزر ہوا۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی کہ انہیں زندہ کرے۔ اللہ تعالیٰ نے (منکرین معاد کے مقابلے میں) مردوں کے احیاء کے لیے ایک نمونہ کے طور پر انہیں زندہ کر دیا۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ وہ شام کے کسی شہر میں رہتے تھے۔ کبھی کبھی ان کے درمیان طاعون پھیل جاتا تھا۔ جب بھی اس کے آثار دیکھتے تو امیر لوگ جن کے پاس کافی وسائل ہوتے وہ شہر چھوڑ جاتے۔ غریب لوگ باقی رہ جاتے اور ان میں بہت اموات واقع ہوتیں۔ جو لوگ باہر چلے جاتے وہ زیادہ تر صحیح و سالم رہتے۔ بعد ازاں انہوں نے فیصلہ کیا کہ اب جب کبھی ایسا ہوگا تو سب نکل جائیں گے۔ انہوں نے ایسا ہی کیا لیکن کوئی نہ فائدہ ہوا اور سب اللہ کے حکم سے اس دنیا سے چل بسے۔ [۱]

مندرجہ بالا آیت میں اس نکتے کی طرف کوئی اشارہ نہیں ہے کہ مرنے کے بعد اس زندہ کرنے کا مقصد اس دنیا میں معاد کے منظر کی نشاندہی کرنا ہے لیکن جو روایات اس واقعے کی تشریح کے ضمن میں آئی ہیں ان میں یہ تصریح کی گئی ہے کہ یہی ہدف پیش نظر تھا۔ [۲]  
 یہاں پھر ہمیں بعض نام نہاد روشن فکر مفسرین کی انحرافی تفسیر کا سامنا کرنا پڑتا ہے کیونکہ یہ واقعہ بھی معجزانہ پہلو رکھتا ہے اور ہم جانتے

[۱] مجمع البیان، تفسیر فخر رازی اور تفسیر نور الثقلین (زیر بحث آیت کے ذیل میں)

[۲] مجمع البیان، ج ۲، ص ۳۴۷

ہیں کہ ایسے امور کا بعض افراد کے لیے ہضم کرنا مشکل ہے۔ لہذا ظاہر قرآن جس امر کی حکایت کرتا ہے یہ لوگ اس کا سرے سے انکار کر دیتے ہیں۔ انہوں نے اسے امتوں کی حیات و موت کے لیے صرف ایک مثال قرار دیا ہے جو ان کی نظر میں درحقیقت ان کی کامیابی اور ناکامی کے لیے ایک کنایہ ہے۔

یہ افراد کہتے ہیں کہ مذکورہ بالا آیت میں ایک ایسے گروہ کی خبر دی گئی ہے جنہوں نے اپنی قوت و طاقت اور استقلال کو بالکل گنوا دیا۔ اس طرح سے وہ ایک مردہ امت کی طرح سے ہو گئے۔ پھر وہ خواب غفلت سے بیدار ہوئے اور لطف الہی سے دوبارہ قوت و استقلال پایا۔<sup>[۱]</sup> لیکن ہم جانتے ہیں کہ ایسی تفسیروں اور توجیہوں کو اگر قرآن کی حدود میں لے آیا جائے تو پھر بہت سے حقائق قرآنی قابل انکار قرار پائیں گے۔ پھر ہر کوئی واضح آیات کی اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق تفسیریں کر سکتا ہے۔ یوں قرن جو انسانوں کا رہبر و رہنما ہے توجیہ افکار اور ذاتی ذوق کا آلہ بن جائے گا جب کہ اسے تو راہبر ہونا چاہیے اور اس کے پیچھے چلنا چاہیے۔

روایات اسلامی میں جس تفسیر بالرائے سے سختی سے روکا گیا وہ ایسی ہی تفسیریں ہیں۔ ایسی ہی تفسیر بالرائے کرنے والے کو ایسا شخص قرار دیا گیا ہے کہ جو آسمان سے زمین پر آگرے۔ ایسی تفسیریں فہم الفاظ کے معیارات اور قواعد سے خارج ہیں۔ اگر یہ لوگ چاہتے ہیں کہ ایسی تفسیروں سے مادی فکر والوں کو مطمئن کریں تو وہ ہرگز ایسی چیزوں سے مطمئن نہیں ہوتے اور اگر یہ معجزات کا انکار کرنا چاہتے ہیں تو پھر ایسی بات نہ تو مذہب کے حامی قبول کرتے ہیں اور نہ مخالفین مذہب۔

## مقتول بنی اسرائیل کا واقعہ

احیاء اموات کا اس جہان میں عینی نمونہ قرآن مجید کے جن واقعات میں پیش کیا گیا ہے ان میں سے آخری مورد بنی اسرائیل کے کچھ افراد سے متعلق ایک واقعہ ہے۔ ہوا یہ کہ ان میں سے ایک اہم آدمی خفیہ طور پر قتل ہو گیا۔ قاتل کی تلاش کے سلسلے میں بنی اسرائیل کے درمیان بہت اختلاف پیدا ہوا۔ ہر قبیلہ اس قتل کا الزام دوسرے قبیلے پر دھرتا تھا۔ ممکن تھا کہ اس کشمکش کے جاری رہنے کی صورت میں کوئی بہت بڑا فتنہ پیدا ہو جاتا۔ لہذا وہ حضرت موسیٰ کے پاس آئے۔ حضرت موسیٰ نے الطاف الہی سے مدد لی اور ایک ایسے اعجاز آمیز طریقے سے مسئلہ کو حل کر دیا جسے سب نے قبول کر لیا۔

آپ نے حکم دیا کہ ایک گائے کو ذبح کریں۔ لیکن گائے کا سر آسانی سے نہ کاٹا جاسکا۔ بنی اسرائیل کے بہانہ جو افراد اس گائے کے اوصاف پوچھنے کے لیے بار بار حضرت موسیٰ کے پاس آئے اور بے جا اور بے معنی سوالات کر کے انہوں نے مسئلے میں تاخیر پیدا کی۔ آخر کار کچھ خاص اوصاف والی ایک گائے کو انہوں نے ذبح کیا۔ اس کے گوشت کا ایک حصہ مقتول پر رکھا گیا۔ وہ اللہ کے حکم سے چند لمحوں کے لیے زندہ ہو گیا اور اس نے اپنے قاتل کی شناخت کر دی۔

اس واقعے کے آخری حصے میں قرآن فرماتا ہے: اس وقت کو یاد کرو جب تم نے ایک شخص کو قتل کر دیا، پھر اس کے بارے میں تم

جھگڑنے لگے اور جو کچھ تم چھپاتے تھے اللہ نے اسے ظاہر کر دیا۔ پس ہم نے حکم دیا کہ اس کا ایک حصہ مقتول کے جسم پر مارو۔ اس طرح سے اللہ مردوں کو زندہ کرتا ہے اور تمہیں اپنی آیات دکھاتا ہے کہ شاید سمجھ جاؤ (وَإِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادْرَأْتُمْ فِيهَا ۗ وَاللَّهُ مَخْرُجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُونَ ﴿۵۰﴾ فَقُلْنَا اضْرِبُوهُ بِبَعْضِهَا ۗ كَذَلِكَ يُخَيِّ اللَّهُ الْمَوْتَى ۚ وَيُرِيكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ﴿۵۱﴾) (بقرہ ۴۲-۴۳)

یہ بات عجیب ہے کہ اس میں انہوں نے ایک مردے کا کچھ حصہ دوسرے مردے کو مارا تا کہ وہ زندہ ہو جائے اور حقیقت حال کو بیان کرے۔ ان دونوں کے درمیان کیا ربط ہے اور یہ اثر کہاں سے پیدا ہوا، یقیناً یہ ایک رازِ الہی ہے جس سے اس کی پاک ذات کے علاوہ کوئی آگاہ نہیں۔ بس اتنی بات واضح ہوتی ہے کہ دوسری دنیا میں مردوں کو زندہ کرنا قدرتِ الہی کے لیے کس قدر آسان اور سادہ ہے۔ یہ کوئی ضروری نہیں کہ ہمیشہ ایک موجود زندہ ہی سے دوسرا موجود زندہ پیدا ہو، بلکہ ممکن ہے کہ حکمِ الہی سے دو اعضاء کے باہم ملنے سے شعلہ حیات بھڑک اٹھے۔

کَذَلِكَ يُخَيِّ اللَّهُ الْمَوْتَى (اس طرح سے اللہ مردوں کو زندہ کرتا ہے)۔ یہ جملہ وضاحت سے اس حقیقت کو بیان کرتا ہے کہ مقتول کے زندہ ہونے نے موت کے بعد حیات کا ایک عینی نمونہ انسانوں کے لیے پیش کیا ہے۔

اس مقام پر پھر ہمیں صاحب المنار جیسے مصنفین کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو اس قدر وضاحت کے باوجود جملہ کے معنی خلاف ظاہر کرنے پر مصر ہیں، جب کہ ان کے پاس نہ کوئی عقلی قرینہ ہے اور نہ ہی نقلی اور نہ ضرورت ہے۔

وہ کہتے ہیں:

ظاہر ایوں تھا کہ اگر کسی شہر کے پاس کوئی مقتول پڑا ملتا اور اس کے قاتل کی شناخت نہ ہوتی تو ہر کوئی وہاں اپنے خاص مذہبی مراسم کے ساتھ اپنے ہاتھ دھوتا اور خونِ مقتول سے بری ہو جاتا اور جو کوئی نہ دھوتا اسے قاتل سمجھا جاتا۔ احیائے موتے سے یہاں مراد اس خون کی حفاظت ہے جس کے ایسی کشمکش اور نزاع میں بہہ جانے کا اندیشہ ہوتا تھا۔ یعنی اللہ ایسے احکام کے ذریعے مزید خون بہنے سے روکتا ہے۔<sup>[۱]</sup>

جیسا کہ پہلے بھی اشارہ کیا جا چکا ہے ایسی تفسیریں ایک طرح سے الفاظ کی بازی گری ہیں۔ ان تفاسیر سے کلامِ اللہ کی اصالت ہی مخدوش ہو جاتی ہے۔ اس سے کسی بھی آیت سے کسی بھی مقصد پر استدلال کرنے کا راستہ کھل جاتا ہے۔ پھر تو ہم الفاظ سے کنائی اور مجازی معانی نکالتے رہیں، بغیر اس کے کہ اس کے لیے کوئی اطمینان بخش قرینہ موجود ہو۔ علاوہ ازیں ایسا کرنے کی کوئی ضرورت و احتیاج بھی نہیں، کیونکہ مذاہب کے پیروکاروں کو بہر حال معجزات اور خوارقِ عادات کو ماننا ہی پڑتا ہے۔ جب ایسا ہے تو ان تو جیہات کی کیا ضرورت ہے۔

شاید ذبح کرنے کے لیے گائے کو اس لیے منتخب کیا گیا کہ بنی اسرائیل قربانی گائے کی ہی دیا کرتے تھے۔

اب یہ سوال باقی ہے کہ اس قتل کا محرک کیا تھا؟ روایات میں آیا ہے کہ ایک جوان نے اموال پر قبضہ کے لیے اپنے چچا کو قتل کیا تھا (یا اس لیے کہ اس کی بیٹی سے شادی کر سکے)۔ اس کے پیش نظر قتل کا محرک مال یا عورت کی محبت ہے (اور دنیا میں اکثر قتل کا محرک یہی ہوتا ہے)۔

اس عجیب واقعہ میں، بالخصوص اس کی تفصیلات میں بہت سے سبق آموز نکات ہیں۔ چونکہ یہ معاد کی بحث سے خارج ہیں لہذا ہم ان



سے صرف نظر کرتے ہیں۔ بیشتر آگاہی کے لیے آپ تفسیر نمونہ ج ۱ میں زیر بحث آیات کی تفسیر کی طرف رجوع کریں۔<sup>[۱]</sup>

یہ تھے مردہ کے احیاء کے چند عینی نمونے جن کی طرف قرآن مجید میں اشارہ ہوا ہے۔ اس کے ساتھ ہی امکان معاد کے بارے میں گفتگو اختتام کو پہنچتی ہے۔ اب ہم اس کے عقلی دلائل کی جستجو کی طرف بڑھتے ہیں۔

[۱] سورہ بقرہ کی آیہ ۵۵ و ۵۶ میں بھی حیات بعد از ممات کے ایک نمونے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ جب بنی اسرائیل کے نمائندے حضرت موسیٰ کے ہمراہ کوہ طور پر گئے تو وہاں انہوں نے چشم ظاہر سے اللہ کو دیکھنے کا تقاضا کیا۔ ایک ہلاکت خیز بجلی پہاڑ پر پڑی اور وہ ریزہ ریزہ ہو گیا۔ موسیٰ بہوش ہو گئے اور بنی اسرائیل کے نمائندے مر گئے۔ بعد ازاں اللہ نے انہیں زندہ کیا کہ شاید اس کی نعمت کا شکر بجالائیں (ثم بعثنکم من بعد موتکم لعلکم تشکرون)۔ لیکن اس لیے کہ آیت میں یہ بات بیان نہیں کی گئی کہ اس کا مقصد معاد کا کوئی نمونہ پیش کرنا تھا، ہم نے اسے زیر بحث موضوع کی آیات میں نہیں شمار کیا، خاص طور پر اس بات کے پیش نظر کہ بعض مفسرین نے یہ احتمال ذکر کیا ہے کہ بنی اسرائیل اس عظیم چمک کو دیکھ کر بے ہوش ہو گئے تھے، مرے نہیں تھے۔ نیز بعض نے موت سے جہل اور بعثت سے علم مراد لیا ہے، (روح المعانی میں آلوسی نے یہ دو تفسیریں بعض مفسرین سے نقل کی ہیں۔ ج ۱ ص ۲۲۹) اگرچہ ایسی تفسیریں ظاہر آئیے کے مخالف ہیں اور قابل قبول نہیں ہیں۔



## وقوع معاد پر دلائل

معاد کے ثبوت کے لیے متعدد عقلی و منطقی دلائل موجود ہیں کہ جن کی طرف قرآن مجید نے اشارہ کیا ہے بلکہ بعض جگہ تو بڑی صراحت سے بیان کیا ہے۔ دوسرے الفاظ میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ قرآن نے اپنے ان اشاروں میں مسلمانوں کو ان اصول و براہین کی پیروی کے لیے ہدایت کی ہے۔

اصولاً قرآن مجید نے اپنی اعتقادی بحثوں میں کسی ایک میں بھی تعبد اور بے دلیل گفتگو کا انداز نہیں اپنایا بلکہ ان تمام مباحث میں دلائل عقلی پر زور دیا ہے۔ لہذا بعض اوقات ایک چھوٹی سی آیت اہم ترین عقلی دلائل کے درپچوں کو کھول دیتی ہے جس کی مثال توحیدی مباحث میں بہت زیادہ دیکھنے کو ملتی ہے اور معاد کی بحث میں بھی آپ انشاء اللہ اسے ملاحظہ فرمائیں گے۔

قرآن مجید سے وقوع معاد کے بارے میں معمولاً سات دلیلیں پیش کی جاتی ہیں جو درج ذیل ہیں:

- ۱۔ دلیل فطرت
- ۲۔ دلیل حکمت
- ۳۔ دلیل عدالت
- ۴۔ دلیل حرکت و ہدف
- ۵۔ دلیل رحمت
- ۶۔ دلیل نفی اختلاف
- ۷۔ دلیل بقائے روح

## ادلیل فطرت

یہاں پر دلیل فطرت سے مراد ہے کہ انسان اپنے اندر دل کی گہرائیوں سے ایک حقیقت پر ایمان و اعتقاد کو پاتا ہے اور ہماری بحث کے مطابق انسان دوسرے جہان کے وجود، قیامت اور خدائی عدالت پر ایمان کو محسوس کرتا ہے۔  
البتہ اس بات کی مختلف طریقوں سے وضاحت ضروری ہے جس کی تشریح ہم درج ذیل آیات کی بحث کے بعد بیان کریں گے۔

- (۱) فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا ۖ فِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۚ لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ ۚ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ ۚ (روم: ۳۰)
- (۲) لَا أُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيَمَةِ ۖ وَلَا أُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ۖ أَيَحْسَبُ الْإِنْسَانُ أَنَّنَّ نَجْمَعُ عِظَامَهُ ۖ (القيامة: ۳۱ تا ۳۲)

ترجمہ

- (۱) اپنا رخ خدا کے دین حنیف (خالص آئین کی طرف کرلو۔ یہ ایسی فطرت ہے جس پر خدا نے انسانوں کو پیدا کیا۔ خدا کی خلقت میں تغیر و تبدل نہیں ہے۔ یہی دین اور محکم و استوار آئین ہے۔  
(۲) روز قیامت کی قسم..... اور باضمیر اور ملامت کنندہ نفس لوامہ کی قسم! (کہ قیامت حق ہے) کیا انسان خیال کرتا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو جمع نہ کریں گے؟

## تفسیر

### معاد دل کی گہرائیوں میں

بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ متذکرہ آیات میں سے پہلی آیت میں شاید انسان کی صرف فطرت خدا شناسی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جب کہ آیت میں دقت نظر کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا موضوع سخن عمومیت کا حامل ہے اور تمام دین کو فطری جانتا ہے۔ یعنی اصول عقائد کا مجموعہ حتیٰ کہ فروع دین کی کلیات اور احکام بصورت خلاصہ فطرت کی اتھاہ گہرائیوں میں موجود ہے۔  
ارشاد ہوتا ہے: اپنا رخ خدا کے خالص دین کی طرف کرلو، یہ وہی فطرت ہے جس پر خدا نے انسانوں کو پیدا کیا، خلقت خدا میں تغیر و تبدل نہیں ہے۔ یہی مستحکم و استوار آئین اور دین ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

## فَاقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا ۖ فِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۚ لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ ۚ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ ۚ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ

جیسا کہ آپ ملاحظہ فرما رہے ہیں متذکرہ بالا آیت میں لفظ ”دین“ دوبار استعمال ہوتا ہے کہ جو دینی حقائق کے مجموعے کی جانب اشارہ ہے اور یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ ایک جملے میں فرماتا ہے: ”یہ خلقت خدا ہے“ بعد ازاں ارشاد ہوتا ہے: ”خلقت خدا میں تغیر و تبدل نہیں ہے“ اور تیسری مرتبہ اس مسئلہ پر تاکید کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”یہ آئین مستحکم اور استوار ہے۔“

لہذا اس طرح اس آیت میں انسانوں کے لیے دین کے فطری ہونے پر تین بار تاکید کی گئی ہے۔<sup>[۱]</sup> اس آیت کے مجموعی مطالب سے اندازہ ہوتا ہے کہ نہ صرف مسئلہ خدا شناسی بلکہ قیامت اور خدا کی اس عظیم عدالت پر اعتقاد بھی انسانی فطرت میں شامل ہے۔

قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ اس آیت کے ضمن میں ملنے والی روایات میں بھی یہ مطلب روز روشن کی طرح عیاں ہے۔  
حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے کسی نے اس آیت کے ضمن میں فطرت کا معنی پوچھا:

امام علیہ السلام نے فرمایا: ہی الاسلام

اس فطرت سے مراد اسلام ہے۔<sup>[۲]</sup>

تفسیر در المنثور میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یوں نقل کیا گیا ہے:

### فطرت الله التي فطر الناس عليها، دين الله

”وہ فطرت کہ جس پر خدا نے لوگوں کو خلق کیا ہے، دین خدا ہے۔“<sup>[۳]</sup>

یہ معروف ترین حدیث شیعہ سنی دونوں نے نقل کی ہے کہ تمام انسان فطرت (اسلام) پر پیدا ہوئے ہیں لیکن یہ ان کے والدین ہیں

[۱] ”حنیف“ کا معنی خالص یا ہر قسم کے انحراف سے خالی ہونا ہے اور اس کا ریشہ اصلی بمعنی ”تمایل“ ہے۔ البتہ یہاں حق کی جانب تمایل کے معنی میں ہے۔ ”فطرت“ دراصل ”فطر“ (بروزن سطر) کے مادے سے ہے اور اس کا معنی پھاڑنا ہے، چونکہ تخلیق کے وقت پردہ عدم پھٹ جاتا ہے۔ اسی لیے یہ لفظ خلقت و آفرینش کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ”قیم“ کا مادہ قیام ہے جس کا معنی استوار، مستحکم، مضبوط و پائیدار اور ثابت و مستقیم ہے۔

[۲] نور الثقلین جلد ۴ ص ۱۸۴ حدیث ۵۴

[۳] در المنثور ج ۵ ص ۱۵۵

جو انہیں مجوسیت، یہودیت یا نصرانیت کی طرف کھینچ لے جاتے ہیں۔<sup>[۱]</sup>

دوسری آیت میں خداوند متعال کی قسم کے دو موضوع ذکر ہوئے ہیں: ایک روز قیامت اور دوسرا بیدار انسانی وجدان (لا اقسام بیوم القیمة ولا اقسام بالنفس اللوامة)۔

بعض معتقد ہیں کہ مندرجہ آیت میں لافنی ہی کے معنی میں ہے اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ میں ان دو موضوعات کی قسم نہیں کھاتا اور ہدف یہ ہے کہ اپنے مقصد کو بطور تاکید بیان کرے۔ یہ اسی طرح ہے جیسے ہم کسی کو کہتے ہیں کہ میں تیری جان کی قسم نہیں کھاتا جب کہ اشارہ یہ ہے کہ قسم سے بڑھ کر ہے۔ لیکن بیشتر مفسرین کا کہنا ہے کہ لازائدہ ہے اور تاکید کے لیے استعمال ہوئی ہے۔ بنا برائیں خدا نے روز قیامت کی قسم بھی کھائی ہے اور اسی طرح ”نفس لوامہ“ کی بھی۔

انسان کا اخلاقی ضمیر ہی ”نفس لوامہ“ ہے کہ جب اس سے کوئی غلطی سرزد ہوتی ہے تو اپنے ہی کو ملامت کرتا ہے۔ جتنی بڑی غلطی ہو ضمیر کی سرزنش اور عذاب بھی اتنا ہی زیادہ ہوتا ہے حتیٰ کہ بعض افراد جب گناہان کبیرہ کے مرتکب ہوتے ہیں یا کسی بڑی جنایت کا ارتکاب کرتے ہیں تو خود کشی کر لیتے ہیں تاکہ اس طرح ضمیر کے شکنجے سے نجات پالیں اور ہم میں سے اکثر نے قاتلوں یا جنایت کاروں کے بارے میں ایسی مثالیں سنی یا دیکھی ہیں۔

(روز قیامت اور نفس لوامہ) دو ایسے اہم ترین موضوعات کہ جن کی قسم کھائی جاسکتی ہے، ان کا اکٹھے ذکر ہونا درحقیقت ان کے آپس میں رابطے کی طرف اشارہ ہے۔

روز قیامت خدا کی سب سے بڑی عدالت ہے اور نفس لوامہ بھی انسان کے دل میں ایک چھوٹی عدالت اور قیامت ہے یا دوسرے الفاظ میں یہ کہ آپ کیسے قیامت کا انکار کرتے ہیں درحالیکہ اس کا چھوٹا سا نمونہ اسی دنیا میں خود آپ کے اپنے اندر موجود ہے اور آپ نے کئی بار آزمایا ہے کہ کوئی نیک کام انجام دینے سے آپ کی روح خوشی و مسرت سے پھولے نہیں سماتی۔ یہ اطمینان و سکون اور ضمیر کی رضامندی کا وہ صلہ ہے جو آپ کی روح آپ کو دیتی ہے۔ برا کام انجام دینے سے آپ بے چین ہو جاتے ہیں۔ اپنے ہی اندر سے اپنے آپ پر کوڑے برساتے ہیں۔ اندر ہی اندر سے جلتے رہتے ہیں۔ گریہ و بکا کرتے ہیں اور یہ وہ سزا ہے جو عدالت ضمیر سے آپ کو ملتی ہے۔

کیسے ممکن ہے کہ آپ میں سے ہر ایک کے اندر تو یہ خدائی عدالت ہو لیکن اتنی بڑی کائنات میں اس عظیم عدالت کا کوئی وجود نہ پایا جائے؟

یہ بات جاذب توجہ ہے کہ روز قیامت کے اثبات کے لیے روز قیامت کی قسم کھائی گئی ہے۔ گویا ارشاد ہوتا ہے: روز قیامت کی قسم

[۱] در المنثور، ج ۵ ص ۱۵۵ اور تفسیر جامع الجوامع متعلقہ آیت کے ذیل میں

کہ قیامت حق ہے۔“ [۱]

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ مذکورہ قسم مومنین کے لیے ہے تو اس بحث کی ضرورت ہی نہیں ہے اور اگر منکرین کے لیے ہے تو کیونکر اس چیز کی قسم کھائی گئی ہے جسے وہ قبول نہیں کرتے۔

بعض مفسرین اس مشکل کو حل کرنے کے لیے فرماتے ہیں کہ کلمہ رب تقدیر میں ہے اور آیت کا معنی یوں ہے کہ قیامت کے پروردگار کی قسم! قیامت واقع ہوگی۔ [۲]

یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ یہ قسم ان لوگوں کے لیے ہے جو کلا روز قیامت کے قائل ہیں، لیکن اس کی جزئیات میں شک کرتے ہیں، وہ جزئیات کہ جو بعد والی آیات میں بیان ہوئی ہیں، قرآن نے ان کے اثبات کے لیے روز قیامت کی قسم کھائی ہے۔

ایک اور تفسیر جو یہاں بیان کی جا رہی ہے اور شاید گذشتہ دونوں تفسیروں سے بہتر ہے وہ یہ کہ قرآن نے منکروں کے سامنے مسئلہ روز قیامت کو اس کے فطری ہونے کی وجہ سے اتنے مسلم طور پر بیان کیا ہے کہ اس کے اثبات کے لیے خود اسی کی قسم کھائی ہے۔

دوسرے الفاظ میں یوں کہ خود انہی کی فطرت سے ان کے لیے استدلال پیش کیا ہے۔ نفس لوامہ کی وضاحت میں مفسرین کے گونا گوں بیانات ملتے ہیں۔ بعض مفسرین نے اس بارے میں چھ تفاسیر نقل کی ہیں۔ کبھی اسے نفس مومن کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں جو لغزشوں پر اپنے آپ کو سرزنش کرتا ہے اور کبھی اسے نفس کافر سے موسوم کیا گیا ہے جو قیامت میں اپنے اعمال کے نتائج کو دیکھ کر اپنے آپ کو سرزنش کرتا ہے۔ بعض کا کہنا ہے کہ یہ مومن و کافر سے اعم تر ہے اور بعض فرماتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام کے جنت سے خارج ہونے کے بعد کی داستان کی طرف اشارہ ہے۔

قسم جو کہ دلیل شرافت ہے اور روز قیامت کے ساتھ واقع ہوئی ہے اس کے لیے سب سے مناسب یہی ہے کہ یہ ایسے مومنین کے نفوس کی جانب اشارہ ہے جو ابھی حد کمال تک نہیں پہنچے۔

## وضاحت

نفوس انسانی کو تین گروہ میں تقسیم کیا جاتا ہے: پہلا گروہ مکمل ظلمانی ہے جو نہ تو لائق قسم ہے اور نہ ہی اس میں کمال کی طرف بڑھنے کا جذبہ اور تحریک ہے اور اسی طرح یہ روز قیامت کی نشانیوں میں سے بھی نہیں ہے۔ یہ نفس امارہ ہے جو ہمیشہ برائی اور بدی کا حکم کرتا ہے۔

دوسرا گروہ نیم نورانی ہے جو حق کے راستے میں کمال کی طرف پرواز کرتا ہو ہے۔ جب کبھی اپنے ظلمانی پہلو کی وجہ سے خطا کا مرتکب

[۱] توجہ رہے کہ آیت میں مقسم لہ (وہ چیز کہ جس کے لیے قسم کھائی جائے) محذوف ہے اور بعد والے جملے سے پتہ چلتا ہے کہ ”تقدیر“

میں یوں تھا۔ ”للتبعثن یوم القیمة“

[۲] تفسیر فخر زاری ج ۳ ص ۲۱۶

ہوتا ہے تو نور ایمان کے پرتو سے بیدار ہو جاتا ہے اور اپنے آپ کو ملامت کرتا ہے، ایسی ملامت جو کمال تک پہنچنے کا ذریعہ ہے۔ اسی نفس کی قدرو قیمت ہے اور یہی صحنہ قیامت کا ایک چھوٹا سا نمونہ ہے۔ اسے نفسِ لواہ کہتے ہیں۔

تیسرا گروہ مکمل نورانی ہے جو نفسِ لواہ کے مرحلے سے گزر کر اطمینان و سکون کے مرحلے تک جا پہنچتا ہے ”یا ایتھا النفس المطمئنة“ کے خطاب کا مخاطب قرار پاتا ہے، ”ارجعی“ کے خطاب سے کمال مطلق کے مبدا کی طرف بازگشت پر مامور ہو جاتا ہے، خدا کے خالص بندوں میں شمار ہونے لگتا ہے اور بالآخر ارضیہ مرضیہ (خدا سے خوش اور خدا اس سے) کی منزل پر فائز ہو جاتا ہے۔

مختصر یہ کہ اس آیت کی تفسیر اور دلالت سے مراد یہ ہے کہ قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت کے مد نظر ان دو قسموں کا اکٹھے واقع ہونا بے ربط اور حادثاتی طور پر نہیں ہو سکتا بلکہ روزِ قیامت اور نفسِ لواہ کے درمیان ضرور کوئی رابطہ ہے اور وہ رابطہ یہ ہے کہ ہر انسان (اگر غلط تعلیمات کی وجہ سے فطرتِ حقیقی سے تہی دامن نہ ہوا ہو تو) ایک ایسے وجدان و ضمیر کا حامل ہے جو برائیوں کے وقت اسے سرزنش کرتا ہے اور نیکیوں کے وقت ترغیب دلاتا ہے۔

یہ وجدان کہ جو ایک وجدانِ شخصی ہے اور انسان کے اندر موجود ایک چھوٹی سی عدالت کا کام دیتا ہے، اس بات کو روشن کرتا ہے کہ اتنے بڑے عالم میں بھی کوئی ایک بڑا وجدان ہونا چاہیے جو مجرموں کی ملامت اور سزا کے لیے قیام کرے۔ لہذا اس بڑے وجدان کا مصداق روزِ قیامت کی عدالت کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔

## چند وضاحتیں

### ۱۔ قیامتِ فطرت کے آئینہ میں

اگرچہ فطری مسائل استدلالی ہیں نہ قابلِ درک، دیکھے جاسکتے ہیں نہ سنے جاسکتے ہیں بلکہ ہر کسی کو اپنے دل کی اتھاہ گہرائیوں میں اسے پانے کی جدوجہد کرنا چاہیے۔ لیکن اس کے باوجود ہم چند ایک وضاحتیں پیش کرنا ضروری سمجھتے ہیں تاکہ اس جدوجہد میں لوگوں کی مدد ہو جائے اور وہ اپنے اندرونی پیغام کو بہتر اور آسان طریقے سے سمجھ سکیں، تحریرِ فطرت کو آگاہی کے ساتھ پڑھ سکیں اور اس فطری پیغام کے منکرین کے مقابلے میں مدلل جواب کی صلاحیت کے حامل ہو سکیں۔

(۱) اگر ہم فنا کے لیے پیدا ہوئے ہیں تو پھر عشقِ بقاء سے کیا مطلب؟

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ موت اگر نیستی کے معنی میں ہو تو پھر ہر کوئی اس سے گریزاں ہے اور نہ فقط طولِ عمر کا خواہشمند ہے بلکہ حیاتِ ابدی کا خواہاں ہے۔

طولِ عمر کے لیے ہاتھ پاؤں مارنا، اکسیرِ جوانی کے حصول کی تگ و دو اور سرچشمہٗ آبِ حیات کو پانے کا شوق ان سب کے نشاناتِ تاریخِ بشر، دانشوروں اور سائنسدانوں کی کاوشوں اور شعراء کے کلام میں دکھائی دیتے ہیں۔ یہ سب بات پر دلالت کرتے ہیں کہ انسان ذاتاً بقاء کا

طلبگار ہے۔ حتیٰ کہ انسان کو اپنی اولاد کی زندگی کا اشتیاق کہ جو خود اسی کی زندگی کا استمرار محسوب ہوتا ہے، اس فطری عشق کی علامت ہے۔ اگر ہم فنا کے لیے خلق ہوئے ہیں تو پھر ہمارے اندر اس فطری خواہش کا وجود بے معنی ہے۔ درحقیقت ایک بلاوجہ کا عشق ہے اور کیسے ممکن ہے کہ خدائے حکیم و دانایا ہمارے اندر ایک بلاوجہ اور فالتو چیز خلق کرے۔ (توجہ رہے کہ توحید کی بحثوں کو قبول کرنے اور خدا کی پاک ذات پر ایمان لانے کے بعد معاد کی مباحث شروع ہوتی ہیں)

انسان کے اندر موجود یہ فطری خواہش اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ انسانی وجود سے باہر اس کی تسکین و اشباع کا راستہ موجود ہے، پیاس پانی کے وجود پر دلالت کرتی ہے، بھوک غذا کے وجود پر اور جنس مخالف کی طرف رغبت اس کے موجود ہونے پر دلالت کرتی ہے اور اگر ایسا نہ ہو تو یہ حکیم کی حکمت کے خلاف ہے۔ بنا بریں عشق بقاء انسان میں فطری طور پر موجود ہے اور یہ زندگی جاوید کی روشن دلیل ہے۔

اس بارے میں معروف دانشور فیض کا شانی مرحوم نے ایک بڑی ظریف بات کہی ہے۔ فرماتے ہیں:

کس طرح ممکن ہے کہ نفوس انسانی نابود ہو جائیں جب کہ خدا نے اپنی حکمت کے تحت ان کی فطرت میں بقاء سے عشق اور فنا و عدم سے کراہت کا جذبہ پیدا کیا ہے؟ دوسری طرف یہ مسئلہ حتمی و یقینی ہے کہ اس دنیا میں تو بقاء و دوام امر محال ہے اور اگر کسی اور دنیا کا وجود بھی نہ ہو کہ جہاں انسان منتقل ہو سکے تو پھر خدا کا ودیعت شدہ یہ جبلی و فطری جذبہ بے ہودہ اور بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے اور خدائے حکیم کی ذات اس سے کہیں بالاتر ہے کہ وہ ایسا لغو کام انجام دے۔ [۱]

یالغرض معاصر دانشوروں کے بقول انسان کے ہمیشہ زندہ رہنے کی خواہش اتنی ہمہ گیر ہے کہ اس آرزو کے پورے نہ ہونے کو کسی طور بھی قبول نہیں کیا جاسکتا۔

## (۲) تاریخ میں عقیدے کا تسلسل۔ فطری ہونے کی دلیل

قوموں کے رسم و رواج ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں۔ فرہنگ و تمدن عموماً تغیر و تبدل کا شکار رہتا ہے۔ انسانی تاریخ میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ فقط وہی امور پائیدار رہتے ہیں جن کی جڑیں فطرت کی اتھاہ گہرائیوں میں ہوں۔

لہذا امور عادی سے مسائل فطری کو جدا کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ یاد دہانی کے الفاظ میں یوں کہہ لیجیے کہ اگر کوئی چیز مختلف قوموں کے اندر طول تاریخ میں (اگرچہ مختلف صورتوں ہی میں کیوں نہ ہو) اپنے وجود کو محفوظ رکھ سکے تو یہ اس کے فطری ہونے کی بہترین علامت ہے اور یہ امر زندگی بعد از مرگ کے بارے میں انسانی توجہ کے مسئلے پر مکمل طور پر صادق آتا ہے۔ (دقت نظر فرمائیں)۔

آج سوشالوجسٹ حضرات بتاتے ہیں کہ مذہبی اعتقادات من جملہ حیات بعد از مرگ کا عقیدہ ہمیشہ لوگوں میں موجود رہا ہے۔

بطور نمونہ سمویل کنیک کی سوشالوجی کی کتاب سے ایک پیرا گراف آپ کے حاضر خدمت ہے:

”آج پوری دنیا میں نہ فقط مذہب موجود ہے بلکہ دقیق ترین تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ اولین انسانی طبقات بھی مذہب کے حامل

تھے۔ جیسا کہ آج کے انسان کے اسلاف (FOREFATHERS) بھی ایک قسم کا مذہب رکھتے تھے کیونکہ وہ اپنے مردوں کو ایک مخصوص طریقے سے دفن کرتے تھے اور ان کے کام کاج کے اوزار ان کے پاس رکھ دیتے تھے۔ اس طرح دوسری دنیا کے وجود پر اپنے عقیدے کو ثابت کرتے تھے۔<sup>[۱]</sup>

مذہبی عقائد کا اس قدر گہرا نفوذ قیامت کے فطری ہونے کی بہترین علامت ہے۔

۳۔ آیات اس بات کو باور کیا جاسکتا ہے کہ ہمارے باطن میں تو ایک چھوٹی سی عدالت ہو لیکن اس عظیم کائنات میں محکمہ عدل نہ ہو؟ انسان باطن میں اخلاقی وجدان کی موجودگی یا دوسرے لفظوں میں انسان کے اندر موجود عدالت ہر ایک کے لیے قابل احساس ہے۔ کیا کوئی ایسا شخص بھی ہے جو ایک بہت بڑی انسانی خدمت انجام دے کر اور محروموں اور مظلوموں کو نجات دلانے کے بعد اپنے اندر خوشی محسوس نہ کرے؟ اور کون ہے جو کسی ظلم کا مرتکب ہو اور اپنے اندر بے چینی محسوس نہ کرے اور اس وجہ سے وہ مضطرب و پریشان نہ ہو جائے۔ (البتہ ہم پیشہ ورجنایت کاروں کی بات نہیں کرتے جن کی ابتدائی فطرت تکرار گناہ سے مسخ ہو جاتی ہے۔ بلکہ یہ بات عام افراد پر صادق آتی ہے)۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ معاد پر ایمان انسانی سرشت میں موجود ہے اور اس کے لیے کسی دوسری دلیل کی ضرورت نہیں۔ اگرچہ اس بارے میں عقلی دلائل بھی فراوانی سے موجود ہیں۔

## ۲۔ دلیل حکمت

جہاں ہستی کی بناوٹ پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ ہر چیز ہدف، حکمت، نظم و ضبط اور پروگرام کے تحت خلق ہوئی ہے۔ اب اگر ہم انسانی زندگی پر نظر ڈالیں اور یہ فرض کریں کہ موت اس کے لیے ہر چیز کا خاتمہ ہے، ہزاروں مشکلات اور زحمت سے پر یہ چند روزہ دنیاوی زندگی، چند لقموں کی خاطر سر توڑ کوششوں کے بعد ہمیشہ ہمیشہ کے لیے حیات سے آنکھیں چرا لینا، یقیناً ایسی کوئی چیز انسانی خلقت کا ہدف نہیں ہو سکتی وگرنہ اس طرح تو اس کی خلقت ہی فضول، عبث اور بے مقصد ہو جائے گی اور یہ بات خدائے حکیم کی حکمت کے سراسر منافی ہے۔

قرآن مجید نے یہی بات جیتے جاگتے مطالب میں یوں پیش فرمائی ہے۔

(۱) اَلْحَسْبُ لَكُمْ اَمَّا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثًا وَاَنْتُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُونَ ﴿۱۱۵﴾

(مومنون: ۱۱۵)



(۲) وَمَا خَلَقْنَا السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا إِلَّا بِالْحَقِّ ۖ وَإِنَّ السَّاعَةَ  
لَآتِيَةٌ ﴿۱۱۵﴾ (الحجر: ۸۵)

(۳) اَيُّحَسِبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُتْرَكَ سُدًى ﴿۳﴾ ..... اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقَدْرِ عَلٰى  
اَنْ يُحْيِيَ الْمَوْتٰى ﴿۴﴾ (قیامت: ۴۰-۳۶)

ترجمہ

- (۱) کیا تم خیال کرتے ہو کہ ہم نے تمہیں فضول پیدا کیا ہے اور تم ہماری طرف لوٹ کر نہ آؤ گے!
- (۲) اور ہم نے زمین و آسمان اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے ماسوائے حق پیدا نہیں کیا اور وقت مقررہ (قیامت) یقیناً پہنچ کر رہے گا۔
- (۳) کیا انسان گمان کرتا ہے کہ یوں ہی بے ہدف چھوڑ دیا جائے گا؟ ..... کیا وہ قادر نہیں کہ مردوں کو زندہ کرے؟

تفسیر

## قیامت کے بغیر بے معنی زندگی

پہلی آیت میں قرآن مجید نے چھوٹے سے جملے میں مطالب کے سمندر کو سمودیا ہے اور قیامت کی انتہائی واضح دلیل بیان فرمائی ہے۔

اَفَحَسِبْتُمْ اَمَّا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّ اَنْتُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۱۵﴾ (مومنون)

”کیا تم خیال کرتے ہو کہ ہم نے تمہیں فضول اور بے مقصد پیدا کیا ہے اور تم ہماری طرف لوٹ کر نہ آؤ گے؟“

یعنی اگر قیامت کا وجود نہ ہوتا اور آپ کی زندگی اسی چند روزہ دنیاوی حیات تک محدود ہوتی تو پھر واقعاً یہ زندگی فضول، بے مقصد اور بے معنی ہوتی۔ یہ حیات ابدی ہے جو اس دنیا میں ہماری زندگی کا مفہوم عطا کرتی ہے اور اسے عبث ہونے سے بچا کر حکمت خدا کے ساتھ ہم آہنگ کرتی ہے۔

﴿۱﴾ سورہ ص آیت ۲۷، دخان ۳۸، آل عمران ۱۹۱ اور اسی طرح دیگر متعدد آیات میں خلقت کے با مقصد ہونے کا ذکر ہے۔ لیکن چونکہ ان میں معاد اور روزِ محشر کی عدالت پر صریحاً اشارہ نہ تھا اس لیے انہیں زیر بحث لانے سے گریز کیا گیا ہے۔

لہذا اس آیت کے بعد ارشاد ہوتا ہے: فتعالی اللہ الملک الحق، اس کا وجود سراسر حق ہے، باطل کا اس میں کوئی ٹھکانہ نہیں۔ بے مقصد اور عبث کام باطل ہے اور باطل کا حق کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں۔

”مقائیس اللغۃ“ اور ”مفردات“ کے مطابق ”عبث“ کا معنی دراصل مخلوط کرنا ہے لیکن بعد ازاں بے مقصد امور پر بھی اس کا اطلاق ہونے لگا ہے۔

”لسان العرب“ کے مطابق یہ کھیلنے کو دینے کے معنی میں ہے۔ اگرچہ اس کے معانی میں مخلوط کرنا بھی بیان کیا گیا ہے اور مجموعی طور پر فضول، بے ہدف، نامعقول، بے معنی اور عقل سے عاری کاموں پر اس کا اطلاق ہوتا ہے لیکن انسانی خلقت میں ایسا ممکن نہیں ہے۔

اسی مطلب کو دوسری آیت میں ایک اور انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

**وما خلقنا السبوت والارض وما بینہما الا بالحق**  
**”اور ہم نے زمین و آسمان اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے ماسوائے حق پیدا نہیں کیا۔“**  
 بلافاصلہ ارشاد ہوتا ہے:

### وان الساعة لاتية

”اور یقیناً وقت مقررہ (قیامت) پہنچ کر رہے گا۔“

ان دو آیتوں کا اکٹھے ذکر ہونا ممکن ہے اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ عجائبات، نعمات، برکات، اسرار اور عقل کو خیرہ کر دینے والے رموز سے مالا مال اس وسیع کائنات کی خلقت کا ہدف اگر فقط دنیا کی چند روزہ مادی اور پست زندگی ہی ہوتا تو پھر یہ خلقت بیہودہ و لغو اور فاقد حق ہوتی۔ لہذا وہ چیز جو اسے حقانیت اور ہدف عطا کرتی ہے وہ دوسری دنیا کی زندگی جاوید ہی ہے۔

گذشتہ آیت میں خلقت انسان کے عبث نہ ہونے کی بات کی گئی تھی اور اس آیت میں کل کائنات کی خلقت کے حق ہونے کی گفتگو ہے۔ دونوں کا نتیجہ ایک ہے، وہ یہ کہ آخرت کی زندگی کے بغیر دنیاوی زندگی بے معنی، بے کیف، بے مقصد اور لغو و بیہودہ ہے اور یہ کام حکیم کے ہاتھوں ہرگز انجام نہیں پاسکتا۔

تفسیر المیزان میں ہے کہ اس آیت میں حق و لعب و باطل کے مقابل میں ہے اور جملہ وان الساعة لاتية اس پر دلیل ہے۔ لہذا جنہوں نے حق کو عدل و انصاف کے معنی میں بیان کیا ہے یہ درست دکھائی نہیں دیتا۔<sup>[۱]</sup>

یہ بات قابل توجہ ہے کہ اس آیت کے آخر میں پیغمبر کو عفو و بخشش کا امر ہوا ہے اور ایسی خوبصورت بخشش جو سرزنش و ملامت سے پاک ہو (فاصح الصفح الجمیل)

ممکن ہے یہ تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ اے پیغمبر چونکہ ہدف خلقت انسانوں کی تربیت اور اگلے جہان کے لیے انہیں

آمادہ کرنا ہے لہذا آپ تربیت کے تمام اصولوں کو اپنائیں جن میں عفو و درگزر اور محبت و مدارا بھی شامل ہے، خصوصاً نادان اور متعصب لوگوں کے لیے۔

یہ نکتہ بھی قابل ذکر ہے کہ پہلی آیت کے مفہوم کے مطابق اگر آخرت کی زندگی نہ ہوتی تو خلقت انسان عبث ہوتی اور دوسری آیت کے مطابق (متذکرہ بالا تفسیر کی روشنی میں) اگر آخرت نہ ہوتی تو کل کائنات کی خلقت لغو و لایعنی ہوتی، شاید اس حوالے سے کہ خلقت کائنات کے درخت کا پھل اور محصول اعلاء انسان ہے لہذا اگر آخرت کی حیات جاوید نہ ہو تو پھر اس درخت اور پھل دونوں کی خلقت بے معنی ہے۔

”مابینہما“ (جو کچھ زمین و آسمان میں موجود ہے) کی عبارت میں فرشتے، نور حرارت، ابر، ہوا، مختلف گیسوں اور خطہ زمین پر بسنے والے تمام جاندار، خواہ انسان ہوں یا نباتات شامل ہیں۔

تیسری آیت میں انسانی خلقت کے ہدف پر اشارہ کرتے ہوئے اسے مسئلہ معاد سے مربوط کر کے ارشاد فرمایا گیا ہے: ایحسب الانسان ان یترک سدی (کیا انسان گمان کرتا ہے کہ یوں ہی بے ہدف اور مہمل چھوڑ دیا جائے گا)۔

انسان کی معمولی و ناچیز پانی (نطفہ) سے پیدائش اور رحم میں اس کے تکامل کے بعض مراحل کا ذکر کرنے کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ: الیس ذلک بقدر علی ان یحیی الموقی کیا اس جیسا مردوں کو زندہ کرنے کی قدرت نہیں رکھتا؟ اس سے واضح ہوتا ہے کہ حیات بعد از مرگ کے بغیر انسانی وجود کا با مقصد ہونا غیر ممکن ہے۔

یقیناً خداوند حکیم کا کوئی کام بغیر ہدف کے نہیں ہو سکتا اور یہ بات بھی مسلم ہے کہ اس کے افعال کا ہدف خود اسی کی طرف نہیں پلٹتا کیونکہ وہ تو ہر لحاظ سے لاحد و اورغنی بالذات ہے، لہذا بندوں ہی کی طرف پلٹتا ہے۔ کیا مشکلات و مصائب سے پر دنیا کی مختصر زندگی اس عظیم خلقت کا ہدف بن سکتی ہے؟ یقیناً ایسا نہیں ہے۔ بنا برائیں ایک ایسا عالم جو انسان کے سیر تکاملی کا ہدف ہے اسے قبول کئے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے۔

”التحقیق“ کے بقول سدی (بروز ہدی) دراصل ایسی حرکت کو کہتے ہیں جو فکر و تدبر اور نظم و ضبط کے بغیر ہو۔ اسی مناسبت سے اس اونٹ کو ”اہل سدی“ کہا جاتا ہے جسے ساربان کے بغیر بیابان میں چھوڑ دیا جائے۔ رات کو ٹپکنے والی رطوبتوں کو بھی سدی (بروزن وفا) کہا جاتا ہے کیونکہ یہ نظم اور کسی خاص پروگرام سے تہی دامن ہوتی ہے۔ کپڑے کے بنے جانے سے پہلے اس کی تاروں اور ریشوں کو بھی سدی کہا جاتا ہے اس لیے کہ یہ اس حالت میں بے نتیجہ اور مہمل ہوتے ہیں۔

مختصر یہ کہ آیت استفہام انکاری کی صورت میں گویا ہے کہ آیا یہ ممکن ہے کہ اس قدر زیادہ استعداد، فکری و جسمی صلاحیتوں اور گونا گوں امکانات کے ہوتے ہوئے انسان کو بغیر کسی پروگرام کے اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے؟ اس کے بعد مسئلہ معاد اور مسوئیت کو نتیجہ کے طور پر آیت مجیدہ میں بیان کیا گیا ہے۔

## چند وضاحتیں

## کون عاقل چند روز دنیاوی زندگی کو ہدف خلقت سمجھتا ہے؟

جس عالم میں ہم زندگی بسر کر رہے ہیں بلا شک و شبہ بہت بڑا، انتہائی دقیق اور منظم ہے۔ کرہ زمین منظومہ شمسی کے مجموعے کا ایک یونٹ ہے۔ وہ بھی اپنی سطح پر مجموعہ کہکشاں کا ایک چھوٹا سا حصہ ہے۔ ہماری کہکشاں اس عالم میں پائی جانے والی متعدد کہکشاؤں میں سے ایک ہے۔

پروفیسر کارل گیلزین اپنی کتاب ”سفری بہ جہانہای دور دست“ میں رقمطراز ہے: غول پیکر ستاروں کا مجموعہ جسے کہکشاں بھی کہتے ہیں، یہ آسانی جزا اپنے ہی محور کے گرد گھومتے ہیں اور ایک دوسرے سے اتنے زیادہ فاصلے پر واقع ہیں جس کا سوچنا بھی مشکل ہے۔ ہر کہکشاں کئی ارب ستاروں پر مشتمل ہے اور ان ستاروں کے درمیان فاصلہ اس قدر زیادہ ہے کہ کسی ایک کہکشاں میں واقع دو ستاروں کے درمیانی فاصلے کی مسافت طے کرنے کے لیے کئی لاکھ نوری سال درکار ہیں۔<sup>[۱]</sup>

اگر اس مطلب پر یہ جملہ اضافہ کر دیا جائے تو اس جہان کی عظمت کے لیے کافی ہوگا، وہ یہ کہ ماہرین فلکیات کی تازہ ترین تحقیقات کے مطابق صرف ہماری کہکشاں میں تقریباً ایک کھرب ستارے موجود ہیں جب کہ ایک اندازے کے مطابق اس عالم میں ایک ہزار بلین سے زیادہ کہکشاں موجود ہیں۔

وقت نظر اور نظم و ضبط کے حوالے سے اس کائنات کے جزء جزء کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ آپ ایک چھوٹے سے خلیے کی ساخت کا ایک بڑے صنعتی شہر کے ساتھ موازنہ کر سکتے ہیں۔

اس دوران وہ کم سے کم کامل ترین موجود انسان ہی ہے جسے ہم اس کی روح و جسم کے ساتھ مخصوص بناوٹ، اس کی ریزہ کاری، ظرافت اور عجائب کے ہمراہ اسے پہچانتے ہیں۔

اب اگر یہ طے پائے کہ گلشن خلقت کے اس سرسبز و شاداب پھول کی زندگی دنیا کے انہی چند روز تک محدود رہے، کبھی بچپن اور ناتوانی ہے تو کبھی جوانی کے شدید طوفانوں میں مبتلا ہے، پھر ایک وقت آتا ہے کہ بڑھاپے اور بیکاری کا شکار ہو جاتا ہے۔ اسی طرح گاہے تندرست گاہے بیمار اور شاید زیادہ وقت ضروریات زندگی کے پورا کرنے کے لیے بھاگ دوڑ میں صرف ہو جاتا ہے، بعد ازاں موت اور فنا اس کا مقدر ہے یہ کس قدر نازیبیا اور حکمت سے دور ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ خدا حکیم ہے یعنی اس کے تمام کام حکمت سے مالا مال ہیں۔ کیا حکمت اس کے علاوہ کچھ ہے کہ اس کے تمام کام سوچے سمجھے اور واضح ہدف کے تحت ہوں، اس کے باوجود کہ وہ تمام کمالات کا مالک ہے اور ہر چیز سے بے نیاز ہے کیا یہ ممکن ہے کہ اس کا ہدف اپنے ہی وجود کے فائدے کے لیے ہو، اور اگر اس مطلب کا نتیجہ بندوں کے حق میں نکلتا ہے تو پھر دنیا کی محدود اور مادی زندگی اس

عظیم خلقت کا ہدف نہیں بن سکتی، وہ زندگی جو پلک جھپکنے میں فانی ہو جاتی ہے۔

کیا یہ ایسے ہی نہیں ہے جیسے ایک کار میگر سالہا سال کی محنت کے بعد ایک بہترین اور دقیق ترین گاڑی یا کوئی اور مشین بنائے اور جو نہی وہ کام کرنا شروع کرے اسے توڑ پھوڑ دے اور تباہ و برباد کر دے۔ کیا آپ کی نظر میں یہ کام حکیمانہ ہے؟  
کیا یہ اس سے مشابہ نہیں ہے کہ ایک بچے کو کسی مصنوعی رحم میں ہزاروں مشکلات اور دردِ دہر کے بعد پروان چڑھایا جائے اور جو نہی وہ زندگی کے لیے آمادہ ہوا سے مار دیا جائے؟

یہی وجہ ہے کہ خدا اور قیامت پر ایمان نہ رکھنے والے مادی لوگ زندگی کو بے معنی اور بے ہدف سمجھتے ہیں اور سچ پوچھیں تو قیامت کی زندگی کے بغیر دنیاوی زندگی واقعی بے معنی اور بے ہدف ہے اور اس لحاظ سے وہ لوگ اپنی بات میں سچے ہیں۔  
پس خدا اور اس کی حکمت پر ایمان رکھنے والا کوئی شخص بھی اس بات کا انکار نہیں کر سکتا کہ انسان کی موت واقع ہونے اس کی زندگی کا خاتمہ نہیں ہو جاتا۔ بلکہ یہ دنیا رحمِ مادر کی طرح ہے، انسان یہاں ایک جنین کی مانند پرورش پاتا ہے اور یہ رحم اسے دوسرے جہان کے جنم کے لیے آمادہ کرتا ہے۔ بلا شک و شبہ رحم میں جنین کی یہ زندگی ہدف نہیں ہے بلکہ یہ تو ایک اور طویل زندگی کے لیے مقدمہ ہے۔

### ۳۔ دلیل عدالت

عدالت خدا کی صفات میں سے ایک ہے وہ عدالت جو عالم ہستی میں جگہ جگہ دکھائی دیتی ہے۔ زمین و آسمان میں، انسان کے وجود میں، دل کی دھڑکنوں میں، خون کی گردش میں حتیٰ کہ پوری کائنات میں اس کے آثار واضح ہیں۔

#### بِالْعَدْلِ قَامَتِ السَّمُوتُ وَالْأَرْضُ

”زمین و آسمان عدالت کی بنیاد پر قائم ہیں۔“ [۱]

کیا یہ ممکن ہے کہ انسان اس جہان کی ہمہ گیر عدالت سے دور رہے اور اس وسیع کائنات میں ایک بے تکی جوڑ کی طرح رہے؟ انسان کی تاریخ اور موجودہ حوادث سے بخوبی پتہ چلتا ہے کہ اس دنیا میں نہ تو کبھی مظلوموں کو ان کا مکمل حق ملا ہے اور نہ ہی کبھی کسی ظالم کو اس کے صحیح کیفر کردار تک پہنچایا گیا ہے۔ ممکن ہے جزئی طور پر کہیں یہ کام انجام پایا ہو لیکن وسیع اور بڑی سطح پر اس کام کو انجام نہیں دیا گیا۔ اس جہان پر حاکم عدالت کہ جو خدا ہی کی عدالت کا پرتو ہے، اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ ایک دن ایسا بھی ہو کہ جب تمام انسانوں کے اعمال کی دقیق ترین طریقے سے جانچ پڑتال کی جائے اور یہ وہی دن ہے کہ جسے ہم قیامت کہتے ہیں۔ اسی اشارے کے ساتھ ہم قارئین محترم کی توجہ درج ذیل آیات مجیدہ کی طرف مبذول کرتے ہیں:

(۱) أَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِينَ كَالْمُجْرِمِينَ ﴿۳۵﴾ مَا لَكُمْ فِیْهِ كَيْفَ تَحْكُمُونَ ﴿۳۶﴾

(قلم: ۳۵، ۳۶)

(۲) أَمْ نَجْعَلُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ كَالْمُفْسِدِينَ فِي الْأَرْضِ أَمْ

نَجْعَلُ الْمُتَّقِينَ كَالْفُجَّارِ ﴿۲۸﴾ (ص: ۲۸)

(۳) أَمْ حَسِبَ الَّذِينَ اجْتَرَحُوا السَّيِّئَاتِ أَنْ نَجْعَلَهُمُ كَالَّذِينَ آمَنُوا

وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ ۚ سَوَاءٌ فَعْيَاهُمْ وَفَعْيَاهُمْ ۚ سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ ﴿۳۷﴾ وَخَلَقَ

اللَّهُ السَّمُوتَ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزَىٰ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا

## يُظْلَمُونَ ﴿٣٢﴾ (الحجاثیہ: ۲۱، ۲۲)

ترجمہ

(۱) کیا ہم مومنوں کو مجرموں کے برابر قرار دیں گے؟ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ کیسا حکم لگاتے ہو؟  
 (۲) جو لوگ ایمان لائے اور عمل صالح انجام دیتے رہے کیا ہم انہیں زمین پر فساد کرنے والوں کے برابر قرار دیں گے؟ یا متقین کو فاجروں کی مانند کر دیں گے؟  
 (۳) وہ لوگ جنہوں نے گناہوں کا ارتکاب کیا ہے کیا وہ خیال کرتے ہیں کہ ہم انہیں با ایمان اور عمل صالح انجام دینے والوں کے برابر ٹھہرائیں گے تاکہ ان کی زندگی و موت ایک ہی جیسی رہے؟ یہ کتنا غلط حکم لگاتے ہیں اور خدا نے زمین و آسمان کو با حق خلق کیا ہے تاکہ ہر کسی کو اس کے انجام شدہ اعمال کے مطابق جزا دی جائے اور ان پر کوئی ظلم نہ ہوگا۔

تفسیر

## اگر قیامت نہ ہو تو عدالت بھی نہ ہوگی

سورہ قلم میں متقین کے لیے عظیم اجر کا ذکر کرنے کے بعد ارشاد باری تعالیٰ ہوتا ہے کہ افنجعل المسلمین کالمجرمین (کیا ہم مومنین کو مجرمین کے برابر قرار دیں گے؟)۔

کیا بجا ہے کہ یہ دونوں با ہم برابر ہوں؟ کیا عدالت اسی چیز کا تقاضا کرتی ہے؟  
 پس مزید ارشاد ہوتا ہے: مالکم کیف تحکمون (تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ کیسا حکم لگاتے ہو؟)  
 کوئی بھی عاقل انسان یقین نہیں کرتا کہ مسلم و مجرم، مطیع و عاصی اور عادل و ظالم کا انجام ایک جیسا ہو اور وہ بھی خدا کی بارگاہ میں کہ جہاں ہر کام بڑے حساب کتاب کے ساتھ اور عدالت کی بنیاد پر ہوتا ہے۔

اس آیت کی تفسیر میں بعض مفسرین نے دو احتمال ذکر کیے ہیں: اول یہ کہ ممکن ہے یہ آیت مسئلہ معاد سے متعلق ہو کہ کیونکہ یہاں اس دنیا میں مسلمین و مجرمین تقریباً برابر ہی ہیں بلکہ بعض اوقات مجرمین غیر مشروع طریقوں سے زیادہ انعامات و اکرامات ہتھیا لیتے ہیں۔ لہذا مسلمین

[۱] اس بارے میں ان آیات سے بھی استدلال کیا گیا ہے۔ یس ۵۹، زلزال ۸، ۷، انبیاء ۷۴ چونکہ ان کی دلالت واضح نہ تھی اس لیے ہم نے اس سے صرف نظر کیا ہے۔

کی مجرمین پر برتری کہ جو عدل و انصاف کا تقاضا ہے، دوسری دنیا میں لازم آ رہی ہوئی چاہیے۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ ان مشرکین کا جواب ہے جو کہتے تھے کہ اگر قیامت ہو بھی تو ہماری حالت اس دنیا کی طرح وہاں بھی اچھی ہوگی۔ (اچھے سال کا بہار ہی سے پتہ چل جاتا ہے)۔ قرآن انہیں جواب دیتا ہے: کیا یہ ممکن ہے کہ خداوند عادل مسلمین اور مجرمین کو ایک جیسا قرار دے؟

لیکن ظاہر اُن دونوں تفسیروں میں کوئی تفاوت نہیں ہے اور ممکن ہے دونوں معانی اس آیت کے مفہوم میں سموائے ہوں۔  
 ضمناً شریعت سے قطع نظر اس آیت کے حسن و فتح اور عقلی ادراکات پر عقل کی حاکمیت بھی ثابت ہو جاتی ہے۔ (وقت نظر فرمائیں)  
 یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ فخر رازی اپنی گفتگو کے شروع ہی میں اس آیت کو ”حسن و فتح عقلی“ کے دلائل میں سے شمار کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے: برادران اہل تسنن سے جو نقل ہوا ہے کہ اگر خدا کافروں کو بہشت میں اور فرمانبردار لوگوں کو دوزخ میں بھیج دے تو یہ جائز ہے۔ یہ اس آیت کے مطابق حکم عقل کے خلاف اور فتح ہے۔ لیکن فخر رازی چونکہ خود شاعرہ سے تھا اور حسن و فتح عقلی کا منکر تھا لہذا اس کا جواب اس طرح دیتا ہے: اس مساوات اور برابری کا انکار خدا کے فضل و احسان کی وجہ سے ہے، نہ یہ کہ کسی کا اس پر کوئی حق ہے۔<sup>[۱]</sup>

قرآن صریحاً انہیں عقلی و منطقی فیصلہ کرنے کو کہتا ہے اور پھر سرزنش و ملامت کے لہجے میں کہتا ہے: تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ کیا حکم لگاتے ہو؟ یعنی یہ فیصلہ ایک عاقل انسان کے شایان شان نہیں ہے اور ایسے امور میں عقل و منطق کی حاکمیت پر یہ واضح و روشن دلیل ہے۔  
 دوسری آیت میں اسی مطلب کو مزید کھول کر بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہوتا ہے: اَمْ نَجْعَلُ الدِّينَ اَمْنًا وَعَمَلُوا الصَّالِحَاتِ كَالْمُفْسِدِينَ فِي الْاَرْضِ (جو لوگ ایمان لائے اور عمل صالح انجام دیتے رہے، کیا یہ ممکن ہے کہ ہم انہیں زمین پر فساد کرنے والوں کے برابر کر دیں؟)

يَا اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِينَ كَالْفُجَّارِ (کیا ہو سکتا ہے کہ ہم متقین کو فاجروں کی مانند کر دیں؟)  
 جاذب توجہ یہ ہے کہ سورہ ص کی اس آیت سے پہلے والی آیت میں زمین و آسمان اور وہ جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے ان سب کے بامقصد ہونے کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

### وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا

ایک طرف زمین و آسمان کی آفرینش کا بے مقصد نہ ہونا اور دوسری جانب صالح مومنین اور فاسق و فاجر مفسدین کا آپس میں برابر نہ ہونا اس بات کا تقاضا ہے کہ قیامت اور عدل و انصاف کی کوئی عدالت ضرور ہوتی چاہیے۔ بنا برائیں ان دو آیتوں میں دلیل حکمت اور دلیل عدالت آپس میں مخلوط ہیں۔

قیامت کا انکار صرف وہی کر سکتا ہے جو خدا کے حکیم ہونے پر شک کرتا ہو اور اس کی عدالت پر بھی شک کی ہو کیونکہ اس صورت میں نہ تو اس دنیا کی خلقت کا کوئی ہدف نظر آتا ہے اور نہ ہی مطیع اور فاسق کے درمیان کوئی امتیاز باقی رہتا ہے۔



یہ مطلب بھی قابل توجہ ہے کہ مفسدین کو مومنین صالح اور فاجرین کو متقین کے مقابلے میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ اس حقیقت کی جانب ایک لطیف اشارہ ہے کہ اگر انسان ایمان اور عمل صالح کے اسلحہ سے لیس نہ ہو تو خواہ ناخواہ مفسدین کی صف میں جا پینچے گا۔

اور اسی طرح اگر تقویٰ یعنی گناہوں سے بچانے والی قوت سے تہی دامن ہو تو فاجروں کی صفوں میں جا ملے گا (فجار کا مادہ ”فجر“ ہے جس کا معنی وسیع ترین شگاف ڈالنا ہے۔ گویا فاجر انسان دین و اطاعت کے پردے کو پھاڑ ڈالتا ہے)۔

یہ آیت مجیدہ بھی عقل کی حاکمیت پر روشن دلیل ہے اور حسن و قبح کے معاملے میں انسان کے عقلی ادراکات کے حجت ہونے کی بات کرتی ہے اور اس حقیقت پر بھی واضح دلیل ہے کہ عقل شریعت کے وارد ہونے سے پہلے اچھائی برائی کو کسی حد تک درک کر لیتی ہے۔ یہاں پر یہ بات عجیب دکھائی دیتی ہے کہ فخر رازی نے یہاں پر تو اس مسئلے کو ضمنی طور پر مکمل قبول کیا ہے جب کہ گذشتہ بحث میں اس کا انکار کر چکا ہے۔<sup>[۱]</sup>

اس سے پتہ چلتا ہے کہ اگر انسان اپنے ضمیر کی طرف رجوع کرے تو تعصب کے پردے ہٹ جائیں گے اور اسے احساس ہوگا کہ وہ تہہ دل سے اس واقعیت کا معترف ہے۔

تیسری آیت میں اسی معنی کو ایک اور انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: اَمِ حسب الذین اجترحوا السيئات ان نجعلهم كالذین امنوا و عملوا الصلحت سو آء محیا هم و ہماتہم۔ وہ لوگ جنہوں نے گناہوں کا ارتکاب کیا ہے کیا وہ خیال کرتے ہیں کہ ہم انہیں با ایمان اور عمل صالح انجام دینے والوں کے برابر ٹھہرائیں گے تاکہ ان کی زندگی و موت ایک ہی جیسی ہو؟ خدائے عادل کی عدالت سے ایسا امر بعید ہے اور خدا کی ذات اقدس سے ایسا قبیح امر صادر ہونا محال ہے محال۔

سَاء مَا یَحْكُمُونَ کتنا غلط حکم لگاتے ہیں!

کیا یہ ممکن ہے کہ خوب و بد، پاک و ناپاک، صالح و طالح، مومن و فاسق اور نور و ظلمت ایک جیسے ہو جائیں؟ یہ امر اصلاً و ابداً ممکن ہی نہیں ہے۔ سو آء محیا هم و ہماتہم سے کیا مراد ہے؟ مفسرین نے متعدد احتمالات ذکر کیے ہیں: کبھی کہتے ہیں اس سے مراد دنیاوی موت و حیات ہے کیونکہ ایمان اور عمل صالح انسان کے وجود پر مثبت اثرات مرتب کرتے ہیں، دل کو منور اور فکر کو روشن کر دیتے ہیں اور صالح مومنین کو خدا کی ہدایت، حمایت اور نصرت شامل حال رہتی ہے جب کہ کفر اور گناہ دل کو اندھیرا اور روح کو تاریک کر دیتا ہے اور انسان کو الطافات الہی سے محروم کرنے کا باعث بنتا ہے۔

بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ اس آیت سے مراد دنیا کی موت کے بعد آخرت کی زندگی ہے یعنی جب پہلا گروہ فوت ہوتا ہے تو رحمت کے فرشتے ان پر نازل ہوتے ہیں۔ ان پر درود و سلام بھیجتے ہیں اور انہیں جنت میں داخل ہونے کی بشارت دیتے ہیں۔ (الذین تتوفونہم الملائکة طیبین یقولون سلام علیکم ادخلوا الجنة)۔<sup>[۲]</sup> جب کہ گنہگاروں کے مرنے کے وقت عذاب کے فرشتے ان پر نازل

[۱] تفسیر کبیر، ج ۲۶ ص ۲۰۱

[۲] نحل ۳۲

ہوتے ہیں، ان کے چہروں اور پشت پر مارتے ہیں اور انہیں خدا کے دردناک عذاب کی خبر دیتے ہیں۔ (فکیف اذا توفتهم الملائکة یضربون وجوههم وادبارهم)۔<sup>[۱]</sup>

اس آیت کی تفسیر میں اور بھی احتمالات بیان کیے گئے ہیں جو چندان قابل ملاحظہ نہیں ہیں۔ لیکن متذکرہ بالا دونوں تفسیروں کو جمع کیا جا سکتا ہے اگرچہ بعد والی آیت دوسری تفسیر کے ساتھ زیادہ موزوں ہے چونکہ ارشاد ہوتا ہے: وخلق السموت والارض بالحق (خدا نے زمین و آسمان کو باحق خلق کیا ہے)۔

### ولتجزی کل نفس بما کسبت وهم لا یظلمون

(اور ہدف یہ تھا کہ ہر کسی کو اس کے انجام دیئے ہوئے اعمال کے مطابق جزا دی جائے اور ان پر کسی قسم کا کوئی ظلم و ستم نہ ہوگا)۔<sup>[۲]</sup>

یہ بات مد نظر رہے کہ ایک طرف ہم کہتے ہیں کہ خدا عادل ہے، زمین و آسمان کی خلقت حق ہے اور ہر کسی کو اس کے اعمال کا عادلانہ جزا و سزا بھی ہے اور دوسری طرف جیسا کہ ہم نے کہا یہ امر اس دنیا میں مکمل طور پر انجام نہیں پاتا۔ پس ضروری ہے کہ اس موت کے بعد ایک اور زندگی ہوتا کہ حق و عدالت کا بول بالا ہو اور عدل و انصاف کی حکمرانی ہو سکے۔

## چند وضاحتیں

### خلقت کا بنیادی قانون۔ عدل

جو علم طبیعیات سے تھوڑی بہت آشنائی بھی رکھتا ہو وہ جانتا ہے کہ اس دنیا میں تمام موجودات ایک خاص قانون سے بہرہ مند ہیں۔ ان قوانین کی حاکمیت اتنی عجیب تلی ہے کہ دانشور اور سائنسدان اپنی علمی کتابوں کو با آسانی ان قطعی و دقیق قوانین اور فارمولوں کی بنیاد پر مرتب کر سکتے ہیں۔ مثلاً فضائی اور خلائی سفر کے پروگرام حتیٰ کہ مختلف سیاروں تک پہنچنے کے پروگرام بھی انہی فارمولوں کی بنیاد پر مرتب ہوتے ہیں۔ مختصر یہ کہ جدھر بھی نگاہ کریں ہر طرف قانون نظم و عدالت دکھائی دے گا جو ہر چیز پر سایہ فگن ہے۔ بڑے بڑے منظومات شمسی سے لے کر ایٹم کے چھوٹے ترین ذرے تک اس قانون کا احاطہ ہے۔

[۱] محمد ۲۷

[۲] زمخشری اپنی تفسیر کشاف میں رقمطراز ہے کہ: ”ولتجزی“ کا جملہ ”بالحق“ پر عطف ہے کیونکہ اس میں تعلیل کے معنی پائے جاتے ہیں (لہذا معنی یوں ہوگا خلق اللہ السموت والارض لیحق الحق ولتجزی...) بعد ازاں احتمال دیتا ہے کہ جملہ محذوف پر بھی عطف ہو سکتا ہے اور تقدیر میں یوں ہو خلق اللہ السموت والارض بالحق لیدل بہ علی قدرتہ ولتجزی کل نفس۔ (تفسیر کشاف، ج ۴ ص ۲۹۰)

دوسری طرف یہ کہ انسان اس قانون عدالت سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتا ہے، اس قانون سے کہ جو خالق کے حکم سے پوری کائنات پر حاکم ہے کیونکہ اس صورت میں تو انسان اس کائنات میں ایک بے ڈھنگے اور ایک بے رنگ جوڑ کی مانند ہو کر رہ جائے گا۔ لہذا یہ استثناء انتہائی غیر منطقی اور بے دلیل ہے۔ بناء برائیں ہمیں یقین ہے کہ انسان کے لیے بھی ایک ایسی عدالت کو مد نظر رکھا گیا ہے جہاں سب حاضرین ہوں گے اور کائنات کی ہمہ گیر عدالت سے بہرہ ور ہوں گے۔

علمائے عقائد پرانے وقتوں ہی سے مسئلہ معاد کے اثبات کے لیے اس دلیل سے استفادہ کرتے چلے آ رہے ہیں۔ وہ انسانی مظالم کے ان مناظر کو پیش کرتے تھے جن سے متعلق اس دنیا میں عدل و انصاف کا اجراء نہ ہو سکا اور ساری عمر بہترین زندگی گزارنے والے ظالموں کا ذکر کرتے رہے۔ اسی طرح ان مظلوموں کے بارے میں بھی بتاتے رہے جو زندگی کے آخری لمحوں تک مختلف شکنجوں اور عذاب میں مبتلا رہے۔

کیا وہ عادل خدا اس پر راضی ہے؟ کیا یہ مناظر اس کے عدل و انصاف کے منافی نہیں؟

لہذا علمائے کرام اس سے باسانی نتیجہ اخذ کرتے تھے کہ ایک اور دنیا ہونی چاہیے کہ جہاں انسانوں سے متعلق خدا کا عدل و انصاف رونما ہو۔ جس کسی نے اگر ذرہ بھر بھی نیکی کی ہو تو اسے جزا ملے اور جس نے ذرہ برابر بھی برائی کی ہے اسے اپنے کیفر کردار تک پہنچنا چاہیے۔

لہذا قیامت خدا کے عدل و انصاف کی مظہر ہے اور تمام سوالات کا مکمل ترین جواب۔

## ۴۔ دلیل ہدف و حرکت

بلاشبہ و شبہ انسانی خلقت کا ایک ہدف ہے، ان مادہ پرستوں کے خیالات کے بالکل برعکس جو اس دنیا کو بے ہدف سمجھتے ہیں۔ الہی جہان بینی میں انسانی خلقت کا یقیناً ایک ہدف ہے جو اپنی تکاملی حرکت کے تحت آگے بڑھ رہا ہے۔ اب اگر موت کے ساتھ ہی ہر چیز کا خاتمہ ہو جائے تو پھر یقیناً یہ ہدف حاصل نہیں ہوتا یا دوسرے الفاظ میں یوں کہ انسانی زندگی اس دنیا کے بعد بھی جاری رہنی چاہیے تاکہ اپنے ضروری تکامل تک پہنچ سکے اور یہاں ہوئے گئے بیج کا ثمر وہاں حاصل کر سکے۔ مختصر یہ کہ معاد کو قبول کئے بغیر خلقت کے ہدف کا قائل ہونا ممکن نہیں اور اگر موت کے بعد والی دنیا کے ساتھ انسانی زندگی کا راستہ منقطع کر دیا جائے تو پھر ہر چیز معمہ بن جائے گی۔

اس پس منظر کے ساتھ درج ذیل آیات پر توجہ فرمائیں:

(۱) يٰۤاَيُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدًا فَمُلْقِيْهِ<sup>①</sup> (انشقاق: ۶)

(۲) وَمَنْ تَزَكَّىٰ فَاِنَّمَا يَتَزَكَّىٰ لِنَفْسِهٖ<sup>ط</sup> وَاِلٰى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ<sup>②</sup> (فاطر: ۱۸)

(۳) اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ<sup>③</sup> (بقرہ: ۱۵۶)

(۴) اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذٍ الْمُسْتَقَرُّ<sup>④</sup> (قیامت: ۱۲)

(۵) اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذٍ الْمَسٰقُ<sup>⑤</sup> (قیامت: ۳۰)

ترجمہ

(۱) اے انسان تو اپنے پروردگار کی طرف مشقت اٹھاتے ہوئے بڑھتا چلا جا رہا ہے اور آخر کار اس سے ملاقات کرے گا۔

(۲) جس نے تزکیہ کیا اس نے اپنے ہی لیے تزکیہ کیا ہے اور خدا ہی کی طرف بازگشت ہے۔

(۳) ہم خدا ہی کے لیے ہیں اور اسی کی جانب لوٹ جانے والے ہیں۔

(۴) آخری ٹھکانہ فقط تیرے پروردگار ہی کے ہاں ہے۔

① قرآن مجید میں ان آیات کے مطالب سے ہم آہنگ اور بھی متعدد آیات ہیں جو خدا کی طرف سب کے لوٹنے پر بحث کرتی ہیں۔ مثلاً علق

(۵) تمام راستے تمہارے پروردگار پر منتہی ہوتے ہیں۔

## تفسیر

### تمام راستے خدا پر منتہی ہوتے ہیں

پہلی آیت میں بطور کلی بنی نوع انسان کو مخاطب کر کے ارشاد ہوتا ہے: یا ایہا الانسان انک کادح الی ربک کدحا فملاقیہ (اے انسان تو بڑی محنت اور مشقت کے ساتھ اپنے پروردگار کی طرف بڑھ رہا ہے اور آخر کار اس سے ملاقات کرے گا)۔ بعض مفسرین کے بقول ”کدح“، ”بروزن“، ”مدح“ جلد پر پڑنے والی خراش کے معنی میں ہے۔ اسی مناسبت سے یہ لفظ محنت و مشقت کی وجہ سے انسانی جان اور روح پر پڑنے والے اثرات کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔<sup>[۱]</sup> مفردات راغب کے بقول اس لفظ کا اطلاق ایسی محنت پر ہوتا ہے جو سختیوں اور تکالیف سے پر ہو۔ لیکن المیزان کا کہنا ہے کہ کدح جب الی کے ساتھ آئے تو یہ حرکت کے معنی میں ہے۔ (البتہ ان معانی میں کوئی تضاد نہیں ہے)۔<sup>[۲]</sup> مجموعی طور پر اس بات سے پتہ چلتا ہے کہ قرآن مجید انسانوں کو ایک ایسے کارواں سے تشبیہ دیتا ہے جو عدم کی سرحدوں کو پار کر کے اقلیم وجود میں داخل ہوا اور اب یہاں سے آگے اپنے پروردگار کی طرف بڑھ رہا ہے تاکہ لقاء اللہ تک جا پہنچے۔ درج ذیل آیت اسی معنی پر دلالت کرتی ہے:

### وَأَنَّ إِلَىٰ رَبِّكَ الْمُنْتَهٰی ﴿۳۲﴾ (نجم ۳۲)

ممکن ہے بعض لوگ اس راستے سے منحرف ہو جائیں اور کبھی بھی لقاء اللہ تک نہ پہنچ پائیں لیکن انسانی خلقت کی بنیاد ہی اس ہدف کے حصول میں رکھی گئی ہے۔

جیسا کہ پہلے بھی اشارہ کیا گیا ہے لقاء اللہ سے مراد دل کی آنکھوں سے خدا کا مشاہدہ کرنا اور شہودِ قلب کے اس مقام تک پہنچنا جو انسان اپنے کمال کے ارتقائی مراحل کو طے کرتے ہوئے حاصل کرتا ہے اور یہ قرب خدا کے اہم ترین مراتب میں سے ہے۔ دوسری آیت میں پہلے انسان کی پاکیزگی، تقویٰ اور تزکیہ کی بات کی گئی ہے جس کا فائدہ خود اسی کی ذات کو ہوتا ہے ارشاد باری تعالیٰ ہوتا ہے: وَمَن تَزَكَّىٰ يَفُضِّلْهُ فَاَمَّا يَنزَلُ فِي لِنَفْسِهِ (جس نے تقویٰ اختیار کیا پس اس کا نتیجہ بھی خود اسی کی طرف لوٹے گا)۔ بعد ازیں ارشاد ہوتا ہے: وَاللّٰهُ الْمَصِيرُ (سب کی بازگشت خدا ہی کی جانب ہے)۔

[۱] تفسیر کشاف۔ روح المعانی اور فخر رازی (زیر بحث آیت کے ذیل میں)

[۲] المیزان، ج ۲۰ ص ۳۶۰

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر نیک اور متقی لوگ اس دنیا میں پاکی و تقویٰ کے تمام نتائج سے بہرہ مند نہ ہوں تو ان کی بازگشت خدا کی طرف ہے۔ وہاں دارالبقاء میں اپنے اعمال کے نتائج سے بہرہ ور ہو جائیں گے۔

بہر حال ”والی اللہ المصیر“ کا جملہ اس حقیقت کو بیان کرتا ہے کہ کمال انسان کے ارتقائی مراحل موت کے ساتھ ختم نہ ہوں گے بلکہ اسی طرح جاری و ساری رہیں گے یہاں تک کہ لقاء اللہ تک جا پہنچے۔

زیر بحث تیسری آیت کی تفسیر میں مفسر بزرگ علامہ طبرسی مرحوم فرماتے ہیں: انا للہ (ہم خدا ہی کے لیے ہیں) عبودیت کا اقرار ہے کہ ہم سب اس کے بندے اور مملوک ہیں۔ (وانا الیہ راجعون) (اور ہمیں اسی کی طرف پلٹ جانا ہے) روز قیامت کا اقرار ہے۔ اس کے بعد وہ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے اس فرمان کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو انہوں نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا:

**ان قولنا ”انا للہ“ اقرار علی انفسنا بالہلک و قولنا ”وانا الیہ راجعون“**

**اقرار علی انفسنا بالہلک**

”یہ جو ہم کہتے ہیں انا للہ یہ اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ ہم اس کے بندے اور مملوک ہیں اور جو کہتے ہیں وانا الیہ راجعون یہ اس بات کا اعتراف ہے کہ ہمیں اس دنیا سے جانا ہے (اور ہمارا قیام کہیں اور ہوگا)۔“<sup>[۱]</sup>

توجہ رہے کہ قرآن مجید نے اس جملے کو صابریں کے شانستہ ترین جملے کے طور پر بیان کیا ہے جو وہ مصائب سے دوچار ہونے کے وقت کہتے ہیں۔ یہ ایسا جملہ ہے جو مصائب کے وقت انسان کے لیے تسلی کا باعث بنتا ہے۔ مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑنے پر یہ جملہ دل و جان کو بیدار کر دیتا ہے اور ان حساس لمحات میں انسانی روح کو پلید اور شیطانی سوچوں سے محفوظ رکھتا ہے۔

کیونکہ ایک طرف تو انسان اقرار کرتا ہے کہ خود اور وہ جو کچھ اس کے پاس ہے سب کا سب خدا کی ملکیت ہے۔ وہی نعمت عطا کرتا ہے اور وہی واپس لے لیتا ہے۔ بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ اگرچہ عطا کرنے والا جو بخش دے ہرگز واپس نہیں لیتا۔ لہذا یہاں واپس لینے سے مراد یہ ہے کہ وہ اسے کسی بہتر جگہ پر ذخیرہ کرنا چاہتا ہے اور یہ بات خود مصیبت زدہ کے لیے تسلی کا باعث ہے۔

دوسری طرف انسان اعتراف کرتا ہے کہ ہمیں اسی کی طرف لوٹ جانا ہے۔ یہ جملہ بھی اسے ایک اور تسلی دیتا ہے چونکہ جہاں وہ جا رہا ہے وہ اس کی رحمت، لطف اور فضل و کرم کی جگہ ہے، سرائے ابدی اور اس کے لقاء کا مرکز ہے۔

اسی لیے بعض کا کہنا ہے کہ یہ آیت خدا کی ان عظیم ترین نعمتوں میں سے ایک ہے جو خدا نے اس امت کو عطا کی ہیں تاکہ مصیبت کے وقت اس آیت سے الہام حاصل کر سکے۔ کتنا فرق ہے اس آیت میں اور حضرت یعقوب علیہ السلام کی اس بات میں جو انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو کھودینے پر کہی: وقال یا اسفی علی یوسف (اور کہا ہائے میرا یوسف)۔<sup>[۲]</sup> جی ہاں! اس وقت تک ابھی یہ

[۱] مجمع البیان ج ۱ ص ۲۳۸۔ یہ جملہ نہج البلاغہ میں بیان ہونے والے جملات قصار میں بھی ہے۔

[۲] سورۃ یوسف ۸۴

آیت نازل نہ ہوئی تھی۔

البتہ یہ جملہ توحید کامل اور قیامت پر ایمان کا نچوڑ ہے۔ اسی طرح ہر وقت اور ہر حال میں خدا کی پاک ذات پر توکل اور بھروسہ کرنے کا حاصل ہے۔<sup>[۱]</sup>

چوتھی آیت میں اسی حقیقت کو ایک نئے پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ روز قیامت دنیا میں پیش آنے والے ان عجیب و غریب حوادث کا ذکر کرنے کے بعد ارشاد ہوتا ہے: الی ربك یومئذ المستقر (اس دن آخری آرام گاہ فقط تیرے پروردگار ہی کے ہاں ہے)۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ دنیا انسان کے لیے آرام گاہ نہیں ہے۔ اس میں موجود تمام علامتیں گواہی دیتی ہیں کہ یہ فنا اور نیست و نابود ہو جانے کی جگہ ہے، دگرگونی، فرسودگی اور زوال کا مقام ہے۔ لہذا دنیا انسان کی تکاملی حرکت میں اس کا آخری ہدف نہیں بن سکتی۔ بنا برائیں آرام گاہ کوئی اور جگہ ہے۔

بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ آیت میں ایک تقدیر ہے اور وہ یہ ہے کہ اس سے مراد الی حکم ربك ہے۔ یعنی وہاں آرام گاہ دراصل وہی خدا کا حکم ہے جس کے ذریعے عدل و انصاف کا قیام ہوگا یا وہ حکم خدا ہے جس کے ذریعے ایک گروہ کو جنت کی آرام گاہوں میں بھیجا جائے گا اور دوسرے گروہ کو دوزخ میں ٹھکانے لگایا جائے گا۔

لیکن اس بات کو مد نظر رکھتے ہوئے کہ یہاں تقدیر فرض کرنا خلاف قاعدہ ہے اور تقدیر کی کوئی ضرورت بھی دکھائی نہیں دیتی، لہذا ایسی تفاسیر پر کوئی دلیل نظر نہیں آتی۔

گذشتہ آیت میں بیان ہونے والے مطلب کو پانچویں اور آخری آیت میں ایک نئے اور اچھوتے انداز میں تازہ اصطلاح استعمال کرتے ہوئے بیان کیا گیا ہے۔ جان کنی کے لحاظ، مختصر سے حالات اور انسانی زندگی کا بستر گول ہو جانے کی جانب اشارہ کرنے کے بعد ارشاد ہوتا ہے: الی ربك یومئذ المساق (اس دن تمہارے رب کی طرف کھینچ لے جایا جائے گا)۔

مساق مصدر میسی ہے جس کا معنی سوق (ڈھکیلنا) ہے۔ اس اصطلاح سے پتہ چلتا ہے کہ انسان کی تکاملی حرکت کی سمت خدا ہی کی طرف ہے۔ یعنی کمال مطلق اور کمال لامتناہی کی جانب۔

یہاں پر پھر بعض مفسرین نے حکم یا جزا کا لفظ تقدیر میں فرض کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہاں دھکیلے جانے سے مراد ہے کہ خدا کے حکم اور اس کی جزاء کی طرف سب کو دھکیلا جائے گا۔ لیکن جیسا کہ ہم گذشتہ آیت میں بھی عرض کر چکے ہیں ایسی تقدیروں کے فرض کرنے کی اصلاً کوئی ضرورت ہی نہیں ہے۔ بلکہ تمام حرکات خدا ہی کی جانب ہیں۔

[۱] گذشتہ آیت کی اس بیان شدہ تفسیر کے ذریعے اس آیت سے ملتی جلتی دوسری آیات کی تفسیر بھی واضح ہو جاتی ہے۔ مثلاً الی اللہ مرجعکم جمیعاً (مائدہ ۱۰۵) ان الی ربك الرجعی (علق ۸) والہوتی یبعثہم اللہ ثم الیہ یرجعون (انعام ۳۶) ان الینا الیہم (غاشیہ ۲۵)

قرآن مجید کی بعض آیات میں بھی خدا کی پاک ذات کو تکالیف حرکت کی انتہا کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَأَنَّ إِلَىٰ رَبِّكَ الْمُنْتَهَىٰ ﴿٣٢﴾ (نجم ۳۲)

اور یہ آیت خود بھی متذکرہ بالا مطلب پر ایک اور دلیل ہے۔

## چند وضاحتیں

### سفر کی آخری منزل

آیات مجیدہ کی روشنی میں بیان ہونے والے اس مطلب (تمام انسانوں کی بازگشت خدا ہی کی طرف ہے) کو عقلی دلائل سے بھی ثابت کیا جاسکتا ہے کیونکہ انسانی معاشرہ اس کارواں کی مانند ہے جس نے عدم کے تاریک نقطے سے حرکت شروع کی ہو اور نور مطلق کی طرف پیش قدمی کر رہا ہو۔ اس حرکت پر فرمان خدا اور اس کی ربوبیت سایہ فگن ہے (توجہ رہنا چاہیے کہ یہ تمام بحثیں اصل توحید اور صفات کو قبول کرنے کے بعد کی ہیں)۔

ان متعدد آیات میں لفظ رب کی اصطلاح کا استعمال بتاتا ہے کہ یہ ایک ایسی حرکت ہے جو خدا کی ربوبیت کے سائے تلے اور ایک باقاعدہ حساب کتاب کے تحت انجام پاتی ہے۔

اگر اس حرکت کا آخری نقطہ موت ہو تو ایسی حرکت بے ہدف، بے مقصد اور فاقد قرار گاہ ہوگی جب کہ یقین ہے کہ یہ الہی حرکت ایک بہتر مقصد کی طرف جاری ہے۔

انتہائی غور فکر کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ ہر حرکت تکاملی ایک اعلیٰ تر اور بالاتر مرحلے میں پہنچنے کے لیے انجام پاتی ہے اور اعلیٰ ترین نقطہ وجود ذات مقدس واجب الوجود ہے۔ بنا براین تمام حرکات اسی کی جانب جاری و ساری ہیں۔ لہذا انسان جب تک اس کے قرب کو حاصل نہ کر لے، اس کی پاک ذات کے مقام شہود تک نہ پہنچ جائے اور مقربین کی صف میں داخل نہ ہو جائے، آرام نہ پائے گا کیونکہ حرکت کے آخری نقطہ تک نہیں پہنچ سکا۔ (وقت نظر فرمائیں)۔

اس تمام بحث سے واضح ہوتا ہے کہ موت واقع ہونے سے انسان کا ارتقاء اور سیر صعودی نہیں رکنی چاہیے بلکہ دوسری دنیا میں بھی اس کو اسی طرح جاری رہنا چاہیے۔ بنا براین حرکت اور ہدف کا وجود حیات بعد از مرگ کے مسئلہ پر خود ایک روشن دلیل ہے۔



## ۵۔ دلیل رحمت

خدا کی مشہور و معروف صفات میں سے ایک صفت رحمت ہے۔ رحمت کا معنی ہے اس وجود کو فیض اور نعمت سے نوازنا جو اس کی اہلیت اور صلاحیت رکھتا ہو۔

چونکہ انسان اپنی مخصوص بناوٹ اور اس روح کے ساتھ جو نفع الہی کی برکت سے اس میں پھونکی گئی ہے حیات جاوید اور کئی ایک کمالات تک پہنچنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ لہذا خداوند رحمان و رحیم ایسے فیض اور سعادت کو اس سے منقطع نہیں کرتا اور نہ ہی موت واقع ہونے سے اس کے فیض و رحمت کا خاتمہ ہوتا ہے۔ اسی کو دلیل رحمت کہا جاتا ہے۔ اب قرآن مجید سے اس مطلب پر درج ذیل آیت آپ کے پیش خدمت ہے:

(۱) قُلْ لِّمَن مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط قُلْ لِلّٰهِ ط كَتَبَ عَلٰی نَفْسِہِ الرَّحْمَۃُ ط  
لِيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰی يَوْمِ الْقِيَمَةِ لَا رَيْبَ فِیْہِ ط (انعام ۱۲)

ترجمہ

(۱) آپ کہئے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں موجود ہے، یہ سب کس کی ملک ہے؟ آپ کہہ دیجئے سب اللہ ہی کی ملک ہے، اس نے (اللہ تعالیٰ نے) رحمت اور مہربانی فرمانا اپنے اوپر لازم فرمایا ہے۔ روز قیامت کہ جس میں کوئی شک ہی نہیں تم سب کو خدا ضرور جمع کرے گا۔

## تفسیر

یہ آیت درحقیقت چار حصوں پر مشتمل ہے۔

پہلا حصہ سوالیہ انداز میں شروع ہوتا ہے۔ پیامبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا گیا ہے کہ آپ کہیئے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں موجود ہے یہ سب کس کی ملک ہے؟ (قل لمن مَّا فی السموات والارض)۔

بعد ازاں کسی جواب کا انتظار کئے بغیر ارشاد ہوتا ہے کہ آپ خود ہی کہہ دیجئے سب اللہ ہی کی ملک ہے۔ (قل اللہ) یعنی یہ بات اتنی واضح اور قطعی و مسلم ہے کہ اصلاً کسی بحث مباحثے کی ضرورت ہی نہیں۔

دوسرے حصے میں ارشاد باری تعالیٰ ہوتا ہے کہ خدا نے رحمت اور مہربانی فرمانا اپنے اوپر لازم فرمایا ہے (تا کہ تمام لوگوں کو بلا استثناء اپنی رحمت و اسعہ اور بے پایاں لطف و عنایات سے فیض یاب کرے) (کتب علی نفسہ الرحمة)۔

تیسرے حصے میں قیامت سے متعلق ارشاد ہوتا ہے: روزِ قیامت کہ جس میں کوئی شک و شبہ ہی نہیں تم سب کو خدا ضرور بالضرور جمع کرے گا۔ (لیجمعنکم الی یوم القیمۃ لا ریب فیہ)۔

چوتھے حصے میں یوں نتیجہ گیری کی گئی ہے: فقط وہی لوگ ایمان نہ لائیں گے جنہوں نے اپنے کو ضائع کیا، اپنا سرمایہ وجود کھودیا اور گھائے میں رہے۔ (الذین خسروا انفسہم فہم لا یؤمنون)۔

ان چار جملوں کا آپس میں کیا رابطہ ہے، اس بارے میں بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ پہلا حصہ توحید کے بارے میں ہے اور باقی حصہ معاد یا نبوت اور معاد کو بیان کرتا ہے اور دین کے بنیادی ترین اصول اس میں سموائے گئے ہیں۔

لیکن علامہ طباطبائی مرحوم کا فرمانا ہے کہ پوری آیت مسئلہ معاد کو بیان کرتی ہے اور یہی تفسیر زیادہ صحیح دکھائی دیتی ہے۔ ہم اس کی وضاحت یوں پیش کرتے ہیں:

پہلے حصے میں خدا نے تمام عالم ہستی پر اپنی مالکیت اور حاکمیت کو بیان کیا ہے اور ایک سوال و جواب کی صورت میں مطلب بالکل واضح کر دیا ہے، ایک ایسے سوال کے ساتھ کہ جس کا جواب دل، فطرت اور ضمیر کی اتھاہ گہرائیوں سے ملتا ہے۔ یہاں تک کہ مشرکین بھی اسی پر اعتقاد رکھتے تھے (یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے کوئی باپ اپنے بیٹے کو تنبیہ کرتے ہوئے کہتا ہے کیا میں نے تمہاری تعلیم و ترقی کے لیے تمام وسائل فراہم نہیں کیے۔ اس کے بعد بیٹے کے جواب کا انتظار کیے بغیر خود ہی کہتا ہے: یقیناً میں نے ایسا ہی کیا ہے)۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عالم ہستی میں کوئی چیز بھی حق تعالیٰ کے ارادے اور فرمان کے مقابلے میں رکاوٹ کھڑی نہیں کر سکتی۔ بعد ازاں مزید ارشاد ہوتا ہے: قادر و توانا خدا نے رحمت فرمانا اپنے اوپر لازم قرار دے دیا ہے اور کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ اسے لازم قرار نہ دے جب کہ وہ منبع فیض ہے اور اس سرچشمے پر بخل پھٹک ہی نہیں سکتا۔ لہذا اگر تا ابد بھی فیض رسانی کرے تو اس سے کوئی چیز کم نہ ہوگی۔ کیا رحمت اس کے علاوہ بھی کچھ ہے کہ نعمت اسے دی جائے جو اس کا مستحق ہو اور ہر موجود کو اس کمال مطلوب تک پہنچایا جائے جس کی وہ صلاحیت رکھتا ہے؟

جب یہ دو مقدمے ثابت ہو گئے (کہ ایک طرف خدا منبع فیض ہے اور دوسری طرف اس کی فیض رسانی میں کوئی چیز رکاوٹ نہیں بن سکتی) تو تیسرے جملے میں یوں نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے: پس روزِ قیامت کہ جس میں کوئی شک و شبہ نہیں، تم سب کو ضرور اکٹھا کیا جائے گا۔ اگر انسانی موت کے ساتھ ہی سب کچھ ختم ہو جائے تو پھر انسان تو اپنے کمال مطلوب تک نہ پہنچا اور حیات جاوید کی استعداد کھو بیٹھا، رحمت و فیض الہی اس سے اٹھالی گئی یا اس فیض رسانی میں کوئی رکاوٹ پیدا ہو گئی۔ لیکن چونکہ رکاوٹ کا تو اصلاً کوئی مسئلہ ہی نہیں اور اس کی رحمت بھی یقینی ہے لہذا انسان کے لیے دوسری دنیا میں حیات جاوید پانا اور قرب الہی کا حصول بھی حتمی ہے۔

البتہ بعض لوگ حیات ابدی کی صلاحیت گنوا بیٹھتے ہیں اور گھائے کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ قیامت پر ایمان نہیں رکھتے۔

بنا برائیں یہ دلیل رحمت جو اس آیت کا نچوڑ ہے مکمل طور پر منطقی ہے اور دلیل حکمت اور دلیل عدالت سے بالکل جدا ہے۔

(وقت نظر فرمائیں)۔

ضمناً اس سوال کا جواب بھی واضح ہو جاتا ہے کہ قیامت ایک گروہ کے لیے تو مایہ رحمت ہے جب کہ دوسرے گروہ کے لیے باعث عذاب ہے اور یہ بات کیونکر رحمت خداوندی کے مطابق ہو سکتی ہے؟

اس کا جواب وہی ہے جو آیت کی وضاحت میں بیان ہو چکا ہے اور وہ یہ کہ خدا نے اپنی رحمت تک پہنچنے کی صلاحیت ہر کسی کو عطا کی ہے اور اس کے لوازمات بھی ہر ایک کے اختیار میں دے دیئے ہیں۔ اب اگر بعض لوگ اپنی صلاحیتوں کو زنگ لگا دیں اور انہیں تباہ و برباد کر دیں جب کہ عقل بھی رکھتے ہیں اور تعلیمات وحی سے بھی بہرہ ور ہیں، بنا برائیں وہ خود قصور وار ٹھہریں گے۔ چونکہ یہ ان کے اپنے ہاتھوں کی کمائی ہے لہذا لعنت کا طوق بھی خود سے پہنیں۔

زندگی کی تمام نعمتیں اسی طرح ہیں۔ بعض ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور بعض ان نعمتوں سے سوء استفادہ کرتے ہیں۔ لہذا یہ چیز خدا کی رحمت اور فیض رسانی میں رکاوٹ نہیں بن سکتی۔

یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ لیجمعنکم کے جملے میں ایک طرف ”لام قسم“ دوسری طرف ”نون تاکید ثقیلہ“ اور تیسری طرف ”لا ریب فیہ“ کا جملہ استعمال کر کے تاکید در تاکید پیش کی گئی ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ رحمت پروردگار کے پیش نظر قیامت ہر لحاظ سے حتمی ہے۔ امید ہے دلیل رحمت کے ضمن میں پیش ہونے والی متذکرہ بالا توضیحات کافی ہوں گی۔ بنا برائیں ہم مزید وضاحت کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔

## ۶۔ دلیل وحدت

افکار و آراء کا مختلف ہونا دنیاوی زندگی کی خصوصیات میں سے ہے۔ حتیٰ کہ ایک ہی مذہب کے پیروکار مختلف عقائد کی وجہ سے کئی ایک گروہوں میں تقسیم ہیں۔

بعض اوقات آراء و عقائد کا یہ اختلاف معاشرے سے گھر اور خاندان تک اس طرح سرایت کر جاتا ہے کہ خاندان کا ہر فرد مختلف عقیدے اور مکتب کا پیروکار ہوتا ہے۔

بلاشبہ ہر انسان دنیا میں موجود ان اختلافات کے ہاتھوں نالاں ہے اور ہر کسی کی یہ آرزو ہے کہ ان اختلافات کا جلد از جلد خاتمہ ہو جائے۔

خدا جس نے انسان کو تکامل اور ہدایت کے لیے خلق کیا ہے یقیناً وہ انسان کو اپنی یہ آرزو پانے سے محروم نہ رکھے گا اور اس کی ربوبیت کا تقاضا بھی یہی ہے۔ چونکہ بعض وجوہات کی بنا پر یہ ہدف دنیا میں تو پورا نہ ہوگا اور متعدد شواہد بھی اس بات کی گواہی دیتے ہیں، لہذا اختلافات رفع ہونے اور وحدت کے حصول کی جگہ یقیناً کوئی دوسری دنیا ہے۔

قرآن مجید نے اس مطلب پر بہت تاکید کی ہے۔ دسیوں آیات مجیدہ اس موضوع کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ ہر قسم کے اختلافات رفع ہونے کی جگہ ایک دوسری دنیا ہے اور خدا یقیناً اس کام کو انجام دے گا۔

اس مقدمے کے ساتھ اب ہم درج ذیل آیات مجیدہ کی طرف توجہ مبذول کرتے ہیں:

(توجہ رہے کہ ملتے جلتے مضامین کی حامل آیات میں سے ایک آیت کو متن کے لیے انتخاب کیا گیا اور باقی آیات کی طرف حاشیے میں اشارہ کیا گیا ہے)۔

(۱) **وَأَقْسَمُوا بِاللّٰهِ جَهْدَ أَيْمَانِهِمْ ۖ لَا يَبْعَثُ اللّٰهُ مَن يَمُوتُ ۖ بَلَىٰ وَعْدًا عَلَيْهِ**

**حَقًّا وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ** ﴿۳۸﴾ **لِيُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي يُخْتَلَفُونَ فِيهِ**

(نحل: ۳۸، ۳۹)

(۲) **ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ فَيُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ** ﴿۳۹﴾

(انعام: ۱۶۳)

(۳) **إِنَّ رَبَّكَ يَقْضِي بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ فِيمَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ** ﴿۹۳﴾

(یونس: ۹۳)

(۴) اللَّهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ فِيمَا كُنْتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ ﴿٦٩﴾ (حج: ۶۹)  
 (۵) إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالصَّابِئِينَ وَالنَّصَارَى وَالْمَجُوسَ  
 وَالَّذِينَ أَشْرَكُوا ۖ إِنَّ اللَّهَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ ۖ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ  
 شَهِيدٌ ﴿١٤﴾ (حج: ۱۴)

ترجمہ

- (۱) وہ بڑی محکم قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ خدا انہیں مارے گا تو پھر کبھی دوبارہ زندہ نہ کرے گا۔ جی ہاں یہ خدا کا  
 حتمی وعدہ ہے (کہ وہ تمام مردوں کو دوبارہ زندگی عطا کرے گا) لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ مقصد یہ ہے کہ جن  
 باتوں پر یہ لوگ جھگڑا کرتے ہیں اسے ان کے سامنے صاف واضح کر دے۔  
 (۲) پھر تم سب کو اپنے پروردگار کے حضور لوٹ کر جانا ہے۔ تب تم لوگ جن باتوں میں باہم جھگڑتے تھے وہ  
 سب تمہیں بتا دے گا۔  
 (۳) جن باتوں میں یہ باہم جھگڑ رہے ہیں قیامت کے دن تمہارا پروردگار اس میں فیصلہ کر دے گا۔  
 (۴) جن باتوں میں تم باہم جھگڑا کرتے ہو قیامت کے دن خدا تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کر دے گا۔  
 (۵) جن لوگوں نے ایمان قبول کیا اور یہودی، صائبان (لامذہب)، نصاریٰ، مجوسی اور مشرکین خدا قیامت کے  
 دن ان لوگوں کے درمیان ٹھیک ٹھیک فیصلہ کر دے گا۔ حق و باطل کو جدا جدا کر دے گا اور خدا ہر چیز پر گواہ ہے  
 (اور ہر چیز سے آگاہ ہے)۔

تفسیر

یہ اختلافات کب ختم ہوں گے؟

ابتداءً پہلی آیت میں دوسری دنیا کے وجود کی نفی پر منکرین معاد کی قسموں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: وہ تاکیداً اور مکرراً قسمیں کھا

[۱] انہی مضامین کی حامل قرآن مجید کی دیگر آیات آل عمران ۵۵، مائدہ ۸۸، نحل ۹۲، ۱۲۴، بقرہ ۱۱۳، زمر ۳، جاثیہ ۱۷، حج ۶۹، دخان ۴۰،

نبا ۱۷، مرسلات ۱۳-۱۴، سجدہ ۲۵۔

کر کہتے ہیں کہ خدا مرنے والے کو ہرگز دوبارہ زندہ نہ کرے گا۔ (واقسموا باللہ جہد ایمانہم لا یبعث اللہ من یموت) بعد ازاں انہیں جواب دیا جاتا ہے: ”جی ہاں! (یقیناً سب کو نئی زندگی عطا کی جائے گی) یہ خدا کا حتمی وعدہ ہے۔ لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔“ (بلی وعدا علیہ حقاً ولکن اکثر الناس لا یعلمون)

اس کے بعد قیامت اور مردوں کے دوبارہ زندہ ہونے کے مقصد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد باری تعالیٰ ہوتا ہے: ”مقصد یہ ہے کہ جن باتوں پر یہ لوگ جھگڑا کرتے ہیں اسے ان کے سامنے واضح کر دے۔“ (لیبدین لہم الذی یختلفون فیہ)

بنا برائیں کہا جاسکتا ہے کہ قیامت کے مقاصد میں سے ایک اختلافات کی نفی کرنا اور وحدت کی جانب لوٹنا ہے کیونکہ دنیا کی یہ ماہیت اتنے انواع و اقسام کے پردوں کے ساتھ اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ یہ اختلافات کلی طور پر ختم ہو جائیں۔ لیکن وہ دن کہ جو کشف غطاء ہے، پردوں کے ہٹ جانے کا دن ہے، تمام اسرار پنہانی کے آشکار ہونے کا دن ہے، اس دن ہر چیز واضح و روشن ہو جائے گی اور ہر قسم کے اختلافات کا خاتمہ ہو جائے گا۔

مومنوں کا ایمان پکا ہو جائے گا اور وہ عین الیقین کے مقام تک جا پہنچیں گے جب کہ کافر اور باطل مذاہب کے پیروکار اپنی غلطی کا اعتراف کریں گے اور حق پر لوٹ آئیں گے۔

دوسری آیت میں اسی مطلب کو ایک اور انداز سے پیش کیا گیا ہے۔ مشرکین کے معبودوں کی نفی کرنے کے بعد اور اس امر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہ ہر کسی نے اپنے اعمال کے بدلے خود کو گروہی رکھ دیا ہے، لہذا کسی کا گناہ دوسرے کے کھاتے میں نہ ڈالا جائے گا۔ ارشاد ہوتا ہے: پھر تم سب کو اپنے پروردگار کے حضور میں لوٹ کر جانا ہے۔ تب تم لوگ جن باتوں میں باہم جھگڑتے تھے وہ سب تمہیں بتا دے گا (اور اختلافات ختم ہو جائیں گے)۔

### (ثم الی ربکم مرجعکم فینبئکم بما کنتم فیہ تختلفون)

پہلی آیت میں تمہیں اختلافات کی بات تھی اور اس آیت میں انباء (خبر دینا، آگاہ کرنا) کی بات کی گئی ہے اور درحقیقت دوسری پہلی کی علت ہے چونکہ روز قیامت خدا کا خبر دینا دراصل تمہیں حقائق کا جوشاں چشمہ ہے یا ”تمہیں“ دیکھنے سے اور ”انباء“ سننے سے تعلق رکھتا ہے۔ تیسری آیت میں لوگوں کے اختلافات سے متعلق خدا کی قضاوت کا ذکر کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ”جن باتوں میں یہ اکثر باہم جھگڑتے رہتے ہیں روز قیامت تمہارے پروردگار اس میں فیصلہ کر دے گا۔“

### (ان ربک یقضی بینہم یوم القیمۃ فیما کانوا فیہ یختلفون)

واضح ہے کہ جب خدا اس دن ان کے درمیان رسماً قضاوت کرے گا تو یقیناً تمام اختلافات ختم ہو جائیں گے اور حقائق اظہر من الشمس ہو جائیں گے۔

یہ آیت بنی اسرائیل کے اختلافات کی طرف اشارہ کرتی ہے یا ان اختلافات کی جانب جو نزول قرآن اور ظہور اسلام کے بعد ان

کے درمیان پیدا ہوئے۔ بعض لوگوں نے اسلام اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملنے والی روشن نشانیوں کے بعد ان سے ہاتھ اٹھالیا جب کہ بعض نے اپنے شخصی منافع و مفادات کی خاطر ان روشن علامات سے منہ موڑ لیا۔

یا پھر ان اختلافات کی طرف اشارہ ہے جو حضرت موسیٰ بن عمران علیہ السلام کے دور میں فرعونیوں کے چنگل سے آزادی اور اس عظیم معجزے کے مشاہدے کے بعد ان کے درمیان پیدا ہوئے۔ البتہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کوہ طور پر جانے اور سامری کا بجھڑا نکالنے کے بعد پیدا ہونے والے اختلافات کی طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے۔

اگرچہ متعدد مفسرین پہلے احتمال کو ترجیح دیتے ہیں لیکن اس آیت سے پہلے والی آیات دوسرے احتمال کو ترجیح دیتی ہیں۔ [۱] البتہ تینوں تفسیروں میں جمع بندی کی جاسکتی ہے۔

بہر حال بعض معروف مفسرین کے بقول یہ اختلافات اس دنیا میں تو ختم ہونے سے رہے، فقط قیامت ہی ہے کہ خدا انکے درمیان قضاوت کرے گا اور ہر کھڑے کھوٹے اور حق و باطل کو جدا جدا کر دے گا۔ [۲]

چوتھی آیت میں لفظ حکم استعمال ہوتا ہے۔ بنی اسرائیل کے اختلافات کے ایک پہلو پر اشارہ کرنے کے بعد ارشاد ہوتا ہے: ”جن باتوں میں تم باہم جھگڑا کرتے ہو قیامت کے دن خدا تم لوگوں کے درمیان حکم کر دے گا۔“

### (اللہ یحکم بینکم یوم القیمة فیما کنتم فیہ تختلفون)

یہودیوں کا اختلاف کس بات پر تھا؟ آیت کے شروع سے پتہ چلتا ہے کہ ہفتے کے دن پران کے درمیان اختلاف تھا جو ان کی چھٹی کا دن تھا (اختلاف یہ تھا کہ آیا اس دن شکار کرنا حرام ہے یا حلال؟ اگرچہ ان کے پیغمبر اسے حرام قرار دے چکے تھے یا ہفتے کی جمعہ پر فضیلت کے بارے میں اختلاف تھا)۔

تاریخ اس بات پر گواہ ہے کہ اصولاً بنی اسرائیل نے ہمیشہ اختلاف و انتشار کے ایک مرکز کا کردار ادا کیا ہے۔ لیکن آج ایسی مرکزیت نہیں ہے بلکہ بعض حوادث زمانہ کی وجہ سے ان کا اصل وجود بھی خطرہ میں پڑ گیا ہے۔ اسی لیے ہاتھوں میں ہاتھ دے کر خصوصاً دنیا بھر کے مسلمانوں کے خلاف متحد ہو گئے ہیں۔

گذشتہ آیات میں بیان ہونے والے مطلب کو پانچویں آیت میں ایک اور عنوان کے تحت بطور کلی زیر بحث لایا گیا ہے۔ کافروں کے مختلف گروہوں اور مؤمنین کے درمیان پائے جانے والے وسیع ترین اختلافات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے: ”جنہوں نے ایمان قبول کیا (مسلمان) اور وہ لوگ جو یہودی، صائبان (ستارہ پرست)، نصاریٰ، مجوسی اور مشرک ہیں خدا روز قیامت ان کے درمیان جدائی ڈال دے گا (حق کو باطل سے جدا کر دے گا) اور خدا ہر چیز پر گواہ ہے (اور ہر چیز سے آگاہ ہے)۔“

[۱] فخر رازی، قرطبی اور طبری مرحوم نے پہلی تفسیر کو قبول کیا ہے جب کہ الہیز ان کی تعبیرات دوسری تفسیر سے موافقت رکھتی ہیں۔

[۲] تفسیر کبیر، ج ۱ ص ۱۵۹

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالصَّابِئِينَ وَالنَّصَارَى وَالْمَجُوسَ وَالَّذِينَ  
أَشْرَكُوا ۖ إِنَّ اللَّهَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ ۖ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ

شَهِيدٌ ﴿١٤﴾

یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ قیامت کے معروف ترین ناموں میں سے ایک یوم الفصل ہے۔ قرآن گویا ہے: إِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ  
كَانَ مِيقَاتًا ﴿١٤﴾ (نہا: ۱۷)

یعنی یوم الفصل (سب کی) وعدہ گاہ معین وقت ہے۔ قرآن حکیم میں اس کے علاوہ بھی کئی ایک اور آیات میں قیامت کے  
بارے میں اسی اصطلاح کو بیان کیا گیا ہے۔

”فصل“ دراصل دو چیزوں کی ایک دوسرے سے جدائی کے معنی میں ہے۔ قیامت کو یوم الفصل اس لیے کہا گیا ہے کہ اس دن حق  
باطل سے جدا ہو جائے گا اور خدا کی قضاوت کے ذریعے ہر طرح کا اختلاف ختم ہو جائے گا۔ نیک و پاک لوگوں کی صفوف بدکار و آلودگان  
سے جدا ہو جائیں گی۔ مجمع البیان میں طبری مرحوم کے بقول اہل حق کے چہرے سفید اور نورانی ہوں گے اور اہل باطل کے چہرے سیاہ اور  
ظلمانی ہوں گے۔ ﴿١٤﴾

کیا اتنی واضح و آشکارا علامات کے باوجود بھی حق و باطل کے مسئلے میں کوئی اختلاف و نزاع باقی بچتا ہے؟

اس آیت میں ان چھ مشہور ادیان کا ذکر کیا گیا ہے جو نزول قرآن کے وقت موجود تھے اور درحقیقت زیادہ تر پیروکار انہی مذاہب کے  
تھے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ: مومنین (مسلمان)، یہود، صائبین (حضرت یحییٰ علیہ السلام کے پیروکار جن میں سے بعض کو ان کے انحرافات کی  
وجہ سے ستارہ پرست کہا جانے لگا)، نصاریٰ (عیسائی)، مجوس (زرتشتیان، آگ پرست)، مشرکین اور بت پرست۔ خدا روز قیامت ان کے  
درمیان جدائی ڈال دے گا اور اہل حق کو واضح طور پر اہل باطل سے جدا کر دے گا۔

اگر آج اہل حق کو اہل باطل سے جدا کرنے کے لیے دلیل، منطق اور استدلال کی ضرورت ہے تو اس دن اصلاً ایسے کسی مسئلے کی  
ضرورت پیش نہ آئے گی بلکہ فارسی محاورہ کے مطابق ”آنجا کہ عیاں است چہ حاجت بہ بیان است“ یعنی جو چیز خود سے اظہر من الشمس ہے اس  
کی وضاحت کرنا معنی نہیں رکھتا۔

رنگ رخسارہ ہا خبر از سر در و نہامی دہد!

رنگ رخسار رازِ درون کو ظاہر کرتا ہے۔



## چند وضاحتیں

متذکرہ بالا پانچ آیات میں پانچ مختلف عنوانات ”انباء“، ”تبیین“، ”حکم“، ”قضاء“ اور ”فصل“ کا ذکر کر کے اس حقیقت کو انتہائی واضح طور پر بیان کر دیا گیا ہے کہ روزِ قیامت اختلافات کے خاتمے، حقائق کے آشکار ہونے، حق و باطل کے جدا ہونے اور آخری حکم اور قضاوت کا دن ہے۔

ایسا کیوں نہ ہو جب کہ قیامت یوم البروز اور یوم الظہور ہے۔

**وَبَرَزُوا لِلَّهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ﴿۳۸﴾ (ابراہیم ۳۸)**

قیامت پردوں کے ہٹ جانے اور کشفِ غطاء کا دن ہے۔

**فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَاءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيدٌ ﴿۲۲﴾ (ق ۲۲)**

درحقیقت عالم دنیا کہ جو ایک تاریک یا نیم ظلمانی عالم ہے، اس کی طبیعت میں یہ ہے کہ یہ حقائق کو مکمل طور پر پشت از بام نہیں ہونے دیتی۔ یہ بالکل رات کی مانند ہے جس میں انسان چراغ لیے حقائق تک دسترس حاصل کرنے کی جتنی بھی کوشش کرے پھر بھی حقائق کا کچھ حصہ نمایاں ہونے سے رہ جائے گا لیکن قیامت طلوع آفتاب کی مانند ہے کہ جس کی درخش سے ہر چیز واضح، آشکار اور روشن ہو جائے گی۔

رات کی تاریکی میں ممکن ہے بعض لوگ راستے کو پالیں اور بعض بھٹک جائیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ حق تک پہنچنے والا ہر کوئی اپنے تئیں اس کی تعریف کرے۔ جیسا کہ یہ مثال مشہور ہے کہتے ہیں: کچھ افراد رات کی تاریکی میں ہاتھی کی جان پہچان کرنے کے لیے اس کے پیچھے جا نکلے۔ ہر کسی نے اس کے جسم کے کسی ایک حصے کو چھوا۔ اب جب واپس لوٹے تو متضاد تعریفیں کرنے لگے۔ جس نے ہاتھی کے پاؤں کو مس کیا تھا اس نے کہا: ہاتھی ایک ستون کی مانند ہے۔ دوسرا جو ہاتھی کی سونڈ کو چھو کر آیا تھا کہنے لگا کہ ہاتھی تو ایک بڑے پائپ کی طرح ہے۔ تیسرا جس نے ہاتھی کے سینے کو مس کیا تھا ہاتھی کو ایک چھت جیسا سمجھ رہا تھا۔ لیکن جب ہاتھی روشنی میں نمودار ہوا تو سارے اختلافات برطرف ہو گئے اور سب جان گئے کہ ان کی تعریفیں محدود تھیں۔

جیسا کہ پہلے بھی اشارہ کیا گیا ہے انسان میں یہ صلاحیت ہے کہ امواج اختلاف سے چھٹکارا پالے اور یقین وحدت کی دنیا میں قدم بڑھاتا چلا جائے۔ خدا جس نے اسے تکامل کے لیے خلق کیا ہے یقیناً اسے اس فیض سے محروم نہ رکھے گا۔

تکامل کی راہ میں درپیش موانع میں سے ایک اختلاف ہے۔ اختلاف سکون و آرام میں مزاحمت ایجاد کرتا ہے اور یہ اختلاف ہی ہے جو بعض اوقات انسان کے اعتقادات کی جڑوں کو شک کے زہر ہلاہل سے سیراب کرتا ہے۔ لہذا ضروری ہے کہ اس دن کا انتظار کیا جائے جب ان تمام مزاحمتوں کا خاتمہ ہو جائے۔

البتہ جہاں تک دنیاوی زندگی کی طبیعت نے اجازت دی ہے انبیاء اور اوصیاء نے آسمانی کتابوں کی مدد سے حقائق کو روشن کیا ہے۔

لیکن وہ بھی ان چراغوں کی مانند تھے جسے انسان رات کی تاریکی میں اس دنیا میں لیے پھر رہا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ وحدت کی جگہ فوراً اختلاف سراٹھا لیتے ہیں۔ چنانچہ قرآن گویا ہے:

وَمَا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ إِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي اخْتَلَفُوا فِيهِ ۖ (نحل: ۶۴)

”ہم نے آپ پر یہ کتاب صرف اس واسطے نازل کی ہے کہ جن امور میں لوگ اختلاف کر رہے ہیں انہیں آپ

ان پر تبیین (ظاہر) فرمادیں۔“

ایک اور جگہ یوں ارشاد فرمایا گیا ہے:

فَمَا اخْتَلَفُوا إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ ۖ (جاثیہ: ۱۷)

”انہوں نے علم و آگاہی کے حصول ہی کے بعد باہم اختلاف کیا۔“

اس سے پتہ چلتا ہے کہ انبیاء کی پوری جدوجہد اور نسبی اختلافات کے برطرف ہونے کے باوجود بھی اختلاف مکمل طور پر ختم نہ ہوئے۔

دراصل اس دنیا میں بہت سارے لوگوں پر ہوا و ہوس اور حب و بغض حکم فرما ہے۔ جب تک یہ پردے نہیں ہٹتے وحدت کی طرف

گامزن نہیں ہوا جاسکتا۔

لیکن روز قیامت یہ تمام پردے جل کر راکھ ہو جائیں گے اور حقائق بغیر ان پردوں کے آشکار ہو جائیں گے۔

## ۷۔ دلیل بقائے روح

الہیات کے متعدد فلاسفہ معاد کی بحث میں بقائے روح کے مسئلہ پر زور دیتے ہیں اور اسے قیامت کی روشن ترین دلیلوں میں سے ایک جانتے ہیں۔

بلاشبہ بقائے روح پر اعتقاد ہمارے لیے حیات بعد از موت اور قیامت کے آدھے راستے کو ہموار کر دیتا ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے کہ اگر کوئی بقائے روح پر اعتقاد نہ رکھتا ہو تو مسئلہ قیامت اس کے لیے ثابت کرنا مشکل ہو جائے۔ بلکہ بحث معاد بقائے روح کے مسئلہ کو منہا کر کے بھی مکمل طور پر قابل اثبات ہے۔

شاید اسی بناء پر قرآن کریم نے بحث قیامت کے تحت بیان ہونے والی آیات میں بقائے روح کے مسئلہ پر کم تر سہارا لیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہ قرآن مجید نے بقائے روح اور مسئلہ معاد کے درمیان کوئی خاص رابطہ برقرار نہیں کیا جیسا کہ آپ ملاحظہ بھی فرمائیں گے۔ لیکن اس کے باوجود انکار نہیں کیا جاسکتا کہ بقائے روح کے مسئلہ کی روشنی میں قیامت کے مسئلہ کو زیادہ واضح طور پر ثابت کیا جاسکتا ہے۔ اس حقیقت سے بھی فرار نہیں کیا جاسکتا کہ قرآن پاک میں بقائے روح کے مسئلہ پر انتہائی ظریف اور خوبصورت اشارے ملتے ہیں بنا بریں بقائے روح کا مسئلہ ایک طائرانہ نگاہ کا سزاوار ہے۔ چونکہ روح سے مربوط مباحث اس قدر وسیع ہیں کہ ان کے لیے علیحدہ سے کئی ایک کتابیں لکھنے کی ضرورت ہے اس لیے ابھی ہم اس مسئلے کی گہرائیوں میں نہیں جاسکتے۔

اب اس مقدمے کے ساتھ ہی ہم قارئین محترم کو آیات ذیل کی طرف گوش شنوا اور چشم بینا کے ہمراہ دعوت دیتے ہیں:

(۱) وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ ﴿۱۶۹﴾

(ال عمران: ۱۶۹)

(۲) وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَكِنْ لَا تَشْعُرُونَ ﴿۱۷۰﴾ (البقرة: ۱۷۰)

(۳) النَّارُ يُعْرَضُونَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَعَشِيًّا ۖ وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ أَدْخِلُوا آلَ فِرْعَوْنَ أَشَدَّ الْعَذَابِ ﴿۴۶﴾ (مومن: ۴۶)

(۴) قُلْ يَتَوَفَّكُم مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِي وُكِّلَ بِكُمْ ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّكُمْ تُرْجَعُونَ ﴿۱۱﴾

(سجدہ: ۱۱)

(۵) اللَّهُ يَتَوَفَّى الْأَنْفُسَ حِينَ مَوْتِهَا وَالَّتِي لَمْ تَمُتْ فِي مَنَامِهَا ۖ فَيُمْسِكُ الَّتِي قُتِلَ عَلَيْهَا الْهَوْتَ وَيُرْسِلُ الْأُخْرَىٰ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ ﴿۳۲﴾ (زمر: ۳۲)

ترجمہ

- (۱) (اے پیغمبرؐ) ہرگز گمان نہ کرو کہ خدا کی راہ میں قتل ہونے والے مردہ ہیں بلکہ وہ زندہ ہیں اور انہیں اپنے پروردگار کے ہاں سے روزی دی جاتی ہے۔
- (۲) خدا کی راہ میں قتل ہونے والوں کو مردہ مت کہو بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تم شعور نہیں رکھتے۔
- (۳) ان کا عذاب وہ آگ ہے جس کے سامنے یہ صبح و شام لائے جاتے ہیں اور جس دن قیامت برپا ہوگی تو حکم ہوگا کہ آل فرعون کو سخت ترین عذاب میں پھینک دو۔
- (۴) کہہ دیجئے کہ تم پر مامور ہونے والا ملک الموت تمہاری روح لے لے گا اور پھر تم اپنے پروردگار کی طرف لوٹ جاؤ گے۔
- (۵) خدا موت کے وقت ارواح قبض کرتا ہے اور ان روحوں کو بھی نیند کی حالت میں لے جاتا ہے جو ابھی نہیں مری۔ پھر جن ارواح کی موت کا حکم صادر ہو چکا انہیں اپنے پاس ہی رکھ لیتا ہے اور باقی روحوں کو (کہ جنہیں ابھی زندہ رہنا ہے) واپس لوٹا دیتا ہے ایک مقررہ وقت تک کے لیے اس امر میں غور و فکر کرنے والوں کے لیے واضح نشانیاں ہیں۔

تفسیر

استقلال ارواح

پہلی آیت میں راہ خدا میں شہادت پانے والوں کی بات ہوئی ہے۔ بعض کمزور ایمان لوگ ان (شہداء) کی حالت پر افسوس کرتے

[۱] متعدد آیات مجیدہ میں موت کے لیے توفی (دریافت کرنا) کی اصلاح استعمال ہوئی ہے جو بقائے روح کی جانب ایک لطیف اشارہ ہے۔  
مانند: النساء ۹۷، انعام ۶۱، نحل ۲۷، ۳۲، ۷۰، یونس ۳۶، زمر ۴۰، مؤمن ۶۷، انفال ۵۰، اعراف ۳۷، حج ۵۔

تھے کہ کیسے مرکب گئے، ختم ہو گئے، مٹی میں مٹی ہو گئے اور کہیں کے بھی نہ رہے؟ اس موقع پر قرآن حکیم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مخاطب کرتا ہے (تاکہ اعتراض کرنے والے ہوش کے ناخن لیں) ارشاد ہوتا ہے: ہرگز گمان نہ کرو کہ خدا کی راہ میں قتل ہونے والے مردہ ہیں بلکہ وہ زندہ ہیں اور انہیں اپنے پروردگار کے ہاں سے روزی دی جاتی ہے۔ (ولا تحسبن الذين قتلوا في سبيل الله امواتا بل احياء عند ربهم يرزقون)۔

اس طرح قرآن نے موت کے بارے میں، خصوصاً خدا کی راہ میں شہید ہونے والوں کی موت سے متعلق لوگوں کی فکر و نظر کو مکمل طور پر تبدیل کر دیا اور بتایا کہ وہ خدا کے جوار رحمت میں مسرت و خوشی میں غرق ہیں اور دوسروں کے لیے پیغام بھیجتے ہیں کہ کسی غم و اندوہ یا فکر و فاقے کی ضرورت نہیں۔ وہ تو راحت و سکون میں ہیں۔

ایک تو یہ روشن عبارات بقائے روح پر دلالت کرتی ہیں، دوسرا شہداء کی اس دنیا سے کہیں بالاتر اور اعلیٰ تر زندگی کی حکایت کنندہ ہیں۔ اگر موت کے ساتھ ہی انسانی زندگی کا مکمل خاتمہ ہو جائے تو پھر یہ عبارات حتیٰ کہ شہداء کے بارے میں بھی بے معنی ہو جاتی ہیں اور مجاز و استعارے سے بڑھ کر ان کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی۔

لیکن جو لوگ ان آیات کے پیغام کو درک نہیں کر پائے، آغاز اسلام کے کمزور ایمان لوگوں کی طرح انہی کی پیروی کرتے ہوئے ایسی عبارات کی تفسیر یوں کرتے ہیں کہ ان سے مراد شہداء کا نام اور ان کے مکتب کا باقی رہنا ہے۔ جب کہ آیت صریحاً ایسے افکار کو رد کرتی ہے اور شہداء کے لیے حیات ابدی کی قائل ہے، ایسی حیات جو یقیناً جسمانی نہیں ہے۔ چونکہ شہید کا خون سے رنگین جسم تو سپرد خاک کر دیا جاتا ہے پس برزخ میں بقائے روح کے ذریعے ملنے والی روحانی زندگی ہی ہے۔

تفسیر المیزان کے بقول اگرچہ بعض مصرع ہیں کہ یہ آیت شہدائے بدر کے لیے مخصوص ہے (یا بعض کے نزدیک شہدائے احد سے مربوط ہے) لیکن یقیناً آیت کا مفہوم انتہائی وسیع ہے اور بلا استثناء تمام شہداء اس میں شامل ہیں۔ البتہ شہداء کے علاوہ دوسروں کے بارے میں بھی انکار نہیں کیا گیا۔

بہر حال اس آیت کا اور اس کے بعد والی تمام آیات کا لہجہ یہ بیان کرتا ہے کہ شہداء کی ارواح باقی ہیں، وہ خدا کے جوار رحمت میں معنوی رزق سے بہرہ ور ہیں اور اس کے فضل و نعمت پر خوشحال و شاداں ہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ آیت غلط توجیہات اور انحرافی تفسیروں پر مہر بطلان ثبت کر رہی ہے۔

## شہدائے فی سبیل اللہ

متذکرہ بالا مطلب ہی کو دوسری آیت میں ایک اور انداز سے پیش کیا گیا ہے۔ اس میں فرق یہ ہے کہ پہلی آیت کا شان نزول شہدائے احد اور دوسری کا شان نزول شہدائے بدر سے مربوط ہے۔ لیکن مضمون آیت یہ دو جگہ پر عمومیت کا حامل ہے۔

ایک فرق یہ بھی ہے کہ پہلی آیت میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مخاطب قرار دیا گیا تھا جب کہ دوسری میں تمام مسلمانوں کو

خطاب کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ خدا کی راہ میں قتل ہونے والوں کو مردہ مت کہو، بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تم شعور نہیں رکھتے۔

## (ولا تقولوا لمن يقتل فی سبیل اللہ اموات بل احياء ولكن

### (لا تشعرون)

درست ہے کہ پہلی آیت اپنے بعد بیان ہونے والی آیات کے ساتھ مل کر شہداء کی روحانی زندگی پر زیادہ تاکید کرتی ہے۔ لیکن دوسری آیت بھی مکمل گویا ہے، خصوصاً جہاں یہ کہا گیا ہے کہ ”وہ زندہ ہیں لیکن تم نہیں سمجھتے“۔

یہاں دوبارہ بعض ایسے تنگ نظر افراد سے ہمارا واسطہ پڑتا ہے جنہوں نے شہداء کی زندگی کے بارے میں مجازی اور اخرائی توجہیات کی ہیں۔ ان کے نزدیک شہید کی زندگی سے مراد اس کا ہدایت پا جانا، اس کے دین کا نام باقی رہنا یا پھر اس کے اپنے نام کی بقاء ہے۔ جب کہ ان کے پاس اس بات پر کوئی دلیل نہیں ہے۔

گویا اس گروہ نے ان دونوں آیات کی ان تعبیرات پر دقت نظر نہیں کی جن میں شہید کی زندگی کے علاوہ اس کی روزی، رزق، خوشی، مسرت، مختلف خدائی نعمتوں سے بہرہ مند ہونا، بے غم، نڈر اور بخوف ہونے کا ذکر کیا گیا ہے۔ خصوصاً جہاں یہ دو ٹوک بات کی گئی ہے: ”تم ان کی زندگی کو نہیں سمجھ سکتے۔“

اگر مقصد بیان نام و دین کا باقی رہنا اور قیامت کی زندگی ہے تو پھر مذکورہ تعبیرات میں سے کوئی ایک بھی صحیح نہیں ہے۔

اسی لیے قرآن نے بقائے روح کی بحث کی بنیاد ہی کو اس پر استوار کیا ہے اور شہداء سے بات کا آغاز ہوا ہے۔

## آل فرعون پر برزخی عذاب

تیسری آیت میں ایک ظالم و ستیگر گروہ یعنی آل فرعون کی بات ہوئی ہے جو شہداء کے بالکل برعکس ہے۔ ان کے مرنے کے بعد کی حالت یوں بیان کی گئی ہے: انہیں صبح و شام آگ کے سامنے لایا جاتا ہے اور جس دن قیامت برپا ہوگی تو حکم ہوگا کہ آل فرعون کو سخت ترین عذاب میں پھینک دو۔

## (النار یعرضون علیہا غدوا و عشیا و یوم تقوم الساعة ادخلوا ال

### فرعون اشد العذاب)

واضح ہے کہ جس آگ کے سامنے آل فرعون کو صبح و شام لایا جاتا ہے اس سے مراد برزخی آگ ہے کیونکہ دنیا سے تو وہ جا چکے ہیں اور قیامت ابھی برپا نہیں ہوئی۔ علاوہ ازیں روز قیامت انہیں صبح و شام سزا نہیں ہوگی بلکہ وہاں تو دائمی طور پر سخت ترین عذاب میں مبتلا رہیں گے۔ (جیسا کہ آیت ذیل اس پر دلالت کرتی ہے)۔

قرآن کی یہ عبارت بقائے روح پر ایک اور زندہ دلیل ہے۔ لیکن اگر روح ہی باقی نہ رہے تو پھر کس چیز کو صبح و شام آگ کے سامنے لایا

جاتا ہے؟ کیا فقط بے جان اور خاک شدہ جسم کو؟ اس کا کیا فائدہ، اس پر کیا اثر ہوگا؟ پس ضروری ہے کہ ان کی روح باقی رہے، شعور اور درک کرنے کی قوت رکھتی ہو تو عالم برزخ میں ہر صبح و شام عذاب الہی میں مبتلا ہو۔

غلو اور عشی (صبح و شام) کی اصطلاح ممکن ہے اس وجہ سے بیان کی گئی ہو کہ صبح اور شام کا وقت طاعوت صفت لوگوں کی قدرت نمائی، عیش و عشرت اور خورد و نوش کے اوقات سے ہے۔ اسی لیے ٹھیک اسی وقت ان پر خدا کی پھٹکار پڑتی ہے۔

آیت ذیل آگ میں داخل ہونے کو بیان کرتی ہے جب کہ یعرضون (پیش کیا جانا) کی تعبیر اس سے بہت مختلف ہے۔ ممکن ہے یہ آگ کے قریب ہونے پر اشارہ ہو۔ برزخ میں آتش دوزخ نزدیک ہوں گے اور روز قیامت اس کے اندر جھونک دیئے جائیں گے۔

متعدد مفسرین اس آیت کو عذاب قبر اور برزخ سے متعلق سمجھتے ہیں<sup>[۱]</sup> اور یہ بات قطعی و مسلم ہے کہ عذاب قبر (اور برزخ) بقائے روح کے بغیر کوئی معنی نہیں رکھتا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: آپ میں سے جو بھی دنیا سے چلا جائے اسے صبح و شام اس کا قیام کا ٹھکانا دکھایا جاتا ہے۔ اگر جنتی ہو تو اس کی جنت والی جگہ اور اگر دوزخی ہو تو اس کا جہنمی ٹھکانا اسے دکھایا جاتا ہے اور اسے کہا جاتا ہے: قیامت میں یہ تمہاری جگہ ہے (اور یہی بات اس کی خوشی یا غمی کا باعث بنتی ہے)<sup>[۲]</sup>

اس حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ برزخ میں جزاء و سزا فقط شہیدوں اور آل فرعون تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ باقی سب لوگ بھی اس میں شامل ہیں۔

## قبض روح

چوتھی آیت میں (اور اس سے ملتی جلتی دوسری آیتوں میں بھی) ایک اور اصلاح اسی بارے میں ہمیں ملتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: کہہ دیجئے کہ تم پر مامور ہونے والا ملک الموت تمہاری روح لے لے گا اور پھر تم اپنے پروردگار کی طرف لوٹ جاؤ گے۔

## (قل یتوفکم ملک الموت الذی وکل بکم ثم الی ربکم ترجعون)

یہاں ایک انتہائی لطیف اور جالب تعبیر کا استعمال کیا گیا ہے۔ یہ تعبیر یتوفکم ہے جو توفی (بروزن ترقی) کے مادے سے ہے۔ مفردات میں راغب نے بیان کیا ہے کہ ”وافی“ دراصل کسی ایسی چیز کو کہتے ہیں جو حد کمال تک پہنچی ہو۔ لہذا ”توفی“ کسی چیز کو مکمل طور پر پکڑنے کے معنی میں ہے۔ یہ تعبیر واضح طور پر اس حقیقت کو بیان کرتی ہے کہ موت فنا اور نابودی کے معنی میں نہیں ہے بلکہ مکمل طور پر قبض کرنے اور لے لینے کی ایک قسم ہے اور انسانی روح کی مکمل گرفت کے معنی میں ہے۔ یہ خود ایک روشن دلیل ہے کہ انسانی روح مرنے کے بعد

[۱] مجمع البیان ج ۸، ص ۵۲۵؛ تفسیر فخر رازی ج ۲ ص ۷۳، قرطبی ج ۸ ص ۶۳، المیزان ج ۱ ص ۵۴

[۲] یہ حدیث مجمع البیان میں صحیح بخاری اور صحیح مسلم سے نقل کی گئی ہے (جلد ۷ اور ۸ صفحہ ۵۲۶)



باقی رہتی ہے۔ بڑے بڑے متعدد مفسرین اس مسئلے کی طرف متوجہ رہے ہیں اور اس پر تاکید بھی کرتے رہے ہیں کیونکہ توفی (مکمل طور پر لے لینا) کے ساتھ فنا اور نابودی کا کوئی ربط دکھائی نہیں دیتا۔

یہ نکتہ پیش نظر رہے کہ یہ آیت قیامت کا انکار کرنے والوں کے جواب میں ہے۔ گذشتہ آیت میں انہی کی زبانی نقل کیا گیا ہے کہ انہوں نے کہا جب ہم مرجائیں گے اور زمین میں گم ہو جائیں گے تو کیا پھر ہم دوبارہ خلق کئے جائیں گے؟

### وَقَالُوا إِذَا ضَلَلْنَا فِي الْأَرْضِ أَأَنَّا لَفِي خَلْقٍ جَدِيدٍ ﴿١٠﴾

آیت مجیدہ ان کے جواب میں گویا ہے: آپ کا وجود فقط آپ کا جسم نہیں ہے جو موت کے ساتھ ہی مکمل طور پر آپ گم ہو جائیں گے بلکہ گوہر حقیقی تو روح ہے جو خدا کے فرشتے قبض کر لیتے ہیں اور روز قیامت آپ خدا ہی کی طرف لوٹ کر جائیں گے (اور روح کے ساتھ ساتھ آپ کا جسم بھی محشور ہوگا)، جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں کہ یہ عبارت قرآن کی متعدد آیات میں دہرائی گئی ہے اور اس پر تاکید بھی کی گئی ہے۔

آیات مجیدہ یہ پیغام دے رہی ہیں کہ موت کو مادہ پرست دنیا داروں کی نظر سے نہ دیکھو کیونکہ وہ تو اسے انسان کی نابودی اور زندگی کا خاتمہ سمجھتے ہیں۔ ان کی تو پکار ہے ”ان ہی الاحیاء تنال دنیا نموت ونحیا“ جب کہ موت تو حیاتِ ادنیٰ اور پست ترین زندگی سے حیاتِ اعلیٰ اور بہترین زندگی کی طرف منتقل ہونے کے معنی میں ہے اور وہ بھی ان خدائی فرشتوں کے ذریعے کہ جو اس منتقلی کا وسیلہ بنتے ہیں۔

بعض مقامات پر اس توفی (لینا) کو خدا کی طرف منسوب کیا گیا ہے: ”اللہ یتوفی الانفس حین موتہا“ ”خدا موت کے وقت جانوں (ارواح) کو لے لیتا ہے۔“ (زمر ۴۲)

ایک دوسری جگہ یوں ارشاد ہوتا ہے: وَلٰكِنْ اَعْبُدِ اللّٰهَ الَّذِیْ یَتَوَفٰكُم (لیکن میں اس خدا کی پرستش کرتا ہوں جو موت کے وقت آپ کی روح قبض کرتا ہے)۔ (یونس ۱۰۴)

البتہ قرآن مجید میں ذکر ہونے والی ان تینوں عبارتوں (خدا آپ کی جانیں قبض کرتا ہے، ملک الموت روح لیتا ہے اور فرشتے روحیں قبض کرتے ہیں) میں کوئی اختلاف نہیں ہے کیونکہ سب اس کے فرمانبردار ہیں۔ لہذا حقیقی فاعل اسی کی ذاتِ اقدس ہے۔ اسی طرح روحیں قبض کرنے والے فرشتوں کا ایک سردار ہے جسے ملک الموت کہا جاتا ہے۔ ارواح قبض کرنے والے باقی فرشتوں کو وہی مامور کرتا ہے۔

پانچویں اور آخری آیت میں یہی مطلب کچھ اضافے کے ساتھ دکھائی دیتا ہے۔ اس میں انسانی نیند کا موت کے ساتھ موازنہ کیا گیا ہے اور توفی کا کلمہ ہر دو جگہ استعمال کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: خدا موت کے وقت جانیں (ارواح) قبض کر لیتا ہے اور وہ جانیں جو ابھی نہیں مریں انہیں بھی حالت نیند میں لے لیتا ہے۔

### اللہ یتوفی الانفس حین موتہا والتی لم تمت فی منامہا

پھر جن کی موت کا حکم صادر ہو چکا ہو نہیں روک لیا جاتا ہے اور باقیوں کو (جن کی موت کا حکم ابھی صادر نہیں ہوا) ایک معین مدت تک



کے لیے واپس بھیج دیا جاتا ہے۔

### (فیمسک التی قضی علیہا الموت ویرسلک الاخری الی اجل مسمی)

جو لوگ غور و فکر کرتے ہیں ان کے لیے اس مسئلہ میں واضح آیات اور روشن نشانیاں ہیں۔

### (ان فی ذلک لآیت لقوم یتفکرون)

”انفس“ نفس کی جمع اور جان کے معنی میں ہے اور یہاں جان سے مراد وہی انسانی روح ہے متذکرہ بالا آیت سے پتہ چلتا ہے کہ دونوں حالتوں میں انسان کی روح لے لی جاتی ہے یعنی موت کے وقت اور حالت نیند میں۔ البتہ اس میں فرق یہ ہے کہ نیند کی حالت میں مکمل توفی نہیں ہے، روح دوبارہ بدن میں لوٹا دی جاتی ہے لیکن موت کی صورت میں واپسی کا کوئی امکان نہیں۔ (بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو سوئے سوئے مرجاتے ہیں اور پھر کبھی بیدار نہیں ہوتے۔ ان کے بارے میں ہم پہلے والی آیت میں اشارہ کر چکے ہیں)۔ بعض مفسرین کا قول ہے کہ ”روح کی تین حالتیں ہیں۔ کبھی یہ ظاہر و باطن دونوں پر محیط ہے، کبھی فقط ظاہر پر حکم فرما ہے اور گاہ بگاہ ظاہر و باطن دونوں سے اپنا بور یا بستر گول کر جاتی ہے۔

پہلی حالت بیداری کی ہے۔ دوسری نیند کی حالت ہے اور تیسری حالت موت ہے۔<sup>[۱]</sup> مزید وضاحت کے لیے اس حقیقت پر توجہ رہے کہ انسانی زندگی تین طرح کی ہے۔ ”نباتاتی زندگی“ جس کی بنیاد پر بدن کے خلیے تغذیے، رشد، نمو اور تولید مثل کرتے ہیں (جیسے تمام نباتات)۔

”حیوانی زندگی“ جس میں حس اور حرکت بھی شامل ہے خواہ حرکات غیر اختیاری ہوں، جیسے نبض چلنا یا دل دھڑکنا، یا اختیاری، جیسے کسی جاندار کا چلنا اور ہاتھ پاؤں ہلانا۔

”انسانی زندگی“ انسان کے اعلیٰ ترین ادراکات، فیصلے، ارادے، مختلف مسائل کے تجزیہ و تحلیل، ایجاد، دریافت، احساس ذمہ داری اور مسئولیت سے مربوط ہے۔

یہ بات قطعی ہے کہ حالت نیند میں پہلی اور دوسری قسم انسان سے نہیں لی جاتی۔ فقط تیسری قسم ہے جو انسان کھو بیٹھتا ہے۔ ضمناً اس آیت سے بخوبی اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ نیند موت ہی کی ایک ناقص شکل ہے، یا دوسرے الفاظ میں یوں کہ موت نیند کا ایک مکمل نمونہ ہے۔ مزید آیت مجیدہ سے پتہ چلتا ہے کہ انسان جسم و روح سے مرکب ہے۔ جسم عالم مادہ سے ہے اور روح ایک ایسا گوہر ہے جو اس عنصری مادی جہان سے ماوراء ہے۔

اسی طرح خوابوں کے وہ معنے اور تازہ بہ تازہ حقائق جو انسان اس حالت میں درک کرتا ہے کسی حد تک حل ہو جاتے ہیں۔ چونکہ نیند کے وقت انسانی روح جدا ہو جاتی ہے اور آزادانہ فعالیت کر سکتی ہے اسی لیے نئے نئے عوامل سے آگاہ ہوتی ہے۔

امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے:

**ان الروح يخرج عند النوم، ويبقى شعاعه في الجسد فلذلك يرى الرؤيا،**

**فاذا انتبه عاد روحه الى جسده بأسرع من لحظة**

”روح نیند کے وقت بدن سے خارج ہو جاتی ہے اور اس کی شعاع بدن میں باقی رہتی ہے۔ اسی لیے انسان

خواب دیکھتا ہے اور جب بیدار ہوتا ہے تو روح پلک جھپکنے میں واپس لوٹ آتی ہے۔“ [۱]

بہر حال ان آیات کی بقائے روح کے علاوہ کوئی اور تفسیر نہیں بنتی کیونکہ موت کے وقت کسی چیز کا اخذ کرنا اور وہ بھی مکمل طور پر اس کا کوئی جسمانی مصداق نہیں بنتا۔ نباتاتی اور حیوانی زندگی تو موت کے ساتھ ہی ختم ہو جاتی ہے لہذا یہ توفی کا مصداق نہیں بن سکتی۔ بنا برائیں ہم نتیجہ نکالتے ہیں کہ توفی (مکمل طور پر لے لینا) سے مراد روح انسانی ہی ہے جو انسانی زندگی کا حقیقی عامل ہے۔

## چند وضاحتیں

### ۱۔ بقائے روح

بقائے روح کے مسئلے کا روح کی اصالت اور ثبات کے مسئلے کے ساتھ نزدیکی رابطہ ہے کیونکہ اگر روح مستقل ہو تو ہی موت کے بعد باقی رہ سکتی ہے لیکن اگر مادے اور اس کے خواص کے تابع ہو تو اس صورت میں مادی جسم کے نابود ہونے کے ساتھ ساتھ روح بھی نابود ہو جائے گی۔

لہذا ہر چیز سے پہلے ہمیں اس اصل کو دیکھنا ہے کہ آیا انسانی روح ایک مستقل گوہر ہے یا پھر جسم کے فزیکل اور کیمیکل خواص اور دماغی خلیوں سے متعلق کوئی چیز ہے جو دماغ کے ختم ہونے کے ساتھ ساتھ خود بھی نابود ہو جاتی ہے، ہو بہو نباتاتی اور حیوانی روح کی طرح کہ جو نمو، تغذیہ، تولید مثل، حس اور حرکت کا مجموعہ ہے اور یہ بات واضح ہے کہ جسم کے خاتمے کے ساتھ ہی تغذیہ باقی رہتا ہے نہ نمود تولید مثل اور نہ ہی حس و حرکت (دقت نظر فرمائیں)

لیکن ہمارے پاس ایسے متعدد دلائل ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ انسانی روح نباتاتی اور حیوانی روح کے ساتھ کسی قسم کی شباهت نہیں رکھتی بلکہ یہ ایک مستقل حقیقت ہے جو کبھی اس مادی بدن کے ساتھ تعلق پیدا کر لیتی ہے اور کبھی اس سے جدا ہو جاتی ہے۔

سب سے پہلے ہم روح کی اصالت اور استقلال کو ثابت کرنے کے لیے الہیات کے فلاسفہ کے عقلی دلائل بیان کریں گے۔ اس کے بعد منکرین یعنی مادیوں کے دلائل بیان کر کے ان پر ایک تنقیدی اور تحقیقی نگاہ ڈالیں گے۔

جیسا کہ پہلے بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ فقط بقائے روح کو ثابت کرنے سے معاد کی بحث میں ہمارا پورا مقصد بیان نہیں ہوتا (کیونکہ قیامت کا ایک بڑا حصہ جسمانی پہلو کا حامل ہے) لیکن پھر بھی ہمارا کم از کم آدھا راستہ ہموار ہو جاتا ہے اور منکرین کی وجاہت ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔

## ۲۔ کیا روح مستقل ہے؟

جہاں تک انسانی علم و دانش کی تاریخ کی رسائی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ روح، اس کا ڈھانچہ اور اس کی خصوصیات ہمیشہ دانشوروں کی توجہ کا مرکز رہی ہیں اور ہر دانشور نے اپنی استعداد کے مطابق روح کے اسرار آ میز محیط میں گامزن رہنے کی کوشش کی ہے۔ بالکل اسی وجہ سے علماء اور دانشمندیوں کی طرف سے روح کے بارے میں پیش ہونے والے نظریات بھی متعدد اور کئی انواع پر مشتمل ہیں۔

ممکن ہے ہمارا آج کا علم و دانش حتیٰ کہ آئندہ آنے والی نسلوں کا علم و دانش اور سانس بھی روح کے تمام رازوں کو کشف کرنے کے لیے کافی نہ ہو اگرچہ دنیا کی ہر چیز کی نسبت ہماری روح ہمارے زیادہ نزدیک ہے۔ لیکن چونکہ ہم مادی عالم سے زیادہ مانوس ہیں اور روح کا گوہر اس سے بالکل مختلف ہے اس لیے ہمیں اس بات سے کوئی زیادہ تعجب نہیں کرنا چاہیے اگر ہم ماورائے مادہ مخلوق اور اس عجیب ترین خلقت کے اسرار و رموز اور اس کی گہرائیوں کو نہ سمجھ پائیں۔

بہر حال یہ مطلب عقلی طور پر روح پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالنے میں رکاوٹ نہیں بن سکتا اور نہ ہی روح پر حاکم کلی اصول اور نظاموں کو سمجھنے میں مانع ہے۔

وہ اہم ترین اصل جس کا یہاں جاننا ضروری ہے روح کے استقلال اور اصالت کا مسئلہ ہے ان مادی مکاتب کے مقابلے میں جو روح کو مادی جانتے ہیں اور اسے مادے کی خصوصیات اور عصبی خلیوں کے علاوہ کچھ نہیں سمجھتے۔

یہاں ہم زیادہ تر اسی بحث کو بیان کریں گے کیونکہ بقائے روح کی بحث اور تجربہ کامل یا تجربہ برزخی کا مسئلہ بھی اسی پر منحصر ہے۔ لیکن اس بحث کو شروع کرنے سے پہلے ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ اس نکتے کا ذکر کر دیا جائے جیسا کہ بعض کا خیال ہے روح اور انسانی بدن کا تعلق ایک قسم کا حلول ہے (البتہ ایسا نہیں جیسے ہوا مٹک میں داخل ہو جاتی ہے) بلکہ ایک طرح کا ایسا رابطہ اور پیوند ہے جس کی بنیاد ہی اس بات پر ہے کہ روح بدن پر حاکم ہے اور اس پر مکمل تصرف اور اختیار رکھتی ہے۔ اسی مطلب کو بعض نے لفظ اور معنی کے تعلق سے تشبیہ دی ہے۔ البتہ یہ مسئلہ استقلال روح کی بحث میں مزید روشن ہو جائے گا۔

اب ہم اصل مطلب کی طرف لوٹتے ہیں۔

اس بات میں تو کوئی شک نہیں کہ انسان اور بے روح پتھر و لکڑی میں بہت فرق ہے۔ ہم اس بات کو اچھی طرح محسوس کرتے ہیں کہ بے جان موجودات حتیٰ کہ نباتات کے ساتھ بھی ہمارا بہت فرق ہے۔ ہم سمجھ بوجھ رکھتے ہیں، سوچ بچار کرتے ہیں، فیصلے کرتے ہیں، قوت ارادہ

سے مالا مال ہیں۔ عشق و محبت کی پیٹنگیں بڑھاتے ہیں، انظہار نفرت بھی کرتے ہیں اور.....

لیکن نباتات اور جمادات میں ان احساسات میں سے کوئی چیز بھی نہیں پائی جاتی۔ لہذا ہمارے اور ان کے درمیان ایک اصولی تفاوت موجود ہے اور یہ وہی چیز ہے جسے روح انسانی کہا جاتا ہے۔

روح اور نفس کے اصل وجود کا کوئی بھی انکار نہیں کرتا حتیٰ کہ مادیت والے بھی اس کے منکر نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ سب روح شناسی (علم نفسیات) [۱] اور نفسیاتی تجزیات [۲] کو ایک مفید علم سمجھتے ہیں۔ اگرچہ یہ دونوں علم مختلف حوالوں سے تقریباً اپنے ابتدائی مراحل طے کر رہے ہیں لیکن اس کے باوجود ان کا ایسے علوم میں شمار ہوتا ہے جن پر دنیا کی بڑی بڑی یونیورسٹیوں میں اساتذہ اور محققین کام کر رہے ہیں۔ آئندہ بحث میں آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ روح اور نفس ایک دوسرے سے جدا حقیقتیں نہیں ہیں بلکہ ایک ہی واقعیت کے مختلف مراحل ہیں۔

جب جسم کے ساتھ روح کے رابطے کی بات ہوئی ہے اور ان کے ایک دوسرے پر اثرات مرتب کرنے کا ذکر آتا ہے تو اس کا نام نفس رکھا جاتا ہے اور جب جسم سے قطع نظر فقط روحانی مظاہر کی بات ہو تو یہاں روح کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔

مختصر یہ کہ ہمارے اندر موجود روح اور نفس نام کی حقیقت سے کوئی بھی انکاری نہیں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ میٹر یلسٹ [۳] اور میٹافزیک [۴] فلاسفہ کے درمیان پائی جانے والی یہ لمبی چوڑی جنگ کس مسئلہ پر ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ الہی اور روحانی دانشمندوں اور میٹافزیک فلاسفہ معتقد ہیں کہ انسانی جسم کو تشکیل دینے والے مواد کے علاوہ بھی ایک اور حقیقت انسان کے اندر پوشیدہ ہے جس کی جنس تو مادہ نہیں ہے لیکن انسانی بدن براہ راست اس کے زیر اثر رہتا ہے۔

دوسرے الفاظ میں یوں کہ روح ماورائے طبیعت ایک ایسی حقیقت ہے جس کی فعالیت اور ساخت عالم مادہ کی بناوٹ اور سرگرمیوں سے مختلف ہے۔ یہ درست ہے کہ ہمیشہ عالم مادہ کے ساتھ اس کا تعلق رہتا ہے لیکن روح نہ تو مادہ ہے اور نہ ہی مادی خواص میں سے ہے!

الہی فلاسفہ کے مد مقابل مادی فلاسفہ صف آراء ہیں جو کہتے ہیں: مادے کے علاوہ روح نام کی کسی ایسی مستقل چیز کا وجود نہیں جو مادے سے بے نیاز ہو۔ جو کچھ بھی ہے فقط یہی جسمانی مادہ ہے یا پھر اس کے کیمیائی اور طبیعی [۵] آثار ہیں۔

ہم مغز اور اعصاب نامی ایک ایسے نظام کے حامل ہیں جو ہمارے بہت سارے حیاتی امور انجام دیتا ہے، بدن کے دیگر نظاموں کی طرح مادہ سے بہرہ ور ہے اور مادی قوانین ہی کے تحت اپنی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہے۔

[۱] PSYCHOLOGY

[۲] PSYCHO-ANALYSIS

[۳] ACIDITY, MATERIALIST (مادہ پرست)

[۴] METAPHYSICS مابعد الطبیعیات۔ (علم روح انسانی)

[۵] CHEMICAL &amp; PHYSICAL

مثال کے طور پر ہماری زبان کے نیچے خاص قسم کے غدود پائے جاتے ہیں جنہیں لعاب دہن کے غدود کہا جاتا ہے۔ یہ غدود طبیعیات کے امور بھی انجام دیتے ہیں اور کیمیائی فعالیت بھی کرتے ہیں۔ جب منہ میں غذا ڈالی جاتی ہے تو یہ خود بخود کام کرنا شروع کر دیتے ہیں یعنی مکمل طور پر خود کار [۱] ہوتے ہیں۔

اس قدر زیادہ اندازہ گیر ہیں کہ غذا چبانے اور نرم کرنے کے لیے جتنے پانی کی ضرورت ہو فقط اتنی ہی مقدار میں لعاب دہن کا چھڑکاؤ کرتے ہیں۔ آبدار، خشک اور نمدار غذائیں اپنی ضرورت کے مطابق لعاب دہن سے اپنا حصہ وصول کرتی ہیں۔ تیزابی [۲] مواد خصوصاً جب بہت گاڑھا ہو تو ان غدود کی فعالیت میں اضافہ ہو جاتا ہے تاکہ پانی کی زیادہ مقدار حاصل کر کے اس مواد کو بطور کافی پتلا کر دیا جائے اس لیے کہ معدہ کے کناروں کو نقصان نہ پہنچنے پائے۔

جب غذا نگلی جائے تو ان غدود کی فعالیت ختم ہو جاتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ ان جوشاں چشموں پر ایک عجیب نظام حکم فرما ہے۔ اگر ایک لمحے کے لیے بھی اس نظام کا تعادل اور حساب درہم برہم ہو جائے تو پھر یہ مسلسل منہ سے رال ٹپکتی رہے گی یا زبان اور گلہ اتنا خشک ہو جائے گا کہ لقمہ بھی حلق میں پھنس کر رہ جائے۔

یہ لعاب دہن کا طبیعیاتی کام ہے۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ لعاب دہن کا اہم ترین کام کیمیائی ہے۔ مختلف قسم کے مواد غذا کے ساتھ مل جاتے ہیں اور اس طرح معدے کی زحمت کم ہو جاتی ہے۔

مادہ پرست کہتے ہیں: ہمارے اعصاب و مغز کا سلسلہ لعاب دہن کے غدود کی مانند ہے اور اسی کی طرح طبیعی اور کیمیائی فعالیت انجام دیتا ہے (اسے مجموعی طور پر (PHYSICO-CHEMICAL) کہا جاتا ہے)۔ یہی (PHYSICO-CHEMICAL) طبعی و کیمیائی فعالیت ہے جسے مظاہر روح یا روح کہا جاتا ہے۔

ان کا کہنا ہے کہ جب ہم سوچ رہے ہوتے ہیں تو ہمارے دماغ سے ایک خاص قسم کی برقی امواج پیدا ہوتی ہیں جنہیں مخصوص آلات کے ذریعہ کاغذ پر ثبت کر لیا جاتا ہے۔ نفسیاتی امراض کے ہسپتالوں میں خصوصی طور پر ان امواج کا مطالعہ کیا جاتا ہے اور انہی امواج کے ذریعے نفسیاتی مریضوں کی بیماری کو پہچانا جاتا ہے جس کے بعد مناسب علاج معالجہ کی راہ تلاش کی جاتی ہے۔ یہ ہمارے مغز کی طبعی (PHYSICAL) فعالیت ہے۔

علاوہ ازیں دماغی خلیے سوچ بچار کے وقت یا دیگر نفسیاتی سرگرمیوں کے دوران کیمیائی عمل و رد عمل بھی انجام دیتے ہیں۔

لہذا روح اور مظاہر روح ہمارے دماغی و اعصابی خلیوں کے طبعی خواص اور کیمیائی عمل و رد عمل کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔

وہ اس تمام بحث سے یوں نتیجہ نکالتے ہیں:

۱۔ جیسے بدن سے پہلے لعاب دہن کے غدود کی فعالیت اور اس کے اثرات نہ تھے اور بدن کے خاتمے کے ساتھ یہ بھی ختم ہو جاتے ہیں بالکل اسی طرح ہماری روح کی فعالیت اعصابی نظام اور مغز کے وجود میں آنے سے شروع ہوتی ہے اور ان کی تباہی کے ساتھ یہ بھی تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔

۲۔ چونکہ روح جسم کے خواص میں سے ہے اس لیے مادی ہے اور ماورائے طبیعت کے پہلو کی حامل نہیں۔

۳۔ روح ان تمام قوانین پر مشتمل ہے جو جسم پر حکمرانی کرتے ہیں۔

۴۔ روح جسم کے بغیر کوئی مستقل وجود نہیں رکھتی اور نہ ہی رکھ سکتی ہے۔

### ۳۔ روح کے عدم استقلال پر مادہ پرستوں کے دلائل

مادہ پرستوں کا دعویٰ ہے کہ روح، فکر اور باقی تمام مظاہر روح یہ سب کے سب مادی ہیں، یعنی دماغی اور اعصابی خلیوں کے طبعی اور کیمیائی خواص ہیں۔ اپنے اس دعوے کو ثابت کرنے کے لیے انہوں نے چند دلائل بیان کیے ہیں جن کی طرف ہم یہاں اشارہ کر رہے ہیں۔  
۱۔ اس بات کو آسانی ثابت کیا جاسکتا ہے کہ دماغ یا اعصابی سلسلے میں خلل واقع ہونے سے آثار روح کی بھی چھٹی ہو جاتی ہے۔<sup>[۱]</sup>  
مثلاً اس بات کا تجربہ کیا گیا ہے کہ اگر کبوتر کے دماغ میں نقص ڈال دیا جائے تو وہ مرتا نہیں ہے لیکن اپنے حافظے کی بہت سی معلومات کھو بیٹھتا ہے۔ اگر اس کے منہ میں دانہ ڈالا جائے تو کھا لیتا ہے اور ہضم بھی کر لیتا ہے اور اگر فقط اس کے سامنے دانے ڈال دیئے جائیں تو بھوک سے مر جائے گا لیکن کھائے گا نہیں۔

اسی طرح انسانی دماغ پر لگنیوالی چوٹوں یا بعض بیماریوں کی وجہ سے مغز کے بعض حصے کام کرنا چھوڑ دیتے ہیں اور انسان اپنا حافظہ کھو دیتا ہے۔

اخبار میں تھا کہ ایک پڑھا لکھا نوجوان ایکسڈنٹ کی وجہ سے اپنا حافظہ کھو بیٹھا اور زندگی کے تمام سابقہ واقعات بھول گیا یہاں تک کہ اپنی ماں بہن کو بھی نہ پہچانتا تھا۔ جب اسے اس کے گھر لے جایا گیا جہاں وہ پلا بڑھا تھا تو اس کے لیے یہ گھر بالکل نا آشنا تھا!  
اس واقعہ سے اور اسی طرح کے دیگر واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ دماغی خلیوں کی فعالیت اور مظاہر روح کے درمیان ایک نزدیکی رابطہ موجود ہے۔

۲۔ سوچ بچار کے وقت مغز میں مادی تبدیلیاں زیادہ رونما ہوتی ہیں۔ مغز غذا بھی زیادہ حاصل کرتا ہے اور فاضل مواد بھی زیادہ چھوڑتا ہے۔ حالت نیند میں جب مغز فکری کام نہیں کرتا تو غذا بھی کمتر استعمال کرتا ہے اور یہی فکری آثار کے مادی ہونے پر دلیل ہے۔<sup>[۲]</sup>

[۱] سائیکا لوجی، ڈاکٹر ارانی ص ۲۳

[۲] بشر از نظر مادی۔ وکٹر ارانی ص ۲

۳۔ تجربات ثابت کرتے ہیں کہ مفکرین کے دماغ کا وزن عام طور پر ایک متوسط حد سے زیادہ ہی ہوتا ہے (مردوں کے دماغ کا متوسط وزن تقریباً ۱۴۰۰ گرام اور خواتین کے دماغ کا وزن اس سے کچھ کم ہوتا ہے) یہ روح کے مادی ہونے پر ایک اور دلیل ہے۔

۴۔ اگر فکری قوت اور مظاہر روح اس بات پر دلیل بنیں کہ روح ایک مستقل وجود کی حامل ہے تو پھر حیوانات میں بھی یہی بات قبول کرنا ہوگی، کیونکہ وہ بھی کسی حد تک ان ادراکات کے مالک ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ ان کا کہنا ہے ہم احساس کرتے ہیں کہ ہماری روح کسی مستقل وجود کی حامل نہیں ہے اور انسان شناسی سے مربوط علوم کی پیش رفت سے بھی اس واقعیت کی تائید ہوتی ہے۔

ان تمام دلائل سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ انسانی اور حیوانی فزیالوجی کی وسعت اور پیش رفت سے یہ حقیقت روز بروز واضح ہوتی جا رہی ہے کہ دماغی خلیوں اور مظاہر روح کے درمیان بہت نزدیکی رابطہ ہے۔

## دلیل کے کمزور پہلو

مادہ پرستوں نے جو ایک بڑی غلطی کی ہے وہ یہ کہ ”آلہ“ اور ”فاعل“ میں تمیز نہیں کر پاتے۔

یہ جاننے کے لیے کہ وہ آلہ اور فاعل میں کیونکر تمیز نہیں کر پائے ہم ایک مثال پیش کرتے ہیں۔ (دقت نظر فرمائیے گا)

گلیلیو کے بعد آسمانوں کے مطالعات میں ایک بڑا انقلاب رونما ہوا ہے۔ اٹلی کے گلیلیو نے ایک عینک ساز کی مدد سے چھوٹی سی دور بین بنائی اور اس کام پر بڑا خوش تھا۔ راتوں کو آسمان پر موجود ستاروں کے مطالعے میں مصروف رہتا۔ ایسے ایسے حیرت انگیز مناظر اس کی آنکھوں کے سامنے آئے کہ پہلے کبھی کسی انسان نہ نہ دیکھے تھے۔ گلیلیو سمجھ گیا کہ اس نے اہم ترین چیزیں دریافت کی ہیں۔ اس دن کے بعد سے عالم بالا کے اسرار کشف کرنے کی چابی انسان کے ہاتھوں لگی۔

اس دن تک انسان ایک ایسے پرندے کی مانند تھا جسے اپنے ارد گرد چند شاخوں کے علاوہ کچھ سمجھائی نہ دیتا تھا۔ لیکن جونہی دور بین کو آنکھوں پر سجایا تو کائنات کے اس بزرگ ترین جنگل میں اپنے ارد گرد بے شمار دختوں کا بھی مشاہدہ کرنے لگا۔

یہ مسئلہ ترقی کے زینے طے کرتا گیا یہاں تک کہ ایسی بڑی بڑی فلکیاتی دور بینیں وجود میں آئیں جن کے عدسہ کا قطر کئی میٹر پر مشتمل تھا۔ ان دور بینوں کو صاف ستھری فضا میں بلند پہاڑوں پر نصب کیا گیا۔ یہ آلات دور بین بعض اوقات چند منزلہ عمارت کے برابر ہوتے تھے۔ ان کی مدد سے انسان نے عالم بالا کے وہ جہان دیکھے جس کے ہزاروں حصے کو بھی ان معمولی آنکھوں نے نہ دیکھا تھا۔

اب آپ اندازہ کریں۔ اگر کسی دن ٹیکنالوجی کی ترقی کے ساتھ ساتھ ایسی دور بین بننا شروع ہو جائے جس کے عدسے کا قطر سو میٹر ہو اور اس کی مشینری ایک شہر جتنی بڑی ہو تو پھر ہمارے لیے کتنی دنیاں دریافت ہو جائیں گی!!!

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ دور بینیں ہم سے چھن جائیں تو یقیناً آسمانوں سے متعلق ہماری بعض معلومات اور ہمارے بعض مشاہدات میں فرق تو پڑے گا لیکن کیا دیکھنے والے حقیقتاً ہم ہیں یا دور بین ہے؟



کیا دوربین اور ٹیلیسکوپ ہمارا آلہ کار ہے اور ہم اس کے وسیلے سے دیکھتے ہیں یا خود فاعل ہے اور حقیقت میں دیکھنے والی بھی دوربین ہی ہے؟

دماغ کے لیے مغزی خلیوں کے بغیر سوچ بچار کرنا ممکن نہیں۔ اس بات سے تو کسی کو انکار نہیں ہے۔ لیکن کیا دماغ روح کا آلہ کار ہے یا خود روح ہے؟!

مختصر یہ کہ مادہ پرستوں نے جتنی بھی دلیلیں پیش کی ہیں ان سے فقط یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہمارے ادراکات اور دماغی خلیوں کے درمیان ایک رابطہ موجود ہے۔ لیکن ان ادلہ میں سے کوئی ایک بھی یہ ثابت نہیں کرتی کہ دماغ ادراکات کو انجام دیتا ہے اور آلہ کار نہیں ہے۔ (وقت نظر فرمائیں)۔

اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اگر مردہ جسم کوئی بات نہیں سمجھتا تو روح کا بدن سے رابطہ منقطع ہو جانے کی وجہ سے ہے اس کا مطلب یہ نہیں کہ روح فنا ہو گئی ہے۔ یہ اسی طرح ہے جیسے کسی بحری جہاز کا وائریلیس سسٹم خراب ہو جائے۔ اب بحری جہاز اس کا عملہ اور کپتان تو موجود ہیں لیکن ساحل پر موجود لوگ ان سے رابطہ برقرار نہیں کر سکتے کیونکہ رابطہ کرنے والا وسیلہ ختم ہو چکا ہے۔

## ۴۔ استقلال روح کے طرفداروں کی ادلہ

### الف: (وجود سے باہر کی دنیا سے آگاہی) ”واقعیت نمائی کی خاصیت“

مادہ پرستوں سے جو سب سے پہلا سوال کیا جاسکتا ہے وہ یہ ہے کہ اگر افکار اور مظاہر روح وہی دماغ کے طبیعی اور کیمیائی خواص ہیں تو پھر دماغ، معدے، جگر اور پھیپھڑوں کے کاموں میں کوئی اصولی تفاوت تو نہ رہا کیونکہ معدے کا کام مثلاً ایک قسم کے طبیعی و کیمیائی اعمال انجام دینا ہے۔ معدہ اپنی مخصوص حرکات کے ساتھ غذا کی تیزابیت خارج کرتا ہے، اسے قابل ہضم بناتا ہے اور بدن میں جذب ہونے کے قابل بناتا ہے۔ اسی طرح تھوک بنانے والے غدود (SALIVARY GLANDS) کے بارے میں بھی جیسا کہ کہا جاتا ہے یہ بھی طبیعی اور کیمیائی کام کرتے ہیں۔ جب کہ ہم دیکھتے ہیں کہ روح کا کام ان سب سے مختلف ہے۔

چونکہ دماغ ایک استثنائی حالت رکھتا ہے اس لیے ماسوائے دماغ کے بدن کے باقی تمام نظاموں کا کام تقریباً ایک دوسرے سے ملتا جلتا ہے۔ ان سب کا کام داخلی پہلوؤں پر مشتمل ہے جب کہ مظاہر روح کا تعلق خارجی پہلو سے ہے۔ یعنی یہ مظاہر ہمیں اپنے وجود سے باہر کی دنیا سے آگاہ کرتے ہیں۔

اس مطلب کی وضاحت کے لیے ہم چند نکات پیش کرتے ہیں اور قارئین کی توجہ کے طالب ہیں:

سب سے پہلے یہ کہ کیا ہمارے وجود سے باہر بھی کوئی جہان موجود ہے یا نہیں؟ یقیناً ایسا جہان موجود ہے۔ ”خیال پرست فلاسفہ“<sup>[۱]</sup>



کہتے ہیں: خارج میں کوئی جہان موجود نہیں ہے۔ ان کا کہنا ہے: ”جو کچھ بھی ہے وہ ہم ہیں اور ہمارے تصورات۔ باہر کی دنیا ایسے ہی ہے جیسے خواب میں دیکھے جانے والے مناظر ہوں۔ لہذا یہ تصورات سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں۔“ یہ لوگ بھی سخت اشتباہات کے مرتکب ہوئے ہیں۔ اس بات کی دلیل یہ ہے کہ یہ لوگ خود عمل کے وقت ”واقع پرست“ بن جاتے ہیں۔ جو کچھ کتابوں کی دنیا میں پڑھا ہوتا ہے یا اس پر غور و فکر کیا ہوتا ہے عملی زندگی میں قدم رکھتے ہی سب کچھ بھول جاتے ہیں اور پھر ہر چیز کو واقعی اور حقیقی سمجھتے ہیں۔

دوسرا یہ کہ کیا ہم باہر کی دنیا سے آگاہ بھی ہیں یا نہیں؟

یقیناً اس سوال کا جواب بھی ہاں میں ہے کیونکہ ہم اپنے باہر کی دنیا سے بہت زیادہ آگاہی رکھتے ہیں اور وہ تمام موجودات جو ہمارے ارد گرد ہیں یا دور دراز علاقوں میں پائے جاتے ہیں، ان سب کے بارے میں ہم کافی معلومات رکھتے ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا باہر کی دنیا ہمارے وجود کے اندر سما سکتی ہے؟ یقیناً ایسا نہیں ہو سکتا۔ البتہ اس کا نقشہ اور خاکہ ہمارے پاس موجود ہے۔ بنا برائیں واقعیت نمائی کی خاصیت سے استفادہ کرتے ہوئے ہم اپنے وجود سے باہر کی دنیا تک رسائی حاصل کرتے ہیں۔

اس واقعیت نمائی کے بارے میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ دماغ کے فقط طبعی اور کیمیائی خواص ہیں۔ یہ بات اپنی جگہ پر بجا ہے کہ یہ خواص ہمارے باہر کی دنیا کے تاثرات کی پیداوار ہیں یا دوسرے الفاظ میں یوں کہ یہ خواص ان تاثرات کا معلول ہیں۔ لیکن یہ بالکل اس تاثیر کی مانند ہے جو غذا کی معدے پر ہوتی ہے۔ کیا غذا کی معدے پر یہ تاثیر اور اس کا طبعی و کیمیائی عمل و رد عمل اس بات کا باعث بن سکتا ہے کہ معدہ مختلف غذاؤں کے بارے میں معلومات حاصل کر لے؟!

خارج میں موجود چیزوں کے بارے میں آگاہی حاصل کرنے کے لیے ان پر ایک قسم کا احاطہ ہونا ضروری ہے اور یہ احاطہ دماغی خلیوں کا کام نہیں ہے۔ دماغی خلیے خارجی چیزوں کا فقط اثر قبول کر سکتے ہیں اور یہ اثر پذیریری بدن کے دیگر نظاموں کی اثر پذیریری سے مختلف ہے جسے ہم سب بخوبی سمجھتے ہیں۔

اگر خارجی چیزوں کا اثر انداز ہونا اس بات کی دلیل ہو کہ ہم اپنے باہر کی دنیا سے آگاہی حاصل کر لیں تو پھر ضروری ہے کہ ہم اپنی زبان اور معدے سے بھی سمجھنا شروع کر دیں جب کہ ایسا نہیں ہوتا۔ خلاصہ یہ کہ ہمارے ادراکات کی استثنائی حالت اس بات پر دلیل ہے کہ اس میں کوئی اور حقیقت پوشیدہ ہے جس کا نظام طبعی اور کیمیائی نظاموں کے قوانین سے بالکل مختلف ہے۔ یعنی ہمیں قبول کرنا ہوگا کہ ہمارے اندر ایک اور گہر موجود ہے جسے روح کہا جاتا ہے اور یہی حقائق کے ادراک کا باعث بنتا ہے۔ (دقت نظر فرمائیں)

## ب: شخصیت کی یکتائی

ایک اور دلیل جو استقلال روح کے لیے پیش کی جاسکتی ہے وہ دوران زندگی انسانی شخصیت کی یکتائی کا مسئلہ ہے۔

اس کی وضاحت کچھ یوں ہے کہ ہم اگرچہ ہر چیز کے بارے میں شک اور تذبذب کا شکار ہوں لیکن اس بارے میں ہمیں کسی قسم کا کوئی شک نہیں کہ ”ہم وجود رکھتے ہیں۔“

”میں ہوں“ اور اپنے ہونے میں مجھے کوئی شک و شبہ نہیں۔ میرا اپنے وجود کے بارے میں علم اصطلاحی طور پر علم حضوری کہلاتا ہے نہ کہ علم حصولی۔ یعنی میں اپنے سامنے حاضر ہوں اور اپنے آپ سے جدا نہیں ہوں۔

بہر حال ہماری اپنے بارے میں پہچان اور آگاہی ہماری روشن ترین معلومات میں سے ہے۔ اس کے لیے کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔ فرانس کے مشہور فلاسفر ڈیکارٹ کی وجود پر یہ معروف دلیل کہ ”میں سوچ بچار کرتا ہوں لہذا وجود رکھتا ہوں۔“ کچھ نادرست سی دکھائی دیتی ہے چونکہ قبل اس کے کہ وہ اپنے وجود کو ثابت کرے دو دفعہ اپنے وجود کا اعتراف کر چکا ہے۔ ایک دفعہ جب کہتا ہے ”میں“ اور دوسری دفعہ جب کہتا ہے ”کرتا ہوں۔“

یہ ”میں“ زندگی کے آغاز سے لے کر اختتام تک یعنی پوری عمر ایک ہی رہتا ہے۔ آج کا ”میں“ وہی کل والا ”میں“ یا پھر بیس سال پہلے والا ”میں“ ہوتا ہے۔ ”میں بچپن سے لے کر آج تک ایک ہی شخص ہوں۔“ میں وہی شخص ہوں جو پہلے تھا اور آخری عمر تک بھی یہی رہوں گا۔ ایسا نہیں کہ کسی اور شخص کا روپ دھار لوں۔ البتہ یہ ہے کہ میں نے درس پڑھا اور تعلیم یافتہ ہو گیا۔ ترقی و کمال کا ایک زینہ طے کر لیا اور مزید بھی کرتا رہوں گا۔ لیکن اس سے میں کوئی اور نیا آدمی نہیں بن گیا۔ یہی وجہ ہے کہ تمام لوگ مجھے پوری زندگی ایک ہی شخص کے عنوان سے جانتے ہیں۔ میرا ایک نام ہے، ایک شناختی کارڈ ہے اور.....

آئیے اب اندازہ کریں اور دیکھیں کہ یہ ایک وجود جو ہماری پوری زندگی پر محیط ہے: یہ کیا ہے؟ کیا یہ ہمارے بدن کے ذرات اور خلیے ہیں یا دماغ کے خلیوں کا مجموعہ اور اس کا عمل و رد عمل ہے؟ یہ تو ہماری زندگی میں کئی مرتبہ تبدیل ہوتے ہیں۔ تقریباً سات سال میں ایک دفعہ تمام خلیے تبدیل ہو جاتے ہیں کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ ہر صبح و شام ہمارے جسم میں لاکھوں خلیے مرتے ہیں اور لاکھوں نئے ان کی جگہ لے لیتے ہیں بالکل اس عمارت کی طرح کہ جس میں سے ایک ایک کر کے اینٹیں نکالی جائیں اور نئی اینٹیں اس کی جگہ لگاتے ہیں۔ اس طرح یہ عمارت کچھ ہی عرصہ بعد مکمل طور پر تبدیل ہو چلی جائے گی اگرچہ عام لوگوں کو پتہ بھی نہ چلے۔ یا ایک بڑے تالاب کی مثال لیں جس کے ایک طرف سے آہستہ آہستہ پانی نکالتے جائیں اور دوسری طرف سے ڈالتے جائیں۔ واضح ہے کہ کچھ ہی دیر بعد تالاب کا پورا پانی بدل جائے گا اگرچہ ظاہراً دیکھنیوالے لوگوں کو اس کا پتہ نہیں چلے گا اور وہ اس کی طرف متوجہ بھی نہ ہوں گے، بلکہ وہ سمجھیں گے کہ یہ پانی پہلے والا ہی ہے۔

بطور کلی کہا جاسکتا ہے کہ ہر وہ وجود جو غذا حاصل کرتا ہے اور اسے استعمال کرتا ہے تدریجاً اس میں نو سازی کے مراحل طے ہوتے ہیں اور وہ تبدیل ہو جاتا ہے۔

بنا بریں ایک ستر سالہ آدمی کے اجزائے بدن تقریباً دس مرتبہ تبدیل ہوتے ہیں۔ اس حساب و کتاب کی بناء پر اگر انسان کو مادہ پرستوں کی طرح فقط یہی جسم اور دماغی و اعصابی نظاموں کا مجموعہ یا طبعی و کیمیائی خواص کا پیکر سمجھا جائے تو پھر اس ”میں“ کو ستر سال میں دس دفعہ تبدیل ہونا چاہیے اور ہو بہو وہ پہلے والا شخص باقی نہیں رہنا چاہیے جب کہ کوئی بھی عقل مند اس بات کو قبول نہ کرے گا۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ مادی اجزاء کے علاوہ ایک مستقل حقیقت پوری زندگی میں موجود رہتی ہے جو مادی اجزاء کی طرح تبدیل نہیں ہوتی۔ ہماری وجود کی اساس بھی اسی سے ہے اور ہماری شخصیت کی یکتائی کا عامل بھی یہی ہے۔

### ایک اشتباہ سے پرہیز

بعض خیال کرتے ہیں کہ دماغی خلیے تبدیل نہیں ہوتے۔ ان کا کہنا ہے فزیالوجی کی کتب میں لکھا ہے کہ دماغی خلیوں کی تعداد ابتدائے عمر سے لے کر آخر تک ایک جیسی ہی رہتی ہے یعنی کمتی بڑھتی نہیں۔ فقط یہ بڑے ہو جاتے ہیں لیکن تولید مثل نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر ان میں نقصان ہو جائے تو اس کی تلافی نہیں ہو سکتی۔ لہذا ہمارے بدن میں ایک مستقل اکائی موجود ہے اور یہ وہی دماغی خلیے ہیں جو ہماری شخصیت کی یکتائی کے محافظ ہیں۔

لیکن یہ بہت بڑا اشتباہ ہے کیونکہ جو لوگ یہ بات کرتے ہیں انہوں نے دو مختلف مسئلوں کو غلطی سے ایک دوسرے میں گڈ مڈ کر دیا ہے۔ آج کے علوم نے جو بات ثابت کی ہے وہ یہ ہے کہ دماغی خلیوں کی تعداد ساری زندگی ایک ہی رہتی ہے اور کمتی بڑھتی نہیں۔ یہ نہیں کہا گیا کہ ان خلیوں کو تشکیل دینے والے ذرات تبدیل نہیں ہوتے کیونکہ جیسے ہم نے کہا کہ بدن کے خلیے دائمًا غذا حاصل کرتے ہیں اور اپنے کہنے ذرات کو بھی آہستہ آہستہ کھو بیٹھتے ہیں، ہو بہو پانی کے اس تالاب کی طرح کہ جس کے ایک طرف سے پانی ڈالا جا رہا ہو اور دوسری طرف سے خارج ہو رہا ہو۔ کچھ دیر بعد اس کا سب کچھ مکمل طور پر تبدیل ہو جاتا ہے اگرچہ پانی کی مقدار اپنی جگہ قائم ہے۔ اسی طرح دماغی خلیے بھی تبدیل ہو جاتے ہیں۔<sup>[۱]</sup>

### ج: چھوٹے بڑے کا ایک دوسرے پر منطبق نہ ہونا

فرض کریں ہم ایک انتہائی خوبصورت اور دلکش سمندر کے کنارے بیٹھے ہیں۔ چند چھوٹی کشتیاں اور ایک بحری جہاز سمندر کی لہروں پر محور قص ہیں۔ ایک طرف سورج غروب ہوتے ہوئے اپنی رعنائیاں بکھیر رہا ہے تو دوسری طرف ابھرتا ہوا چاند دل موہ رہا ہے۔ حسین سمندری پرندے موجوں پر اٹھتے بیٹھتے اٹھکیلیاں کر رہے ہیں اور اسی طرح سمندر کے اس پار ایک بلند قامت پہاڑ آسمان کے ساتھ بوس و کنار میں لگن ہے۔

اب کچھ لچھوں کے لیے اپنی آنکھیں بند کریں اور جو کچھ دیکھا ہے اسے اپنے ذہن میں مجسم کرنے کی کوشش کریں: پہاڑ اپنی اسی عظمت کے ساتھ، دریا اپنی اسی پہناوری کے ساتھ، بحری جہاز اپنے اسی غول پیکر کے ساتھ ہمارے ذہن میں مجسم ہو جائیں گے یعنی یوں لگتا ہے جیسے ہماری روح میں یا ہماری فکر کے سامنے ایک غیر معمولی سکرین موجود ہو۔

[۱] فزیالوجی کی کتابوں میں اس مسئلے کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر کتاب کا نام ہے ہارمونز ص ۱۱ اور حیوانی فزیالوجی مصنف

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس اتنے بڑے منظر کی عکاسی کی جگہ کون سی ہے؟ کیا دماغ کے غیر معمولی چھوٹے خلیوں میں یہ استعداد ہے کہ وہ اتنے بڑے منظر کو اپنے اندر سمو سکیں؟ یقیناً ایسا نہیں ہو سکتا۔ لہذا ضروری ہے کہ ہمارے جسم کا کوئی ایک حصہ ایسا ہونا چاہیے جو اس جسمانی مادے سے ماوراء ہوا اور اتنا وسیع ہو کہ ان تمام مناظر کو اپنے اندر سمو لے۔

پانچ سو (۵۰۰) میٹر پر محیط عمارت کا ایک نقشہ ہمارے پاس موجود ہے۔ اب ہم اس نقشے کو چند میٹر پر مکمل کرنا چاہیں تو کیا یہ ممکن ہے؟

یقیناً اس سوال کا جواب منفی ہے کیونکہ ایک بڑا وجود اپنے بڑے پن کے ساتھ چھوٹے وجود پر منطبق نہیں ہو سکتا۔ منطبق ہونے کے لیے ضروری ہے کہ دونوں مساوی ہوں یا پھر نقشہ چھوٹا بنوا لیا جائے۔

اس صورت کے پیش نظر ہم اپنے بڑے بڑے ذہنی نقشوں کو دماغ کے چھوٹے چھوٹے خلیوں پر کیونکر اتار سکتے ہیں؟ ہم زمین کے چار کروڑ میٹر محیط کو اپنے ذہن میں ترسیم کر سکتے ہیں۔ زمین سے بارہ لاکھ گنا بڑے سورج اور اسی طرح سورج سے لاکھوں گنا بڑی کہکشاؤں کو بھی اپنی سوچوں میں مجسم کر سکتے ہیں ان نقشوں کو اگر دماغ کے ننھے منے خلیوں پر اتارنا چاہیں تو ممکن نہیں کیونکہ قانون یہ ہے کہ بڑی چیز چھوٹی چیز پر منطبق نہیں ہو سکتی۔ پس ضروری ہے کہ ہم اس جسم سے ماوراء ایک ایسے وجود کا اعتراف کریں کہ جو ان تمام بڑے بڑے نقشوں اور مناظر کو قبول کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

## سوال

ممکن ہے کہا جائے کہ ہمارے ذہنی نقشے مائیکرو فلم یا جغرافیائی نقشوں کی طرح ہیں جن کے کونے میں ایک کسری ہندسہ لکھا ہوتا ہے جیسے ۱/۱۰۰۰۰۰۰۰ یا ۱۰۰۰۰۰۰۰۰/۱ یہ ان کے چھوٹے ہونے کا سکیل ہے جو ہمیں بتاتا ہے کہ نقشے کو اسی نسبت کے ساتھ بڑا کریں تاکہ حقیقی نقشے تک پہنچ سکیں۔ اسی طرح اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ جب کسی غول پیکر بحری جہاز کی تصویر اتاری جاتی ہے تو فقط بحری جہاز کی تصویر سے اس کے بڑے ہیکل کا اندازہ نہیں ہوتا۔ اسی لیے تصویر اتارنے سے پہلے کسی آدمی کو اس کے عرشہ پر کھڑا کر دیا جاتا ہے اور پھر ان دونوں کی اکٹھی تصویر بنائی جاتی ہے تاکہ ان دونوں کے موازنہ سے بحری جہاز کی وسعتوں اور عظمتوں کا اندازہ ہو سکے۔

ہمارے ذہنی نقشے بھی انتہائی چھوٹی تصویریں ہیں جو معین سکیل (پیمانے) کے مطابق چھوٹی کی گئی ہیں اور جب انہیں اسی نسبت کے تحت بڑا کیا جائے تو حقیقی نقشہ مل جائے گا، لہذا یقیناً یہ چھوٹے نقشے اور مائیکرو فلمیں ہمارے دماغی خلیوں میں سما سکتی ہیں۔ (دقت نظر فرمائیں)

## پاسخ

یہاں ایک اہم ترین مسئلہ درپیش ہے، وہ یہ کہ مائیکرو فلم معمولاً پروجیکٹر کے ذریعے بڑی کی جاتی ہے اور پھر پردہ سکرین پر اسے منعکس کر دیا جاتا ہے یا جغرافیائی نقشوں کے کونے پر لکھا گیا عدد ہماری مدد کرتا ہے کہ نقشے کو اس عدد سے ضرب دے کر ایک بڑا حقیقی نقشہ اپنے ذہن

میں منعکس کر لیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ پردہ سکرین جس پر ہماری ذہنی مائیکروفلم منعکس ہو وہ کہاں ہے؟ کیا یہ پردہ سکرین وہی دماغی خلیے ہیں؟ قطعاً ایسا نہیں ہے اور وہ چھوٹا سا جغرافیائی نقشہ جسے ہم ایک بڑے عدد کے ساتھ ضرب دے کر ایک بڑے نقشے میں تبدیل کریں گے یقیناً اس کے لیے بھی کوئی جگہ درکار ہوگی۔ تو کیا دماغ کے یہ چھوٹے چھوٹے خلیے اس ضرورت کو پورا کر سکتے ہیں؟

مزید واضح الفاظ میں یوں بیان کریں کہ مائیکروفلم اور جغرافیائی نقشوں میں جو کچھ خارج میں موجود ہے وہی کچھ چھوٹے سائز میں فلم اور نقشوں میں سمو دیا گیا ہے۔ لیکن ہمارے ذہنی نقشے اپنے خارجی وجود کے پورے سائز کے ساتھ موجود ہوتے ہیں اور یقیناً ان کے لیے ان کے سائز کے مطابق جگہ درکار ہے جب کہ ہم جانتے ہیں کہ دماغی خلیے اس سے کہیں چھوٹے ہیں کہ ان نقشوں کو اس طرح پوری وسعت کے ساتھ منعکس کر سکیں۔

مختصر یہ کہ ہم ان ذہنی نقشوں کو اسی بڑائی کے ساتھ تصور کرتے ہیں جو خارج میں موجود ہے اور یہ اتنی بڑی تصویر چھوٹے سے خلیے میں منعکس نہیں ہو سکتی اسی لیے اسے ایک بڑی جگہ کی ضرورت ہے اور اسی سے ہم ان خلیوں سے ماوراء ایک حقیقت کے وجود کا سراغ پاتے ہیں جسے روح کہا جاتا ہے۔

## د: مظاہر روح مادی کیفیات سے ہم آہنگ نہیں

استقلال روح پر اور اس کے مادی نہ ہونے پر ایک اور دلیل یہ ہے کہ مظاہر روح کے خواص اور اس کی کیفیات مادی موجودات کے خواص اور کیفیاتوں سے بالکل کوئی شباهت نہیں رکھتے کیونکہ:

اولاً: موجودات کے لیے زمان لازمی ہے اور یہ تدریجی پہلو کے حامل ہیں۔

ثانیاً: وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ فرسودہ ہو جاتی ہیں۔

ثالثاً: انہیں متعدد اجزاء میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

لیکن ذہنی مظاہر ان خواص اور آثار کے حامل نہیں ہوتے۔ مثلاً بچپن میں جو مناظر ہمارے ذہن پر نقش ہوتے ہیں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پرانے ہوتے ہیں نہ فرسودہ، اپنی اصل شکل میں قائم رہتے ہیں۔ ممکن ہے انسانی مغز سودہ ہو جائے لیکن اس کے کہنہ و فرسودہ ہونے سے وہ خانہ فرسودہ نہیں ہوتا جس میں بیس سال پہلے ہمارے ذہن پر ایک منظر یا نقشہ ثبت ہوا تھا اور یہ ایک قسم کے ثبات کا حامل ہے جو مادے سے ماوراء جہان کی خاصیت ہے۔

ہماری روح کو نقش و نگار اور تصویر کشی کے میدان میں عجیب تخلیقی ملکہ حاصل ہے۔ بغیر کسی مقدمہ کے ایک لحظے میں ہر قسم کے نقوش ذہن میں بن جاتے ہیں جیسے آسمانی کرات، کہکشائیں، زمینی و دریائی موجودات اور پہاڑ وغیرہ یہ کسی مادی موجود کی خاصیت نہیں بلکہ یہ تو ماورائے مادہ کسی موجود کی خبر دیتی ہے۔

علاوہ ازیں ہم جانتے ہیں کہ  $2+2=4$ ، اس میں کوئی شک نہیں۔ ہم اس معادل کے طرفین کا تجزیہ تو کر سکتے ہیں یعنی دو کے عدد کا تجزیہ کر لیں یا چار کا لیکن اس برابری کا تجزیہ ہرگز نہیں کر سکتے۔ یہ نہیں کہہ سکتے کہ برابری کے دو نصف ہیں اور ہر نصف دوسرے سے مختلف ہے، بلکہ برابری ایک ایسا مفہوم ہے جو ناقابل تجزیہ ہے، یا وجود رکھتی ہے یا وجود نہیں رکھتی۔ لیکن اسے نصف بالکل نہیں کیا جاسکتا۔

ایسے ذہنی مفاہیم قابل تجزیہ نہیں ہوتے اور یہی وجہ ہے کہ یہ مادی نہیں ہوتے کیونکہ اگر مادی ہوتے تو قابل تجزیہ ہوتے۔ اسی لیے ہماری روح بھی مادی نہیں ہو سکتی کیونکہ یہ بھی ایسے ہی غیر مادی مفاہیم کا مرکز ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہ مادے سے ماوراء ہے (دقت نظر فرمائیں)

[۱]

## ۵۔ کیا روح مجرد ہے؟

کیا فقط انسانی روح مستقل ہے یعنی جسم کے نیست و نابود ہونے کے بعد روح اپنی بقاء کو جاری رکھ سکتی ہے؟ یا استقلال کے علاوہ مجردات میں سے بھی ہے یعنی زمان و مکان جیسے مادے کے عمومی خواص سے مبرا ہے؟

بعض فلاسفہ کا اصرار ہے کہ روح مجردات میں سے ہے اور کسی قسم کی مادی کیفیات اس کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتیں۔ اس مطلب کو ثابت کرنے کے لیے استقلال روح کے ضمن میں بیان ہونے والی گذشتہ ادلہ کو پیش کیا جاتا ہے۔ جب کہ بعض دوسرے فلاسفہ روح کو ایک قسم کا لطیف مادہ سمجھتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ ہے کہ اسے ”آدھا مجرد“ جانتے ہیں یعنی عنصری کثیف مادے سے مجرد۔

مثال کے طور پر ہمیں یقین ہے کہ نور ایک قسم کا جسم ہے، اب یہ خواہ شعاعوں کی صورت میں ایٹھر (ETHER) میں موجود ہو یا پھر ذرات اور فوٹان (PHOTON)، غیر مرئی شعاعوں، کی شکل میں۔ لیکن یقیناً عام اجسام سے اس کا حساب کتاب جدا ہے وہ تو انین جو عام اجسام پر حاکم ہوتے ہیں اس پر حکم فرما نہیں ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ شفاف اجسام سے عبور کر جاتا ہے۔ اس کے لیے خلاء و ملاء دونوں یکساں ہیں۔

کیا واقعی روح انسان بھی اس سے ملتی جلتی کوئی چیز ہے یا مکمل مجرد ہے۔ لطیف و کثیف ہر دو مادوں سے ماوراء ہے، چونکہ معاد سے مربوط مباحث میں روح کے تجرید یا مادہ لطیف ہونے کا زیادہ عمل دخل نہیں ہے۔ جو چیز اہم ہے وہ استقلال روح اور جسم کے نیست و نابود ہونے کے بعد اس کی بقاء ہی کا مسئلہ ہے۔ اب ہم اس بارے میں مزید بحث سے پرہیز کرتے ہوئے اسے فلسفیانہ بحث پر چھوڑتے ہیں۔ البتہ فقط اتنا کہتے ہیں کہ ایک مستقل روح اس عنصری جسم کے فنا ہونے کے بعد باقی رہ سکتی ہے اور فعال بھی۔ اب خواہ یہ مکمل طور پر مجرد ہو یا جسم لطیف کی حامل اور یہ بعد از مرگ کے جہان کی طرف ایک قدم ہے۔ (دقت نظر فرمائیں)

## معادِ جسمانی

### اشارہ

کیا حیات بعد از مرگ فقط روحانی پہلو کو حاصل ہے، یعنی انسان مرنے کے بعد ہمیشہ کے لیے اس بدن سے جدا ہو جائے گا، بدن بوسیدہ ہو کر بالکل ختم ہو جائے گا اور اس دنیا کی ابدی زندگی فقط روح سے مربوط ہوگی؟

یا حیات بعد از مرگ دونوں پہلوؤں کی حامل ہے (یعنی) مادی جسم بھی واپس لوٹے گا اور روح بھی پلٹ آئے گی اور دوبارہ ایک دوسرے کے ساتھ مل جائیں گے؟ یا فقط جسمانی پہلو کی حامل ہے یعنی صرف جسم واپس آئے گا اور روح تو اس جسم کے خواص و آثار سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں ہے؟

یا پھر قیامت روحانی اور نیم جسمانی پہلو کی حامل ہے یعنی روح اور جسم دونوں پلٹ آئیں گے اور اکٹھے ہو جائیں گے لیکن یہ مادی و عنصری جسم واپس نہیں آئے گا بلکہ ایک ایسا لطیف جسم ہوگا جو اس جسم سے برتر اور اس کا حاصل ہوگا؟

ان چار نظریات میں سے ہر ایک کے معتقدین موجود ہیں۔ لیکن قرآن مجید سے واضح طور پر جو معلوم ہوتا ہے اور سینکڑوں آیات اس پر دلالت کرتی ہیں وہ یہ کہ معاد روحانی اور جسمانی ہے (اسی مادی جسم کے ساتھ)۔ چونکہ روح کی بازگشت تو دانشمندیوں اور فلاسفہ کے درمیان قطعی ہے اسی لیے معادِ جسمانی کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے وگرنہ مراد وہی معادِ جسمانی و روحانی ہی ہے۔

آئیے قرآن مجید کی طرف رجوع کرتے ہیں اور معادِ جسمانی پر صراحت سے دلالت کرنے والی آیات پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔ چونکہ اس بارے میں آیات بہت زیادہ ہیں لہذا ہم نے نو گروہ میں ان کی دستہ بندی کی ہے اور ہر گروہ میں سے چند نمونے قارئین محترم کے پیش خدمت ہیں:

### گروہ اول

اس گروہ میں وہ آیات بیان کی گئی ہیں جن میں منکرین معاد کے ان سوالات کا جواب دیا گیا ہے جو وہ ہمیشہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کیا کرتے تھے کہ جب ہم خاک ہو جائیں گے یا عظام رمیم (یعنی بوسیدہ ہڈیوں) کی صورت میں تبدیل ہو جائیں گے تو پھر کیسے نئی زندگی پائیں گے؟ یہ مطلب بڑی صراحت سے بیان کیا گیا ہے کہ خدا اس کام پر قادر ہے کہ انہی بوسیدہ ہڈیوں کو حیات نو بخش دے (جی ہاں اسی مادی و عنصری جسم کو زندہ کرے گا)۔

(۱) وَصَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَنَسِيَ خَلْقَهُ ط قَالَ مَنْ يُحْيِي الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيمٌ ﴿۷۸﴾



قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِي أَنشَأَهَا أَوَّلَ مَرَّةٍ ۖ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيمٌ ﴿٤٩﴾ (یس: ۴۸، ۴۹)

(۲) اَيَحْسَبُ الْإِنْسَانُ أَنَّنِى نَجْمَعُ عِظَامَهُ ۚ بَلَىٰ قَدِيرِينَ عَلٰى أَن نُّسَوِّيَ بَنَانَهُ ﴿٥٠﴾ (قیامہ: ۳، ۴)

(۳) أَيْعِدُكُمْ أَنكُمْ إِذَا مِتُّمْ وَكُنْتُمْ تُرَابًا وَعِظَامًا أَنَّكُمْ تُخْرَجُونَ ﴿٥١﴾ (مومنون: ۳۵، ۳۶)

(۴) وَكَانُوا يَقُولُونَ ۖ أَيُّذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَعِظَامًا ۖ إِنَّا لَبَعُوثُونَ ﴿٥٢﴾ (واقعه: ۴۷ تا ۵۰)

(۵) ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمْ بِأَنَّهُمْ كَفَرُوا بِآيَاتِنَا وَقَالُوا ۖ إِذَا كُنَّا عِظَامًا وَرُفَاتًا ۖ إِنَّا لَبَعُوثُونَ خَلْقًا جَدِيدًا ﴿٥٣﴾ (بنی اسرائیل: ۹۸)

ترجمہ

(۱) اور ہمارے بارے میں باتیں بنانے لگا اور اپنی خلقت کو بھول گیا اور کہنے لگا: جب یہ ہڈیاں سڑگل جائیں گی تو کون ان ہڈیوں کو زندہ کرے گا؟ کہہ دو: انہیں وہی زندہ کرے گا جس نے اسے پہلی مرتبہ خلق کیا اور وہ ہر طرح کی پیدائش سے آگاہ ہے۔

(۲) کیا انسان خیال کرتا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو جمع نہیں کریں گے؟! ہاں (ضرور کریں گے) ہم اس پر قادر ہیں کہ اس کی انگلیوں کی پور پور درست کریں۔

(۳) کیا وہ آپ سے وعدہ کرتا ہے کہ جب آپ مر کر خاک اور ہڈیاں ہو جائیں گے تو دوبارہ (قبروں سے) نکلیں گے؟ ہیہات ہیہات ان وعدوں سے جو آپ سے کئے جاتے ہیں۔

(۴) اور کہتے ہیں کہ جب ہم مرجائیں گے اور مٹی اور ہڈیاں بن جائیں گے تو کیا ہم دوبارہ اٹھائے جائیں گے؟

﴿۱﴾ اگرچہ اس بارے میں قرآن مجید میں اور بھی بہت ساری آیات پائی جاتی ہیں لیکن مضامین کی ہم آہنگی کے پیش نظر فقط انہی آیات پر اکتفا کیا گیا ہے۔



یا ہمارے پہلے اجداد؟ کہوا گئے اور پچھلے سب کے سب روزِ معین جمع ہوں گے۔  
(۵) یہ ان کی جزاء ہے کیونکہ انہوں نے ہماری آیات کا انکار کیا اور کہا: جب ہم بوسیدہ ہڈیوں اور پراگندہ خاک میں تبدیل ہو جائیں گے تو کیا دوبارہ از سر نو خلق کئے جائیں گے؟

## تفسیر

### ۱۔ بوسیدہ ہڈیاں کیسے زندہ ہوں گی؟

چونکہ متذکرہ بالا آیات دیگر بحثوں میں بھی موردِ توجہ قرار پائی ہیں اور ان کی تفسیر بیان ہو چکی ہے لہذا یہاں پر فقط اس بحث سے متعلق اہم نکات پر روشنی ڈالی جائے گی۔

پہلی آیت میں صراحت سے ارشاد ہوتا ہے کہ وہی خدا جس نے اسے پہلی مرتبہ خلق کیا بوسیدہ ہڈیوں میں تبدیل ہونے کے بعد دوبارہ اسے زندہ کرے گا۔

بھیہما (ان بوسیدہ ہڈیوں کو زندہ کرے گا) معادِ جسمانی پر اس قدر صراحت کے ساتھ دلالت کرتا ہے کہ اگر قرآن مجید میں فقط اس عبارت کے علاوہ اور کچھ بھی نہ ہوتا تو یہ اس مسئلے کے اثبات کے لیے کافی تھا جب کہ ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ سینکڑوں آیات معادِ جسمانی کی خبر دیتی ہیں۔

یہ نکتہ قابلِ توجہ ہے کہ مذکورہ آیت میں خصوصاً اسی مادی و عنصری جسم پر تاکید کی گئی ہے نہ کہ اس سے مشابہ کسی اور جسم پر اور نہ ہی کسی برزخی یا نیم مادی جسم کا ذکر کیا گیا ہے۔

دوسری آیت میں ان لوگوں کے خیال کو رد کیا گیا ہے جو یہ گمان کرتے ہیں کہ خدا انسانی ہڈیوں کو جمع نہ کرے گا اور واضح طور پر کہا گیا ہے کہ ہم نہ فقط اس امر کو انجام دیں گے بلکہ اس پر بھی قادر ہیں کہ اس کی ظریف ترین خصوصیات (جیسا کہ انگلیوں کے پوروں کی لائینس) کو واپس پلٹا دیں اور منظم و مرتب کر دیں۔

ہر لحاظ سے معاد کے جسمانی ہونے کے بارے میں اس آیت کی صراحت قابلِ توجہ ہے۔  
تیسری آیت میں حضرت صالح علیہ السلام کی قومِ ثمودؑ کے بیان کو نقل کیا گیا ہے۔ وہ لوگ ایک دوسرے کو خطاب کر کے اس عظیم پیغمبر کی مذمت میں یوں کہا کرتے تھے: کیا وہ تم سے وعدہ کرتا ہے کہ جب تم دنیا سے چلے جاؤ گے اور مٹی اور ہڈیوں میں تبدیل ہو جاؤ گے تو پھر

[۱] مذکورہ آیت مجید میں اس پیغمبر اور قوم کے نام کی وضاحت نہیں کی گئی۔ بعض نے اسے قومِ ثمود (قوم صالح) کہا ہے اور بعض کا خیال ہے کہ یہ قوم عاد (قوم ہود) تھی لیکن آیت مجیدہ میں بیان کی جانے والی ان کی سزا (آسمانی چنگھاڑ) قومِ ثمود سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔

(قبروں سے) نکالے جاؤ گے (اور لباسِ حیات پہنو گے)۔

ہیہات کس قدر بعید ہیں یہ (جھوٹے) وعدے جو تم سے کئے جاتے ہیں: (ایعد کم اذما تمم و کنتم ترابا و عظاما انکم مخرجون ہیہات ہیہات لما توعدون)۔

ان عبارات سے واضح ہوتا ہے کہ ان کے پیغمبر صالح (یا ہود) نے ان سے معاد جسمانی کا وعدہ کیا تھا اور انہوں نے شدت سے اس کی مخالفت کی تھی۔ بالآخر اس تکذیب کی وجہ سے دردناک عذاب میں مبتلا ہوئے اور نابود ہو گئے (جیسا کہ انہی آیات کے ضمن میں سورۃ حج میں بھی بیان ہوا ہے۔

چوتھی آیت میں اصحابِ شمال کی بات کی گئی (جن کا نامہ اعمال ان کے جرائم کی وجہ سے ان کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا)۔ قرآن ان کی مذمت کرتے ہوئے اسی معنی کو دہراتے ہوئے گویا ہے: وہ گناہانِ کبیرہ پر اصرار کرتے تھے اور معاد کا انکار کرتے ہوئے کہتے: جب ہم مر جائیں گے اور مٹی اور ہڈیاں ہو جائیں گے تو کیا ہمارا دوبارہ لوٹنا ممکن ہے؟ (وکانوا یقولون اذا متنا و کنا ترابا و عظاما انا لمبعوثون)۔

یہ شدید مذمت درحقیقت اس واقعیت کا دفاع ہے کہ خاک شدہ ہڈیاں دوبارہ لباسِ حیات پہنیں گی اور زندہ ہو جائیں گے۔ آخری پانچویں آیت میں بھی کفار کے ایک گروہ کے بارے میں صراحت سے ارشاد ہوتا ہے: یہ آتش دوزخ ان کی پاداش ہے اس لیے کہ وہ کافر ہو گئے اور کہتے ہیں: جب ہم ہڈیاں اور پراگندہ خاک ہو جائیں گے تو کیا دوبارہ خلقت جدید پائیں گے؟ (ذلک جزاؤ ہم بانہم کفروا بایتنا وقالوا اذا کنا عظاما ورفاتاء انا لمبعوثون خلقا جدیدا)۔  
ضمناً اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ معاد جسمانی کے منکراہل دوزخ ہیں اور یہ عبارت بھی مدعا پر دلیل ہے۔  
مجموعی طور پر متذکرہ بالا آیات سے بخوبی یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ یہی مادی جسم ختم ہونے کے بعد دوبارہ حیات نو پائے گا۔

## گروہ دوم

یہاں ان آیات کا ذکر ہے جو بیان کرتی ہیں کہ روزِ قیامت انسان قبروں سے اٹھیں گے۔ واضح بات ہے کہ قبور انسانی اجسام کی جگہ ہے اور یہ تعبیر بھی معاد جسمانی پر ایک روشن دلیل ہے۔

یہ آیات بھی قرآن مجید میں بہت زیادہ ہیں جس میں سے چند نمونے آپ کے پیش خدمت ہیں:

(۱) وَأَنَّ السَّاعَةَ آتِيَةٌ لَا رَيْبَ فِيهَا ۖ وَأَنَّ اللَّهَ يَبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُورِ ﴿۴﴾ [۱]

(حج: ۴)

[۱] یہی مطلب سورہ انفطار آیت ۴ اور سورہ عادیات آیت ۹ میں نظر آتا ہے۔

(۲) وَنُفِخَ فِي الصُّورِ فَإِذَا هُمْ مِنَ الْأَجْدَاثِ إِلَىٰ رَبِّهِمْ يَنْسِلُونَ ﴿۵۱﴾ (یس: ۵۱)

(۵۱)

(۳) قَالُوا يٰوَيْلَنَا مَنْ بَعَثَنَا مِنْ مَرْقَدِنَا ۚ هٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمٰنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُونَ ﴿۵۲﴾ (یس: ۵۲)

ترجمہ

- (۱) اور قیامت کے آنے میں تو شک ہی نہیں اور خدا ان سب کو قبروں میں آرام کر رہے ہیں، زندہ کرے گا۔
- (۲) دوبارہ صور پھونکا جائے گا اچانک وہ قبروں سے اپنے پروردگار (کی عدالت) کی طرف تیزی سے بڑھیں گے۔
- (۳) وہ کہیں گے وائے ہو ہم پر! کس نے ہمیں ہمارے مرقد سے اٹھایا (جی ہاں) یہ وہی ہے جس کا خدا نے وعدہ کیا تھا اور اس کے رسولوں نے سچ کہا۔

تفسیر

۲۔ کس طرح قبروں سے اٹھیں گے؟

متذکرہ بالا آیات تین عناوین (قبروں سے خارج ہونا، اجداث اور مرقد) کے تحت بیان ہوئی ہیں اور اس سے ملتی جلتی آیات کو ملا کر مجموعاً سات آیات بنتی ہیں جو صراحت کے ساتھ معاد جسمانی پر دلالت کرتی ہیں۔

پہلی آیت میں ارشاد باری تعالیٰ ہوتا ہے وان الساعة اتية لاريب فيها وان الله يبعث من في القبور (یہ اس وجہ سے ہے کہ قیامت آئے گی اور اس میں تو شک ہی نہیں اور خدا ان سب کو زندہ کرے گا جو قبروں میں آرام کر رہے ہیں)۔ یہ بات تو ان کہے معلوم ہے کہ قبروں میں جو آرام کر رہے ہیں وہ انسانی اجسام ہی ہیں اور اس عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ جسم مادی ہی

سے نئی زندگی کا آغاز ہوگا۔

دوسری آیت میں قبور کی بجائے اجداث کی تعبیر دکھائی دیتی ہے۔ اجداث جدث (بروزن قفس) کی جمع ہے جس کے معنی قبر ہیں۔ بعض ارباب لغت کا کہنا ہے کہ حدث اہل تہامہ کی لغت ہے لیکن اہل نجد اس کی بجائے جدف کہتے ہیں۔ بہر حال اس تعبیر کا بھی معاد جسمانی کے علاوہ کوئی مفہوم نہیں ہے کیونکہ قبر میں اجسام یا بوسیدہ ہڈیاں اور ان کی خاک موجود ہے اور روز قیامت ان قبور سے انسانوں کا خارج ہونا ان ابدان کے زندہ ہونے پر دلالت کرتا ہے۔

تیسری آیت میں تعبیر سوم سے ہمارا سامنا ہوتا ہے اور وہ مردوں کے اپنے اپنے مرقد سے قیام کا مسئلہ ہے۔ کفار جب حیات نو کے بعد اپنے آپ کو ایک دوسری دنیا میں پائیں گے تو ان میں سے ایک گروہ کی فریاد بلند ہوگی: قالوا یوئلنا من بعثنا من مرقدنا (کہیں گے وائے ہم پر! کس نے ہمیں ہمارے مرقد سے اٹھایا)۔

مرقد ”رقود“ اور ”رقاد“ کے مادے سے ہے جو دن یا رات میں نیند کے معنی میں ہے۔ بعض اہل لغت اسے رات کی نیند سے مخصوص جانتے ہیں اور بعض اوقات کہا جاتا ہے کہ اس کا اصلی معنی وہ نیند اور آرام ہے جو مشکلات میں گھیراؤ کے وقت طاری ہو (آرام بخش نیند)۔ لہذا یہ کلمہ شدائد اور مشکلات کے دور کرنے کی خاطر ہونے والا وقفے کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔

بنا برائیں مرقد کے معانی آرام گاہ، استراحت گاہ اور خواب گاہ ہیں اور یہ جو قبر کے بارے میں اسے استعمال کیا گیا ہے اس لئے ہے کہ میت دنیاوی گرفتاریوں اور مشکلات سے رہائی پا کر وہاں آرام بخش نیند پاتی ہے۔<sup>[۱]</sup>

قبر کے بارے میں اس تعبیر کا استعمال اس وجہ سے ہے کہ موت اور نیند کی آپس میں بہت زیادہ شباهت ہے حتیٰ کہ کہا جاتا ہے: النوم اخ الموت (نیند اور موت بھائی بھائی ہیں)۔

بعض نے کہا ہے کہ اس تعبیر کے انتخاب میں منکرین معاد کا ہدف یہ تھا کہ موت کے بعد زندہ ہونے کے مسئلے پر اپنے شک کا دوبارہ اظہار کریں کہ آیا واقعاً ہم سو رہے تھے اور بیدار ہو گئے ہیں یا مرے ہوئے تھے جو زندہ ہوئے ہیں؟

لیکن ابھی وقت نہیں گزرتا کہ خود ہی اپنے اس سوال کا جواب دیتے ہیں اور اعتراف کرتے ہیں کہ هذا ما وعد الرحمن وصدق المرسلون (یہ وہی چیز ہے جس کا خداوند رحمن نے وعدہ کیا اور اس کے رسول سچ کہتے تھے)۔

قیامت کا منظر اس قدر گویا اور دہشت ناک ہے کہ ہر ضدی انسان کو حقائق کا واضح اعتراف کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ وہ خدا کی (لفظ) رحمن کے ساتھ تعریف کر کے گویا یہ چاہتے ہیں کہ اپنی خطاؤں کا اعتراف کرتے ہوئے رحمت الہی کے دامن کو تھام لیں۔ شاید اس طرح اپنے گزشتہ تاریک ادوار کی تلافی کر سکیں۔

بہر حال یہ تعبیر بھی معاد جسمانی پر دلالت کرتی ہے کیونکہ اگر معاد روحانی ہوتی تو آرام گاہ کا کوئی مفہوم ہی نہ تھا۔

[۱] مقائیس اللغة، صحاح اللغة اور التحقيق فی کلمات القرآن (مادہ رقد)

## گروہ سوم

یہاں وہ آیات پیش کی جا رہی ہیں جو کہتی ہیں: انسان مٹی سے پیدا ہوا، دوبارہ مٹی میں لوٹ جائے گا اور پھر مٹی ہی سے محشور ہوگا۔

(۱) مِنْهَا خَلَقْنَكُمْ وَفِيهَا نُعِيدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرَى ﴿۵۵﴾ (طہ: ۵۵)

(۲) وَاللَّهُ أَنْبَتَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ نَبَاتًا ﴿۱۵﴾ ثُمَّ يُعِيدُكُمْ فِيهَا وَيُخْرِجُكُمْ

إِخْرَاجًا ﴿۱۸﴾ (نوح: ۱۴، ۱۸)

(۳) قَالَ فِيهَا تَحْيَوْنَ وَفِيهَا تَمُوتُونَ وَمِنْهَا تُخْرَجُونَ ﴿۲۵﴾ (اعراف: ۲۵)

## ترجمہ

(۱) ہم نے تمہیں اس (مٹی) سے خلق کیا اور اسی میں واپس لوٹائیں گے اور پھر اسی سے دوبارہ تمہیں باہر نکالیں گے۔

(۲) اور خدا نے تمہیں نباتات کی طرح زمین سے اگایا! پھر اسی زمین میں تمہیں واپس لوٹائے گا اور دوبارہ تمہیں خارج کرے گا۔

(۳) فرمایا: تم اس (زمین) میں زندہ ہو گے اور اسی میں مرو گے اور اسی سے (روزِ قیامت) باہر نکلو گے۔

## تفسیر

## ۳۔ تم دوبارہ مٹی سے محشور ہو گے

پہلی آیت موسیٰ و فرعون کی داستان کے دوران بیان ہوئی ہے۔ لیکن بات خداوند متعال کی طرف سے کی جا رہی ہے۔ زمین (ارض) جس کا گذشتہ آیات میں ذکر ہوا ہے، اس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: ہم نے تمہیں اس سے خلق کیا اور اسی میں واپس لوٹائیں گے اور پھر دوبارہ تمہیں اسی سے باہر نکالیں گے (مِنْهَا خَلَقْنَكُمْ وَفِيهَا نُعِيدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرَى)۔

ہم سب کے وجود کی ابتداء مٹی تھی، یا ہم سب آدم سے ہیں اور آدم مٹی سے ہیں، یا پھر وہ تمام غذائی مواد کہ جس سے ہمارا گوشت، پوست اور ہڈیاں تشکیل پاتی ہیں مٹی سے حاصل ہوتا ہے (نباتات سے یا ان حیوانات سے جو نباتات سے غذا حاصل کرتے ہیں)۔

ہم سب کی بازگشت یقیناً مٹی میں ہوگی اور ہماری قیامت بھی مٹی ہی سے ہوگی اور یہ معاد جسمانی کے مسئلے پر ایک روشن دلیل ہے۔

یہ عبارت ایک توان لوگوں کے لیے جواب ہے جو معاد کو ناممکن جانتے تھے کہ کس طرح خاک شدہ اجساد زندہ ہوں گے اور اس بات سے غافل تھے کہ ہم سب ابتداء میں مٹی ہی تھے اور دوسرا اس میں فرعون اور اس کے حواریوں جیسے تمام باغی، گردنکش اور متکبر افراد کو خبردار کیا گیا ہے کہ وہ جان لیں کہ ابتدا میں وہ سب خاک تھے اور پھر خاک میں واپس لوٹیں گے اور دوبارہ خاک ہی سے اٹھیں گے اور خدا کی عدالت میں حاضر ہوں گے۔ انسان کے لیے زندگی کے ان مراحل پر تھوڑی سی فکر ہی کافی ہے جو اس کے غرور کا خاتمہ کر دے اور حق کے مقابل میں تواضع اور تسلیم کی روح اس میں زندہ کر دے۔

دوسری آیت خدا کے بزرگ پیغمبر حضرت نوح علیہ السلام کی زبانی ہے جس میں انہوں نے انسانوں کی ان نباتات سے تشبیہ دی ہے جو زمین سے اگتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے: **والله انبتکم من الارض نباتا** (خدا نے نباتات کی طرح تمہیں زمین سے اگایا)۔ **ثم یعیدکم فیہا** (پھر تم سب کو دوبارہ زمین میں پلٹا دے گا)۔ **ویخرجکم اخر اجا** (اور بار دیگر تمہیں اسی زمین سے نکالے گا)۔<sup>[۱]</sup> انسانوں کے بارے میں انبات (اگانا) کی اصطلاح بڑی ظریف اصطلاح ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ انسانی اور گیاہی زندگی پر حاکم قوانین کی آپس میں بہت زیادہ مشابہت ہے۔ علاوہ ازیں انسانوں کے بارے میں خدا کا کام فقط ایک استاد اور معلم جیسا نہیں ہے بلکہ یہ باغبان کے کام سے زیادہ مشابہت رکھتا ہے جو مناسب حالات میں بیج بوتا ہے اور پھر ان کی آبیاری کرتا ہے تاکہ ان میں پوشیدہ صلاحیتیں شمر آ رہو سکیں۔

ہم جانتے ہیں کہ فقط انہی پودوں کو زندگی کا حق حاصل ہوتا ہے جو رشد اور نمو پا سکیں، جو سرسبز و شاداب ہوں، جو پھولوں اور پھلوں کو اپنے دامن میں لیے ہوں اور سایہ کی نعمت سے بہرہ ور ہوں، وگرنہ وہ تو اس خشک لکڑی کی مانند ہوں گے جو فقط جلانے کے کام آتی ہے اور یہی حال انسان کا ہے۔

بسوزند چوب درختان بی بر

سزا خود ہمیں است مربی بری را!

(بے شمر درختوں کی لکڑی جلتی ہے اور بے شمری کی سزا بھی یہی ہے)۔

بہر حال یہ آیت بھی معاد جسمانی پر روشن دلیل ہے کیونکہ ارشاد ہوتا ہے: زمین میں واپس جاؤ گے دوبارہ زمین سے خارج ہو گے، ابتداء میں مٹی تھے اور دوبارہ مٹی ہی سے اٹھو گے۔

تیسری آیت میں حضرت آدم علیہ السلام، ان کی بیوی حوا اور ان کی نسل کی زبانی بات کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: خداوند تعالیٰ

[۱] ان آیات میں قاعدتاً "انباتا" کہا جانا چاہئے تھا کہ جو فعل انبتکم کا مصدر ہے لیکن بعض مفسرین کے مطابق آیت میں ایک تقدیر ہے جو یوں ہے "انبتکم من الارض فنبتکم نباتا..... یا..... انبتکم من الارض انبات النبات" (تفسیر فخر رازی، ابوالفتوح رازی اور المیزان)

نے ان سے کہا آپ زمین میں زندہ ہوں گے، اسی میں مریں گے اور اسی سے (روز قیامت) خارج ہو گے (قال فیہا تحیون و فیہا تموتون ومنہا تخرجون)۔

”ومنہا تخرجون“ (اس یعنی زمین سے خارج ہو گے) کا جملہ قرآن مجید کے مطابق معاد جسمانی پر روشن دلیل ہے اور کسی بھی تاویل کے ذریعے اسے معاد روحانی یا نیم جسمانی پر منطبق نہیں کیا جاسکتا۔

اس آیت سے پتہ چلتا ہے کہ معاد جسمانی کا مسئلہ خلقت آدم کی ابتداء ہی سے زیر بحث تھا اور یہ صرف ظہور اسلام اور نزول قرآن کے زمانے کے ساتھ مختص نہیں ہے۔

### گروہ چہارم

یہاں ان آیات کا بیان ہے جن میں انسان کی حیات مجددی طرف بازگشت کو زمین کی حیات بعد از مرگ کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے:

(۱) وَاللّٰهُ الَّذِیْ اَرْسَلَ الرِّیْحَ فَتُثْبِتُ سَحَابًا مِّنْهُ اِلٰی بَلَدٍ مَّيِّتٍ فَاَحْيٰیْنَا بِہِ

الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِہَا ۚ كَذٰلِکَ النُّشُوْرُ ۙ (فاطر: ۹)

(۲) وَاَحْيٰیْنَا بِہِ بَلَدًا مَّيِّتًا ۚ كَذٰلِکَ الْخُرُوْجُ ۙ (ق: ۱۱)

### ترجمہ

(۱) خدا وہ ہے جس نے ہواؤں کو بھیجا تا کہ بادلوں کو اڑائے پھر میں، ہم ان بادلوں کو مردہ زمین کی طرف چلاتے

اور اس کے ذریعے زمین کو مرنے کے بعد زندہ کرتے ہیں۔ قیامت بھی اسی طرح ہے۔

(۲) اور ہم نے بارش کے ذریعے مردہ زمین کو زندہ کیا۔ جی ہاں! مردوں کا زندہ ہونا بھی ایسے ہی ہے۔

### تفسیر

### ۴۔ معاد زمینوں کے زندہ ہونے کی مانند ہے

ان آیات کی تفسیر گذشتہ مباحث میں مختلف مناسبتوں کے تحت بیان ہو چکی ہے۔ اب ہم انہیں اس نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید نے بارش کے ذریعے زمین کو ملنے والی زندگی کے ساتھ قیامت کو تشبیہ دی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: كَذٰلِکَ النُّشُوْرُ (انسانوں کا جی اٹھنا بھی

[۱] اس بارے میں اور بھی کئی ایک آیات ہیں جن کی طرف گذشتہ بحثوں میں اشارہ ہو چکا ہے۔ مثلاً روم ۱۹، زخرف ۱۱ اور حج ۵۔

ایسے ہی ہے)۔

ایک دوسرے مورد پر فرماتا ہے: كَذَلِكَ الْخُرُوجُ اِنْسَانُوں كا (قبروں سے) باہر نکلنا بھی اسی طرح ہے۔  
یہ تعبیرات اور اس سے مشابہ دوسری عبارات بھی معاد جسمانی کی آشکارا خبر دیتی ہیں کیونکہ اگر یہ عنصری جسم لباس حیات زیب تن نہ کرتا تو زمین کی حیات بعد از مرگ کے ساتھ اس کی تشبیہ بالکل بغیر کسی مناسبت کے تھی چونکہ معاد روحانی تو بدن کی موت کے بعد بقائے روح کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے اور بقائے روح کو زمین کی حیات بعد از مرگ کے ساتھ کیا شاہت؟  
جیسا کہ پہلے بھی ہم نے اشارہ کیا ہے کہ قرآن مجید میں اور بھی آیات انہی مضامین اور عبارات کے ساتھ مختلف صورتوں میں پائی جاتی ہیں جو سب کی سب معاد جسمانی پر دلالت کرتی ہیں۔

### گروہ پنجم

یہاں ان آیات کا بیان ہے جن سے پتہ چلتا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے یا تمام پیغمبروں کے مخالفین مسئلہ معاد کے بارے میں کس قدر سخت موقف رکھتے تھے اور بعد از مرگ زندہ ہونے کے دعوے کو (نعوذ باللہ) جنون آمیز اور عجیب و غریب شمار کرتے تھے۔

اگر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم معاد روحانی کی دعوت دیتے تو یقیناً یہ کوئی عجیب بات نہ تھی کیونکہ یہ جاہل اقوام خود بھی بقائے روح کا عقیدہ رکھتی تھیں اور اصولاً بقائے روح کوئی عجیب چیز نہ تھی۔

علاوہ ازیں ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خاک کے اندر پراگندہ انسانی اجزاء کے اکٹھا ہونے پر متعجب تھے۔ ذیل کی آیات پر توجہ فرمائیں:

(۱) وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا هَلْ نَدُلُّكُمْ عَلَىٰ رَجُلٍ يُنْبِئُكُمْ إِذَا مُزِّقْتُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ ۖ إِنَّكُمْ لَفِي خَلْقٍ جَدِيدٍ ۚ أَفْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا أَمْ بِهِ جِنَّةٌ ۚ (سبا: ۷۸)

(۲) إِنَّ هُوَ إِلَّا رَجُلٌ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا وَمَا نَحْنُ لَهُ بِمُؤْمِنِينَ ۝ (المومنون: ۳۸)

### ترجمہ

(۱) کافروں نے کہا: کیا ہم آپ کو ایک ایسے آدمی کے بارے میں بتائیں جو خبر دیتا ہے کہ جب (مر جاؤ گے،



مٹی ہو جاؤ گے اور) ریزہ ریزہ ہو جاؤ گے تو (دوبارہ) نئی خلقت پاؤ گے! کیا وہ خدا پر جھوٹ باندھتا ہے یا کسی جنون کا شکار ہو گیا ہے؟  
(۲) وہ صرف ایک جھوٹا شخص ہے جس نے خدا پر جھوٹ باندھا ہے اور ہم اس پر ہرگز ایمان نہ لائیں گے۔

## تفسیر

### ۵۔ کیا ہمارا مٹی میں سے دوبارہ اٹھنا ممکن ہے؟

ان آیات کی تفسیر پہلے بھی بیان ہو چکی ہے لیکن اب ہم ان پر ایک نئے زاویے سے نگاہ ڈالیں گے۔ پہلی آیت کے مطابق رسول اکرمؐ کے ہم عصر مشرکین آپؐ کے خلاف قیام کئے ہوئے تھے اور تعجب سے کہا کرتے تھے: ایک ایسا شخص پیدا ہوا ہے جو کہتا ہے: جب تم خاک ہو جاؤ گے، ریزہ ریزہ ہو جاؤ گے تو دوبارہ نئی خلقت سے ہمکنار ہو گے۔ پھر اس بات کو علامت جنون اور خدا پر جھوٹ باندھنے کے عنوان سے مشہور کرتے تھے۔ یعنی اگر وہ عاقل ہے تو لوگوں کو غفلت میں مبتلا کرنے کے لیے خدا پر جھوٹ باندھتا ہے اور اگر عاقل نہیں ہے تو پھر ان باتوں کا سرچشمہ اس کی دیوانگی اور جنون ہے!

دوسری آیت میں قوم ثمود کے کفار اپنے پیغمبر حضرت صالحؑ علیہ السلام کے بارے میں گویا ہیں۔ اس آیت میں بھی یہی مطلب دکھائی دیتا ہے کہ وہ حضرت صالحؑ کی طرف سے پیش ہونے والے مسئلہ معاد کے بارے میں انتہائی تعجب اور حیرت کا شکار تھے اور اسے ایک قسم کی دروغ پردازی اور خدا کے بارے میں افتراء بندی شمار کرتے تھے۔

ان سب سے پتہ چلتا ہے کہ پیامبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا حضرت صالحؑ علیہ السلام اور دیگر تمام انبیاء معاد جسمانی ہی کی دعوت دیتے تھے ورنہ ان کے ساتھ ہونیوالا یہ سلوک بے معنی تھا۔ معاد جسمانی کے مسئلہ پر قرآن مجید سے یہ چند مزید دلائل ہیں۔

### گروہ ششم

اب ان آیات کا بیان ہے جن میں بہشت کی مختلف قسم کی مادی نعمتوں کا ذکر ہے۔ مثلاً پھل، نہریں، تخت، مختلف النوع شراب طہور، لباس، سایہ، مختلف درخت اور جسمانی لذائذ کی دیگر مختلف اقسام اور ایسی آیات بے شمار ہیں۔

یقیناً ہم ان تمام آیات کو مجازی معانی میں نہیں لے سکتے اور نہ ہی الفاظ کو بغیر کسی واضح قرینے کے حقیقی معانی سے منصرف کر سکتے ہیں۔ درست ہے کہ بہشتی پھل، شراب، لباس، برتن اور غذا کا دنیاوی چیزوں کے ساتھ بہت زیادہ فرق ہے اور ہم اس محدود دنیا کے زندانی ہوتے ہوئے عالم آخرت کے وسیع افق کا اچھی طرح ادراک نہیں کر سکتے، لیکن جو کچھ بھی ہے بہر حال یہ نعمتیں ایسی مادی نعمتیں ہیں جو فقط معاد جسمانی ہی کے ساتھ مناسبت رکھتی ہیں۔

البتہ بہشتی نعمتیں مادی نعمتوں تک ہی محدود نہیں ہیں بلکہ مادی نعمتوں کے ساتھ ساتھ بے نظیر اور ناقابل توصیف معنوی و روحانی مواہب بھی فراوان ہیں۔ لیکن یہ مادی نعمتوں کے وجود میں کوئی رکاوٹ نہیں ہیں۔

دوسرے الفاظ میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ چونکہ معاد جسمانی پہلو بھی رکھتی اور روحانی پہلو کی بھی حامل ہے اور بہشتی نعمتیں بھی جسمانی و روحانی دونوں پہلوؤں پر محیط ہیں لہذا معاد کو فقط روحانی پہلو تک محدود نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی ان تمام روشن آیات سے چشم پوشی کی جاسکتی ہے۔ ایسی آیات کی تعداد شانہ سینکڑوں سے بھی تجاوز کرتی ہو، نمونے کے طور پر درج ذیل جو چند آیات آپ کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہیں قرآن مجید کی صرف ایک سورۃ، سورۃ الرحمن، سے منتخب کی گئی ہیں۔ اس مجمل سے حدیث مفصل کا آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں:

۱۔ وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ جَنَّاتٌ ۝

۲۔ ذَوَاتَا أَفْنَانٍ ۝

۳۔ فِيهِمَا عَيْنٌ تَجْرِي ۝

۴۔ فِيهِمَا مِنْ كُلِّ فَاكِهَةٍ زَوْجٌ ۝

۵۔ مُتَكِيْنَ عَلَى فُرُشٍ بَطَآئِنُهَا مِنْ إِسْتَبْرَقٍ ۝

۶۔ وَجَنَّاتُ الْجَنَّتَيْنِ دَانٍ ۝

۷۔ وَمِنْ دُونِهِمَا جَنَّاتٌ ۝

۸۔ فِيهِمَا عَيْنٌ نَضَّاخَتِي ۝

۹۔ فِيهِمَا فَاكِهَةٌ وَنَخْلٌ وَرُمَّانٌ ۝

۱۰۔ فِيهِنَّ خَيْرٌ حَسَانٌ ۝

۱۱۔ حُورٌ مَّقْصُورَاتٌ فِي الْحَيَامِ ۝

۱۲۔ لَمْ يَطْمِثْهُنَّ إِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَانٌ ۝

۱۳۔ مُتَكِيْنَ عَلَى رَفْرَفٍ خُضْرٍ وَعَبْقَرِيٍّ حِسَانٍ ۝

(سورۃ الرحمن، آیات ۳۶ تا ۷۶)

ترجمہ

- (۱) اور جو اپنے پروردگار کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرے اس کے لئے بہشت کے دوباغ ہیں۔
- (۲) بہشت کے وہ دوباغ مختلف النوع نعمتوں اور سرسبز درختوں سے مالا مال ہیں۔
- (۳) ان میں دو چشمے ہیں جو ہمیشہ بہتے ہیں۔
- (۴) ان میں ہر پھل کی دو قسمیں ہیں۔
- (۵) یہ لوگ ان فرشتوں پر جن کے استراطلس کے ہوں گے تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے۔
- (۶) اور دونوں باغوں کے میوے قریب (جھک رہے) ہیں۔
- (۷) اور ان کے نیچے دو جنتیں اور ہیں۔
- (۸) ان میں دو چشمے پھوٹ رہے ہیں۔
- (۹) ان میں درخت، کھجور، انار اور بکثرت پھل پائے جاتے ہیں۔
- (۱۰) اور ان بہشتی باغوں میں نیک سیرت، بااخلاق اور خوب صورت عورتیں ہیں۔
- (۱۱) ایسی عورتیں جو بہشتی خیموں میں مستور ہیں۔
- (۱۲) ایسی عورتیں جنہیں جن و انس میں کسی نے بھی اس سے پہلے مس نہیں کیا اور
- (۱۳) یہ بہشتی سبز رنگ کے بہترین اور زیبا ترین کپڑے سے ڈھکے ہوئے تختوں پر ٹیک لگائے ہوں گے۔

تفسیر

## ۲۔ بہشت کی مادی نعمتوں کا معاد جسمانی پر دلالت کرنا

جیسا کہ آپ نے مشاہدہ فرمایا صرف سورہ رحمن میں کہ جو قرآن مجید کی نسبتاً ایک چھوٹی سورۃ ہے بہشت کی مادی نعمتوں میں سے کم از کم بارہ قسمیں بیان ہوئی ہیں۔ مثلاً: بہشتی باغ، مختلف النوع اور سرسبز درخت، رنگارنگ اور مختلف قسم کے پھل، یہاں تک کہ پھلوں کے پائے جانے کا طریقہ کار اور ان کا تمام بہشتیوں کے لئے دستیاب ہونا، بہشتی قالین، بہشتیوں کے خوبصورت اور جاذب نظر کپڑے، بہشتی عورتیں، ہر لحاظ سے باکرہ عورتیں کہ جو یا قوت و مرجان کی طرح ہوں گی، آب جاری کے رواں چشمے، بہشتی خیموں میں مستور عورتیں، زیبا ترین کپڑوں سے مزین تخت جن پر بہشتی ٹیک لگائے ہوں گے وغیرہ وغیرہ۔

قرآن مجید کی باقی سورتوں میں بھی کئی ایک ایسے نمونے دکھائی دیتے ہیں (مثلاً) مختلف مضامین اور ناموں کے ساتھ بہشتی نہروں کا

ذکر، شراب طہور، رنگ برنگے برتن کہ جن میں بہشتیوں کے کھانے اور مشروب ہوں گے، بہشتی حجرے، ایک دوسرے کے سامنے لگے ہوئے تختوں پر بہشتیوں کا براجمان ہونا اور محفل انس کا تشکیل دینا (وغیرہ)

گاہ یہ گاہ بہشت کی یہ مادی نعمتیں آیات میں اس طرح سلسلہ وار بیان ہوتی ہیں کہ کسی قسم کے ابہام و شک کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ سورہ غاشیہ کی ان چھوٹی، خوبصورت اور پر محنتی آیات کی جانب توجہ فرمائیں:

وَجُودًا يُؤْمِنُ تَأَمِّمَةً ۝۹

فِي جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ۝۱۰

فِيهَا عَيْنٌ جَارِيَةٌ ۝۱۱

فِيهَا سُرُرٌ مَّرْفُوعَةٌ ۝۱۲

وَأَكْوَابٌ مَّوْضُوعَةٌ ۝۱۳

وَمَنَارِقُ مَصْفُوفَةٌ ۝۱۴

وَزَرَابِيُّ مَبْثُوثَةٌ ۝۱۵ (غاشیہ: آیات ۸ تا ۱۶)

اس دن چہرے شاداب اور تروتازہ ہوں گے۔

جنت کے عالی شان باغ میں۔

اس میں چشمے جاری ہوں گے۔

اس میں اونچے اونچے اور خوبصورت تخت بچھے ہوں گے۔

اور ان چشموں کے کنارے جام رکھے ہوں گے۔

اور گاوٹکیئے قطار در قطار لگے ہوں گے۔

اور نفیس مسندیں بچھی ہوں گی۔

اس سورہ کی چھیس آیات میں سے سات آیتیں اسی معاد جسمانی اور جنت کی مختلف جسمانی نعمتوں کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ اسی ترتیب سے اگر ہم اس بارے میں قرآن کی تمام آیات کو جمع کریں تو ایک بڑی تعداد اکٹھی ہو جائے گی۔

یہاں دو نکتوں کا ذکر ضروری ہے:

۱۔ یقیناً بہشتی نعمتیں مادی نعمتوں تک ہی محدود نہیں ہیں۔ بہشت میں روحانی و معنوی نعمتیں بھی بکثرت پائی جاتی ہیں جو انشاء اللہ اپنے مقام بحث پر بیان ہوں گی۔ اصولاً یہ کیونکر ممکن ہے کہ خدا انسانی جسم کی تسکین کے لیے تو یہ سب طرح طرح کی نعمتیں فراہم کرے لیکن

اس کی روح کے لئے کہ جو اس کے وجود کے ایک اہم حصے کو تشکیل دیتی ہے اور ہر لحاظ سے افضل و برتر ہے، کوئی مناسب اور شائستہ مواہب اور نعمتیں فراہم نہ کرے؟

روحانی نعمتیں چونکہ وضاحت اور بیان کی حامل نہیں ہیں جب تک ان نعمتوں تک رسائی نہ ہو اور ان کا ادراک نہ کیا جائے، ان کا احساس نہیں ہو سکتا۔ اسی لئے آیات قرآن میں ان کے بارے میں کوئی زیادہ تشریح اور وضاحت دکھائی نہیں دیتی۔ البتہ اس کے باوجود اس بارے میں ایسی مختصر، جالب اور سرسبز تعبیرات مل جاتی ہیں جو ان نعمتوں کی عظمت اور عمق کو بیان کرتی ہیں۔ اس کی تشریح ایک مستقل بحث میں پیش کی جائے گی۔

۲۔ بعض احباب بڑی جرأت اور جسارت کے ساتھ ان تمام آیات کی تاویلات اور توجیہات کرتے ہیں اور انہیں خلاف ظاہر مفہیم پر محمول کرتے ہیں اور ان سب کو معنوی نعمتوں پر کننا یہ سمجھتے ہیں۔ حالانکہ باب الفاظ کے جانے پہچانے قوانین ہمیں ہرگز ایسی اجازت نہیں دیتے اور اگر یہ طے کر لیا جائے کہ ہم اپنے آپ کو ایسی تاویلات اور توجیہات کی چھٹی دے دیں تو پھر ظواہر الفاظ کی حجت کا کوئی مفہوم باقی نہ رہے گا، الفاظ مفہیم کے انتقال کا ذریعہ نہ رہیں گے، اپنی ارزش و اصلت کو کھو بیٹھیں گے اور یہ خدا اور قرآن مجید کے خلاف جسارت ہے۔

### گروہ ہفتم

اس گروہ میں ایسی آیات کا ذکر ہے جن میں روز قیامت مجرموں کو ملنیوالی سزاؤں اور ان کے کیفر کردار کی وضاحت کی گئی ہے۔ ان سزاؤں میں متعدد جسمانی پہلو کی حامل ہیں۔ اگر معاد فقط روحانی ہو تو پھر ان تمام تعبیرات کے مجازی معانی تصور کرنا پڑیں گے جب کہ اس کام کا کوئی جواز نہیں بنتا۔

یہاں بھی ہم (اس بات پر) تاکید کریں گے کہ قیامت کی سزائیں دو طرح کی ہیں: روحانی عذاب اور جسمانی عذاب اور قرآن مجید میں ان دونوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اگرچہ آیات قرآن میں زیادہ تر جسمانی عذاب ہی کو مورد توجہ قرار دیا گیا ہے اور اس کی علت ہم گذشتہ بحث میں ذکر کر چکے ہیں۔

یہ آیات بہت زیادہ ہیں بطور نمونہ درج ذیل چند آیات کی طرف توجہ فرمائیں:

(۱) وَأَصْحَابُ الشَّيْطَانِ ۚ مَا أَصْحَابُ الشَّيْطَانِ ۖ فِي سُمُومٍ وَخَمِيمٍ ۖ وَظِلٍّ مِّنْ

يَحْمُومٍ ۖ لَا بَارِدٍ وَلَا كَرِيمٍ ۖ (واقعہ: ۳۱ تا ۳۴)

(۲) يَوْمَ يُحْمَىٰ عَلَيْهَا فِي نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوَىٰ بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوبُهُمْ

وَوُجُوهُهُمْ ۖ (توبہ: ۳۵)

(۳) وَقَالُوا لَا تَنْفِرُوا فِي الْحَرِّ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ أَشَدُّ حَرًّا لَوْ كَانُوا يَفْقَهُونَ ﴿٨١﴾ (توبہ: ۸۱)

(۴) كَمَنْ هُوَ خَالِدٌ فِي النَّارِ وَسُقُوا مَاءً حَمِيمًا فَقَطَّعَ أَمْعَاءَهُمْ ﴿١٥﴾ (محمد: ۱۵)

(۵) يَوْمَ يُسْحَبُونَ فِي النَّارِ عَلَى وُجُوهِهِمْ ذُقُوا مَسَّ سَقَرٍ ﴿٣٨﴾ (قمر: ۳۸)

(۶) تَصْلَى نَارًا حَامِيَةً ﴿٥٠﴾ تَسْقَى مِنْ عَيْنٍ اٰنِيَةٍ ﴿٥١﴾ لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ اِلَّا مِنْ ضَرِيحٍ ﴿٥٢﴾ لَا يُسْبِغُ وَلَا يُغْنِي عَنْ جُوعٍ ﴿٥٣﴾ (الغاشية: ۴ تا ۷)

(۷) اِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّومِ ﴿٣٣﴾ طَعَامٌ الْاٰثِمِ ﴿٣٤﴾ كَالْمُهْلِ يَغْلِي فِي الْبُطُونِ ﴿٣٥﴾ كَغَلْيِ الْحَمِيمِ ﴿٣٦﴾ (دخان: ۳۳ تا ۳۶)

ترجمہ

- (۱) بائیں ہاتھ والے، بائیں ہاتھ والے کیا (مصیبت میں) ہیں۔ (دوزخ کی) آگ اور کھولتے ہوئے پانی اور کالے سیاہ دھوئیں کے سایہ میں ہوں گے جو نہ ٹھنڈا ہے اور نہ خوش آئند۔
- (۲) جس دن وہ (سونا چاندی) جہنم کی آگ میں گرم کیا جائے گا، پھر اس سے ان کی پیشانیاں اور ان کے پہلو اور ان کی پٹھیں داغی جائیں گی۔
- (۳) ..... اور کہنے لگے (اس) گرمی میں (گھر سے) نہ نکلو (اے رسول) تم کہہ دو کہ جہنم کی آگ اس سے کہیں زیادہ گرم ہے۔
- (۴) (بھلا یہ لوگ) ان کے برابر ہو سکتے ہیں جو ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے اور ان کو کھولتا ہوا پانی پلایا جائے گا تو وہ آنتوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے گا۔
- (۵) اس روز یہ لوگ اپنے اپنے منہ کے بل جہنم کی آگ میں گھیٹتے جائیں گے (اور ان سے کہا جائے گا) اب جہنم کی آگ کا مزہ چکھو۔
- (۶) دہکتی ہوئی آگ میں داخل ہوں گے۔ انہیں ایک کھولتے ہوئے چشمہ کا پانی پلایا جائے گا۔ خاردار جھاڑی کے سوا ان کے لیے کوئی کھانا نہیں جو نہ موٹائی پیدا کرے نہ بھوک میں کچھ کام آئے۔
- (۷) تھوہڑا درخت ضرور ان کا کھانا ہوگا، جیسے پگھلا ہوا تانبا، وہ پیٹوں میں اس طرح ابال کھائے گا جیسے کھولتا

ہوا پانی ابال کھاتا ہے۔

## تفسیر

### ۷۔ دوزخ کی مادی سزائیں

زیر بحث ان آیات کی تفسیر کا ملاروشن ہے اور زیادہ وضاحت کی ضرورت نہیں ہے چونکہ ان آیات میں آتش دوزخ کا ذکر کیا گیا ہے، ایسی آگ کہ جس میں مجرموں کو اوندھے منہ کھینچا جائے گا، ایسی آگ کہ جس میں ان درہم و دینار کو پگھلایا جائے گا جو خزانوں کی صورت میں جمع کئے گئے اور ان میں سے حقوق الہی ادا نہ کئے گئے اور پھر ان (پگھلے ہوئے درہم و دینار) سے ان کے مالکوں کے چہرے، پہلو اور پشت کو داغا جائے گا۔

مسموم و مہلک ہواؤں، کھولتے پانی اور جھلسا دینے والے سائے کا بیان ہے جو مجرموں کی تاک میں ہیں۔ ان چہروں کی بات کی گئی ہے جنہیں اس دن آتش جہنم میں پھینکا جائے گا اور کھولتے چشموں میں سے انہیں پلایا جائے گا اور ان کے کھانے کو ضریح (ناگوار غذا) کے علاوہ کچھ نہ ہوگا۔

اس درخت زقوم کا ذکر ہے جو گناہگاروں کی غذا ہے۔ جام سوزان ہوں گے جو گناہگاروں کو دینے جائیں گے۔ یہ سب اور ان سے مشابہ دوسرے موارد بھی روزِ روشن کی طرح معادِ جسمانی پر دلالت کرتے ہیں کیونکہ اگر معاد فقط روحانی پہلو کی حامل ہوتی تو اس طرح کے جسمانی عذاب بے معنی دکھائی دیتے۔

### گروہ ہشتم

ایسی آیات ہیں کہ جو قیامت میں انسانی بدن کے اعضاء کے بارے میں بات کرتی ہیں مثلاً ہاتھ، پاؤں، آنکھ، کان، زبان، منہ، صورت، گوشت وغیرہ اور یہ سب معادِ جسمانی پر دلالت کرتے ہیں۔

ایسی آیات قرآن مجید میں فراوان ہیں۔ ہم نمونے کے طور پر ذیل میں چند آیات پیش کرتے ہیں:

(۱) الْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلَىٰ أَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَا أَيْدِيهِمْ وَتَشْهَدُ أَرْجُلُهُمْ بِمَا

كَانُوا يَكْسِبُونَ ﴿۶۵﴾ (یس: ۶۵)

(۲) حَتَّىٰ إِذَا مَا جَاءُوهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَأَبْصَارُهُمْ وَجُلُودُهُمْ بِمَا

كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۲۰﴾ (حم سجدہ: ۲۰)

(۳) وَقَالُوا لَجُلُودِهِمْ لَمْ شَهِدْتُمْ عَلَيْنَا ط قَالُوا أَنْطَقَنَا اللَّهُ الَّذِي أَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ (حم سجدہ: ۲۱)

(۴) فَأَمَّا مَنْ أُوتِيَ كِتَابَهُ بَيِّنَاتٍ ۖ فَيَقُولُ هَآؤُمْ اقْرَءُوا كِتَابِيهِ ۖ -----  
وَأَمَّا مَنْ أُوتِيَ كِتَابَهُ بِشَهَادَةٍ ۖ فَيَقُولُ يَلِيَّتَنِي لَمْ أُوتِ كِتَابِيهِ ۖ (حاقة: ۱۹-۲۵)

(۵) وَجُودٌ يَوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ۖ ضَآحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ ۖ وَوُجُوهٌ يُّومَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ۖ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ۖ (عبس: ۳۸ تا ۴۱)

ترجمہ

- (۱) آج ہم ان کے منہ پر مہر لگا دیں گے اور ان کے ہاتھ ہمارے ساتھ گفتگو کریں گے اور ان کے پاؤں ان کاموں کی گواہی دیں گے جو وہ انجام دیتے رہے۔
- (۲) یہاں تک کہ جب سب کے سب جہنم کے پاس جائیں گے تو ان کے کان، آنکھیں اور بدن کا گوشت ان کے اعمال کی گواہی دیں گے۔
- (۳) وہ اپنے گوشت پوست سے کہیں گے: تم نے کیوں ہمارے خلاف گواہی دی؟ وہ جواب دیں گے جس خدا نے ہر موجود کو گویائی بخشی اسی نے ہمیں گویا کیا۔
- (۴) جس کا نامہ اعمال اپنے دائیں ہاتھ میں ہوگا (فخر و مباہات اور فرط خوشی سے) چلائے گا کہ (اے اہل محشر!) میرا نامہ اعمال لو اور پڑھو..... لیکن جس کا نامہ اعمال بائیں ہاتھ میں ہوگا، کہے گا: اے کاش مجھے میرا نامہ اعمال ہرگز نہ دیا گیا ہوتا۔
- (۵) اس دن بہت سے چہرے کشادہ و نورانی ہوں گے۔ خنداں و مسرور اور ایسے چہرے بھی ہوں گے جن پر گرداٹی ہوگی اور سیاہی چھائی ہوگی۔



## تفسیر

## ۸۔ ایک اور زندہ دلیل۔ اعضائے بدن کا گفتگو کرنا

چونکہ ان آیات کی تفسیر شاہدانِ روز قیامت اور نامہ اعمال جیسی بحثوں میں بھی کی جائے گی لہذا یہاں پر ہم فقط اجمالی طور پر اشارہ کرتے ہوئے اپنے موروثیہ مطلب (کہ وہ معاد جسمانی پر کیسے دلالت کرتے ہیں) پر بحث کریں گے مونہوں پر مہر لگنے، زبان کے وقتی طور پر بیکار ہو جانے، ہاتھ پاؤں کے گفتگو کرنے اور انسان کے انجام دیئے ہوئے اعمال پر ان کی گواہی کو پہلی آیت میں بیان کیا گیا ہے۔ یقیناً یہ مسئلہ فقط معاد جسمانی ہی کے ساتھ سازگار ہے وگرنہ معاد روحانی میں تو نہ دست و پا کی کوئی ضرورت ہے اور نہ ہی زبان و دہان اور گفتگو کا کوئی محل ہے۔

دوسری و تیسری آیت کا بیان ہے کہ گوش و چشم یہاں تک کہ گوشت و پوست اس عظیم عدالت میں ان اعمال کی گواہی دیں گے جو وہ انجام دیتے رہے۔

البتہ ممکن ہے یہ گواہی اس طریقے سے ہو کہ خدا انہیں قدرتِ تکلم عطا کرے یا پھر زبان حال سے، کیونکہ گوش و چشم، دست و پا اور گوشت و پوست اعمال کے آثار کو اپنے اندر محفوظ کر لیتے ہیں اور اس دن کہ جو ”یوم البروز“ ہے یہ آثار آشکار ہو جائیں گے (اس کی تشریح انشاء اللہ گواہانِ روز قیامت کی بحث میں بیان ہوگی)۔

چوتھی آیت میں ایسے لوگوں کی بات کی گئی ہے کہ جن کا نامہ اعمال (موفقیت، کامیابی اور پاکیزگی کی علامت کے طور پر) ان کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا اور وہ فخر و مباہات اور سر بلندی کے ساتھ اہل محشر کو اس کے مطالعہ کی دعوت دیں گے اور وہ لوگ کہ جنہیں ان کے برے اعمال کی علامت کے طور پر نامہ اعمال بائیں ہاتھ میں ملے گا ان کی چیخ و پکار بلند ہوگی کہ اے کاش ہمارا نامہ اعمال ہمیں نہ دیا جاتا۔

یہاں پر نہ صرف مختلف اعضائے بدن کی طرف اشارہ کیا گیا ہے بلکہ دائیں اور بائیں ہاتھ کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ پانچویں آیت میں صالحین کے درخشاں اور بدکاروں کے سیاہ و غبار آلود چہروں کا ذکر کیا گیا ہے اور یہ بھی معاد کے جسمانی ہونے پر تاکید ہے۔

نمونے کے طور پر بیان کی جانے والی ان آیات کے علاوہ بھی قرآن مجید میں متعدد آیات ایسی ملتی ہیں جن میں ان طوق و زنجیر کا ذکر ہے جو انکے ہاتھ، پاؤں اور گردن میں پڑی ہوں گی۔ (سورہ ابراہیم ۴۳ اور دھر ۴)

اور ایسی آیات بھی ہیں کہ جنہیں بعض جسمانی حالتوں اور کیفیات تک کا ذکر کیا گیا ہے۔ مثلاً روز قیامت کافروں کے حال پر مومنین کا ہنسنا۔

### فَالْيَوْمَ الَّذِينَ آمَنُوا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُونَ ﴿٣٣﴾ (مطففين ۳۳)

وہ آیات بھی ہیں جو روز قیامت کو ایک ایسے دن سے یاد کرتی ہیں کہ جس دن وحشت و ترس کی شدت سے آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں گی، گردنیں اکڑ جائیں گی، سر آسمان کی طرف کھینچ جائیں گے، یہاں تک کہ شدت رعب اور ترس سے آنکھیں پلک تک نہ جھپک پائیں گی۔

### إِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيهِ الْأَبْصَارُ ﴿٣٤﴾ مُهْطِعِينَ مُقْنِعِينَ رُءُوسِهِمْ لَا

### يَرْتَدُّ إِلَيْهِمْ طَرْفُهُمْ ۖ (ابراہیم ۴۲ و ۴۳)

ایسے دن کا ذکر کیا گیا ہے کہ جس دن ظلم شدت حسرت سے اپنے ہاتھوں کو دانتوں سے کاٹ لیں گے۔

### وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلَى يَدَيْهِ (فرقان ۲۴)

کیا ہم ان تمام آیات کو بغیر کسی واضح دلیل کے کنایہ و مجاز پر محمول کر کے باب الفاظ کے مسلم قواعد سے چشم پوشی کر سکتے ہیں؟

## گروہ نہم

اس گروہ میں ایسی آیات کا بیان ہے کہ جس میں تمام تاریخ انبیاء کے دوران اس دنیا میں پیش آنے والے قیامت کے مختلف نمونوں کو مشتمل کیا گیا ہے۔ مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام اور چار پرندوں کی داستان، حضرت عزیزؑ یا ارمیا پیامبر کا واقعہ، داستان اصحاب کہف اور بنی اسرائیل کے مقتول کا ماجرا، ان سب کی تشریح قبل ”معاد کے تاریخی و عینی نمونے“ کے زیر عنوان بیان ہو چکی ہے۔ یہ تمام واقعات واضح کرتے ہیں کہ معاد فقط روحانی پہلو نہیں رکھتی بلکہ اس میں جسمانی پہلو بھی کارفرما ہے۔ لوگوں کے ساتھ انبیاء کے سوال و جواب کا محور بھی یہی رہا ہے اور ان نمونوں کے پیش کرنے کا مقصد بھی معاد جسمانی کو ثابت کرنا تھا۔ چونکہ ان آیات کو ہم پہلے بہت کھول کر بیان کر چکے ہیں لہذا اب ان پر مزید بحث اور تکرار کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

## نتیجہ بحث

معاد جسمانی کو مختلف بیانات اور طریقوں سے بیان کرنے والے آیات کے ان گروہوں سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے اور اس میں کسی قسم کا کوئی شک و شبہ باقی نہیں رہتا کہ قرآن مجید کی نظر میں (معاد روحانی کے ساتھ ساتھ) معاد جسمانی کا مسئلہ قطعی اور مسلم ہے۔ بلکہ آیات کی وضاحت و صراحت کے پیش نظر یہ کہنا چاہیے کہ معاد جسمانی قرآن مجید کی ضروریات میں سے ہے اور جنہوں نے دوسرا راستہ اختیار کیا ہے قرآن مجید اور اس کی تعلیمات سے نابلد ہیں۔ اب ہم چند وضاحتوں کی طرف بڑھتے ہیں اور معاد جسمانی کے دلائل اور اس کے مخالفین کے اعتراضات کو منطقی صورت میں بیان کر کے اس کی جانچ پرکھ کریں گے۔

## چند وضاحتیں

### معاد جسمانی عقل کی رو سے

کیا معاد اسی عنصری و مادی جسم کے ساتھ عقلی دلائل کے ذریعے قابل اثبات ہے یا نہیں؟ بعض معتقد ہیں کہ ہمارے پاس اس مسئلے پر کوئی خاص عقلی دلیل نہیں ہے ایسے ہی جیسے کہ اس کے انکار پر کوئی دلیل پیش نہیں کی جاسکتی۔ بنا برائیں چونکہ اس کے محال ہونے پر بھی کوئی دلیل نہیں، اس بارے میں قرآن و سنت کی گواہی کافی ہے اور کسی تاویل و توجیہ کی بھی ضرورت نہیں ہے [۱] دوسرے الفاظ میں یہ کہ عقلی دلائل اس مسئلے کی تہہ تک پہنچنے میں ناتواں ہیں اور جب ہم اس مسئلے پر نقلی دلائل کی تاکید دیکھتے ہیں تو اسے قبول کرنے کے علاوہ کوئی چارہ ہی نہیں۔

در حالیکہ بعض احباب معاد جسمانی کو عقلی دلائل کے عین مطابق سمجھتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ انسانی روح بدن کے ساتھ ساتھ پروان چڑھتی ہے، کمال کی منازل طے کرتی ہے اور اسی کے ساتھ متشکل ہوتی ہے۔

بنا برائیں روح اور بدن کا آپس میں بہت قریبی تعلق ہے اور ان کے حالات ایک دوسرے میں منعکس ہوتے ہیں۔ جسی تکالیف روح پر اثر انداز ہوتی ہیں اور روحی تکالیف جسم پر اپنا اثر چھوڑتی ہیں۔ بعینہ ان کا سکون وطمینان بھی ایک دوسرے پر مکمل طور پر موثر ہوتا ہے۔

اس طرح روح اور جسم دودیرینہ دوست ہیں اور باہم نشوونما پاتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ موت روح اور بدن کے رابطے کو عارضی طور پر قطع کر دیتی ہے۔ لیکن مکمل جزا و سزا پانے اور عدالت الہی کے اجراء کے لئے ضروری ہے کہ یہ رابطہ ایک اعلیٰ سطح پر دوبارہ برقرار ہوتا کہ روح اپنے اصلی مرکب کو دوبارہ پالے، اس کے ساتھ پرواز کرے اور اس دنیا کی مادی و معنوی نعمتوں سے بہرہ مند ہو یا پھر اسی کی سختیوں اور عذاب کا مزہ چکھے۔

مختصر یہ کہ یہ دونوں ایک دوسرے کے بغیر ناقص ہیں اور معاد کامل ان دونوں کی بازگشت کے بغیر امکان پذیر نہیں ہے۔

درست ہے کہ پاداش و کیفر اور لذات و الم کا مرکز روح ہی ہے لیکن ہم جانتے ہیں کہ روح متعدد لذات و آلام کو جسم کے ذریعے حاصل کرتی ہے۔ اگر درمیان میں جسم کا واسطہ نہ ہو تو لذات و آلام کا یہ بڑا حصہ مکمل طور پر ختم ہو جائے۔

بنا برائیں عقل گویا ہے کہ جس طرح یہ دونوں اس دنیا میں اکٹھے تھے اسی طرح اس عالم میں بھی انہیں ایک دوسرے کے ساتھ رہنا چاہیے کیونکہ یہ ایک دوسرے کے بغیر ناقص ہیں۔ (دقت نظر فرمائیں)۔

[۱] بحار الانوار میں علامہ مجلسی مرحوم فرماتے ہیں: معاد جسمانی ایسے امور میں سے ہے کہ جس پر تمام ادیان متفق ہیں۔ اسے ضروریات دین میں سے شمار کیا جاتا ہے اور اس کا انکار کرنیوالا مسلمانوں کے زمرے میں نہیں آتا۔ اس سے متعلق آیات قرآن بہت واضح ہیں اور قابل تاویل نہیں ہیں۔ اسی طرح روایات بھی متواتر ہیں جو قابل انکار نہیں ہیں۔ (بحار الانوار ج ۷ ص ۷۷)

## منکرین معاد جسمانی کے شبہات

اب دیکھنا یہ ہے کہ بعض فلاسفہ وغیرہ نے کیوں اس مسئلے کا انکار کیا ہے اور کون سے عوامل اس اعتقاد کی قبولیت کا باعث بنے ہیں؟ ان کی عبارات پر ایک تحقیقی نگاہ ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ درج ذیل آٹھ عوامل اس بارے میں موثر رہے ہیں:

- ۱۔ اعادہ معدوم کا محال ہونا
  - ۲۔ شبہ آکل و ماکول
  - ۳۔ دوران زندگی مواد جسمانی کے تبدیل ہونے کا مسئلہ
  - ۴۔ زمین پر قلت موادِ خاکی
  - ۵۔ کرہ ارض پر معاد جسمانی کی صورت میں قلت مکاں
  - ۶۔ جسم فانی کے لیے حیات باقی کیونکر؟
  - ۷۔ معاد جسمانی و روحانی بیک وقت کیونکر؟
  - ۸۔ چونکہ دوران زندگی جسم کئی بار تبدیل ہوتا ہے تو کیا روز قیامت وہ تمام جسم واپس لوٹیں گے یا ان میں سے بعض؟
- اب ہم ان تمام متذکرہ بالا اعتراضات کی اصل و حقیقت کو پرکھتے ہیں۔

### ۱۔ اعادہ معدوم کا محال ہونا

بعض علماء عقائد معاد جسمانی کے مسئلے میں اعادہ معدوم کی بحث کو گھسیٹ لائے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ انسانی جسم چونکہ کلی طور پر نابود ہو جائے گا اور پھر روز قیامت اس کا دوبارہ پلٹنا یہ اعادہ معدوم کے ضمن میں آتا ہے جب کہ ہم جانتے ہیں کہ اعادہ معدوم محال ہے۔ لہذا یہی وجہ ہے کہ معاد جسمانی کا مسئلہ قابل اعتراض ہے۔

لیکن تھوڑی سی دقت نظر سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اعادہ معدوم اس صورت میں کہ جو قیامت میں ہے، محال نہیں ہے اور نہ ہی معاد اعادہ معدوم کے ضمن میں آتی ہے۔

### وضاحت

اعادہ معدوم کے محال ہونے پر فلاسفہ نے متعدد دلائل پیش کیے ہیں، یہاں تک کہ وہ معتقد ہیں کہ معدوم شدہ چیز کا عالم وجود میں آنا ایسے امور میں شمار ہوتا ہے کہ جن کا محال ہونا جزء بدیہیات ہے کیونکہ کسی شے کی بازگشت اس کی تمام تر خصوصیات اور مشخصات کے ساتھ ہونا

چاہیے اور مسلمان جو چیز کل تک وجود رکھتی تھی آج اس کا اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ واپس لوٹنا محال ہے کیونکہ اس کی خصوصیات میں سے ایک ”کل کے دن میں اس کے وجود کا ہونا“ ہے۔ لہذا کس طرح ممکن ہے کہ ”کل اور آج“ یکجا ہو جائے؟ جب کہ یہ تناقض ہے۔

لیکن اگر اس خصوصیت سے صرف نظر کیا جائے تو کوئی مانع نہیں کہ ایک ایسا وجود پیدا ہو جائے کہ جو تمام پہلوؤں سے بعینہ پہلے وجود کی مانند ہو اور فقط زمانے کے اعتبار سے مختلف ہو۔ واضح ہے کہ یہ وجود عیناً وہی نہیں ہے بلکہ اس کی مثل ہے اور اس طرح اعادہ معدوم کے محال ہونے یا نہ ہونے کا معروف نزاع ایک نزاع لفظی میں بدل جاتا ہے۔ جو نہیں مانتے ان کا کہنا ہے کہ (وجود) اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ واپس نہیں لوٹتا جب کہ طرف دار کہتے ہیں کہ ماسوائے زمان کے اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ واپس لوٹ آتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ معاد جسمانی کے معتقدین میں سے کوئی بھی یہ نہیں کہتا کہ وہ جسم جو دنیا میں تھا روزِ قیامت اسی زمان گذشتہ کی قید کے ساتھ واپس پلٹے گا بلکہ اس کی بازگشت سے مراد دوسرے زمانے میں ہے کہ جو ایک لحاظ سے تو بالکل وہی گذشتہ وجود ہے اور ایک لحاظ سے اس کی مانند ہے (وقت نظر فرمائیں)

علاوہ ازیں معاد کسی طور پر بھی اعادہ معدوم نہیں ہے کیونکہ روح تو معدوم نہیں ہوتی اور من و عن باقی رہتی ہے۔ جسم اگر چہ پراگندہ و منتشر ہو کر خاک میں تبدیل ہو جاتا ہے لیکن نابود ہرگز نہیں ہوتا۔ فقط اس کی ظاہری صورت جاتی رہتی ہے اور روزِ قیامت خاک کے یہی ذرات اپنی پہلے والی صورت اختیار کر لیں گے۔ اگر اعادہ معدوم کے بارے میں بات کی بھی جائے تو فقط ظاہری صورت کے بارے میں ہے کہ اسی جیسی روزِ قیامت پلٹ آئے گی۔ لیکن ایک طرف روح اور دوسری طرف مادہ جسمانی کی وحدت اس انسان کی شخصیت کی حفاظت کا سبب ہے۔ اسی لیے ہم کہتے ہیں کہ یہ انسان وہی فرد ہے کیونکہ اس کی روح وہی روح ہے، مادہ جسمانی بھی وہی ہے اور جسمانی صورت بھی اسی کے مشابہ ہے۔

سورہ یس آیت ۸۱ میں ”مثل“ کی تعبیر بھی شاید اسی معنی پر دلالت کرتی ہے۔

أَوَلَيْسَ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِقَدِيْرٍ عَلٰۤى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ ؕ  
”جس نے زمین و آسمان کو خلق کیا ہے آیا وہ اس پر قادر نہیں ہے کہ اس کی مثل انسانوں کو خلق کرے؟“  
سورہ نساء آیت ۵۶ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

كُلَّمَا نَضٰجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا لِيَذُوْقُوْا الْعَذَابَ ط  
”جب بھی ان (دوزخیوں) کے جسم کی کھالیں جل جائیں گی تو ہم ان کی کھالوں کو بدل دیں گے تاکہ وہ عذاب کا مزہ چکھیں۔“

ابن ابی العوجاء نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے سوال کیا:

ما ذنب الغیر

ان دوسری جلدوں کا کیا گناہ کہ..... وہ بھی جلیں؟!

امام نے اس کے جواب میں فرمایا:

**ہی ہی وہی غیرہا**

نئی جلد وہی پہلے والی جلد ہے اور اس کے باوجود دوسری ہے۔

ابن ابی العوجانے مزید توضیح کا تقاضا کرتے ہوئے عرض کیا: دنیاوی امور میں سے کوئی مثال بیان کیجیے۔ امام نے فرمایا:

**ارایت لو ان رجلا اخذ لبنة فکسر هائم ردھا فی ملبنھا، فھی ہی وہی**

**غیرہا**

”یہ اسی طرح ہے جیسے کسی نے کوئی اینٹ لی ہے اسے توڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کیا اور پھر قالب میں ڈال کر نئی اینٹ بنا

لی۔ اب یہ اینٹ وہی پہلے والی اینٹ ہے اور اس کے باوجود دوسری ہے۔

اس کا مادہ اصل تو وہی ہے لیکن ان کی صورت پہلی صورت کے مشابہ ہے۔<sup>[۱]</sup>

## ۲۔ شبہ آکل و ماکول

دوسرا سوال جو اس بحث میں بیان کیا گیا ہے، یہی شبہ آکل و ماکول ہے جو درحقیقت معاد جسمانی کی پیچیدہ ترین بحثوں میں سے

ایک ہے۔

**توضیح**

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک آدمی کے جسم کے اجزاء کسی دوسرے کے بدن کا حصہ بن جاتے ہیں۔ ایسا خواہ براہ راست ہو جیسا کہ قحط کے زمانے میں کوئی کسی دوسرے انسان کا گوشت کھالے یا بالواسطہ ہو کہ جب انسانی جسم خاک ہو جائے اور اس خاک کا غذائی مواد نباتات کا حصہ بن جائے اور پھر انسان ان نباتات (سبزیوں، دالوں، پھلوں وغیرہ) کو کھانے میں استعمال کرے، یا پھر حیوانات ان سے اپنی غذا حاصل کریں اور وہ حیوان انسانی غذا کے کام آئے۔ بلکہ اس بات کا بھی امکان ہے کہ انسانی بدن کے بعض حصے ریزہ ریزہ ہو کر بخارات اور گیس میں تبدیل ہو جائیں اور سانس کے ذریعے کسی دوسرے انسان کے بدن میں داخل ہو جائیں۔

[۱] بحار الانوار ج ۷ ص ۳۸ حدیث ۶۔ یہی مطلب ایک اور حدیث میں مختصر تفاد کے ساتھ ذکر ہوا ہے۔ (بحار الانوار ج ۷ ص ۳۹

حدیث ۷)

نور الثقلین میں بھی متذکرہ بالا حدیث سورۃ نساء آیت ۵۶ کے ضمن میں ذکر ہوئی ہے۔ ج ۱ ص ۴۹۴

یہ بھی ممکن ہے کہ ایک انسان کا پورا بدن تریجاً کسی دوسرے انسان کے بدن کا حصہ بن جائے۔  
اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ روح کے بدن میں پلٹنے کے وقت یہ اجزاء کس بدن کا حصہ ہوں گے؟ اگر پہلے بدن کا حصہ نہیں تو باقی ابدان ناقص رہ جائیں گے اور اگر بعد والے ابدان کا حصہ بن جائیں تو پہلے بدن کے لیے کچھ باقی نہ بچے گا۔ علاوہ ازیں ممکن ہے ان میں سے بعض اچھے لوگ ہوں اور بعض بدکار۔ بالآخر ان اجزاء کا کیا بنے گا؟

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور چار پرندوں کے واقعے (بقرہ ۲۶۰) کی شان نزول سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا سوال معاد جسمانی اور شبہہ آکل و ماکول کے بارے میں تھا۔ حضرت ابراہیمؑ نے دریا کے کنارے ایک مردار کو دیکھا کہ جس کا کچھ حصہ دریا میں تھا اور دریائی جانور اسے کھا رہے تھے اور باقی بدن خشکی پر تھا جس سے خشکی کے حیوانات کھا رہے تھے۔ اس مسئلے نے حضرت ابراہیمؑ کو سوچ میں ڈال دیا اور اسی بناء پر انہوں نے بارگاہِ خداوند میں معاد کے کسی نمونے کا تقاضا کیا۔

## جواب

ان قدیمی اعتراضات کے مختلف جوابات دیئے گئے ہیں جن میں سے معروف ترین ”اصلی اجزاء“ پر اعتقاد ہے۔ اس عقیدے کے طرف داروں کا کہنا ہے کہ انسانی بدن دو طرح کے اجزاء سے مرکب ہے: ”اصلی اور غیر اصلی اجزاء“۔ اصلی اجزاء تو وہی ہیں کہ جن میں ہرگز کمی بیشی نہیں ہوتی اور غیر اصلی اجزاء وہ ہیں کہ جو ہمیشہ کم و زیادہ ہوتے رہتے ہیں۔

اصلی اجزاء موت کے بعد ہمیشہ باقی رہتے ہیں اور اگر خاک بھی ہو جائیں تو وہ خاک کسی دوسرے جاندار کے بدن کا حصہ نہیں بنتی۔ روزِ قیامت بھی اجزاء اکٹھے ہو کر انسانی جسم کو تشکیل دیں گے اور پھر روح اس سے ملحق ہو جائے گی۔

بعض روایات بھی اس نظریے کی تائید کرتی ہیں۔ روایت ہے کہ مصدق بن صدقہ عمار بن موسیٰ سے نقل کرتا ہے کہ اس نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھا کہ کیا میت کا پورا جسم بوسیدہ ہو جائے گا؟ امام علیہ السلام نے جواب میں فرمایا: جی ہاں، یہاں تک کہ اس کا گوشت اور ہڈیاں بھی باقی نہ بچیں گی ماسوائے اس خاک کے کہ جس سے وہ ابتداء میں خلق ہوا تھا:

**فانہا لاتبلی وتبقى فی القبر مستدیرۃ، حتی یخلق منها کما خلق منها**

## اول مرہ

”وہ حصہ بوسیدہ نہ ہوگا اور قبر میں ہمیشہ باقی رہے گا یہاں تک کہ اس سے اس کی پھر ویسے ہی خلقت ہوگی جیسے پہلے ہوئی تھی۔“ [۱]

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے ایک اور مرسل روایت نقل کی گئی ہے کہ آپؑ نے بنی اسرائیل کی گائے کے ذبح سے متعلق فرمایا:



**فاخذوا قطعة وهي عجب الذنب الذي منه خلق ابن ادم، وعليه يركب**

**اذا اريد خلقا جديدا فضر به بها۔**

”پس انہوں نے اس (ذبح شدہ گائے) کے ایک ٹکڑے کو لیا اور اسے مقتول پر مارا اور وہ ٹکڑا ریڑھ کی ہڈی کا آخری مہرہ تھا وہی چیز کہ جس سے فرزندِ آدم بھی خلق ہوں گے اور جدید خلقت کے وقت اسی سے ترکیب پائیں گے۔“ [۱]

یہ نکتہ قابلِ توجہ ہے کہ دوسری حدیث مرسل ہونے کی وجہ سے ضعف اور پہلی حدیث ”عمر بن سعید“ کے اختلافی ہونے کی وجہ سے قابلِ بحث ہے۔

علاوہ ازیں آپ دیکھیں گے کہ یہ روایات ظاہر قرآن کے مطابق بھی درست نہیں ہیں۔ لہذا ان پر اعتناء نہیں کیا جاسکتا۔ بہر حال سائنسدانوں کی موجودہ تحقیقات اس مسئلے کی نفی کرتی ہیں اور اجزائے بدن کے درمیان کوئی تفاوت روا نہیں رکھتیں۔ وہ اس بات کے قائل ہیں کہ تمام اجزائے بدن خاک ہو سکتے ہیں اور طبعی طور پر دوسرے انسانوں کے بدن کا حصہ بن سکتے ہیں۔ اجزائے اصلیہ کے معتقد حضرات ریڑھ کی ہڈی کہ جسے عربی میں عجب الذنب کہتے ہیں، کو جزء اصلی جانتے ہیں اور انکے بقول وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ ختم نہیں ہوتی جب کہ مشاہدات اس مطلب کی تائید نہیں کرتے۔ کئی بار ایسا ہوا ہے کہ آگ لگنے کے واقعات میں تمام بدن جل کر راکھ ہو گیا اور اس راکھ اور دوسری خاک کے درمیان کوئی فرق بھی دکھائی نہیں دیتا۔

علاوہ ازیں نظریہ فوق قرآنی آیات کے مطابق بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ وہ عربی شخص کہ جو بوسیدہ ہڈی لے کر آیا تھا اور کہتا تھا کہ کون اسے زندہ کرے گا، قرآن اس شخص کے جواب میں کہتا ہے: ”وہی کہ جس نے ابتداء میں اسے پیدا کیا دوبارہ اس کے بدن کو لباسِ حیات سے ڈھانچے گا۔“ بہت بعید دکھائی دیتا ہے کہ وہ مرد عرب فقط ریڑھ کی ہڈی کو ہاتھ میں لئے ہوئے اس کے بارے میں سوال کر رہا ہو۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے چار پرندوں والی داستان سے بھی ظاہر ایسی ہی پتہ چلتا ہے کہ ایک دوسرے سے جدا ہونے والے تمام اجزاء لوٹ آئیں گے۔

بہر حال موجودہ شرائط اور قرآنی متن کو مد نظر رکھتے ہوئے اس جواب پر بھی بھروسہ نہیں کیا جاسکتا اور اس کے اثبات کے لئے خبر واحد پر قناعت نہیں ہو سکتی۔

”شبہ اکل و ما کول“ کے جواب میں بعض دوسرے لوگوں نے ایک اور راہ اپناتے ہوئے کہا ہے کہ لازم نہیں ہے کہ جسم کے وہی سابقہ اجزاء پلٹ آئیں کیونکہ انسان کی شخصیت تو اس کی روح سے مربوط ہے اور روح کسی بھی جسم سے تعلق رکھے وہی پہلے والا انسان ہوگا۔ لہذا دورانِ زندگی انسانی جسم میں رونما ہونے والی تبدیلیاں، اجزاء کا تبدیل ہونا اور دوسرے اجزاء کا ان کی جگہ لے لینا انسانی شخصیت کو ہرگز نقصان



نہیں پہنچاتا۔

بنا برائیں کوئی مانع نہیں کہ خدا ایک اور جسم خلق کرے اور روح اس سے متعلق ہو جائے اور پھر یہ روح اس جسم کے ساتھ بہشتی نعمتوں سے بہرہ ور ہو یا پھر دوزخ کے عذاب میں مبتلا ہو، ہم جانتے ہیں کہ لذت و عذاب کا تعلق روح سے ہے اور جسم کا کردار ایک واسطے سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔

یہ جواب بھی ٹھیک نہیں ہے کیونکہ بہت ساری آیات قرآن کے ساتھ ٹکراتا ہے جیسا کہ گذشتہ مباحث میں ہم نے بیان کیا ہے کہ قرآن کہتا ہے کہ روز قیامت وہی بوسیدہ ہڈیاں ان قبروں سے اٹھیں گی نہ یہ کہ اللہ ایک اور جسم کو خلق کرے گا تا کہ روح اس سے وابستہ ہو سکے۔ لہذا مذکورہ بالا جواب بھی قابل اعتبار نہیں ہے۔

## شبہ آکل و ماکول کا آخری جواب

اس سوال کے بہترین جواب کے لئے ضروری ہے کہ چند مقامات کا ذکر کیا جائے۔

۱۔ ہم جانتے ہیں کہ انسان کے اجزائے بدن بچپن سے لے کر موت تک کئی بار تبدیل ہوتے ہیں۔ دماغی خلیات اگرچہ تعداد کے اعتبار سے کم زیادہ نہیں ہوتے لیکن اجزاء کے اعتبار سے تبدیل ہو جاتے ہیں اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہی ان کی مکمل تبدیلی کا باعث ہوتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ سات سال کے عرصہ تک پہلے والے انسانی بدن کے ذرات میں سے کوئی ایک بھی باقی نہیں رہتا۔ لیکن اس امر کی طرف توجہ رہنا چاہیے کہ پہلے والے ذرات ختم ہوتے وقت اپنے تمام آثار و خواص نئے خلیوں کو منتقل کر دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انسان کی جسمانی خصوصیات رنگ، شکل، صورت اور دیگر کیفیات باقی رہتی ہیں اور ایسا فقط نئے خلیات تک انتقال صفات ہی کی وجہ سے ممکن ہے۔ (وقت نظر فرمائیں)

بنا برائیں ہر انسان کے وہ آخری اجزائے بدن کہ جو مرنے کے بعد خاک میں تبدیل ہو جاتے ہیں ان تمام صفات کا مجموعہ ہوتے ہیں کہ جو وہ پوری زندگی کے دوران کسب کرتے ہیں اور یہ انسانی جسم کی ساری زندگی کی کہانی بیان کرنے والی تاریخ کا کردار ادا کرتے ہیں۔

۲۔ درست ہے کہ روح ہی انسانی شخصیت کی بنیاد فراہم کرتی ہے لیکن اس امر کی طرف بھی توجہ رہنا چاہیے کہ روح جسم کے ہمراہ پرورش اور تکامل کی منازل طے کرتی ہے اور دونوں ایک دوسرے پر موثر ہوتے ہیں۔ لہذا جس طرح دو جسم تمام جہات سے باہم ایک دوسرے کے مشابہ نہیں ہیں اسی طرح دو روہیں بھی تمام پہلوؤں کے اعتبار سے آپس میں شباهت نہ رکھتی ہوں گی۔ بنا برائیں کوئی بھی روح بغیر اس جسم کے جس کے ساتھ اس نے پرورش پائی اور تکامل پیدا کیا مکمل اور وسیع فعالیت کی حامل نہیں ہو سکتی۔ لہذا روز قیامت اسی سابقہ جسم کو واپس پلٹنا چاہیے تاکہ روح اس سے ملحق ہو کر اپنی فعالیت کا نسبتاً ایک بڑے مرحلے میں آغاز کرے اور انجام شدہ اعمال کے نتائج سے بہرہ مند ہو سکے۔

۳۔ انسانی بدن کے ذرات میں سے ہر ایک اس کی تمام جسمی خصوصیات کا حامل ہوتا ہے۔ یعنی اگر ہم جسم کے ہر ایک سیل کی

پرورش کریں، یہاں تک کہ وہ ایک مکمل انسان کی صورت میں تبدیل ہو جائے تو یہ انسان ان تمام شخصی صفات کا حامل ہوگا کہ جس سے یہ سیل حاصل کیا گیا تھا۔ (توجہ فرمائیں)۔

کیا وہ پہلے دن ایک سیل سے زیادہ کچھ تھا؟ نطفے کا ایک سیل ہی اس کی تمام صفات کا حامل تھا اور تدریجاً تقسیم کے ذریعے دوسلوں میں تبدیل ہو گیا اور پھر دو سے چار خلیوں میں اور اسی طرح انسانی بدن کے تمام خلیے وجود میں آ گئے۔ بنا برائیں انسانی بدن کے خلیوں میں سے ہر ایک پہلے والے سیل ہی کی ایک شاخ ہے کہ اگر اسی کی طرح پرورش پائے تو ہر لحاظ سے اسی سے مشابہ ایک ایسا انسان بن جائے گا جو اس کی صفات کا حامل ہو۔

۴۔ معاد جسمانی کے بارے میں قرآنی آیات سے جو پتہ چلتا ہے وہ یہ ہے کہ آخری انسانی بدن کہ جو خاک میں تبدیل ہو گیا ہے اور قبر میں موجود ہے حکم خدا سے زندہ ہوگا اور حساب و کتاب کے لئے آمادہ ہو جائے گا۔ قرآن کی نظر میں معاد جسمانی کے موضوع پر بیان کی جانے والی بے شمار آیات اس مطلب پر دلالت کرتی ہیں۔

۵۔ کسی ایک بدن کا دوسرے بدن میں مکمل طور پر ضم ہو جانا ممکن نہیں ہے۔ یا دوسرے الفاظ میں یہ کہ جسم اول سارے کا سارا جسم دوم نہیں بن سکتا۔ بلکہ جسم اول جسم دوم کا فقط ایک حصہ ہی بن سکتا ہے کیونکہ جسم دوم کو قبل از موجود ہونا چاہیے تا کہ وہ پورے بدن اول کو یا اس کے کچھ حصے کو تجزیے کے ذریعے اپنا جزء بنا سکے۔

پس کوئی ایک پورا بدن کسی دوسرے بدن کا جزء تو بن سکتا ہے لیکن اس کا ”کل“ بننا ممکن نہیں ہے۔ جیسے متعدد ابدان کا کسی دوسرے بدن کا جزء بننا تو ممکن ہے لیکن اس کے ”کل“ کو تشکیل نہیں دیتے۔ (دقت نظر فرمائیں)

متذکرہ بالا چار مقدمات کی روشنی میں اب ہم شبہہ آکل و ماکول کے اصل جواب کی طرف بڑھتے ہیں:

قرآن صراحت سے کہتا ہے کہ موت کے وقت انسانی بدن کے موجود آخری ذرات ہی روزِ قیامت واپس لوٹیں گے۔ لہذا اگر یہ ذرات خاک ہو کر کسی دوسرے انسان کے بدن کا حصہ بن بھی جائیں تو روزِ قیامت اپنے اصلی بدن یعنی اسی پہلے والے شخص کے بدن میں واپس لوٹ آئیں گے۔ البتہ آپ یہ کہیں گے کہ اس طرح تو بدن دوم ناقص ہو جائے گا چونکہ بعض اجزاء کو جو کھو بیٹھا ہے۔ لیکن بہتر یہ ہے کہ یوں کہا جائے کہ بدن دوم چھوٹا اور لاغر ہو جائے گا (ناقص ہوگا) کیونکہ بدن اول کے اجزاء بدن دوم کے کسی ایک حصے میں نہیں بلکہ پورے بدن میں منتشر اور پراگندہ ہیں (چونکہ انسان غذا بھی کھاتا ہے وہ پورے بدن میں تقسیم ہو جاتی ہے)۔ اس لئے ممکن ہے کوئی ستر کلو گرام وزن کا حامل انسان اپنا آدھا یا سوائے ایک کلو گرام کے باقی سارا وزن کھو بیٹھے اور اس کا بچپن جتنا یا حالت جنین جتنا چھوٹا سا بدن باقی بچے!

اس مسئلے سے کوئی نئی مشکل کھڑی نہیں ہوتی کیونکہ یہ چھوٹا بدن ان تمام خصوصیات کا حامل ہے جو اس بڑے بدن میں موجود تھیں اور یہ نمو کرے تو اسی بڑے بدن کی صورت میں تبدیل ہو جائے گا۔

کیا پہلے دن نوزاد بچے کا جسم چھوٹا نہ تھا اور کیا اس سے بھی پہلے دورانِ جنین میں ایک ننھا منسا وجود نہ تھا؟ بعد ازاں بڑھا پھولا اور ایک مکمل انسان کی صورت سے تبدیل ہو گیا۔ نہ اس کی شخصیت تبدیل ہوئی اور نہ ہی کوئی نیا شخص وجود میں آیا۔

فقط ایک سوال جو یہاں باقی بچتا ہے وہ یہ ہے کہ ان اجزائے خاص کا کیا بنے گا جو دو یا سے زیادہ ابدان کا حصہ بن گئے ہیں اور ان ابدان میں سے ایک تو مطیع و فرمانبردار انسان ہے جب کہ دوسرا گناہ گار؟

اس سوال کا جواب بھی مشکل نہیں ہے چونکہ جیسے پہلے بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ جزاء و سزا درحقیقت روح کے لئے۔ اسی لئے جب بیہوشی کے ذریعے وقتی طور پر اس رابطے کو منقطع کر دیا جاتا ہے تو سرجن بدن کو اوزار سے چیر پھاڑ کر دیتا ہے جب کہ روح کو کوئی تکلیف نہیں پہنچتی۔

دوسرے الفاظ میں یہ کہ بدن اکیلا جزا و سزا، دکھ درد اور لذت حاصل نہیں کرتا بلکہ یہ تو انسانی روح کے کیفر و پاداش اور لذت و الم کے لیے ایک آلہ ہے۔

متذکرہ بیانات کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ظاہر آیات کے مطابق معاد جسمانی اسی مادی و عنصری جسم کے ساتھ ہوگی اور آکل و ماکول کے مفروضے سے کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوتا۔

اس نکتے کا ذکر بھی تاکیداً ضروری ہے کہ معاد جسمانی کا انکار کرنے والے بعض لوگ اسلامی معاشرے میں اور قرآن کی واضح آیات کے مقابلے میں اپنی بات کا بھرم قائم رکھنے کے لیے معاد جسمانی کے بارے میں ایسی تعبیرات بیان کرتے ہیں کہ جن کی بازگشت معاد روحانی کی طرف ہوتی ہے یا اس معاد جسمانی کی طرف کہ جو اس مادی جسم کے بغیر ہو۔

یہ لوگ جسم کو کبھی ایک نوع سے تعبیر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ انسان کی شخصیت چونکہ روح سے وابستہ ہے لہذا یہ روح کسی بھی جسم کے ساتھ تعلق پیدا کر لے اسی شخص کی تشکیل کا باعث بنے گی اور کبھی جسم برزخی کا سہارا لیتے ہیں اور ان لطیف نورانی اجسام کے ساتھ معاد کے برپا ہونے کے قائل ہیں اور کبھی کہتے ہیں کہ کسی چیز کی شیعیت اور ہستی اس کے مادے کے ساتھ نہیں ہوتی بلکہ اس کی صورت کے ساتھ ہوتی ہے اور جب تک صورت موجود ہے اس چیز کی ہستی بھی موجود ہے اور صورت کی بقاء کا دار و مدار روح انسانی کے ساتھ وابستہ ہے۔ بنا برائیں جہاں روح ہوگی وہاں انسان کی تمام شیعیت اور ہستی بھی ہوگی۔

ان تعبیرات میں سے کوئی ایک بھی اس قرآنی معاد جسمانی کے ساتھ ہم آہنگ نہیں کہ جو گذشتہ متعدد آیات میں بیان ہوئی ہے۔ درحقیقت بعض فلاسفہ کی آراء کے ساتھ دل بستگی اور آکل و ماکول کے مسئلہ کو حل نہ کر سکنان باتوں کی طرف میلان کا باعث بنا ہے کہ جو ایک پابند قرآن اور مسلمان عالم کے شایانِ شان نہیں ہے۔

### ۳۔ دورانِ زندگی موادِ جسمانی کے تبدیل ہونے کا مسئلہ

ایک اور مطلب کہ جس نے بعض اذہان کو معاد جسمانی کے حوالے سے مشوش کر رکھا ہے وہ زمین پر مٹی کی قلت کا مسئلہ ہے۔

## توضیح

پوری تاریخ میں اس کرۂ خاکی پر قدم رکھنے والے انسان اور دنیا کے خاتمے تک آنے والے تمام انسانوں کو اگر ہم ذہن میں رکھیں اور پھر سوچیں کہ وہ سب کے سب خاک ہو جائیں گے تو اس طرح خاک کی ایک عظیم مقدار وجود میں آجائے گی جب کہ زمین پر موجود خاک کی مجموعی مقدار کے لئے مشکل ہے کہ وہ اتنی بڑی مقدار کی ضرورت کو پورا کر سکے مگر یہ کہ ہم کہیں کہ اس دن انسان انتہائی چھوٹے بونوں کی شکل میں محسوس ہوں گے اور یہ بھی عجیب دکھائی دیتا ہے۔ بہر حال اس موجودگی سے ان سب انسانوں کے دوبارہ پیدائش ایسے ہی ہے جیسے ہم ایک ہزار ٹن لوہے سے کئی ملیون گاڑیاں بنانا چاہیں۔

## جواب

کیا یہی اچھا ہوتا اگر اس قسم کے اعتراضات کرنے والے احباب اپنے آپ کو کچھ زحمت دیتے اور کاغذ قلم لے کر ایک سرسری حساب کتاب کر لیتے تاکہ معلوم ہو جاتا کہ ایسے اعتراضات حقیقت سے کس قدر دور ہیں۔ اس امر کو مد نظر رکھتے ہوئے کہ ہر انسانی بدن تقریباً ۶۵ تا ۷۰ فیصد پانی پر مشتمل ہے اور خاکی مواد کی مقدار فقط ۳۰ فیصد ہے، لیکن ہم فرض کرتے ہیں کہ بدن کا تمام وزن اسی خاکی مواد ہی پر مشتمل ہے۔

آپ کے خیال میں ایک مکعب میٹر خاک کا کتنا وزن ہوگا؟ تقریباً دو سے تین ٹن تک! اور اگر ہر انسان اوسطاً ساٹھ کلوگرام کا ہو تو ایک مکعب میٹر خاک چالیس متوسط انسانوں کے لئے کافی ہے۔ اس حساب کے تحت ایک مکعب کلو میٹر کہ جو درحقیقت ایک ارب مکعب میٹر خاک بنتی ہے کرۂ زمین پر موجودہ آبادی سے آٹھ گنا زیادہ لوگوں کے لئے کافی ہوگی۔ یہ امر قابل توجہ ہے کہ گذشتہ ادوار میں کرۂ زمین کی آبادی آج کی نسبت بہت کم تھی اور شاید بنی نوع انسان کی پوری تاریخ میں اس کرۂ خاکی پر چالیس ارب لوگ بھی نہ آئے ہوں۔

اب جب کہ ایک مکعب کلو میٹر سے متعلق یہ حساب کرۂ زمین کے حجم کے مقابلے میں ایک ذرے کے برابر بھی نہیں ہے اور اصلاً کسی کھاتے میں نہیں آتا، اب آپ سوچیں کہ اگر ایک مکعب کلو میٹر کی بجائے سو ہزار یا ایک ملین مکعب کلو میٹر کو مد نظر رکھا جائے تو یہ بھی کرۂ زمین کے حجم کے مقابلے میں کوئی بڑی چیز نہیں ہے۔ اب اس صورت میں ایسے اعداد و شمار کے ساتھ ہمارا واسطہ پڑے گا جو ہمارے مطلب کو انتہائی آشکار کر دیتے ہیں۔

اب جب کہ آپ نے اس حساب کتاب کی زحمت فرمائی ہے تو آئیے ذرا افق زمان کی سیروسیاحت پر نکلتے ہیں۔

آپ کے خیال میں ایک انسان کی اوسط عمر کیا ہوگی؟

یاد دوسرے الفاظ میں یہ کہ کتنا عرصہ لگتا ہے کہ ایک نسل مکمل طور پر ختم ہو جائے اور دوسری نسل اس کی جگہ لے لے۔

شاید اوسطاً پچاس سال یا اس سے کچھ کم و بیش۔

لہذا ایک مکعب کلومیٹر خاک کم از کم آٹھ نسلوں یا چار سو سال تک کا احاطہ کر سکتی ہے۔ (اس صورت میں کہ اگر گذشتہ نسلوں کی آبادی کو بھی موجودہ تعداد کے برابر تصور کیا جائے کہ جو قطعاً یوں نہ تھی)۔

لہذا انسانی زندگی کے ایک ملین سال کے لئے فقط دو ہزار پانچ سو مکعب کلومیٹر خاک کافی ہے اور چار ملین سال کے لئے صرف دس ہزار مکعب کلومیٹر خاک کی ضرورت پڑے گی۔ جب کہ ہم جانتے ہیں کہ کسی بھی نظریے کے مطابق کرۂ زمین پر حیات بشر کو چار ملین سال نہیں گزرے اور ہمیں نہیں پتہ کہ دنیا کے اختتام میں کتنی مدت باقی ہے؟

البتہ اس طرح جو بھی حساب ہو تمام تاریخ کے دوران انسانی ابدان کی خاک زمین کے فقط ایک چھوٹے سے گوشے پر مشتمل ہوگی، دس ہزار مربع کلومیٹر اور ایک کلومیٹر گہرائی پر مشتمل ایک چھوٹی سی ریاست۔

چونکہ ہمارے لئے کوئی مشکل نہ تھی لہذا ہم نے اس سارے حساب کتاب کو بڑے فیاضانہ انداز سے انجام دیا ہے۔ نہ تو ہم نے انسانی بدن کے پانی کا حساب کیا ہے اور نہ ہی گذشتہ نسلوں کی تعداد کو کم شمار کیا ہے کہ جو آج کی نسبت بہت قلیل تھی اور اسی طرح دنیا کے آئندہ زمانہ کے لیے بھی ایک طولانی وقت کو مد نظر رکھا ہے۔

مختصر یہ کہ کرۂ زمین کی خاک کا معاد جسمانی کے لئے کافی نہ ہونے کا دعویٰ کسی ایسے ہی شخص سے ممکن ہے کہ جو اس سادہ سے حساب کو بھی نہ جانتا ہو۔ یا پھر وہ لٹھ مار اور بغیر ناپ تول کے بات کرنے والا ہوگا۔

## ۴۔ زمین پر درکار مٹی کی قلت

یہ مسئلہ بھی بعض لوگوں کے ذہن کو مشوش کئے ہوئے ہے کہ اگر معاد بصورت جسمانی ہو اور تمام تاریخ کے لوگوں کے لئے قیامت ایک ہی وقت میں برپا ہو تو اس کرۂ زمین پر ان سب کے لئے گنجائش نہ ہوگی۔ مختصر یہ کہ اگر معاد جسمانی سے متعلق یہ تمام مشکلات حل ہو بھی جائیں تو ان سب انسانوں کا لوٹنا مناسب نہ ہوگا کیونکہ کرۂ زمین تو موجودہ نسل کے لئے بھی کم ہے جب کہ ماہرین آبادی بھی خبردار کرتے رہتے ہیں کہ اگر آبادی کے بڑھنے کی شرح اسی برق رفتاری سے جاری رہی تو محیط زمین آئندہ نسل کے لئے تنگ ہو جائے گا۔ اب آپ سوچیں اگر گذشتہ اور آئندہ کی تمام نسلیں ایک جگہ جمع ہو جائیں تو کیا بنے گا؟

لیکن اگر معاد بصورت روحانی ہو تو اس حوالے سے ہمیں کوئی مشکل نہ ہوگی کیونکہ عالم ارواح میں تو ایسی کوئی مشکل نہیں ہے۔

## جواب

یہ اعتراض پیش کرنے والے اس نکتے سے غافل رہے ہیں کہ قرآن کی واضح آیات کے مطابق معاد کرۂ زمین پر اس کی موجودہ صورت میں انجام نہ پائے گی بلکہ یہ زمین تبدیل ہو جائے گی:

### يَوْمَ تُبَدَّلُ الْأَرْضُ غَيْرَ الْأَرْضِ وَالسَّمَوَاتُ

”اس روز یہ زمین ایک اور زمین میں اور آسمان دوسرے آسمانوں میں تبدیل ہو جائیں گے۔ (ابراہیم: ۴۸)

قرآن مزید کہتا ہے کہ بہشت کی وسعت زمین و آسمان کی پنہائیوں کے برابر ہے:

### سَابِقُوا إِلَىٰ مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ

”اپنے پروردگار کی مغفرت اور اس جنت کے حاصل کرنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جاؤ کہ جس کی

پنہائی زمین و آسمان کے برابر ہے۔“ (حدید: ۲۱)

ان آیات مجیدہ اور قرآن پاک کی بعض دیگر آیات سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ یا تو زمین میں اس قدر گسترش اور وسعت پیدا ہو جائے گی کہ یہ زمین و آسمان کی وسعت کے برابر ہو جائے اور جنت و دوزخ اور تمام انسانوں کو اپنے اندر سمو لے یا پھر روز قیامت انسانوں کو اس کرۂ زمین سے کسی اور جگہ منتقل کر دیا جائے گا۔ البتہ ان دو صورتوں میں تمام انسانوں کے لئے معاد جسمانی کے حوالے سے جگہ کی قلت کا مسئلہ باقی نہیں رہتا اور اس طرح تمام دوزخیوں اور بہشتیوں کے لئے سکونت کا وہ مسئلہ حل ہو جاتا ہے کہ جو اس سے متعلق اعتراض کرنے والوں کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔

## ۵۔ جسم فانی کے لئے حیاتِ باقی کیونکر؟

ایک اور سوال کہ جو معاد جسمانی کے متعلق اٹھایا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ آخرت سرائے جاوید ہے اور آیاتِ خلود اس کی جاودانی پرورش دلیل ہیں جب کہ جسم مادی کچھ بھی ہو کہ نہ اور فرسودہ ہو جاتا ہے اور آخر کار گل سڑ کر ختم ہو جاتا ہے۔ اب اگر معاد جسمانی ہو تو یہ تضاد پیش آئے گا کہ ”فنا“، ”عالم بقا“ میں جانکلے اور وہ جسم کہ جس کی طبیعت ہی میں فنا ہونا ہے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے باقی رہے۔

علامہ علی مرحوم نے تجرید العقائد کی شرح میں اس اعتراض کو یوں بیان کیا ہے کہ جسمانی قوی محدود اور متناہی ہیں جب کہ اہل بہشت کی نعمتوں کے جاودا ہونے پر اعتقاد کا لازمہ لامحدود اور لامتناہی ہونا ہے۔<sup>[۱]</sup>

## جواب:

اس سوال کا جواب بھی کوئی پیچیدہ نہیں ہے چونکہ اس میں تو کوئی اعتراض نہیں ہے کہ جسم اپنی طبیعت کے اعتبار سے فانی، فرسودہ اور بوسیدہ ہونے والا ہے۔ لیکن یہ اس صورت میں ہے کہ اسے مسلسل کوئی بیرونی امداد نہ ملے اور اگر باہر سے الہی امداد اس کے شامل حال رہے تو یہ

امداد جسم کو ہمیشہ کے لئے تازہ دم اور نیا رکھ سکتی ہے۔

یہ بالکل اس درخت کی مانند ہے کہ جو ہر روز ملنے والی مخصوص غذا کے استعمال سے اپنے فرسودہ خلیوں کو از سر نو تعمیر کر سکتا ہے اور ہمیشہ تروتازہ، شاداب اور جوان رہ سکتا ہے اور ایسی بات ہرگز محال نہیں ہے۔

یاد دوسرے الفاظ میں یہ کہ اقتضائے ذات اور چیز ہے اور ذات کے بیرونی عوامل کی اقتضاء ایک اور چیز، جب کہ بحث یہ ہے کہ انسانی بدن کے خلیے جو اپنی طبیعت کے اعتبار سے معین عمر کے حامل ہیں، خدا کے خلق کردہ طریقوں اور بیرونی عوامل کے ذریعے اپنی تعمیر نو کر کے غیر محدود عمر پیدا کر سکتے ہیں اور اس طرح دوام حاصل کر لیتے ہیں۔

اس اعتراض کو متذکرہ بالا انداز میں بیان کرنے کے بعد علامہ حلی مرحوم ایک خاص بے اعتنائی کے ساتھ فرماتے ہیں: یہ دلیل نہیں ہے بلکہ یہ تو دور کی کوڑی لانے کے مترادف ہے یعنی اس کی کوئی منطقی بنیاد نہیں ہے اور ایک خام خیالی سے بڑھ کر کچھ نہیں ہے۔<sup>[۱]</sup>

## ۶۔ معاد جسمانی و روحانی بیک وقت کیونکر؟

کبھی یہ تصور کیا جاتا ہے کہ معاد جسمانی کے معتقدین کا حقیقی مدعا یعنی معاد روحانی و جسمانی کا جمع ہونا مشکل دکھائی دیتا ہے چونکہ اس جہان میں ان دونوں کے موافق مادی و معنوی پاداش اور ہر دو طرح کی لذات ہونا چاہئیں۔ جب کہ (ہم دیکھتے ہیں کہ) اگر انسان عالم قدس کے انوار کی تجلیوں میں کھوجانا چاہے تو اس کے لئے لذات جسمانی کی طرف توجہ کرنا ممکن ہی نہیں اور اسی طرح اگر لذات جسمانی میں غرق ہو تو لذات روحانی کی طرف متوجہ نہ ہو پائے گا۔ مختصر یہ کہ اس دو طرح کی معاد کا باہم واقع ہونا متضاد دکھائی دیتا ہے اور ان دونوں کا جمع ہونا ممکن نہیں ہے۔

## جواب

یہ اعتراض انتہائی کمزور معلوم ہوتا ہے کیونکہ اگر روح باندازہ کافی قدرت رکھتی ہو تو جسم کے لذات مادی کی طرف متوجہ ہونے کے باوجود انوار الہی میں غوطہ زن ہو سکتی ہے۔ بزرگ اولیاء اللہ اور انبیائے کرام اس کا واضح نمونہ ہیں۔

بحار الانوار میں علامہ مجلسی مرحوم اس بارے میں نقل کرتے ہیں کہ اگر اس دنیا میں مقامات معنوی و روحانی کی طرف توجہ انسان کی لذات جسمانی سے روک سکتی ہے تو اس کا برعکس ہونا بھی صادق ہے۔ انسانی روح اس دنیا میں تو ضعیف ہے لیکن موت کے بعد جب عالم قدس و طہارت سے مدد حاصل کرتی ہے تو اس میں اتنی قوت پیدا ہو جاتی ہے کہ ان دونوں کو جمع کر سکے۔<sup>[۲]</sup>

بہر حال یہ بھی دلیل کے مشابہ ہے نہ کہ خود دلیل۔

[۱] شرح تخرید ص ۳۲۲

[۲] بحار الانوار ج ۷ ص ۵۰



## ۷۔ کون سا جسم لوٹے گا؟

یہاں پر آخری اعتراض جو بیان کیا جاسکتا ہے وہ یہ ہے، جیسا کہ ہم پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں کہ یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ انسان کے جسم میں ہمیشہ تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے۔ بعض خلیے تدریجاً ختم ہو جاتے ہیں اور دوسرے خلیے ان کی جگہ لے لیتے ہیں اور تقریباً سات سال میں پہلے جسم کے تمام اجزاء تبدیل ہو کر اپنی جگہ نئے اجزاء کو دے دیتے ہیں، بالکل اس تالاب کی مانند کہ جس میں ایک طرف سے پانی آہستہ آہستہ داخل ہو اور دوسری طرف سے باہر نکل جائے اور یقیناً کچھ ہی دیر بعد اس تالاب کا سارا پانی تبدیل ہو جائے گا۔

بنا برائے ستر سال کی عمر تک یہ جسم دس دفعہ تبدیل ہوتا ہے۔ تو کیا وقت بازگشت یہ تمام دس بدن واپس آئیں گے اور انسان ایک غول پیکر کی صورت میں محسوس ہوگا یا ان میں سے کوئی ایک لوٹے گا؟

اگر یہ کہا جائے کہ ان میں سے کوئی ایک پلٹے گا تو ان میں سے کون سا ہوگا اور ان کے درمیان ترجیحی معیار کیا ہے؟

## جواب

درحقیقت یہ اعتراض بھی دور کی کوڑی لانے سے بڑھ کر کچھ نہیں۔ اس میں کیا رکاوٹ ہے کہ تمام ابدان واپس لوٹ آئیں۔ لیکن حق یہ ہے کہ آخری بدن اس دن زندہ ہوگا کیونکہ قرآن کہتا ہے: ”مردے قبروں سے اٹھ کھڑے ہوں گے۔“ بوسیدہ ہڈیوں اور خاک میں دوبارہ جان پڑ جائے گی اور یہ آخری بدن کی واپسی کے معنی میں ہے اس بدن کو جو تمام ابدان پر ترجیح حاصل ہے وہ اس وجہ سے کہ یہ ان ابدان کی تمام خصوصی صفات کا حامل ہے کیونکہ وہ اجزاء جو اپنی جگہ آنے والے اجزاء کے سپرد کرتے ہیں اپنی صفات بھی انہیں منتقل کر دیتے ہیں۔ اس طرح آخری بدن گذشتہ اوصاف اور تمام اعمال کے نچوڑ کا حامل ہوتا ہے۔ اگر کوئی واقع بین آنکھ ہو تو آخری بدن کی پیشانی پر تمام گذشتہ واقعات کو پڑھ سکتی ہے۔

البتہ اس امر کا اس بات کے ساتھ کوئی تضاد نہیں ہے کہ بہشتی اور صالح مومنین خوبصورت جوان کی صورت میں محسوس ہوں۔ یہ ایسے ہی ہے کہ جیسے ایک پرانی اور فرسودہ اینٹ کو خاک بنا کر قالب میں ڈال دیا جائے اور وہ نئی اینٹ میں تبدیل ہو جائے۔

## نتیجہ بحث

گذشتہ مباحث کے مجموعے سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ معاد جسمانی سے متعلق بحث میں کوئی اہم مشکل درپیش نہیں ہے اور جن مشکلات کا تصور کیا گیا ہے وہ اس مسئلے کی خصوصیات کے بارے میں عدم دقت اور کم توجہی کی بنا پر ہے۔ متذکرہ بالا آٹھ اعتراضات میں سے بہترین قابل بحث اعتراض ”آکل و ماکول“ کا ہے اور باقی جزئی مسائل ہیں کہ جن کا جواب تھوڑی سی فکر اور توجہ کے ساتھ واضح ہو جاتا ہے۔



## معاد

## (گذشتہ اقوام کے کلچر میں)

گذشتہ اقوام میں مسئلہ معاد کی بازگشت بہت زیادہ سنائی دیتی ہے۔ دور ترین زمانوں یعنی قرون قبل از تاریخ سے مختلف قوموں کے درمیان حیات بعد از مرگ پر اعتقاد کے آثار اس طرح بخوبی دکھائی دیتے ہیں کہ اس بات میں کوئی شک و تردد باقی نہیں رہتا کہ وہ دوسری دنیا کے بارے میں راسخ العقیدہ تھے۔

جب ہم مرحلہ تاریخ میں وارد ہوتے ہیں تو پھر بھی دیکھتے ہیں کہ تمام قومیں اپنے تمام تر ثقافتی اختلافات کے باوجود مسئلہ معاد پر ایمان رکھتی ہیں۔ لیکن قبل از اینکہ اس ماجرا کو اسناد کے ساتھ مورخین کی زبان شرح حال سے سنیں قرآن کی طرف پلٹتے ہیں تاکہ دیکھیں کہ قرآن اس بارے میں کیا فرماتا ہے۔

قرآن مجید نے بھی اس حقیقت کو صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ خلقت آدم کے وقت ہی سے معاد اور حیات بعد از مرگ کا مسئلہ موجود رہا ہے۔ حتیٰ کہ ابلیس نے بھی اس امر کا اعتراف کیا ہے اور آدم کے بعد کے پیامبران الہی کہ جو مختلف قوموں کی ہدایت پر مامور تھے، انہوں نے بھی حیات بعد از مرگ اور زندگی آخرت کی طرف اس طرح توجہ دلائی ہے کہ یہ زندگی ان تمام قوموں کے لئے کہ جن کی طرف انبیاء مبعوث ہوئے ایک آشنا بات سمجھی جاتی تھی۔

البتہ اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ مسئلہ پیامبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان میں اور وہ معارف کہ جو بذریعہ وحی ان پر نازل ہوئے ان میں انتہائی وسعت کا حامل ہے۔ قرآن مجید کا ایک بڑا حصہ مسئلہ معاد کی توضیح و تشریح پر مشتمل ہے۔ آئیے قرآن کی طرف پلٹتے ہیں اور دل و جان سے چند ایک آیات کے نمونے رہسپا گوش کرتے ہیں:

(۱) قَالَ أَنْظِرْنِي إِلَى يَوْمٍ يُبْعَثُونَ ﴿۱۳﴾ (الاعراف: ۱۳)

(۲) قَالَ فِيهَا تَحْيَوْنَ وَفِيهَا تَمُوتُونَ وَمِنْهَا تُخْرَجُونَ ﴿۲۵﴾ (الاعراف: ۲۵)

(۳) إِنْ أُرِيدُ أَنْ تَبْثُغَ آبَاؤُكُمْ فَإِثْمُكَ فَتَكُونَ مِنْ أَصْحَابِ النَّارِ ۖ (مائدة: ۲۹)

(۴) أَيْعِدُكُمْ أَنْكُمْ إِذَا مِتُّمْ وَكُنْتُمْ تُرَابًا وَعِظَامًا أَنْكُمْ تُخْرَجُونَ ﴿۳۵﴾

(مؤمنون: ۳۵)

(۵) وَلَا تُخْزِنِي يَوْمَ يُبْعَثُونَ ﴿۸۴﴾ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَلَا بَنُونَ ﴿۸۵﴾ (الشعراء: ۸۴)

(تا ۸۸)

- (۶) وَقَالُوا لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ كَانَ هُودًا أَوْ نَصْرِيًّا (بقرہ: ۱۱۱)
- (۷) وَالسَّلَامُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدْتُ وَيَوْمَ أَمُوتُ وَيَوْمَ أُبْعَثُ حَيًّا (مریم: ۳۳)
- (۸) وَإِلَىٰ مَدْيَنَ أَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۖ فَقَالَ لِقَوْمِهِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَارْجُوا الْيَوْمَ  
الْآخِرَ (العنکبوت: ۳۶)
- (۹) إِنِّي تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَهُمْ بِالْآخِرَةِ هُمْ كَافِرُونَ (۴۵)  
وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ آبَائِي إِبْرَاهِيمَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ (یوسف: ۳۴، ۳۸)
- (۱۰) لَقَدْ وُعِدْنَا هَذَا نَحْنُ وَآبَاؤُنَا مِنْ قَبْلُ ۖ إِن هَذَا إِلَّا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ (۶۸)  
(النمل: ۶۸)

ترجمہ

- (۱) (شیطان) بولا: مجھے فرصت دے جس دن تک لوگ جی اٹھیں (اور مجھے زندہ رکھ)۔
- (۲) فرمایا اسی (زمین) میں تم جیو گے اور اسی میں تم مرو گے اور اسی سے (روزِ قیامت) نکالے جاؤ گے۔
- (۳) میں چاہتا ہوں کہ تو حاصل کرے میرا گناہ اور اپنا گناہ، پھر یہود و زرخ والوں میں سے۔
- (۴) کیا وہ تم سے وعدہ کرتا ہے کہ جب تم مر گئے، ہڈیاں اور مٹی ہو گئے تو پھر (قبروں میں) سے نکالے جاؤ گے۔
- (۵) اور مجھے اس دن کہ جب لوگ مبعوث کئے جائیں گے شرمندہ اور رسوا نہ کر۔ اس دن کہ جب مال و دولت اور اولاد کوئی فائدہ نہ پہنچائیں گے۔
- (۶) انہوں نے کہا کہ یہود یا نصاریٰ کے علاوہ ہرگز کوئی بھی جنت میں داخل نہ ہوگا۔
- (۷) اور (اللہ کا) سلام ہے مجھ پر جس دن میں پیدا ہوا اور جس دن مروں اور جس دن جی اٹھوں۔
- (۸) ہم نے مدین کی طرف ان کے بھائی شعیب کو بھیجا۔ پھر بولا: اے میری قوم! بندگی کرو اللہ کی اور واپس پلٹنے کے دن کی توقع رکھو۔
- (۹) میں نے اس قوم کے دین کو چھوڑ دیا کہ جو خدا پر ایمان نہیں رکھتی اور آخرت کی منکر ہے اور میں نے اپنے

آباؤ اجداد ابراہیم، اسحاق اور یعقوب (کے دین) کی پیروی کی۔  
(۱۰) یہ ایک ایسا وعدہ ہے کہ جو ہمیں اور ہمارے باپ دادا کو پہلے سے دیا گیا ہے یہ وہی پہلوں کے خرافاتی افسانے ہیں۔

## تفسیر

### مختلف زمانوں میں عقیدہ معاد

اوپر بیان کی جانے والی آیات میں سے ہر آیت ایک مخصوص زمانے سے متعلق ہے۔ پہلی آیت ابلیس کے بارگاہ خداوندی سے راندہ جانے کے واقعے کی طرف اشارہ کرتی ہے، وہ ابلیس کہ جو بادۂ غرور اور خودخواہی سے سرمست تھا اور بجائے اس کے کہ خدا کی طرف پلٹتا اور دُوبہ سے استفادہ کرتا ہٹ دھرمی اور ضد پر اتر آیا اور خدا سے یوں تقاضا کرنے لگا۔ مجھے فرصت دے جس دن تک لوگ جی اٹھیں۔

### قال انظرنی الی یوم یبعثون

یہ مہلت اس لئے تھی کہ درگاہ خدا میں توبہ کے ذریعہ لوح معاصی پر قلم غفور و رگزر کے ساتھ خط کھینچ دے یا سینات کے مقابلہ میں حسنت لکھ لے۔ بلکہ یہ مہلت تو اس لئے تھی کہ آدم اور اس کی اولاد کے راستے میں کمین لگائے اور انہیں گمراہ کرے اور اس طرح اپنے غصے اور حسد کی جہنمی پیاس بجھا سکے۔  
اس آیت سے یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ مسئلہ معاد ابتداء ہی سے موجود تھا حتیٰ کہ شیطان بھی اس پر یقین رکھتا تھا کہ ایک ایسا دن درپیش ہے۔

لیکن شیطان کا یہ تقاضا اس صورت میں قبول نہ ہوا جیسا کہ سورہ حجر کی آیت ۳۸ گویا ہے۔ اس (شیطان) سے کہا گیا کہ:

### فَإِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِينَ ﴿۳۸﴾ إِلَى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُومِ ﴿۳۹﴾

”روزِ معین و معلوم تک تجھے مہلت دی جائے گی۔“

بعض نے ”یوم الوقت المعلوم“ کو اختتامِ جہان یا انسان کی ذمہ داری کا زمانہ ختم ہو جانے کے معنی میں لیا ہے۔ بعض دوسرے مفسرین نے اسے مہدی موعود کے روزِ قیام کے معنی میں تفسیر کیا ہے۔

البتہ بعض مفسرین کے کلمات میں ایک احتمال بعید بھی دیکھنے کو ملتا ہے کہ ”یوم الوقت المعلوم“ روزِ قیامت کی طرف اشارہ ہے۔ لیکن یہ احتمال بہت بعید دکھائی دیتا ہے کیونکہ نہ تو ظاہر آیات سے موافقت رکھتا ہے اور نہ ہی ان روایات سے کہ جو اس آیت کی تفسیر

میں نقل ہوئی ہیں۔

یہاں کچھ سوالات پیدا ہوتے ہیں کہ جو کچھ اس طرح سے ہیں:

- ۱۔ کیونکر خدا نے اسے مہلت دی کہ وہ اپنی نیت بد کو عملی جامہ پہنا سکے اور انسانوں کو گمراہ کرے؟  
جواب: ابلیس کی بقاء، اس کے وجود کی اصل کی مانند، انسانوں کی نسبت الہی امتحان کا ایک گوشہ ہے کہ جس کے سائے میں اولیاء اللہ اور بال ایمان افراد راہ کمال طے کرتے ہیں اور ناخالص افراد ان کی صف سے خارج ہو جاتے ہیں۔
- ۲۔ ابلیس کو اختتام جہان تک زندگی کی مہلت کا اطمینان دلانا۔ کیا اس بات کا باعث نہیں ہو سکتا کہ ابلیس اپنے کام کو جاری رکھے اور جو نبی زندگی کا خاتمہ قریب ہونے کا احساس کرے تو بہ کر لے اور خدا کی طرف پلٹ جائے؟  
جواب: جو راستہ ابلیس طے کر چکا تھا ایسا راستہ تھا کہ جس میں واپسی کا کوئی وجود نہ تھا۔ باغیانہ حالت کی شدت کے باعث، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ صفت اس کی طبیعت ثانوی بن چکی تھی۔ اس قسم کی طبیعت کے مقابلے میں تو بہ کا کوئی راستہ موجود نہیں۔
- ۳۔ شیطان نے روز قیامت تک زندگی کا تقاضا کیوں کیا جب کہ اسے اپنے ہدف کے لیے اختتام دنیا تک زندگی کافی تھی؟  
جواب: تفسیر المیزان میں کہا گیا ہے کہ اس کی تمنا تھی کہ عالم بزرخ اور اس دنیا اور اگلی دنیا کے درمیان فاصلے میں بھی انسانوں کو ورغلائے۔

- ۴۔ ابلیس یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ بارگاہ خداوندی کا دھتکارا ہوا ہے کیونکر امیدوار تھا کہ اس کا تقاضا پورا ہو جائے گا؟  
جواب: تفسیر مجمع البیان میں مرحوم طبرسی فرماتے ہیں کہ اسے یقین تھا کہ فضل و کرم الہی اس قدر زیادہ ہے کہ اس کی بارگاہ سے دھتکارا جانے کے بعد بھی اس کے فضل و کرم کا امیدوار ہوا جاسکتا ہے۔ روایات میں یہ بھی ملتا ہے کہ اس کی دعا کی قبولیت ان عبادات کی وجہ سے تھی جو وہ اس سے پہلے انجام دے چکا تھا۔

دوسری آیت حضرت آدم علیہ السلام اور ان کی شریک حیات حضرت حوا کے بہشت سے زمین پر منتقل ہونے اور ابلیس کے اس قرب الہی کے مقام سے دھتکارے جانے سے متعلق ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: خدا نے ان سے خطاب کرتے ہوئے کہا: ”اسی (زمین) میں تم جیو گے، اسی میں مرو گے اور اسی سے (روز قیامت) نکالے جاؤ گے (قال فیہا تحیون و فیہا تموتون ومنہا تمخرجون)۔

اس تعبیر سے پتہ چلتا ہے کہ نہ صرف انسانوں کا اٹھایا جانا بلکہ جنوں اور شیطان کے جوان میں سے ہے، کا اٹھایا جانا بھی اسی ایک دن میں مسلم و قطعی ہے۔ بعض تفاسیر میں احتمال ذکر کیا گیا ہے کہ اس آیت میں فقط حضرت آدم و حوا اور ان کی آئندہ آنے والی اولاد مخاطب ہے، لیکن اس کی کوئی مضبوط دلیل نہیں ہے۔

اس تعبیر سے یہ بھی بخوبی پتہ چلتا ہے کہ زمین انسان کا مبداء حیات بھی ہے اور اس کے مرنے اور دوبارہ اٹھانے کی جگہ بھی۔<sup>[۱]</sup>

[۱] حضرت آدم علیہ السلام کے خروج اور روز قیامت کے ضمن میں خداوند قدوس کی طرف سے سورہ طہ آیت ۱۲۳-۱۲۴ میں اشارہ کیا گیا ہے۔

تیسری آیت حضرت آدم علیہ السلام کے بیٹوں ہابیل وقابیل سے متعلق ہے۔ جب ہابیل کی قربانی اس کے اخلاص کی بنا پر بارگاہِ ایزدی میں قبول ہوئی اور قابیل کی قربانی عدم خلوص کی وجہ سے رد ہوگئی، تو قابیل کے اندر حسد کی آگ بھڑک اٹھی اور اس نے اپنے بھائی کو قتل کی دھمکی دی۔ ہابیل نے کہا: اگر تو میرے قتل کا ارادہ کرے بھی تو میں تیرے قتل کا ارادہ نہ کروں گا، میں خدا سے ڈرتا ہوں۔ پھر اضافہ کرتے ہوئے فرمایا: میں چاہتا ہوں کہ تو اپنے اور میرے گناہوں کا بوجھ اٹھائے اور جہنمیوں میں سے ہو جائے اور ظالموں کی سزا یہی ہے۔ انی ارید ان تبوء باثمی واثمک فتکون من اصحاب النار وذلک جزا الظالمین۔

اس آیت مجیدہ سے بخوبی پتہ چلتا ہے کہ مسئلہ معاد اسی زمانے سے اولاد آدم میں ایک امر مسلم تھا۔ اسی لئے ہابیل اپنے بھائی قابیل کو دوسری دنیا میں عذاب الہی کی تہدید کرتا ہے۔

مفردات میں راغب کے بقول ”تبوء“ ”بواء“ کے مادہ سے ہے کہ جس کا معنی کسی جگہ کا ہموار ہونا ہے، ”نبوء“ کے مقابلے میں کہ جو سطحوں کے متفاوت ہونے کے معنی میں ہے۔ لہذا جب کہا جائے کہ ”بوءات لہ مکانا تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ میں نے اس کے لئے جگہ صاف اور ہموار کی۔

یہ لفظ بعض اوقات اقامت اور لازمی ہونے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے چونکہ جب کوئی انسان چاہے کہ کسی جگہ رہائش پذیر ہو تو اس جگہ کو صاف اور مرتب کرتا ہے۔ متذکرہ بالا آیت کے یہی معنی کئے گئے ہیں۔

لیکن ”مصباح المنیر“ نے اس لفظ کے معانی اعتراف کرنا اور بھاری بوجھ کا ندھوں پر اٹھانا بیان کئے ہیں جب کہ مقائیس اللغہ میں اس کے دو معنی ذکر ہوئے ہیں۔ دو چیزوں کی بازگشت یا دو چیزوں کا مساوی ہونا۔

”کتاب التحقیق“ نے اس کے اصلی معنی انحطاط اور نیچے کی طرف بازگشت بیان کئے ہیں اور باقی تمام معانی کو مجازی معنوں میں لیا ہے کہ جو اصلی معنی کے لوازمات میں سے ہے۔ لہذا اس معنی کے مطابق مورد بحث آیت کا مفہوم یہ ہوگا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ تو بارگاہِ خداوندی میں اپنے اور میرے گناہوں کے ساتھ سقوط کرے۔“

اس لفظ کے قرآن مجید میں اور دیگر عبارتوں میں استعمال کے موارد کو ملاحظہ کرنے سے مقائیس میں بیان کئے گئے دو مفہوموں کو تقویت ملتی ہے اور مورد بحث آیت میں دونوں معانی مناسب ہیں۔

پہلے معنی کے مطابق ہابیل کہتا ہے: ”میں چاہتا ہوں کہ تو واپس پلٹے (خدا کی طرف) اپنے اور میرے گناہوں کے ساتھ۔“ اور دوسرے معنی کے مطابق کہتا ہے: ”تم ایسی جگہ اپنے لئے فراہم کر رہے ہو کہ جو میرے گناہوں اور تیرے گناہوں کے ساتھ تیار ہوئی ہے۔“

یہاں ایک بہت اہم سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ ہابیل جو اپنے بھائی کے ہاتھوں قتل ہوا۔ اس کا وہ کون سا گناہ تھا کہ جس کا بوجھ اس کے بھائی کے کندھوں پر جا پڑا؟ اصولاً یہ بات کس طرح قابل قبول ہے جب کہ خدا فرماتا ہے:

### أَلَا تَنْزِرُ وَازِرَةً وَّزَرَ أُخْرَىٰ (نجم ۳۸)

”کوئی بھی کسی دوسرے کے گناہوں کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔“

یہاں پر معروف مفسرین میں سے ہر ایک نے تقریباً ایک ایسا راستہ انتخاب کیا ہے کہ جس میں بیشتر کسی چیز کو مخدوف تصور کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس کے مطابق ”اٹھی“ (میرے گناہ) کا مطلب ”اٹھ قتل“ (میرے قتل کا گناہ) مقصود ہے۔ لیکن مناسب ترین معنی یہ ہے کہ آیت میں کسی بھی چیز کے مخدوف تصور کرنے کی ضرورت نہیں اور آیت کا مقصود یہ ہے کہ اگر تم اپنی دھمکی پر عمل کرتے ہوئے مجھے قتل کر دو تو میرے گذشتہ گناہوں کا بوجھ تمہارے کندھوں پر آن پڑے گا کیونکہ تمہیں روز قیامت میرے قتل کا بدلہ دینا پڑے گا اور چونکہ تمہارے پاس کوئی عمل صالح نہیں ہے لہذا میرے گناہوں کا بوجھ قبول کرو گے۔ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے آیت کی تفسیر کے ضمن میں ایک حدیث نقل ہوئی ہے کہ جو اس معنی کی تائید کرتی ہے۔ امام فرماتے ہیں:

من قتل مومناً متعمداً اثبت الله على قاتله جميع الذنوب و برى  
المقتول منها و ذلك قول الله عزوجل: انى ارید ان تبوا باٹھی و اٹھک  
فتكون من اصحاب النار

”اگر کوئی کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کر دے تو خدا مقتول کے تمام گناہ قاتل کے حساب میں لکھ دیتا ہے اور مقتول تمام گناہوں سے پاک ہو جاتا ہے اور یہ ہیں کلام خدا کے معنی کہ جو فرماتا ہے کہ انی ارید ان تبوا باٹھی.....“ [۱]  
رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل ہونے والی ایک روایت میں بھی بالکل یہی معنی دیکھنے کو ملتے ہیں (اگرچہ یہ روایت خصوصاً اس آیت کی تفسیر میں نہیں ہے)۔ روایت کچھ یوں ہے:

یوتی یوم القیمة با الظالم و المظلوم فیوخذ من حسنات الظالم  
فتزاد فی حسنات المظلوم، حتی ینتصف، فان لم تکن له حسنات  
اخذ من سیئات المظلوم فتطرح علیہ

”روز قیامت ظالم اور مظلوم کو حاضر کیا جائے گا اور ظالم کی نیکیوں کو لے کر مظلوم کی نیکیوں میں اضافہ کر دیا جائے گا تا کہ انصاف ہو جائے اور اگر ظالم کی کوئی نیکیاں نہ ہوں تو مظلوم کے گناہوں کو لے کر ظالم کے کھاتے میں

## ڈال دیا جائے گا۔“ [۱]

چوتھی آیت حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے کو ظاہر کرتی ہے۔ کافروں اور منکرین کی زبانی حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت کو یوں نقل کیا گیا ہے: کیا وہ (نوح) تمہارے ساتھ وعدہ کرتا ہے کہ جب تم مرجاؤ گے اور خاک اور ہڈیاں ہو جاؤ گے تو دوبارہ (قبروں سے) نکالے جاؤ گے؟ (ایعدکم انکم اذا متتم وکنتم ترابا وعظاما انکم مخرجون)۔

اس تعبیر سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت نوحؑ مسئلہ معاد اور وہ بھی معادِ جسمانی کو بارہا بیان کرتے رہے ہیں اور وہ بھی اس انداز سے کہ دشمنوں کے کانوں تک بھی یہ بات جا پہنچی تھی۔ لہذا وہ اپنی اس عجیب بے یقینی کے ساتھ کہ جس کا سرچشمہ ان کے گھٹیا اور پست افکار تھے ایک دوسرے سے کہتے تھے: دور! دور! وہ وعدے کہ جو تم سے کئے جاتے ہیں (ہیہات ہیہات لہما توعدون)

سورہ نوحؑ کی آیات سے بطور احسن پتہ چلتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام منکرین اور کافرین کے شبہات اور مسئلہ معاد سے ان کی وحشت و دوری کو ختم کرنے کے لیے تشبیہ سے استفادہ کرتے ہیں اور انسانی زندگی کو نباتات کی زندگی سے تشبیہ دیتے ہوئے فرماتے ہیں: خدا نے تمہیں نباتات کی طرح زمین سے پیدا کیا، پھر تمہیں اسی زمین میں پلٹائے گا اور دوبارہ اس سے نکالے گا..... (نوح ۱۷ اور ۱۸)

لہذا اس ترتیب سے سب سے پہلے اوالعزم اور صاحب شریعت پیامبر حضرت نوح علیہ السلام کی قوم میں معاد کی معرفت کا سابقہ واضح و روشن ہو جاتا ہے حتیٰ کہ بالکل انہی دلائل اور تشبیہات کے ساتھ کہ جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مشرکین مکہ کے لئے پیش کیا کرتے تھے۔

پانچویں آیت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور مسئلہ قیامت پر ان کے ایمان سے متعلق گفتگو کی گئی ہے۔ اس آیت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعاؤں کا کچھ حصہ پیش کیا گیا ہے۔ جب انہیں اپنے زمانے کے کفار کی شدید مخالفت کا سامنا تھا تو خدا کی بارگاہ میں عرض کرتے ہیں:

## ولا تخزنی یوم یبعثون

”مجھے شرمندہ و رسوائہ کرنا اس دن کہ جب لوگ دوبارہ اٹھائے جائیں گے۔“

## یوم لا ینفع مال ولا بنون

”اسی دن کہ جب مال اور اولاد کوئی فائدہ نہ پہنچائیں گے۔“

ان سے پہلی دو آیتوں میں عرض کرتے ہیں کہ مجھے پر نعمت بہشت کے وارثوں میں سے قرار دے:

## واجعلنی من ورثۃ جنة النعیم



متذکرہ بالا دعاؤں سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے اس بزرگ ترین الوالعزم انبیاء والے مقام عظمت کے باوجود روز قیامت کی رسوائی سے خوف زدہ تھے۔

ممکن ہے بعض لوگ اس تعبیر کو دوسروں کے لیے نمونہ عمل جانتے ہوں اور غیر معصومین کے لئے ایک درس سمجھیں۔ کیونکہ معصومین کے لئے رسوائی قیامت ناممکن ہے۔ لیکن بعض نے یہاں پر ایک بڑی لطیف تعبیر بیان کی ہے اور وہ یہ کہ:

### حسانات الابرار سیئات البقرین

معمولی نیک کام معصوم پیامبروں کی شان و عظمت سے کمتر ہیں۔ اسی طرح اگر وہ لوگ کہ جو مقربین میں سے ہیں اگر بہشت کے ان نیچے والے حصوں میں جگہ لیں کہ جو ’ابرار‘ کے لیے مخصوص ہیں تو یہ ان کے لئے مایہ رسوائی شمار کیا جائے گا کیونکہ ہر کسی سے ایک خاص عمل کی توقع ہوتی ہے اور ایک خاص مقام و منزلت کی۔

چھٹی آیت ”یہود و نصاریٰ“ کے عقیدہ معاد کے بارے میں ہے:

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

### وقالوا لن یدخل الجنة الا من کان هوداً و نصاری

”انہوں نے کہا کہ کوئی بھی ماسوائے یہودی یا نصاریٰ کے ہرگز جنت میں داخل نہ ہوگا۔“

جی ہاں! وہ اس قدر اپنی بڑائی کے قائل تھے اور احساس برتری کا شکار تھے کہ جنت کو فقط اپنے لئے مختص سمجھتے تھے حتیٰ کہ دوسرے مومنوں کی طرف ان کی معمولی سی توجہ بھی نہ تھی۔

قرآن اولاً ان کے جواب میں کہتا ہے کہ ”یہ ان کی آرزو ہے۔“

### تلك امانیہم

ایسی آرزو کہ جو بے دلیل، بے بنیاد اور واقعیت سے کوسوں دور ہے اور وہ ہرگز اس آرزو کو نہ پاسکیں گے۔

پھر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مخاطب ہوتے ہوئے کہتا ہے:

### قل ہاتوا برہانکم ان کنتم صادقین

”ان سے کہو کہ اگر وہ سچے ہیں تو اپنی دلیل لائیں۔“

یہ اپنے لئے منحصر جاننا کس عقلی معیار پر استوار ہے اور کس دلیل کی بناء پر لطف خدا فقط تمہارے ساتھ مخصوص ہے اور دوسروں کے شامل حال نہ ہوگا؟ اصولاً کس طرح ممکن ہے کہ یہ تعیض عدالت خداوندی کے ساتھ ہم آہنگ ہو اور فقط تمہارے اس گمان کے بدلے خدا نیک کردار مومنین کو جنت سے محروم کر دے؟

فرض کیا اگر وہ اپنے دین کی ابدیت کے دعویدار تھے تو پھر کیونکر پہلی امتوں کے بارے میں ایسی فضاوت کرتے تھے جب کہ وہ



امتیں انبیاء سلف کی پیروی کا رکھیں اور اپنے فرائض پر عمل کرتی رہی تھیں۔ ان سب سے پتہ چلتا ہے کہ وہ جنت کی اجارہ داری میں فقط اپنے ان اوہام کے تابع تھے کہ جن کا سرچشمہ ان کی خود خواہی تھی۔

”امانی“ بمعنی آرزو ”امنیہ“ کی جمع ہے (بعض مفسرین نے بڑی صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ یہ ان آرزوؤں کے معنی میں ہے کہ جن تک انسان کی رسائی نہیں ہے)۔

بنا برائیں ”امانی“ آرزوؤں کے معنی میں ہے یعنی جمع کے معنی ادا کرتا ہے۔ درحالیکہ جنت کی اجارہ داری تو فقط ”ایک آرزو“ تھی۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ اس وجہ سے ہے کہ یہ ایک آرزو اور بہت سی آرزوؤں کو اپنے ہمراہ لئے ہوئے ہے اور وہ عذاب الہی سے نجات، محشر کی وحشت و خوف سے بچت، حساب کتاب کا آسان ہونا اور اسی طرح کے دوسرے مسائل ہیں۔

بعض دوسرے احباب کا کہنا ہے کہ جب آرزو اور امید بہت بڑی ہو جائے تو آرزوؤں کے مفہوم میں داخل ہو جاتی ہے۔ یہ احتمال بھی موجود ہے کہ چونکہ ان میں سے ہر ایک ایسی آرزو رکھتا تھا یا ان میں سے ہر ایک بارہا مرتبہ ایسی آرزو کو جنم دیتا تھا، لہذا اسی لیے جمع کی صورت میں بیان کیا گیا ہے تاکہ معلوم ہو کہ یہ خیال کسی ایک فرد تک محدود نہ تھا بلکہ ایک دائمی اور عمومی پہلو کا حامل تھا۔ بہر حال یہ آیت قوم یہود و نصاریٰ میں عقیدہ معاد کے وجود پر روشن دلیل ہے۔

ساتویں آیت میں ہم حضرت مسیح علیہ السلام کے کلام کا مطالعہ کرتے ہیں کہ جب وہ گہوارے میں تھے اور آپ نے فرمانِ خدا سے بولنا شروع کیا تو بڑی صراحت سے معاد کی خبر دی۔ اپنی گفتگو میں فرماتے ہیں:

### والسلام علی یوم ولدت ویوم اموت ویوم ابعث حیا

”اللہ کا سلام ہو مجھ پر اس دن جب میں پیدا ہوا اور اس دن کہ جب میں مرجاؤں گا اور اس دن کہ جب میں زندہ دوبارہ اٹھایا جاؤں گا۔“

ان تین دنوں کا انتخاب (پیدائش، موت اور روز قیامت یعنی حیات مجدد کا دن) اس وجہ سے ہے کہ یہ تین دن انسانوں کی زندگی میں خطرناک اور تقدیر ساز ہیں۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہ ان تین میں سے ہر ایک انسان کے لئے ایک نئے موسم کی ابتداء ہے کہ جس میں سلامتی بہت اہم ہے اور یہ لطف خدا کے بغیر میسر نہیں ہو سکتی۔ درحقیقت حضرت مسیح علیہ السلام نے اپنے اس کلام کے ذریعے ان تین دنوں میں لطف الہی کا تقاضا کیا ہے۔

ضمناً اسی گہوارے سے آپ تمام انسانوں کو اپنی الوہیت کی نفی اور تمام بندگانِ خدا کی طرح ہونے کا پیغام بھی دے رہے ہیں۔ اسی سورۃ کی پندرھویں آیت میں یہی بات حضرت یحییٰ علیہ السلام کے بارے میں بھی موجود ہے، فرق صرف یہ ہے کہ یہاں سخن خدا کی طرف سے ہے جب کہ وہاں خود حضرت مسیح علیہ السلام کا کلام ہے۔

حضرت امام علی بن موسی الرضا علیہ السلام فرماتے ہیں:

ان اوحش ما یكون هذا الخلق فی ثلاثة مواطن: یوم ولد من بطن امه

فیری الدنيا، ویوم یموت، فیعاین الاخرة واهلها، ویوم یبعث حیا،

فیری احکامالم یرها فی دار الدنيا

”انسان کے لیے وحشت ناک ترین چیز تین موقع پر ہے: اس دن کہ جب وہ پیدا ہوتا ہے اور ماں کے پیٹ سے نکلتا ہے اور اس دنیا پر اس کی نظر پڑتی ہے اور جس دن وہ مرتا ہے۔ مرنے کے بعد اس عالم اور اس جہان کے لوگوں کا مشاہدہ کرتا ہے اور پھر اس دن کہ جب دوبارہ زندہ ہوگا اور ان احکام کو دیکھے گا کہ جو اس نے دار دنیا میں نہ دیکھے ہوں گے۔“

پھر حضرت امام رضا علیہ السلام نے اس بارے میں حضرت مسیح اور حضرت یحییٰ علیہ السلام سے متعلق آیات کی طرف اشارہ فرمایا: [۱] بہر حال متذکرہ بالا آیت سے یہ بخوبی پتہ چلتا ہے کہ مسئلہ قیامت پہلی امتوں میں اس قدر مسلم تھا کہ حتیٰ کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے گہوارے میں اس سے متعلق گفتگو فرمائی۔

اب تک ہم نے ”اولوالعزم“ پیامبروں میں سے چار کے دین میں معاد کی اجمالاً تحقیق کی ہے اور بہت ساری آیات کہ جو حضرت پیامبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دین سے معاد کے بارے میں نقل ہوئی ہیں، کو بھی شامل کر لیا جائے تو یہ موضوع پانچ ”اولوالعزم“ پیامبروں سے متعلق مکمل ہو جاتا ہے۔

”غیر اولوالعزم“ انبیاء میں سے ہم نے حضرت آدمؑ کا قصہ اور اس سے متعلق مسائل جیسا کہ ان کے بیٹوں اور شیطان کی داستان کو ملاحظہ کیا ہے۔ اب بے جا نہ ہوگا اگر ہم اسی مطلب کو دیگر انبیاء کی زبانی بھی سنیں۔

حضرت شعیبؑ کہ جو حضرت موسیٰؑ کے ہم عصر تھے جب رسالت کے لئے مبعوث ہوئے اور مدین [۲] کی طرف آئے تو اپنی قوم سے مخاطب ہو کر فرمایا:

فقال یقوم اعبدوا الله وارجوا الیوم الآخر ولا تعثوا فی الارض

مفسدین

”اے میری قوم! خدا کی عبادت کرو اور یوم آخرت کی امید رکھو اور زمین میں فساد نہ کرتے پھرو۔“

یہاں حضرت شعیبؑ اپنی دعوت کے آغاز میں تمام ادیان کے دو بنیادی اصولوں یعنی ”مبدأ“ اور ”معاد“ کا ذکر کرتے ہیں اور لوگوں

[۱] نور الثقلین، جلد ۳ صفحہ ۳۳۵ حدیث ۷۵

[۲] اردن کے جنوب مغرب کا ایک شہر کہ جو آج کل معان کے نام سے جانا جاتا ہے اور خلیج عقبہ کے مشرق میں واقع ہے۔

کو انہی دو اصولوں کی طرف دعوت دیتے ہیں۔

روزِ قیامت پر امید رکھنے سے مراد اس دن ثواب الہی کے لیے امیدوار ہونا ہے یا پھر اس جگہ امید کا معنی ہے: اس دن پر ایمان و اعتقاد رکھنا۔

نویں آیت حضرت یوسفؑ کی زبانی ہے کہ جب وہ قید خانے میں اپنے دوسرے قیدی ساتھیوں کے ساتھ خواب کی تعبیر کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے۔ قرآن کہتا ہے کہ یوسفؑ نے ان سے اس طرح کہا:

**انی ترکت ملة قوم لا یؤمنون باللہ وہم بالآخرۃ ہم کافرون**

”میں نے ایسی قوم کے دین و مذہب کو نہیں اپنایا کہ جو خدا پر ایمان نہیں رکھتی اور روزِ قیامت کی منکر ہے۔“

یہ تعبیر اس لئے ہے کہ بت پرست مشرکین خدا پر تو اعتقاد رکھتے تھے لیکن معاد اور یوم الجزاء کو تنازع کی صورت میں قبول کرتے تھے اور معتقد تھے کہ ہر انسان کی روح مرنے کے بعد ایک دوسرے جسم کی صورت میں اسی دنیا میں واپس پلٹ آتی ہے اور اپنی جزا و سزا کو اس نئی زندگی میں پالیتی ہے۔ حالانکہ توحیدی دین نہ تو شرک کو قبول کرتا ہے اور نہ ہی تنازع اور روحوں کے اس دنیا میں لوٹ آنے کو، اسی لیے حضرت یوسفؑ نے انہیں منکر خدا اور منکر معاد کہا ہے۔ [۱]

”ملت“ دراصل ”دین“ کے معنی میں ہے۔ لفظ ”ملت“ اور ”دین“ میں فرق یہ ہے کہ دین کی نسبت خدا اور افراد کی طرف دی جاسکتی ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے دین خدا یا دین محمد لیکن ملت کی اضافت معمولاً انبیاء کی طرف ہوتی ہے (یا وہ قومیں کہ جن کے درمیان انبیاء یا مدعیان نبوت رہے ہوں) مثلاً ملت ابراہیم [۲] لیکن ملت اللہ نہیں کہا جاتا۔

یہاں حضرت یوسفؑ کے پیش نظر عزیز مصر، اس کی بیوی، اس کے حواری اور بطور کلی اس زمانے کے وہ تمام مصری لوگ ہیں کہ جو نہ تو مبداء کے بارے میں صحیح عقیدہ رکھتے تھے اور نہ ہی معاد کے بارے میں درست عقیدہ کے حامل تھے۔

بہر حال اس امر کی نشاندہی ہوتی ہے کہ معاد پر اعتقاد مذہب کے دو بنیادی ارکان میں سے ایک رکن کے طور پر دین یوسفؑ میں بھی موجود رہا ہے یہاں تک کہ حضرت یوسفؑ نے قید خانے میں بھی اپنے ساتھ کے قیدیوں کے سامنے ان دونوں ارکان کو باہم بیان کیا ہے۔ قابلِ توجہ یہ ہے کہ اس بات کے فوراً بعد حضرت یوسفؑ فرماتے ہیں،

**واتبع ملة اباؤی ابراهیم واسحاق و یعقوب**

”میں نے اپنے آباؤ اجداد ابراہیمؑ، اسحاقؑ اور یعقوبؑ کے دین کی پیروی کی ہے۔“

یہ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ دو مسلم اصول مبداء و معاد پر ایمان تمام ادیانِ الہی اور پہلے مذاہب میں موجود رہا ہے۔

[۱] المیزان ج ۱۱ ص ۱۸۹

[۲] مفردات راغب مادہ ”ملت“

زیر بحث دسویں اور آخری آیت کہ جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقابل مشرکین مکہ کی زبانی ہے، گویا ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روز قیامت پر ایمان لانے کی دعوت پر اظہارِ تعجب کیا کہ کس طرح انسان خاک ہو جانے کے بعد دوبارہ لباس حیات زیب تن کرے گا اور کہا: یہ ایک ایسا وعدہ ہے کہ جو ہم سے اور ہمارے باپ داداؤں سے پہلے سے کیا جاتا رہا ہے، یہ تو پہلوں کے خرافات قصے و افسانے ہیں۔ (لقد وعدنا هذا نحن و آبائنا و نآمن قبل ان هذا الا اساطیر الاولین)۔

اس تعبیر سے بخوبی پتہ چلتا ہے کہ معاد پر ایمان کی دعوت قدیم ترین ایام میں بھی پیامبران الہی کی طرف سے اسی طرح دی جاتی رہی کہ مشرکین اس کو اساطیر الاولین (پہلوں کے افسانے) کے زمرے میں شمار کرتے تھے۔

”اساطیر“ جمع ہے ”اسطار“ کی اور ”اسطار“ خود ”سطر“ کی جمع ہے، جس کے معنی ہیں درختوں کی قطار یا کلمات یا اس کی مثل۔ لہذا ”اساطیر“ جمع کی بھی جمع ہے اور یہ اشارہ ہے کہ گذشتگان کی حکایات کی طرف اور چونکہ گذشتہ لوگوں کی داستانیں معمولاً خرافات اور افسانوں سے مخلوط ہوتی تھیں اسی لیے ”اساطیر“ کی اصطلاح معمولاً خرافات کے لئے استعمال ہوتی ہے۔

بعض لوگوں نے یہ بھی کہا ہے کہ ”اساطیر“ اسطورہ، اسطارہ اور اسطیر کی جمع ہے اور چونکہ ثلاثی مزید فیہ ہے لہذا یہ لفظ اضافی معنی بھی رکھتا ہے۔ اس کے اصلی معنی طبعی سطر کے ہیں اور اضافی معنی جعل شدہ اور جھوٹی سطور کے ہیں۔ [۱]

## نتیجہ بحث

جو کچھ متذکرہ بالا آیات میں کہا گیا ہے اور اسی طرح کی دوسری بہت سی آیات کہ جو قرآن مجید میں وافر طور پر موجود ہیں، سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ روز قیامت پر ایمان کا مسئلہ اوائل ایام ہی سے موجود تھا کہ جب انسان نے اس زمین پر قدم رکھا۔ تمام پیامبران الہی نے اس کی طرف دعوت کی۔ یہ سب کچھ ان نا آگاہ اور نادان لوگوں کی فکر کے برخلاف ہے جو یہ گمان کرتے ہیں کہ روز قیامت پر ایمان رکھنے والی قوموں کے درمیان حال ہی میں پیدا ہوا ہے۔

قرآن میں بہت ساری آیات سے پتہ چلتا ہے کہ خدا اس مسئلے کے بارے میں روز قیامت مجرموں کے سامنے دلیل و حجت قائم کرے گا اور فرمائے گا:

يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ أَلَمْ يَأْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنكُمْ يَقُصُّونَ عَلَيْكُمُ الْبَيِّنَاتِ

وَيُنذِرُوكُم لِقَاءَ يَوْمِكُمْ هَٰذَا ط

”اے گروہ جن و انس! کیا خود تمہارے درمیان میں سے رسول تمہارے پاس نہیں آئے تاکہ تم سے ہماری آیتیں بیان کریں اور تمہیں ایسے (قیامت کے) دن کی ملاقات سے ڈرائیں؟“ (انعام ۱۳۰)

یہ آیت بطور احسن اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ پوری تاریخ میں رسولانِ الہی تمام جن و انس کو ایمان معاد کی دعوت دیتے رہے ہیں۔ یہی مطلب ایک اور آیت میں بھی ملتا ہے۔ جب دوزخ کے داروغوں نے دوزخیوں سے کہا:

وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا أَلَمْ يَأْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَتْلُونَ عَلَيْكُمْ آيَاتِ رَبِّكُمْ  
وَيُنذِرُونَكُمْ لِقَاءَ يَوْمِكُمْ هَذَا ۖ (زمر ۷۱)

یہ بات توجہ طلب ہے کہ خود دوزخی بھی عموماً اس بات کا اعتراف کرتے ہیں جیسا کہ اسی آیت میں ہے۔ ”انہوں نے کہا: کیوں نہیں۔“

### قالوا بلی

بنابریں قرآن کی نظر میں مسئلہ معاد ایسے مسائل میں سے ہے کہ جو ہمیشہ دعوتِ انبیاء میں سرفہرست رہا ہے اور خلقتِ آدم ہی سے زیر بحث چلا آ رہا ہے اور ہر عصر و زمان میں رسولانِ الہی کی طرف سے اس پر تاکید کی جاتی رہی ہے۔ مزید یہ کہ تمام قومیں اس سے آشنا تھیں۔ آئیے اب اسی سلسلے میں تواریخ اور علماء کے شواہد کی طرف بڑھتے ہیں۔

## توضیحات

### ۱۔ قبل از تاریخ کی قوموں میں معاد

جیسا کہ ہم جانتے ہیں زندگی بشر کو دو دور میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ایک دور وہ ہے کہ جب رسم الخط ایجاد ہو چکا تھا اور انسان اپنی تحریروں کو یادگار کے طور پر چھوڑ سکتا تھا۔ اسے تاریخ کا دور کہتے ہیں۔ دوسرا وہ دور ہے کہ جب رسم الخط ایجاد نہ ہوا تھا اور اس دور کا انسان اپنے حالاتِ زندگی کو مدون تاریخ کی صورت میں پیش نہیں کر سکا۔ یہ قبل از تاریخ کا دور کہلاتا ہے۔

لیکن اس زمانے میں رسم الخط ایجاد نہ ہونا ہرگز اس بات کی دلیل نہیں کہ ہم ان کے حالات پر دسترس نہ رکھتے ہوں کیونکہ زیر زمین غاروں میں اور اسی طرح دوسری کئی جگہوں پر ان قوموں کے چھوڑے ہوئے آثارِ اقدی وافر مقدار میں ملے ہیں کہ بہت حد تک ان کے اسرارِ زندگی سے پردہ اٹھایا جاسکتا ہے۔

ابھی تک ماہرین آثارِ قدیمہ دنیا کے مختلف کونوں میں، گھروں میں اور شہروں میں مختلف وسائل کے ساتھ قبل از تاریخ کی قوموں کی زندگی کے بارے میں جستجو کر رہے ہیں اور کسی چیز کے ملنے کے بعد بہت باریک بینی کے ساتھ اس کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ بعد ازاں ان کی زندگی کی تاریخ، ثقافت اور تمدن کو ضبط تحریر کیا جاتا ہے۔ اس طرح ان کے ذہنی عقائد کا بھی پتہ لگایا جاتا ہے۔

معروف ماہرِ عمرانیات سمیوئیل کنگ اپنی کتاب میں لکھتا ہے:

”آج کے انسان کے اسلاف (کہ جن کے آثار زمین کی کھدائی کے دوران میں ملے ہیں) یعنی (ثاندرتالہا)

دیندار اور مذہبی تھے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ وہ اپنے مردوں کو ایک خاص کیفیت سے دفن کرتے تھے اور ان کے کام کاج کے اوزار ان کے پہلو میں رکھ دیتے تھے اور اس طریقے سے دوسری دنیا کے بارے میں اپنے عقیدے کو ثابت کرتے تھے۔<sup>[۱]</sup>

ہم جانتے ہیں کہ ثنائی تال کے لوگ لاکھوں سال پہلے کے ہیں جب نہ تو ابھی رسم الخط ایجاد ہوا تھا اور نہ ہی تاریخ بشر کا آغاز ہوا تھا۔ یقیناً ان کے عمل کی کیفیت ایک مہمل کام کی مانند تھی۔ چونکہ ہم جانتے ہیں کہ دنیاوی کاموں کے اوزار اس دنیا میں کام آنے والی چیز نہیں ہیں لیکن اس کا جذبہ محرک اور بنیاد بعد از مرگ کی زندگی پر ایمان ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ جوان کے درمیان موجود تھی۔ بیسویں صدی کے انسائیکلو پیڈیا میں ”ہر برٹ اسپنسر“ کی کتاب ”اصول علم الاجتماع“ سے نقل کیا گیا ہے کہ پہلے وقتوں کے لوگ چونکہ سوچ بچار اور فکری طاقت نہ رکھتے تھے لہذا بعد از مرگ کی دنیا کو اپنی عقل کے مطابق سمجھتے تھے۔ اسی لئے اس زندگی کی جزئیات کے بارے میں عجیب و غریب بلکہ خرافات پر مبنی باتیں کرتے تھے۔

ان میں سے بہت سارے لوگ باوجود اس کے کہ موت کے بعد کی دنیا کا اعتراف کرتے تھے لیکن پھر بھی اس زندگی کو فقط ان لوگوں کے لئے مخصوص سمجھتے تھے کہ جو طبعی موت میں اور بعض لوگ اس کو فقط بڑی شخصیات اور طاقت ور افراد کے لئے مخصوص سمجھتے تھے۔ پہلی قوموں میں سے بعض لوگ ایسے بھی تھے کہ جو مرنے والے کے اسلحے کو اس کے ساتھ دفن کر دیتے تھے، گھر کی اشیاء خواتین کے ساتھ اور کھلونے بچوں کے ساتھ دفن کر دیتے تھے (تاکہ بعد از مرگ کی زندگی میں وہ ان سے فائدہ اٹھا سکیں)۔ بعض لوگ تو تمام حیوانات کو بھی میت کے ساتھ دفن کر دیتے تھے اور کچھ تھوڑے سے غذائی بیج اور ذرت بھی قبر میں رکھ دیتے تاکہ آخرت میں زراعت کر سکے۔

کبھی کبھار بعض لوگ تو اس سے بھی ایک قدم بڑھ کر مرنے والے کے ساتھ اس کی بیویوں، غلاموں اور بعض دوست احباب کو بھی سپرد خاک کر دیتے تاکہ مرنے والا آخرت میں ان کے ساتھ مانوس رہے۔ حتیٰ کہ امریکہ اور مکزیک کے بعض علاقوں میں ان بزرگوں کے ساتھ کہ جو اس دنیا سے چلے جاتے پادری اور مذہبی پیشوا کا سر بھی کاٹ دیا جاتا (اور ان بزرگوں کے ساتھ دفن کر دیا جاتا) تاکہ اس دوسری دنیا میں مذہبی و روحانی مشیر کا کام دے سکے۔

گاہ بہ گاہ ان کے مراشیوں کو بھی قتل کر دیتے کہ وہ اپنی حرکات اور باتوں سے اس دوسری دنیا میں اس بزرگوار کو مشغول رکھ سکے۔ ان افراد کے ساتھ قتل ہو کر دفن ہو جانے والے لوگوں کی تعداد اس فرد کی شخصیت پر منحصر تھی، یہاں تک کہ بعض مورخین نے لکھا ہے کہ ان مردوں میں سے بعض کی قربانیوں کی تعداد دو سو افراد تک جا پہنچتی ہے۔

جب کبھی اولاد میں سے کوئی بہت ہی عزیز بچہ فوت ہو جاتا تو اس کے ساتھ اس کی ماں، پھوپھی اور دادی کا سر کاٹ کر دفن کر دیا جاتا

تاکہ دوسری دنیا میں اس کے پاس رہیں۔<sup>[۱]</sup>

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ سب خرافات ان قوموں کے منحرف افکار کی پیداوار تھی۔ لیکن یہ سب ایک نکتہ کو بیان کرتی ہیں اور وہ یہ کہ مرنے کے بعد کی دنیا پر اعتقاد پہلی قوموں کے درمیان ایک گہرے عقیدے کے طور پر موجود رہا ہے۔

کتاب ”تاریخ عمومی تمدن ہا“ میں بھی ذکر ہوا ہے کہ قبل از تاریخ کے ادوار سے لے کر قدیم تاریخ کے اواخر تک مردوں کے اجسام ایک خاص طریقے اور مخصوص رسوم کے ساتھ سپرد خاک کئے جاتے تھے اور بہت ساری گھریلو اشیاء اور پراسرار شکلیں ان کے ساتھ دفن کر دی جاتی تھیں۔ لواحقیں ان کے لئے تشائف بھیجا کرتے تھے۔ یہ تمام عادات و رسوم اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ وہ دوسری زندگی پر ایمان رکھتے تھے۔<sup>[۲]</sup>

## ۲۔ بعد از تاریخ کی قوموں میں ایمان معاد

تاریخی اسناد سے پتہ چلتا ہے کہ دنیا کے مختلف علاقوں میں زندگی بسر کرنے والی اقوام اس عقیدے میں مشترک تھیں اور زندگی بعد از مرگ کے بارے میں بیشتر مضبوط عقیدے کی مالک تھیں اور اس کے لئے تکلفات کی قائل تھیں اگرچہ معمولاً اسے خرافات سے مخلوط کر دیتی تھیں۔

## الف۔ قدیم مصریوں میں معاد

آلبرمالہ اس بارے میں اپنی تاریخ میں یوں رقمطراز ہے:

”مصر کے لوگوں کا عقیدہ تھا کہ مردہ کی روح قبر سے جدا ہو کر بڑے خدا ”آزیریس“ کے حضور حاضر ہوتی ہے۔“

جب اسے احکم الحاکمین ”آزیریس“ کے حضور لے جایا جاتا ہے تو اس کے قلب کو میزان حقیقت میں تولتے ہیں اور جس روح کا حساب کتاب پاک صاف ہو جائے وہ ایک ایسے باغ کی طرف روانہ ہو جاتی ہے کہ جس کی برکتوں کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اموات کے کنارے ایک خط رکھا جاتا تھا تاکہ اس دنیا کے سفر میں ان کے لئے راہنمائی کا کام دے۔ یہ خط عجیب اور جاذب توجہ جملوں کا حامل تھا کہ جو مردے کو بڑے خدا ”آزیریس“ کی بارگاہ میں کہنا ہوتے۔ وہ جملے یہ تھے:

”بزرگی تیرے ہی لئے سزاوار ہے۔ اے خداوند عالی مقام! اے خداوند صدق وعدالت“

میں نے لوگوں کے بارے میں کبھی دھوکا دہی سے کام نہیں لیا، کبھی کسی بڑھیا کو نہیں ستایا، عدالت میں جھوٹ نہیں بولا، بکرو فریب سے آلودہ نہیں ہوا۔

کوئی مزدور جتنی ایک دن میں کام کرنے کی طاقت رکھتا ہے، اس سے زیادہ اس پر بوجھ نہیں ڈالا، ذمہ داری ادا کرنے میں کاہلی نہیں

[۱] انسائیکلو پیڈیا قرن بیستم۔ جلد اول صفحہ ۹۰ تا ۹۴ (خلاصہ)

[۲] تاریخ الحضارات العام۔ جلد ۱ صفحہ ۹۹



برقی، سستی کے قریب نہیں پھٹکا، مقدسات کی بے حرمتی اور ہتک کو جائز نہیں سمجھا، کسی غلام کی اس کے آقا کے پاس چغلی نہیں کھائی، کسی کی روزی پر لات نہیں ماری، کسی بندے کو قتل نہیں کیا اور تابوت اور میت کے ساتھ رکھے گئے کھانے کو چوری نہیں کیا۔

کسی کی زمین غصب نہیں کی، شیر خوار بچوں کے منہ سے دودھ نہیں چھینا، کوئی نہر نہیں کاٹی، میں پاک ہی پاک ہوں!.....  
اے منصفو! آج کے دن کہ جو یوم حساب ہے اس مرحوم کو بھی راہ دو کہ جو گناہ کے قریب نہیں پھٹکا۔ اس نے جھوٹ نہیں بولا۔ نہیں جانتا برائی کیا ہے۔ اس نے زندگی اور حصول معاش میں حق و انصاف کی راہ میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا۔ اس کے اعمال لوگوں کے مورد توجہ اور خداؤں کی خوشنودی کا موجب تھے۔ اس نے بھوکوں کی دادرسی کی۔ راہ خدا میں قربانی کی۔ مردوں کو غذا پہنچائی، اس کا منہ پاک ہے اور اس کے دونوں ہاتھ بھی پاک ہیں۔

مذکورہ مورخ ”آلبرمالہ“ [۱] ان باتوں کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے کہتا ہے کہ ان عبارات سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ مصر کے لوگ گناہان کبیرہ، حسنات اور مستحبات کو بھی پہچانتے تھے۔ مورخ کے اس قول کے ساتھ اس بات کا بھی اضافہ کرنا چاہیے کہ ان عبارات سے ضمناً یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ بھی خدائی حساب کتاب، میزانِ عمل اور بہشت کے باغوں پر بھی اعتقاد رکھتے تھے۔ دراصل یہ عبارات ایک طرح کی تلقین تھیں کہ جو آج کل اموات کے لئے معمول ہے اور زندوں کے لئے گناہوں کی ہر قسم کی آلودگی سے پاکیزگی کے لئے پر معنی اشارات ہیں۔ گناہوں کی ایک دوسرے کے ساتھ نسبت کی اہمیت کو بھی واضح کرتی ہیں۔

خلاصہ یہ کہ تاریخی شواہد کے مطابق مصری حیات بعد از مرگ پر گہرا اعتقاد رکھتے تھے۔ اگرچہ اس اعتقاد کو بہت سی خرافات سے مخلوط کئے ہوئے تھے جن میں سے ایک یہ بھی تھا کہ وہ وسائل و لوازم زندگی اور اشیائے خورد و نوش قبر میں رکھنے کے بجائے ان کی تصاویر، مجسمے یا ڈرائنگز قبروں میں رکھ دیتے تھے اور معتقد تھے کہ یہ تصاویر اور ڈرائنگز ان کی اصلی جگہ لے سکتی ہیں۔

بعض قبروں میں سے کھانا پکانے کے منظر، گائے ذبح کرنے کے مناظر، کھیتوں کی تصاویر اور برتن میں پڑا پکا ہوا گوشت جیسا کہ مہمانوں کے سامنے رکھ جاتا ہے، دکھائی دیا ہے۔ [۲] مردوں کے اجساد کو مومیانے اور اہرام مصر کی طرح قبروں کو بہت زیادہ مضبوط بنانے کا مسئلہ بھی اسی ضمن میں تھا۔

مقصد یہ تھا کہ اپنے اجساد کو مرنے کے بعد سے لے کر حشر تک صحیح و سالم رکھ سکیں اور جب روح بدن میں واپس لوٹے تو سامانِ عیش و عشرت ان کے پاس ہو۔ (لہذا اسی مقصد کے لیے) مختلف قسم کی غذائیں، نانباتی اور باورچیوں کے مجسمے، جواہرات اور دفاع کے مختلف ہتھیار قبر میں اور مردے کے پہلو میں رکھتے تھے۔ چونکہ معمولاً یہ قبریں وحشی حیوانات یا جواہرات کی چوری کے لئے لوگوں کے حملے کا نشانہ بنتی رہتی تھیں لہذا صاحب ثروت افراد اہرام بنانے یا قبروں کے اوپر بلند و بالا عمارتیں بنانے کی کوشش کرتے تھے کہ جسے

[۱] تاریخ مل و شرق و یونان جلد ۱ ص ۷۴

[۲] تاریخ تمدن ویل ڈیورنٹ۔ جلد ۱ ص ۱۸۰



”پیرموس“ یعنی ”بلند“ کہا جاتا تھا۔<sup>[۱]</sup>

## ب۔ بابلی

گذشتہ متمدن قوموں میں سے ایک بابل کی قوم بھی تھی۔ ان کے باقی ماندہ آثار سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بعد از مرگ کی زندگی اور معاد کے بارے میں راسخ العقیدہ تھے۔ بعض مورخین کے بقول اسی دلیل کی بناء پر وہ لوگ اپنے مردوں کے اجساد کو چھت دار زمینوں کے نیچے سپرد خاک کرتے تھے۔ اگرچہ مردوں کو مومیاتے نہ تھے۔ لیکن غسل دینے کے بعد انہیں بہترین لباس پہناتے تھے۔ رخساروں کو رنگین اور پلکوں کو سیاہ کرتے تھے۔ ان کی انگلیوں میں انگوٹھیاں پہناتے اور اگر مردہ عورت ہوتی تو عطر کی شیشیاں، کنگھی، پاؤڈر اور بناؤ سنگھار کے مختلف تیل اس کی قبر میں رکھ دیتے تھے تاکہ اپنے چہرہ کی خوبصورتی اور خوشبو کو دوسرے جہان میں باقی رکھ سکے۔<sup>[۲]</sup>

## ج۔ سومری

جنوبی عراق میں رہنے والی قدیم ترین متمدن قوموں میں سے سومریوں کا شمار ہوتا ہے۔ ”ویل ڈیورنٹ“ کے بقول یہ لوگ اپنے مردوں کے ساتھ اشیائے خورد و نوش، آلات اور ہتھیار بھی دفن کرتے تھے۔ ”ویل ڈیورنٹ“ اسی ضمن میں دوبارہ رقمطراز ہے کہ چونکہ سومری اپنے مردوں کے ساتھ غذائی مواد اور وسائل زندگی بھی قبر میں رکھتے تھے لہذا یہ فرض کیا جاسکتا ہے کہ وہ دوسری دنیا کی زندگی پر اعتقاد رکھتے تھے۔<sup>[۳]</sup>

## د۔ زرتشتی

فارس کے رہنے والے زرتشتی بھی دوسری قوموں کی طرح بعد از مرگ کی زندگی پر اعتقاد رکھتے تھے بلکہ اس زندگی کے بارے میں بڑی دقیق ترین جزئیات بیان کرتے تھے۔ بہشت، دوزخ، پل صراط حتی کہ دوزخیوں کی درجہ بندی کے فرق سے متعلق ایسی تعبیرات کے حامل تھے کہ جو آج کے اعتقادات سے بہت زیادہ شباهت رکھتی ہیں۔ ویل ڈیورنٹ کے بقول وہ معتقد تھے کہ موت کے بعد دوزخ، ”تطہیر گاہ“ (اعراف) اور بہشت کا وجود پایا جاتا ہے۔ تمام روحمیں مجبور ہیں کہ موت کے بعد ایک ایسے پل سے گزریں کہ جو پلید اور پاکیزہ کو ایک دوسرے سے جدا کر دیتا ہے۔ پاکیزہ روحمیں پل کے ایک طرف سرزمین ”سرور“ میں جاتے ہیں..... اور اس ابدی جگہ پر ”اھورامزدا“ کے ہمراہ نعمتوں میں غرق

[۱] تاریخ تمدن ویل ڈیورنٹ۔ جلد ۱ ص ۴۹

[۲] تاریخ تمدن ویل ڈیورنٹ۔ جلد اول ص ۲۸۳ (خلاصہ)

[۳] تاریخ تمدن ویل ڈیورنٹ۔ جلد اول ص ۱۵۵

اور خوش بختی کے ساتھ زندگی بسر کرتی ہیں۔ لیکن پلید و رحیں اس پل سے نہیں گزر سکتیں اور دوزخ کے گڑھوں میں جا گرتی ہیں۔ جس قدر زیادہ انہوں نے گناہ کئے ہوں گے ان کی دوزخ کا گڑھا بھی اتنا ہی گہرا ہوگا۔<sup>[۱]</sup>

جیسا کہ آپ نے ملاحظہ فرمایا ہے بالکل ایسا ہی ہے کہ وہ لوگ بعد از مرگ کی زندگی کے بارے میں بیشتر اور دقیق تر جزئیات بیان کرتے تھے۔

## ہ۔ چینی

چینی بھی اپنے عقائد میں بعد از مرگ کی زندگی پر ایمان کا اظہار کرتے رہتے تھے۔ ”ویل ڈیورنٹ“ کہتا ہے کہ ان کے مذہب میں خداؤں کی مدد اور بہشت کے وصال کی امید دلائی گئی تھی۔ ”آمینا“ خدا بہشت کا حکمران جانا جاتا تھا۔ (ممکن ہے یہاں پر خدا سے مراد فرشتہ ہو)۔<sup>[۲]</sup> ایک اور جگہ پر ہم پڑھتے ہیں کہ وہ لوگ معتقد تھے کہ طبعی موت مرنے والوں کی ارواح خواص میں شمار ہوتی ہیں اور اگر وہ صالح بھی ہوں تو تحائف، قربانیوں اور دیگر احترامات و تکلفات کے ساتھ آہستہ آہستہ بلند پایہ روحوں اور آلہہ (فرشتوں) میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔<sup>[۳]</sup>

## و۔ جاپانی

یہ لوگ بھی اس عقیدہ میں دوسروں کے ساتھ ہم صدا تھے۔ جب مذہب بودھا جاپان پہنچا تو اس پر بدگمانی کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ لیکن جلد ہی جاپان کے آسمان تلے یہ بادل چھٹ گئے اور نگہبان خداؤں (نگہبان فرشتوں)، خوش آئند رسوم..... اور آرام بخش بہشت نے بھی اس میں اپنی جگہ بنالی۔ البتہ یہ آئین دیوا اور دوزخ سے بھی محروم نہیں رہا۔<sup>[۴]</sup> اس ضمن میں دوبارہ ہم دیکھتے ہیں کہ ”ماہایانا“ کا مذہب ایسی حالت میں جاپان پہنچا کہ جب اس کا مذہب بودھا سے کافی فاصلہ پیدا کر چکا تھا۔ (لیکن پھر بھی یہ) تسلی بخش عقائد بہشت، دوزخ اور..... اپنے ہمراہ لایا۔<sup>[۵]</sup>

## ز۔ یونانی

یہ لوگ بھی مختلف طریقوں سے بعد از مرگ کی دنیا کے بارے میں اپنے عقیدے کا اظہار کرتے تھے۔ مثلاً ان میں سے ایک

[۱] تاریخ ویل ڈیورنٹ۔ جلد اول ص ۴۲۹

[۲] تاریخ ویل ڈیورنٹ۔ جلد اول ص ۸۵۱

[۳] اسلام و عقائد و آراء بشری۔ ص ۱۵۸

[۴] تاریخ تمدن ویل ڈیورنٹ۔ جلد ۱ ص ۹۲۵

[۵] اسلام و عقائد و آراء بشری۔ ص ۱۸۴

گروہ ایسا بھی تھا کہ جو فقط اس لئے کہ ان کے مردے زیر زمین خوش باش رہیں کچھ مقدار میں اشیائے خورد و نوش، صفائی ستھرائی کی کچھ چیزیں اور اسی طرح عورتوں کے چھوٹے چھوٹے مجسمے ان کے ساتھ دفن کر دیتے تھے تاکہ سرائے ابدیت میں مردے ان کی تسلی خاطر اور نگہداری سے محروم نہ رہیں۔<sup>[۱]</sup>

## ح۔ رومی

رومی بھی اس سلسلے میں کئی ایک طرح کی باتیں کرتے تھے۔ ”اتروسک“ کہ جو قدیم روم کے فرمانرواؤں میں سے ایک گروہ تھا، ان کے بنیادی ترین اعتقادات میں سے ایک یہ تھا کہ مردے کی روح زیر زمین ایک دنیاوی عدالت میں حاضر ہوتی ہے، جیسا کہ قبروں میں بنائی گئی تصاویر سے پتہ چلتا ہے، قضاوت کے آخری لمحات میں اپنی زندگی کے طرز عمل کے دفاع کے لئے اسے موقع ملتا ہے اور اگر اس دفاع اور جواب دہی میں پورا نہ اتر سکے تو مختلف قسم کے عذاب میں مبتلا ہو جاتی ہے..... وہ کبھی کبھار مردوں کی قبر سخت پتھروں کے اندر ایک گھر کی صورت میں بھی بناتے اور زندگی کے تمام وسائل حتیٰ کہ لباس، گلدان، اسلحہ، جواہرات، آئینہ اور لوازمات آرائش اس میں مہیا کرتے تھے۔<sup>[۲]</sup>

یونانی مورخ ”پلو تارک“ جو ۵۰ تا ۱۲۰ عیسوی تک زندہ رہا اور یونانی و رومی شخصیات اور ان کے عقائد سے متعلق کئی ایک کتابوں کا مصنف ہے، عقیدہ رکھتا تھا کہ ہمیں انسان کے ابدی اور جاوید ہونے، پاداش و جزا بخشنے والی بہشت، پاک کرنے والی برزخ اور سزا دینے والی دوزخ پر اعتقاد رکھنا چاہیے۔<sup>[۳]</sup>

## ۳۔ یہودی کتابوں میں عقیدہ معاد<sup>[۴]</sup>

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہود و نصاریٰ موت کے بعد کی دنیا پر اعتقاد رکھتے تھے اور یہ مسئلہ ”عہد جدید“ کی کتابوں اور اناجیل میں

[۱] ”یونان باستان“ ویل ڈیورنٹ۔ ج ۲ ص ۱۸

[۲] تاریخ تمدن ویل ڈیورنٹ۔ ج ۳ (قیصر و مسیح) ص ۹

[۳] تاریخ ویل ڈیورنٹ۔ ج ۳ ص ۵۷

[۴] یہودیوں کی مقدس کتابیں کہ جنہیں عہد عتیق کہا جاتا ہے، ۳۹ کتابوں پر مشتمل ہیں۔ جن میں سے ۵ کتابیں تورات کے پنجگانہ اسفار ہیں اور ۱۷ کتابیں مورخین کے مکتوبات کے نام پر ہیں۔ جیسا کہ ان کے نام ہی سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بادشاہوں اور ملوک وغیرہ کے بارے میں مورخین کی لکھی گئی تحریریں ہیں۔ باقی ۱۷ کتابوں کو مکتوبات انبیاء کہا جاتا ہے کہ جس میں انبیاء کے حالات زندگی، احادیث، نصائح اور مناجات موجود ہیں۔ لیکن عیسائیوں کی مقدس کتابیں (عہد جدید) مجموعاً ۲ کتابوں سے زیادہ نہیں ہیں جن میں سے ۱۴ انجیلیں ہیں کہ جو حضرت مسیح علیہ السلام کے شاگردوں یا شاگردوں کے بھی شاگردوں کے وسیلے سے لکھی گئی ہیں۔ ۲۲ کتابیں پولس اور مسیحیت کی ان تمام بڑی شخصیات کے وہ خطوط ہیں کہ جو مختلف علاقوں میں بھیجے گئے۔ آخری کتاب یوحنا کے مکاشفات ہیں۔ اس میں اس کے مکاشفات کی تفصیل دی گئی ہے۔

بکثرت دیکھنے کو ملتا ہے اگرچہ ”کتب عتیق“ یعنی کتب یہود میں یہ مسئلہ کم دکھائی دیتا ہے۔

یہ تفاوت ”شاید“ اس وجہ سے ہے کہ یہودی جیسا کہ ان کی پوری تاریخ سے آشکار ہے، یہ دنیا پرستی کی شدت اور حیاتِ مادی سے بہت زیادہ رغبت کی وجہ سے عقیدہ معاد کو اپنے کاموں میں رکاوٹ کا باعث سمجھتے تھے۔ لہذا جب انہوں نے اپنے انبیاء کے آثار میں تحریف کا سلسلہ شروع کیا تو جہاں کہیں مادی زندگی کے بارے میں بات ہوئی اسے بطور احسن محفوظ کر لیا لیکن جہاں دیکھا کہ قیامت اور دنیا پرستوں اور ستم گاروں کی سزا کا ذکر ہے، اسے حذف کر دیا۔

قرآن مجید نے بھی ان کا تعارف کچھ اس طرح سے کروایا ہے:

وَلَتَجِدَنَّهُمْ أَحْرَصَ النَّاسِ عَلَى حَيٰوَةٍ ۖ وَمِنَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا ۚ يَوَدُّ أَحَدٌ

هُم لَوْ يُعَمَّرُ أَلْفَ سَنَةٍ ۖ (بقرہ ۹۶)

”اور تم انہیں (دیناوی) زندگی کے حریص ترین لوگوں میں سے پاؤ گے حتیٰ کہ مشرکین سے بھی زیادہ حریص، اس طرح کہ ان میں سے ہر کوئی چاہتا ہے کہ ہزار سال زندہ رہے۔“

موت کے بعد کی دنیا کے مسئلے سے متعلق ”عہد قدیم“ کی کتب میں دکھائی دینے والی اس ساری بے توجہی کے باوجود ایسی واضح تعبیرات مل جاتی ہیں کہ جو ایک ایسی دنیا پر اعتقاد کے مسئلے کو بیان کرتی ہیں۔ مثلاً:

### ۱۔ کتاب ”اشعیای نبی“:

تمہارے مردے زندہ ہو جائیں گے اور مرے جسم کھڑے ہو جائیں گے۔<sup>[۱]</sup>

### ۲۔ کتاب اول ”سموئیل“:

خداوند مارتا ہے اور زندہ کرتا ہے اور قبروں کے نیچے لے جاتا ہے اور پھر اٹھا لیتا ہے۔<sup>[۲]</sup>

### ۳۔ مزامیر ”داؤد“:

اگرچہ سایہ موت کی وادی میں بھی چلوں، برائی سے نہ ڈروں گا کیونکہ تو میرے ساتھ ہے، تیرا فضل و کرم میری ساری زندگی میں ہر طرح میرے ساتھ رہے گا اور خدا کے گھر میں تا ابد آباد رہوں گا۔<sup>[۳]</sup>

[۱] کتاب اشعیای باب ۲۶ جملہ ۱۹

[۲] کتاب اول سموئیل باب ۲ جلد ۶

[۳] مزامیر داود مزبور ۲۳ جملہ ۴-۶

اسی طرح حضرت ”سموئیل“، ”اشعیا“ اور داؤد جیسے پیغمبروں نے بڑے واضح اشارات کے ساتھ قیامت کے بارے میں خبر دی ہے اگرچہ ایسی باتیں اور اس طرح کے دوسرے بیانات قوم یہود کے لئے خوشی کا باعث نہ تھے۔ شاید اسی بناء پر انہوں نے اس ضمن میں پائی جانے والی کئی ایک عبارات کو ختم کر دیا۔

بعض مورخین نے یہودی عقائد کو کچھ اس طرح بیان کیا ہے:

وہ لوگ معتقد تھے کہ آخر کار یوم اللہ (روز جزا) میں مردے اٹھ کھڑے ہوں گے۔ (نئے سرے سے زندگی شروع کریں گے)..... جلد ہی کوئی ایک نجات دینے والا آئے گا اور اس کی کامیابی کے ساتھ تمام اچھے کام کرنے والے قبروں سے اٹھ کھڑے ہوں گے اور ابدی جگہ بہشت کی طرف چل پڑیں گے۔<sup>[۱]</sup>

یہی مصنف ایک دوسری جگہ پر زشتوں کے عقیدے سے متعلق اشارہ کرتے ہوئے یوں نقل کرتا ہے:

”مردے اٹھ کھڑے ہوں گے، مردہ جسموں میں جان پڑ جائے گی، سانس سینوں میں واپس لوٹ آئے گا، تمام عالم مادی بڑھاپے، موت اور تباہی و بربادی سے نجات پالے گا اور پھر ہمیشہ ایسا ہی رہے گا۔

## ۴۔ اناجیل میں ذکر قیامت

جیسا کہ پہلے بھی اشارہ کیا جا چکا ہے موت کے بعد کی زندگی کے مسئلے پر مسیحیوں کی اناجیل میں نسبتاً زیادہ صراحت کے ساتھ بحث کی گئی ہے۔

مثلاً:

”انجیل متی“ کہ جو سب سے پہلی اناجیل میں سے ہے یوں گویا ہے:

”بنابر اس انسان کا بیٹا اپنے باپ کے جلال میں اپنے فرشتوں کے ساتھ نمودار ہوگا اور پھر اس وقت ہر کسی کو اس کے عمل کے مطابق جزا دیں گے۔“<sup>[۲]</sup>

”انجیل یوحنا“ میں یوں بیان کیا گیا ہے:

”..... وہ گھڑی بھی آئے گی کہ جب وہ سب کے سب جو قبروں میں ہیں اس کی آواز سنیں گے اور باہر نکل آئیں گے۔ وہ جنہوں نے نیکی کی ہوگی قیامت کے لئے اور جنہوں نے بدی کی ہوگی قیامت کے لئے۔“ (قیامت سے مراد ظاہراً نعمت خدا کے سایہ میں حیات ابدی ہی ہے کہ جو صالح افراد کا صلہ ہے اور قیامت جزا سے مراد بدکاروں کا خداوند قدوس کی عادلانہ قضاوت کے مطابق اپنے

[۱] تاریخ تمدن ویل ڈیورنٹ، جلد ۳ ص ۷۳۷ (خلاصہ)

[۲] انجیل متی۔ باب ۱۶ جملہ ۲۷

کیفر کردار تک پہنچنا ہے۔ (۱)

## نتیجہ بحث

متذکرہ بالا تمام بحث سے بخوبی یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ مذہبی و غیر مذہبی مورخین کے مطابق موت کے بعد کی زندگی پر اعتقاد قدیم ترین زمانے ہی سے موجود رہا ہے حتیٰ کہ رسم الخط کے ایجاد ہونے اور قبل تاریخ ہی سے مختلف انسانی قوموں میں یہ عقیدہ موجود رہا ہے۔ ہر قوم و ملت نے اس مسئلے سے متعلق اپنے یقین کا اظہار اس طرح سے کیا ہے کہ یہ بات کاملاً عیاں ہو جاتی ہے کہ یہ اعتقاد قومیت، نسل پرستی، زبان اور کسی خاص علاقے کے رنگ میں نہیں رنگا ہوا تھا بلکہ تاریخ میں اور قبل از تاریخ بھی ایک عمومی اعتقاد کی حیثیت سے موجود رہا ہے۔

جیسا کہ معاد کے فطری ہونے کی بحث میں بھی وضاحت سے بیان کیا گیا ہے کہ اس عمومی اعتقاد کا سرچشمہ یہی ہے کہ اس پر اعتقاد انسان کی سرشت و فطرت میں رچا بسا ہوا ہے اور یہ کہیں باہر سے القاء ہونے والا امر نہیں کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یا قوموں کے بدل جانے سے بدل جائے۔

## ایمان معاد اور تربیت

اس میں شک نہیں کہ معاد پر ایمان انسانی اعمال میں گہری اور وسیع تاثیر کا باعث ہے۔ اصولاً انسان کے اعمال اس کے اعتقادات ہی کا انعکاس ہیں یا بالفاظ دیگر ہر انسان کا برتاؤ اس کے تصور کائنات سے مستقیم و براہ راست مربوط ہے۔

اگر کسی کو پتہ ہو کہ اس کے تمام اعمال جلد ہی ایک ایسی عدالت میں پیش ہوں گے جس کے جج ہر چیز سے آگاہ ہیں، جہاں سفارش کام آئے گی نہ رشوت اور نہ ہی اس عدالت کے حکم پر تجدید نظر ہوگی، پھر اس کے مطابق صلہ پائے گا یا سزا یا دوسرے زاویہ نگاہ سے یہ کہ اس کے تمام اعمال محفوظ ہیں اور رنگ ابدیت میں رنگے ہوئے ہیں اور دوسری دنیا میں اس کے ہمراہ ہیں، اس کی عزت و آبرو یا شرمساری یا پھر آسودگی و سکون یا سزا کا باعث ہیں اور انہی کی بناء پر ابدی سعادت ہے یا ہمیشہ ہمیشہ کا عذاب، یقیناً ایسا فرد نہ صرف اپنی اصلاح و کوشش کرے گا بلکہ اپنے مختلف اعمال کی انجام دہی میں بہت زیادہ باریک بین اور سخت گیر ہوگا بالکل اسی طرح جیسا کہ ایک واقف حال شخص شفا بخش اور مسموم دوائیوں کے خواص سے آگاہ ہو تو ان کے بارے میں بہت حساس ہوتا ہے اور اپنی تمام تر کوشش کے ساتھ شفا بخش دوائیوں ہی کا انتخاب کرتا ہے اور اپنی پوری کوشش کرتا ہے کہ مسموم اور مہلک دوائیوں سے دوری اختیار کرے۔ یہی مسئلہ موت کے بعد کی زندگی اور قیامت کی عدالت پر صادق آتا ہے۔

آئیے! قرآن کی طرف پلٹتے ہیں اور اس حقیقت کو بیان کرنے والی درج ذیل آیات کو گوش شنوا اور چشم بینا سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں:

(۱) فَمَنْ كَانَ يَرْجُوا لِقَاءَ رَبِّهِ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِ

أَحَدًا ۝ (کہف: ۱۱۰)

(۲) وَيُطِيعُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا ۝ اِنَّمَا نُنْطِِعُكُمْ

لِوَجْهِ اللَّهِ لَا نُرِيدُ مِنْكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكْرًا ۝ اِنَّا نَخَافُ مِنْ رَبِّنَا يَوْمًا

عَبُوسًا قَمَطِرٍ ۝ (دھر: ۸ تا ۱۰)

(۳) وَمَالِيَ لَا أَعْبُدُ الَّذِي فَطَرَنِي وَالَّذِي تَرْجَعُونَ ۝ (یس: ۲۲)

(۴) قَالَ الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُمْ مُلْقُوا اللَّهَ ۖ كَمْ مِّنْ فِتْنَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِتْنَةً

كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ ط وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ ﴿٣٩﴾ (البقرة: ۲۳۹)

(۵) قَالُوا لَنْ نُؤْثِرَكَ عَلَى مَا جَاءَنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالَّذِي فَطَرَنَا فَاقْضِ مَا أَنْتَ قَاضٍ ط إِنَّمَا تَقْضِي هَذِهِ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا ﴿٤٠﴾ إِنَّا أَمَّا بِرَبِّنَا لِيَغْفِرَ لَنَا خَطِيئَاتِنَا (طه: ۴۲: ۴۳)

(۶) ..... يَتَسَاءَلُونَ ﴿٣٩﴾ عَنِ الْمُجْرِمِينَ ﴿٣٩﴾ مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرٍ ﴿٣٩﴾ قَالُوا لَمْ نَكُ مِنَ الْمَصْلِيِّينَ ﴿٣٩﴾ ..... وَكُنَّا نَكْذِبُ بِيَوْمِ الدِّينِ ﴿٣٩﴾ (البدر: ۳۰ تا ۳۶)

(۷) وَيُلْ لِلْمُطَفِّفِينَ ﴿١﴾ ..... أَلَا يَظُنُّ أُولَٰئِكَ أَنَّهُمْ مَبْعُوثُونَ ﴿١﴾ (مطففين: ۱)

(۸) إِنَّمَا يَسْتَأْذِنُكَ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ (توبه: ۳۵)

(۹) أَرَأَيْتَ الَّذِي يُكْذِبُ بِاللَّيْلِ ﴿١﴾ فَذَلِكَ الَّذِي يَدْعُ الْيَتِيمَ ﴿١﴾ (ماعون: ۱)

(۱۰) بَلْ يُرِيدُ الْإِنْسَانُ لِيَفْجُرَ أَمَامَهُ ﴿٥﴾ يَسْأَلُ أَيَّانَ يَوْمُ الْقِيَمَةِ ﴿٦﴾ (قيامة: ۵، ۶)

(۱۱) إِنَّ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ زَيَّنَّا لَهُمْ أَعْمَالَهُمْ فَهُمْ يَعْمَهُونَ ﴿٣﴾ (النمل: ۳)

(۱۲) وَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَبَيْنَ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ

حِجَابًا مُسْتَوْرًا ﴿٣٥﴾ وَجَعَلْنَا عَلَى قُلُوبِهِمْ أَكِنَّةً أَنْ يَفْقَهُوهُ وَفِي آذَانِهِمْ وَقْرًا ط

(بنی اسرائیل: ۳۶، ۳۵)

ترجمہ

(۱) جو اپنے پروردگار سے ملاقات کی امید رکھتا ہے پس وہ عمل صالح انجام دے اور اپنے پروردگار کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے۔



(۲) (اور) اپنا کھانا (باوجود اس کے کہ خود اس کے نیاز مند ہیں) اس کی (اللہ تعالیٰ) محبت میں مسکین، یتیم اور اسیر کو کھلاتے ہیں (اور کہتے ہیں) ہم تمہیں خدا کی خوشنودی کے لئے کھانا کھلاتے ہیں اور تم سے کوئی صلہ اور شکر یہ نہیں چاہتے۔ ہم اپنے پروردگار سے خوف زدہ ہیں اس دن کے بارے میں جو سخت اور شدید ہے۔

(۳) میں کیوں نہ اس کی عبادت کروں کہ جس نے مجھے خلق کیا ہے اور سب کے سب اسی کی طرف پلٹ کر جائیں گے۔

(۴) لیکن وہ تو جانتے تھے کہ خدا سے ملاقات کریں گے (اور روز قیامت پر ایمان رکھتے تھے)۔ انہوں نے کہا کتنے ہی ایسے چھوٹے گروہ (لشکر) ہیں کہ جو خدا کے حکم سے بڑے گروہوں (لشکروں) پر غلبہ پا گئے اور خدا صابرین (استقامت کرنے والوں) کے ساتھ ہے۔

(۵) انہوں نے کہا کہ ہم ہرگز تمہیں اس خدا پر کہ جس نے ہمیں خلق کیا ہے وہ روشن دلائل کہ جو ہم تک پہنچے ہیں مقدم نہ جائیں گے۔ جو حکم دینا چاہتے ہو دے لو چونکہ تم فقط اس دنیاوی زندگی ہی میں قضاوت کر سکتے ہو۔ ہم اپنے پروردگار پر ایمان لائے ہیں تاکہ ہمارے گناہوں کو بخش دے۔

(۶) وہ بہشت کے باغوں میں ہیں اور سوال کرتے ہیں مجرمین سے: کس چیز نے آپ کو دوزخ میں بھیجا؟ کہتے ہیں ہم نمازیوں میں سے نہ تھے اور حاجتمندوں کو کھانا نہ کھلاتے تھے اور ہمیشہ اہل باطل کے ساتھ ہم نشین و ہم صدا تھے اور ہر وقت روز جزا کا انکار کرتے تھے۔

(۷) ہلاکت ہے کم تو لے والوں کے لئے، کیا وہ گمان نہیں کرتے کہ دوبارہ اٹھائے جائیں گے یوم عظیم کو۔

(۸) فقط وہ لوگ تم سے اجازت لیتے ہیں کہ جو خدا اور یوم آخرت پر ایمان نہیں رکھتے۔

(۹) کیا تو نے اس شخص کو دیکھا ہے جو روز جزا کو جھٹلاتا ہے؟ یہ وہی ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے۔

(۱۰) (انسان کو قیامت میں شک نہیں ہے) بلکہ وہ تو چاہتا ہے (آزاد رہے اور) ساری عمر گناہ کرے۔ (لہذا) پوچھتا ہے قیامت کب ہوگی!

(۱۱) جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ان کے (برے) اعمال کو ان کے لئے زینت دیتے ہیں اس طرح کہ وہ سرگرداں ہو جاتے ہیں۔

(۱۲) اور جب تم قرآن پڑھتے ہو تو ہم تمہارے اور ان لوگوں کے درمیان کہ جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے غیر مرئی حجاب قرار دے دیتے ہیں اور ان کے دلوں پر پردے ڈال دیتے ہیں تاکہ وہ سمجھ نہ سکیں اور ان کے کانوں کو بہرہ کر دیتے ہیں۔ اور جب تم قرآن میں اپنے پروردگار کو وحدانیت سے یاد کرتے ہو تو تیری طرف پشت کر لیتے ہیں اور تم سے منہ موڑ لیتے ہیں۔

## تفسیر

## اعمال صالح کا باعث، معاد پر ایمان

پہلی آیت میں آخرت پر ایمان اور عمل صالح کے درمیان نزدیک ترین رابطے کو منعکس کیا گیا ہے۔ فرمان خداوندی ہے: ”جو کوئی اپنے پروردگار سے ملاقات کی امید رکھتا ہے پس اسے چاہیے کہ عمل صالح انجام دے اور اپنے پروردگار کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے۔“

**فَمَنْ كَانَ يَرْجُوا لِقَاءَ رَبِّهِ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِ**

**احدا**

درحقیقت آخرت پر ایمان اس آیت کے مطابق انسان میں دو چیزوں کا باعث بنتا ہے، ایک عمل صالح اور دوسرا اخلاص عبودیت۔ جاذب توجہ یہ ہے کہ روز قیامت کو لقاء اللہ کا دن قرار دیا ہے اور جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ یہ دیدار معنوی اور شہود باطنی انسان کے مکمل کا بلند ترین مقام ہے اور اس کا ذکر اخلاص کامل اور عمل صالح کا باعث ہو سکتا ہے۔ یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ معاد پر یقین کے بجائے امید و رجاء کا ذکر کیا گیا ہے اور یہ اشارہ ہے اس امر کی طرف کہ معاد کے بارے میں امید و رجاء بھی ایسے آثار کا منبج ہو سکتی ہے۔<sup>[۱]</sup>

”یرجوا“ کہ جو فعل مضارع ہے استمرار اور کسی کام کے تسلسل پر دلالت کرتا ہے۔ اس کے بعد امر مطلق کی صورت میں اخلاص اور عمل صالح کا حکم، یہ سب اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ وہ امید اور یہ عمل، ہمیشہ اور دائماً ایک دوسرے کے دوش بدوش آگے بڑھتے ہیں۔ اس آیت مجیدہ کا یہ ظریف نکتہ بھی قابل استفادہ ہے کہ قرآن درحقیقت بندوں کو ایسے مسافروں سے تشبیہ دیتا ہے کہ جو کچھ عرصے کی جدائی اور دوری کے بعد اپنے محبوب سے جا ملیں گے اور انہیں چاہیے کہ اس سفر سے لازماً کوئی نہ کوئی سوغات یا تحفہ لے کر جائیں اور کوئی ایسا کام انجام دیں کہ جو اس دیدار کے سزاوار ہوتا کہ دیدارِ یار سے شرمندہ نہ ہونے پائیں۔

بعض تفاسیر نے اس کے شان نزول میں بیان کیا ہے کہ ایک آدمی رسول پاک کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ میں خدا کی راہ میں جہاد کرنے کو پسند کرتا ہوں۔ اس کے ساتھ ساتھ میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ میدانِ جہاد میں میرے مقام کا مجھے علم ہو۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی (اور اخلاص کی تاکید کی گئی)۔

اسی آیت کی ایک اور شان نزول میں بیان کیا گیا ہے کہ کوئی شخص رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: ”اے رسول خدا! میں صدقہ دیتا ہوں اور صلہ رحم بجالاتا ہوں اور یہ کام فقط خدا کی رضا و خوشنودی کے لئے انجام دیتا ہوں۔ لیکن جب لوگ

میرے عمل کے بارے میں باتیں کرتے ہیں اور ستائش کرتے ہیں تو خوش ہوتا ہوں۔“ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خاموش ہو گئے اور کوئی بات نہ کہی تو یہ آیت نازل ہوئی۔<sup>[۱]</sup>

ان شان نزول سے بخوبی پتہ چلتا ہے کہ عبادت اور عمل صالح کی بنیاد اخلاص کامل پر ہے، ایسا اخلاص کہ جس میں ریاکاری، خود نمائی اور شرک کا شائبہ تک نہ ہو۔

دوسری آیت اس معروف داستان کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ جو خاندان رسالت نے تین دن نذر کے روزے رکھے اور پھر اپنا افطار کا کھانا مسکین، یتیم اور اسیر کو بخش دیا۔ اس واقعہ سے یہ حقیقت آشکار ہو جاتی ہے کہ اس بے مثال ایثار و درگزر کا سرچشمہ معاد پر ایمان ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ وہ کہتے ہیں: ”ہم تمہیں فقط خدا کے لئے کھانا کھلاتے ہیں اور تم سے کسی قسم کا صلہ اور شکر یہ نہیں چاہتے۔ ہم اپنے پروردگار سے خوف زدہ ہیں اس دن کہ جو عبوس اور شدید ہے۔“ (اور بناء براسی دلیل کے ہم اس کی رضا کے حصول کے لئے جہاں تک ہماری قوت و طاقت ہے ایثار کرتے ہیں)۔

### انما نطعمکم لوجہ اللہ لا نرید منکم جزاء ولا شکورا۔ انا نخاف من

#### ربنا یوما عبوساً قمطیراً۔<sup>[۲]</sup>

جی ہاں! جو خدا اور روزِ جزا سے ڈرتا ہے نہ صرف اپنی ضرورت سے زائد چیزیں اس کی راہ میں خرچ کر دیتا ہے بلکہ وہ چیز بھی کہ جس کی اسے خود اشد ضرورت ہو اسے بھی اس بے مثل محبوب کی راہ میں دے دیتا ہے اور وہ بھی اخلاص کامل کے ساتھ، صلہ کا منتظر ہے اور نہ کسی کے زبانی اظہار تشکر کا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس عظیم دن پر ایمان خلوص نیت اور نیکیوں کی طرف متوجہ کرنے کا کس قدر طاقت ور محرک ہے۔

یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ گذشتہ آیت میں بات کی گئی ہے کہ قیامت کے بارے میں امید و رجاء عمل صالح اور اخلاص کے لئے موثر ہے اور یہاں اس دن سے خوف کو موثر قرار دیا گیا ہے۔ مجموعی طور پر امید و خوف دونوں اعمال کے بنیادی محرک ہیں۔

تیسری آیت میں اس مردِ مومن کی زبانی نقل کیا گیا ہے کہ جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے تین رسولوں<sup>[۳]</sup> کی حمایت میں انطاکیہ میں

[۱] تفسیر قرطبی، ج ۶، ص ۴۱۰۹

[۲] ”عبوس“ منہ بسورنا، تیوری چڑھانا کے معنی میں ہے اور ”قمطیر“ سخت اور شدید کے معنی میں ہے اور یہ جو روزِ قیامت کو اس سے تشبیہ دی گئی ہے کہ انسانوں کے چہرے بگڑے ہوئے ہوں گے یا منہ بنے ہوئے ہوں گے، یہ انتہائی لطیف تعبیر ہے جو اس کی وحشت اور خوف کی خبر دیتی ہے۔ بعض مفسرین کا قول ہے کہ ”قمطیر“ کا مادہ ”قمر“ ہے اور بعض کے نزدیک اس کا مادہ ”قطر“ بروزن ”قفل“ ہے۔ لیکن مشہور پہلے والا ہی ہے۔

[۳] مفسرین نے اس مردِ مومن کا نام حبیب نجار بتایا ہے اور بعض روایات میں ”مومن آل یاسین“ بھی نقل ہوا ہے۔ ان تین مسیحی پیامبروں کے نام ”شمعون“، ”یوحنا“ اور ”پولس“ بتائے جاتے ہیں۔

کھڑا ہوا اور وہاں کے لوگوں کو ان کی پیروی کی دعوت دی۔ وہ لوگوں کو دعوت دیتے ہوئے یوں کہتا ہے:

### وما لی لا اعبد الذی فطرنی والیہ ترجعون

”کیونکر میں اس کی پرستش نہ کروں کہ جس نے مجھے خلق کیا اور سب نے اسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔“

درحقیقت اس نے اپنی اس بات میں پروردگار کی عبودیت کے لازم ہونے کی دو لیلیں بیان کی ہیں۔ پہلی یہ کہ وہ ہمارا خالق ہے اور ہمارا تمام وجود ”علم“، دانش اور طاقت سب کچھ اسی سے ہے۔ دوسری دلیل یہ کہ آگے ایک اور دنیا ہے کہ سب وہاں پہنچیں گے، خدا اور اس کی عدالت میں لوٹ کر جائیں گے۔

قابل توجہ یہ ہے کہ خلق کرنے اور نعمتوں کی بخشش کے مطلب کو خدا تعالیٰ اپنی طرف نسبت دیتا ہے اور قیامت میں واپس پلٹنے کو ان کی طرف کہ جو پہلے مرحلے میں شکر نعمت کی شکل میں اور دوسرے مرحلے میں مخافین کو قیامت میں عذاب الہی کی دھمکی کی صورت میں ہے۔

### معاد پر ایمان اور استقامت

چوتھی آیت میں بتایا گیا ہے کہ معاد پر ایمان میدان جہاد میں دشمن کے مقابلے میں مقاومت کرنے اور استقامت و پامردی میں کس قدر موثر ہے۔ بنی اسرائیل کے مومنین کے ایک گروہ کی زبانی بات کی گئی ہے کہ انہوں نے ”طالوت“ (ان کے لشکر کا خدائی کمانڈر) کی ہمراہی میں شنگر بادشاہ ”جالوت“ کے خلاف قیام کیا۔ ایک سخت امتحان کے بعد ایک گروہ پیچھے رہ گیا اور صرف ایک چھوٹی سی اقلیت نے میدان جہاد میں قدم رکھا۔ پھر یہ اقلیت بھی دو گروہوں میں بٹ گئی۔ ان میں سے بعض وحشت و خوف میں مبتلا ہو گئے اور کہنے لگے:

### قالوا لا طاقة لنا اليوم بجالوت وجنوده

”آج ہم جالوت اور اس کے لشکر کے مقابلے کی طاقت نہیں رکھتے۔“

اس گروہ کے مقابلے میں ان لوگوں نے کہ جو یہ جانتے تھے کہ خدا سے ملاقات کریں گے (اور روز قیامت پر ایمان رکھتے تھے) کہا: چہ بسا چھوٹے گروہ خدا کے حکم سے عظیم لشکروں پر غلبہ حاصل کر گئے اور خدا صابرين کے ساتھ ہے۔ (قال الذین یظنون انہم ملقوا اللہ کم من فئۃ قليلة غلبت فئۃ کثرۃ باذن اللہ واللہ مع الصبرین)۔

کئی ایک مفسرین کے بقول ”یظنون“ کی تعبیر یہاں روز قیامت پر یقین“ کے معنی میں ہے اور ہونا بھی ایسا ہی چاہیے چونکہ یہ اظہار خیال ایسے افراد کی طرف سے تھا جو مختلف امتحانات کی کسوٹی پر پرکھے جا چکے تھے اور راسخ ایمان کے ساتھ انہوں نے میدان جہاد میں قدم رکھا تھا۔

البتہ فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ ”ظن“ وسیع معنی کا حامل ہے جس میں یقین بھی شامل ہے۔ ”مفردات“ میں راغب کے بقول ”ظن“ اس اعتقاد کے معنی میں ہے کہ جو دلائل اور علامات سے حاصل ہو۔ جب کبھی قوی ہو تو علم پر منتہی ہوتا ہے اور اگر ضعیف ہو تو وہم کی

حدود سے تجاوز نہیں کرتا۔

بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ ”ظن“ یہاں اسی ”گمان“ کے معنی میں ہے۔ لیکن (لقاء اللہ) یہاں قیامت کے معنی میں نہیں بلکہ راہ خدا میں شہادت کے معنی میں ہے۔ یعنی یہ بات ان لوگوں کی تھی کہ جنہیں پر افتخار شہادت کا گمان تھا۔

لیکن یہ معانی بہت بعید دکھائی دیتا ہے کیونکہ چھوٹے گروہ کے بڑے پر غلبے سے اس کی کوئی مناسبت نہیں ہے علاوہ ازیں لقاء اللہ معمولاً آیات قرآن میں قیامت کے معنی میں استعمال ہوا ہے نہ کہ موت یا شہادت کے معنی میں۔

بہر حال یہ بات قطعی ہے کہ جو لوگ قیامت پر ایمان رکھتے ہیں ہرگز موت کو زندگی کا اختتام نہیں سمجھتے بلکہ اسے ایک برتر زندگی کا آغاز شمار کرتے ہیں ایسے اشخاص نہ فقط موت سے ڈرتے نہیں بلکہ شجاعت و جرات اور دلیری کے ساتھ اس کا استقبال کرتے ہیں۔

پانچویں آیت فرعون کے جادو گروں کی زبانی بیان کی گئی ہے جب وہ موسیٰ پر ایمان لائے اور فرعون نے ان کو بے رحمانہ قتل کی دھمکی دی تو انہوں نے بڑی صراحت کے ساتھ فرعون سے کہا:

**فاقص ما انت قاض انما تقضى هذه الحیوة الدنیا انا امانا بربنا**

**لیغفر لنا خطایانا و ما اکرهتنا علیہ من السحر واللہ خیر و ابقی۔**

”جو حکم دینا چاہتے ہو دے لو تم فقط اس دنیاوی زندگی ہی میں حکم دے سکتے ہو لیکن ہم اپنے پروردگار پر ایمان لائے ہیں تاکہ وہ ہمارے گناہوں کو اور وہ جو کچھ تم نے جادو کے ذریعہ ہم پر ٹھونسا ہے بخش دے اور خدا بہتر اور باقی رہنے والا ہے۔“

اس جگہ قیامت پر ایمان اور دنیاوی زندگی کو حقیر جاننا اس بات کا باعث بنا کہ فرعون جادو گر انتہائی بڑی قربانی۔ ایثار، اور درگزر کا مظاہرہ کریں اور فرعون کے تمام تر انعامات اور مادی فوائد و منافع کو پاؤں کی ٹھوکرا ماریں اور غیر معمولی دردناک اور مختلف قسم کے شکنجوں سے بھرپور موت کا استقبال کریں۔ جرات و ہمت اور شجاعت و بہادری کے ساتھ اس ظالم و سفاک طاغوت کی دھمکیوں کے مقابلے میں کھڑے ہو جائیں اور شجاعت کے ساتھ شہادت نوش کریں۔

جی ہاں جب معاد پر ایمان کے شیریں شربت کے گھونٹ دل و جان کی گہرائیوں میں اتر جائیں تو پھر اس قدر شعلہ ور کر دیتے ہیں کہ کوئی بھی دھمکی اس کے مقابلے میں کارگر ثابت نہیں ہوتی اور پھر انسان کی نظر میں خدا اس کی دائمی نعمت اور آخرت کے علاوہ ہر چیز بے وقعت و ناچیز ہے۔

یہی طاقت و رسلہ و ایمان اس امر کا سبب بنا کہ کل کے گھٹیا مادی اور چاپلوس جادو گر آج کے قوی شجاع اور نہایت با استقامت

انسانوں میں تبدیل ہو جائیں۔<sup>[۱]</sup>

الحیوة الدنیا (اس دنیا کی پست زندگی) کی اصطلاح ان لوگوں کے حیات جاوید اور اس بہترین جہان پر ایمان کی طرف ایک عمدہ اشارہ ہے۔

اس آیت کے بعد والی آیات مزید صراحت کے ساتھ ان لوگوں کے جہان آخرت، الہی عدالت بہشت، دوزخ بہشتیوں کے مختلف درجات۔ مختلف قسم کی بہشتی نعمتوں اور ان کے دوام پر ایمان کو واضح کرتی ہیں۔

## انکار معاد کے منفی نتائج

گذشتہ پانچ آیتوں میں معاد اور موت کے بعد کی زندگی پر ایمان کے مثبت آثار کو مختلف جہات سے بیان کیا گیا ہے چھٹی آیت سے معاد پر ایمان نہ رکھنے کے منفی آثار کو مشخص کیا جا رہا ہے۔

### یتساء لون۔ عن المجرمین ما سلكکم فی سقر۔<sup>[۲]</sup>

جب بہشتی دوزخ کی طرف نگاہ کریں اور مجرموں کو مختلف قسم کی سزاؤں میں دیکھیں گے تو ان سے بڑے معنی خیز انداز میں پوچھیں گے کہیں گے: ”کس چیز نے تمہیں دوزخ میں پہنچایا؟“

دوزخی جواب دیں گے اور اپنے دوزخی ہونے کے عوامل کو خلاصۂ چار چیزوں میں بیان کریں گے:

ترک نماز، ضرورت مندوں کو کھانا نہ کھانا اہل باطل کے ساتھ ہم نشینی اور روز جزا کو دائمًا جھٹلاتا۔ (قالوا لہ نك من المصلین ولم نك نطعم المسکین و کنا نخوض مع الخائضین و کنا نکذب ببیوم الدین)۔

ان آیات سے بخوبی پتہ چلتا ہے کہ دوزخی اعمال میں مبتلا ہونے کے عوامل میں سے ایک اہم ترین عامل بلکہ ام الفساد اور عامل اصلی

[۱] جملہ والدی فطر ناکی تفسیر میں دو احتمال ذکر کئے گئے ہیں پہلا یہ کہ جملہ قسم کے معنی میں ہے جیسا کہ مندرجہ بالا تفسیر میں ہم نے ذکر کیا ہے دوسرا یہ کہ جملہ پہلے والے جملے پر عطف ہے۔ ایسی صورت میں معنی یہ ہوگا ہم تمہیں ہرگز مقدم نہ جائیں گے اس روشن دلائل پر کہ جو ہم تک پہنچے ہیں اور اس خدا پر کہ جس نے ہمیں خلق کیا ہے لیکن پہلے والا معنی لطیف دکھائی دیتا ہے چونکہ پہلے والی چند آیات میں وہ فرعون کی عزت کی قسم کھاتے ہیں اور یہاں تمام انسانوں کے خالق کی!

[۲] دراصل ”سقر“ (بروزن سفر) سقر (بروزن فقر) کے مادے سے لیا گیا ہے جس کا معنی ہے دگرگوں ہو جانا یا دھوپ کی تپش کے زیر اثر پگھل جانا مثانیس اللغہ کی طرح بعض نے اس کے معنی جلنے اور جلانے کے بھی کئے ہیں صحاح اللغہ نے کہا ہے کہ آگ کے ناموں میں سے ایک نام ہے بہر حال دوزخ کے لیے اس نام کا انتخاب اس لیے کیا گیا ہے کہ تمام معانی اس میں جمع ہیں کتاب التحقیق میں کہا گیا ہے کہ سقر خود آگ کا نام ہے نہ کہ آگ والی جگہ جیسا کہ جہنم۔

یہی روز جزا کا جھلانا ہے کہ جو انسان کو غیر ذمہ دار مسؤلیت سے عاری اور تقویٰ سے تہی دامن کر دیتا ہے یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ بہشتیوں نے یہ نہیں پوچھا کہ کیونکر خدا نے تمہیں دوزخ میں بھیجا بلکہ سوال یہ کیا کہ تمہیں جہنم بھیجنے میں کون سائل کا فرما تھا تا کہ اس طرح سے برے عقائد و اعمال اور ان کے ساتھ ہونے والے سلوک اور روجہنم کے درمیان موجود طبعی ارتباط کو واضح کریں۔

یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ ان چار عوامل میں سے سب سے پہلے ارتباط با خدا (نماز) کو ترک کرنے کا ذکر ہے اور اور پھر ستم رسیدہ مخلوق کے ساتھ رابطے کو ترک کرنے اور اس کے بعد اہل باطل کے ساتھ ہم نشینی (خوض مع الخائضین) اور آخر میں قیامت پر ایمان نہ رکھنے کا ذکر ہے۔

قیامت کے ناموں میں سے ”یوم الدین“ (روز جزا) کا ذکر اس حقیقت کی طرح اشارہ ہے کہ ایمان اور عمل صالح کی طرف حرکت کا اصلی عامل قیامت کو روز جزا جانا ہی ہے

ساتویں آیت مطففین (کم تولنے والوں) کے بارے میں بات کرتی ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

**ویل للمطففین..... الا یظن اولئک انہم مبعوثون لیوم عظیم یوم**

**یقوم الناس لرب العلمین**

ہلاکت ہے کم تولنے والوں کے لیے کیا انہیں یقین نہیں کہ یوم عظیم کو دوبارہ اٹھائے جائیں گے؟ اس دن کہ جب سب لوگ رب العالمین کی بارگاہ میں کھڑے ہوں گے۔

یہاں بھی ممکن ہے ”ظن“ یقین کے معنی میں ہو یا پھر گمان ہی کے دوسرے مطابق اس واقعیت پر تاکید مقصود ہے کہ روز جزا اس قدر عظیم اور پراہمیت ہے کہ اگر کسی کو اس دن کے وقوع کا گمان بھی ہو تو وہ غلط کام سرانجام دینے سے بچے گا چہ جائے کہ یقین رکھتا ہو۔

لیکن بہت سارے مفسرین نے پہلے معنی کا انتخاب کیا ہے جیسا کہ قبل ازین بقرہ آیت ۲۴۹ میں بھی بیان اور کیا گیا ہے اور روایات میں بھی اسی معنی پر تاکید کی گئی ہے۔<sup>[۱]</sup>

بہر حال ظن کو یقین کے معنی میں تفسیر کریں یا گمان کے ہر دو صورت میں یہ آیت اس بات پر دلیل ہے کہ قیامت پر ایمان انسان کو ظلم اور لوگوں کے غصب حقوق کو ترک کرنے میں ایک اہم کردار ادا کرتا ہے۔

<sup>[۲]</sup> امیر المومنین حضرت علیؑ فرماتے ہیں الظن ظن ان! ظن شک و ظن یقین، فما کان من امر المعاد من الظن، فهو ظن یقین وما کان من امر الدنیا فهو علی الشک ظن دو قسم کا ہوتا ہے شک والا ظن اور یقین والا ظن۔ جو کچھ قرآن میں معاد کے بارے میں بیان ہوا ہے یقین والا ظن ہے اور جو کچھ دنیا کے بارے میں ذکر ہوا ہے شک والا ظن ہے۔ (نور الثقلین، ج ۵ ص ۵۲۸ حدیث ۶) عبارت راغب میں بھی ذکر ہوا ہے کہ لفظ ظن دونوں معنی میں استعمال ہوتا ہے۔



جب کوئی قطعی طور پر یہ جانتا ہو یا اس بات کا گمان بھی کرے کہ اسے ایک عظیم عدالت کا سامنا کرنا ہے کہ جہاں (مشقال ذرہ) نیک و بد کاموں کا محاسبہ ہوگا اور اس کی مناسب پاداش دی جائے گی اور ان کی تلافی یا واپسی کا کوئی راستہ نہ ہوگا تو یقیناً اس دنیا میں اپنے اعمال میں محتاط ہوگا اور یہی ایمان و یقین اس کی تربیت کرے گا۔

البتہ اس سے مراد یہ نہیں کہ وہ لوگ جو کم تولتے ہیں یا کسی اور گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں لازماً معاد پر ایمان نہیں رکھتے اور کافر ہیں۔ بلکہ اس سے مقصود یہ ہے کہ یا تو ان کا ایمان بہت کمزور ہے یا پھر وہ غفلت میں ہیں ورنہ کس طرح ممکن ہے کہ کوئی انسان ایسے دن پر ایمان بھی رکھتا ہو اور پھر بھی خواب غفلت میں پڑا رہے اور اس طرح گناہوں میں غرق ہو جائے گا۔

### ایمان معاد گناہوں سے بچاتا ہے

آٹھویں آیت میں ان لوگوں کی زبانی بات کی گئی ہے کہ جو جہاد کا حکم صادر ہونے کے وقت اس عظیم فریضہ الہی میں شرکت نہ کرنے کی غرض سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے اور مختلف حیلے و بہانے تراشتے تاکہ پیامبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انہیں جائز طور پر معذور قرار دے کر میدان جہاد میں شرکت نہ کرنے کی اجازت دے دیں اور اس طرح یہ لوگ اس اہم فریضے سے سبکدوش ہو جائیں اور ظاہراً کسی گناہ کے مرتکب بھی نہ ہوں۔

قرآن کہتا ہے کہ روز قیامت اور خدا پر ایمان رکھنے والے اپنی جان و مال سے جہاد کرنے کے لیے تم سے کبھی بھی رخصت نہیں مانگیں گے بلکہ جب جہاد کا حکم صادر ہو تو شوق سے میدان کی طرف چل نکلتے ہیں کیا انجام وظیفہ سے بھی رخصت چاہی جاتی ہے؟ اس کے بعد قرآن اضافہ کرتا ہے: صرف وہ لوگ تم سے اجازت مانگتے ہیں جو خدا اور روز جزاء پر ایمان نہیں رکھتے۔ ان کے دل شک و شبہات سے بھرپور ہیں اور خود اپنے شک و تردد میں حیران و سرگرداں ہیں۔

### انما يستأذنك الذين لا يؤمنون بالله واليوم الآخر وأتأتى قلوبهم

#### فهم في ريبهم يترددون۔

البتہ یہ فریضہ جہاد ہی میں منحصر نہیں ہے بلکہ با ایمان اور معاد کے معتقد افراد ہر جگہ عزم راسخ اور مضبوط خلل ناپذیر ارادے کے ساتھ اپنی الہی ذمہ داری کو ادا کرنے کے لیے کمر ہمت باندھتے ہیں۔ لیکن بے ایمان اور کمزور و متزلزل ایمان والے افراد خصوصاً منافقین ہمیشہ کوشش کرتے ہیں کہ مختلف حیلے و بہانے کے ساتھ اس ذمہ داری کی انجام دہی سے بھی بچ جائیں اور یہ بھی ظاہر کریں کہ شریعت مقدسہ کے ظاہری قوانین کے مطابق وہ مستثنیٰ ہیں۔ مخلص مومنین اور چھپے ہوئے منافقین کے درمیان امتیاز کی یہ ایک اچھی علامت ہے۔

نویں آیت بڑی صراحت کے ساتھ ان لوگوں کے بارے میں بات کرتی ہے جو یتیموں کے ساتھ سختی کر کے اور مسکینوں کو کھانا کھلانے کی ترغیب نہ دے کر روز جزا کو جھٹلاتے ہیں ارشاد ہوتا ہے:



## ارأیت الذی یکذب بالذین۔ فذالک الذی یدع الیتیم۔ ولا یحض علی

### طعام المسکین۔

کیا تم نے اس شخص کو نہیں دیکھا جو ہمیشہ روز جزا کا انکار کرتا ہے؟ یہ وہی ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مساکین کو کھانا کھلانے کی ہرگز دوسروں کو ترغیب نہیں دیتا۔

”یدع“ ”دع“ (بروزن حد) کے مادہ سے ہے۔ دراصل یہ لفظ سختی اور غصے کے ساتھ دھکے دینا یا دھتکارنا کے معنی میں ہے ”محض“ ”حض“ کے مادہ سے دوسروں کو ترغیب دینا کے معنی میں ہے۔ چونکہ یہ دونوں لفظ فعل مضارع کی صورتیں مندرجہ بالا آیت میں ذکر ہوئے ہیں لہذا دوام و استمرار پر دلالت کرتے ہیں اور ”طعام“ ”اطعام“ کھانا کھلانے کے معنی ہیں۔

”فذلک“ کی فاء سمیٹ کے معنی میں ہے جو اس معنی پر روشن دلیل ہے کہ ان بُرے اور بد اعمال کا اصلی سرچشمہ یہی روز جزا کا انکار کرنا ہے اور نہ فقط یتیموں کو محروم کرتے ہیں بلکہ سختی و شدت اور غصے کے ساتھ دھتکار دیتے ہیں۔ نہ فقط خود مساکین کی مدد نہیں کرتے بلکہ دوسروں کو بھی اس کام کی ترغیب نہیں دیتے ہیں اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ دوسروں کے کار خیر میں رکاوٹ بنتے ہیں کیونکہ اپنے بُرے اعمال کی عاقبت سے نہیں ڈرتے۔

وہ خدا کی عدالت، حساب کتاب اور جزا و سزا پر ایمان نہیں رکھتے۔ انہیں اس چند روزہ زندگی اور اس کے مادی لذائذ کے علاوہ کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ لہذا اسی سے دل لگا کر دوسری ہر چیز سے بیگانہ ہو جاتے ہیں۔

”رویت“ کے مادے سے ”ارایت“ کا جملہ ممکن ہے آنکھ سے مشاہدہ کرنے کی طرف اشارہ ہو یا پھر چشم دل (یعنی علم و معرفت) سے مشاہدہ کرنا۔ بہر حال ہر دو معنی میں ارشاد ہوتا ہے: اگر روز جزا کے منکرین کو نہیں پہچانتے تو ان کی بڑی واضح نشانیاں ہیں جن میں سے ایک یتیموں کے بارے میں انکی بے رحمی اور سرد مہری ہے اور دوسرا ان کا محرومین کے بارے میں بے اعتنائی برتنا۔ ان بُرے اعمال سے بآسانی انہیں پہچان سکتے ہو اور معاد پر ایمان کی بنیاد نہ ہونے سے انکے وجود کا پتہ لگا سکتے ہو۔

مفسرین نے ان آیات کی مختلف شان نزول بیان کی ہیں کہا جاتا ہے کہ یہ آیات ابوسفیان کے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔ وہ ہر ہفتہ دو اونٹ ذبح کرتا تھا (لیکن صرف اپنے اور اپنے عزیز و اقارب کیلئے) ایک دن ایک بھوکا یتیم اس کے پاس آیا اور اس سے کسی چیز کا تقاضا کیا تو ابوسفیان نے اپنے عصا سے اس یتیم کو پیچھے دھکیل دیا۔ (اس موقع پر مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں)

فخر رازی نے ”ماوردی“ سے نقل کیا ہے کہ یہ آیت ابو جہل کے بارے میں نازل ہوئی۔ ابو جہل ایک یتیم کا وصی تھا۔ ایک دن وہ یتیم عریاں و برہنہ ابو جہل کے پاس آیا اور اپنے مال میں سے کچھ مطالبہ کیا تو اس نے یتیم کو سختی سے دھتکار دیا۔ قریش کے سرداروں نے اس مایوس یتیم بچے سے کہا: محمدؐ سے کہو کہ ابو جہل کے پاس تمہاری سفارش کرے۔ ان کا مقصد تو ہنسی مذاق اڑانا تھا۔ لیکن بچہ کہ جو اس نکتے کی طرف متوجہ نہ تھا رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ عادت تھی کہ کبھی کسی نیاز مند کو اپنے دروازے سے خالی ہاتھ نہ لوٹاتے۔ اس بچے کے ہمراہ ابو جہل کے

ہاں پہنچے۔ ابو جہل کو بہت نعجب ہوا۔ بہر حال اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خوش آمدید کہا اور بہت زیادہ مال اس یتیم گئی دے دیا۔ قریش کے سرداروں نے اس کام پر اس کی سرزنش کی اور کہا: کہیں ایسا تو نہیں کہ محمدؐ سے محبت پیدا ہوگی ہو۔ ابو جہل کہنے لگا خدا کی قسم ایسا ہرگز نہیں مجھے اس سے محبت نہیں ہوئی۔ بلکہ میں نے اس کے دائیں اور بائیں ایسا جنگی اسلحہ دیکھا کہ اس سے ڈر گیا اور خوفزدہ ہو گیا کہ اگر اس کی بات نہ مانی تو کہیں یہ میرے جسم کے اندر نہ اتار دے۔<sup>[۱]</sup>

بہر حال آیت نمایاں طور پر ایمان معاد کی انسان کے اعمال پر تاثیر سے متعلق دلالت کرتی ہے۔  
 ”موت کے بعد کی زندگی اور قیامت کے حساب کتاب پر ایمان کے“ اس دنیا میں انسان کے اعمال اور تربیتی مسائل کے مابین رابطے کو اسی رابطے کو اسی آیت میں ایک اور انداز سے بیان کیا گیا ہے۔  
 ارشاد ہوتا ہے:

### بل ترید الانسان لیفجر امامہ یسئل ایاں یوم القیامة

(منکر معاد در حقیقت معاد میں شک نہیں رکھتا) بلکہ وہ چاہتا ہے (آزاد رہے اور) ساری عمر گناہ کرے۔ (لہذا از

روئے انکار) سوال کرتا ہے قیامت کب آئے گی۔

کس طرح ممکن ہے کہ انسان خدا کی قدرت اور اس کی ان تمام کرات۔ کہکشائیں اور عوالم عجیب کی خلقت کی توانائی پر تو ایمان رکھتا ہو اور اس کی مردوں کی زندہ کرنے کی قدرت سے منکر ہو؟

بنا برائیں اس کا اس انکار سے مقصد کچھ اور ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ ہر قسم کی ہوس رانی۔ ظلم و ستم اور گناہ کے ذریعہ اپنے لیے آزادی حاصل کرے۔ وہ اس طرح اپنے ضمیر کو دھوکا دینا چاہتا اور یہاں تک کہ مخلوق خدا کے سامنے مختلف حیلے بہانے تراشتا ہے وہ چاہتا ہے کہ معاد پر ایمان کی وجہ سے عصیان کی طغیانی کے سامنے وہ جو ایک بڑا بند بندھ جاتا ہے اسے توڑ ڈالے۔ یہ فقط گذشتہ زمانوں پر ہی منحصر نہیں بلکہ آج بھی ایسا ہی ہے۔ لہذا مادہ پرستی کی طرف میلان مبداء و معاد کے انکار کی وجوہات سے مربوط بحثوں میں ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ ان وجوہات میں سے ایک علت یہ بھی بیان کی گئی ہے یعنی مسئولیت سے گریز کرنا الہی قوانین کو توڑنا اور انسانی ضمیر کو دھوکا دینا۔

لفظ ”انسان“ اس آیت میں اسی انسانی طرف اشارہ ہے کہ جس کے بارے میں سودہ دھر کے شروع میں گفتگو کی گئی ہے۔ یعنی وہ انسان کہ جو قیامت کا منکر ہے اور خیال کرتا ہے کہ خدا بوسیدہ ہڈیوں کو جمع کرنے کی قدرت نہیں رکھتا اور ان ہڈیوں کو حیات مجدد بخشنے پر قادر نہیں۔ المیزان کے بقول یہاں ضمیر کا استعمال نہ کرنا اور ”کلمہ انسان“ کو اسم ظاہر کی صورت میں تبدیل کرنا درحقیقت ایک قسم کی سرزنش و ملامت ہے کہ کس طرح اس مقام انسانیت کے باوجود اس غلط راستے کو اپناتا ہے۔<sup>[۲]</sup>

[۱] تفسیر فخر رازی ج ۳ ص ۱۱۱ اور روح البیان ج ۱۰ ص ۵۲۲

[۲] تفسیر المیزان ج ۲۰ ص ۱۹۰

(یرید۔ یفجر) کا یہاں فعل مضارع (کہ جو معمولاً دوام و استمراری ہونے پر دلالت کرتا ہے) کی صورت میں استعمال اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ خود خواہ غرض انسان ہمیشہ یہ چاہتا ہے کہ اپنے دائمی فسق و فجور کو جاری و ساری رکھے۔

”فجور“ ”فجر“ کے مادے سے ہے اور کسی چیز کو وسیع پیمانہ پر چاک و پارہ کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے بنا برائیں چونکہ گناہ پردہ دینداری کو چاک کرنے کا سبب بنتا ہے اسی لفظ فجور کا اس پر اطلاق کیا گیا ہے۔<sup>[۱]</sup>

”امام“ بروزن مقام دراصل اس سمت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے کہ جو آگے کی طرف واقع ہو اور جس کا متضاد خلف (پیچھے) ہے یا ”امام“ کے معنی پیرو کے بھی ہیں۔ چونکہ ہمیشہ پیشرو کی طرف انسان کی توجہ رہتی ہے اس لیے اس کلمے کا اس پر اطلاق ہوا ہے چونکہ مادہ ام قصد کے معنی میں ہے۔)

لیکن یہ واضح ہے کہ یہ لفظ یہاں پر زندگی کے مستقبل کی طرف اشارہ ہے اور بعض مفسرین کے بقول ظرف مکان ہے اور کنایۂ ظرف زمان کے لیے استعمال ہوا ہے۔<sup>[۲]</sup>

درحقیقت مقصد یہ ہے کہ ہوس باز و ہوس پرست انسان تمام عمر گناہ کرنے کی آزادی حاصل کرنے کی خاطر معاد کا انکار کرتا ہے۔ یہ جو بعض احباب نے احتمال ذکر کیا ہے کہ ”امام“ قیامت کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے انتہائی بعید دکھائی دیتا ہے کیونکہ نہ تو فجور کے کلمے سے ہم آہنگ ہے اور نہ ہی آیات کے درمیان پیوند کو مشخص کرتا ہے۔

## معاد پر ایمان اور حق بینی

گیارہویں آیت میں یہی مسئلہ ایک نئی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔  
ارشاد ہوتا ہے:

ان الذین لایؤمنون بالآخرة زینا لهم اعمالهم فهم یعمھون  
وہ لوگ جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ہم ان کے برے اعمال کو ان کے لیے زینت بنا دیتے ہیں اس طرح کہ وہ  
بہکے اور بھٹکتے پھریں۔

جیسا کہ علمائے ادب اور علم اصول میں مشہور ہے کہ وصف حکم کی علت بنتا ہے یعنی کسی حکم کے لاگو یا صادر ہونے کی علت اصلی خود اوصاف ہی ہیں۔ بنا برائیں اگر آیت میں انسان کے برے اعمال کی اس کی نگاہوں میں تزئین کو آخرت پر ایمان نہ رکھنے سے وابستہ کیا گیا ہے تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ چونکہ آخرت پر ایمان نہیں رکھتا اس لیے ایسے انجام میں مبتلا ہو گیا ہے۔ (غور کیجئے گا)

[۱] مفردات راغب

[۲] روح البیان، ج ۱۰ ص ۲۴۵۔ المیزان، ج ۲۰ ص ۱۹۰

ایک مختصر سی کوشش سے اس حقیقت کو جاننا جاسکتا ہے کہ آخرت پر ایمان یعنی ایسی عدالت پر ایمان کہ جس کا قاضی خدا ہے اور جس کے گواہ فرشتے ہیں اور جہاں، دھوکہ دہی، سفارش اور رشوت پھٹک نہیں سکتی، ایسی عدالت پر ایمان انسان کو مجبور کر دیتا ہے کہ وہ اپنے اعمال (جیسا کہ وہ ہیں) کی واقعیت اور حقیقت کا مطالعہ کرے۔

لیکن اس عقیدے سے جدائی و بیگانگی اور نیکی و بدی کے مفاہیم کو تبدیل کرنے میں آزادی کا احساس اس بات کا باعث بنتا ہے کہ خود خواہ اور خود غرض انسان اپنے آپ کو دوسروں کو فریب دینے کے لیے مختلف حیلے اور بہانے تراشے، اپنی سرکش ہوس کو اصلاح و تقویٰ کا رنگ دے اور برائیوں کو خوبصورت پیرائے میں جلوہ نمائی کرے کہ جس کا حاصل حیرت و سرگردانی ہے (جیسا کہ تفریح سے پتہ چلتا ہے جو کہ سبیت پر دلالت کرتی ہے اور یہاں اس عظیم عدالت الہی کے انکار کے خطرناک نتائج میں سے ایک ہے

یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ یہاں تزیین اعمال کی نسبت خدا کی طرف دی گئی ہے درحالیکہ قرآن مجید کی دیگر آیات میں (تقریباً آٹھ مواقع پر) یہی نسبت شیطان اور ہوئے نفس کی طرف دی گئی ہے اور کئی ایک دوسری آیات (تقریباً دس مواد پر) اعمال کو زینت دینے کی نسبت فعل مجہول یعنی زین (مزین کر دیا گیا ہے) کی صورت میں بیان ہوئی ہے۔ اگر عمیق نظر سے دیکھا جائے تو یہ سب تعبیرات ایک ہی حقیقت کو بیان کرتی ہیں اگر نسبت خدا کی طرف ہو تو یہ اس لیے ہے کہ وہ مسبب الاسباب ہے۔ کسی موجود کے جو بھی آثار ہوں بالآخر خدا پر منتہی ہوتے ہیں یا دوسرے الفاظ میں یہ کہ خدا نے روز قیامت کے انکار اور برے اعمال کے تکرار میں یہ تاثیر رکھی ہے کہ اس طرح کے اعمال انسان کو خوبصورت دکھائی دیتے ہیں اور اس سے نیک و بد کی تمیز چھن جاتی ہے۔

اگر نسبت خدا کی طرف ہو تو یہ اس لئے ہے کہ وہ مسبب الاسباب ہے۔ کسی موجود کے جو بھی آثار ہوں بالآخر خدا پر منتہی ہوتے ہیں، یا دوسرے الفاظ میں یہ کہ خدا نے روز قیامت کے انکار اور برے اعمال کے تکرار میں یہ تاثیر رکھی ہے کہ اس طرح کے اعمال انسان کو خوبصورت دکھائی دیتے ہیں اور اس سے نیک و بد کی تمیز چھن جاتی ہے۔

اگر یہ نسبت ہوئے نفس اور شیطان کی طرف دی گئی ہو تو اس لیے کہ برے اعمال کو زینت دینے کی نزدیک ترین اور براہ راست علت یہی ہیں۔

جب کہ بعض مواد پر فعل مجہول کی صورت میں یہ نسبت ذکر ہوئی ہے تو یہ اشارہ ہے اس امر کی طرف کہ انکار قیامت اور برے اعمال کے تکرار کی طبیعت ایسا تقاضا کرتی ہے۔ سب سے پہلے انسان ان سے رغبت پیدا کرتا ہے اور پھر ان سے عشق کرنا شروع کر دیتا ہے اور بعد ازاں نوبت یہاں تک جا پہنچتی ہے کہ یہ انسان کی آنکھوں کو بھانے لگتے ہیں۔

یہ بات بدیہی ہے کہ اس تزیین اعمال کا نتیجہ گمراہی و ضلالت کی وادی میں ہمیشہ کی سرگردانی اور دائمی حیرت ہے کیونکہ انسان جب تک کسی کام کی برائی اور بدی کو تشخیص نہ دے اس کام سے جدا نہ ہوگا۔

جو کچھ گزشتہ سطور میں بیان کیا گیا ہے اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ خدا ان کے اچھے اعمال کو ان کی نظروں میں اس طرح زینت دیتا ہے کہ وہ مغرور ہو جاتے ہیں اور آخر کار اس غرور کے پیچھے سرگرداں۔

یہ کوئی مناسب تفسیر دکھائی نہیں دیتی چونکہ وہ برے اعمال کو زینت دینے کی خدا کی طرف نسبت کو حل نہ کر سکے اس لیے ایسی خلاف ظاہر تفسیریں کرنے لگے۔

مورد بحث بارہویں اور آخری آیت میں پیامبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خطاب فرمایا جا رہا ہے:

**واذا قرأت القرآن جعلنا بینک و بین الذین لا یؤمنون بالآخرۃ حجابا**

**مستورا۔**

جب تم قرآن کی تلاوت کرتے ہو تو ہم تمہارے اور ان لوگوں کے درمیان کہ جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے غیر مرنی پردے ڈال دیتے ہیں۔

مزید ارشاد ہوتا ہے:

**وجعلنا علی قلوبہم اکنۃ ان یفقیہوہ و فی اذا نہم و قرا۔**

اور ہم ان کے کان بہرے کر دیتے ہیں اور دلوں پر پردے ڈال دیتے ہیں تاکہ وہ سمجھ نہ سکیں۔

دوبارہ یہاں پر وصف کی بناء پر حکم کے صادر ہونے کا مسئلہ درپیش ہے یعنی ہم دیکھتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مشرکین کے درمیان حجاب معنوی کا وجود مشرکین کے دلوں پر پردے پڑنے اور ان کے کانوں کا طاقت شنوائی سے محروم ہو جانا یہ سب کچھ ان مشرکوں کے آخرت پر ایمان نہ رکھنے کی بنا پر ہے اس سے یہ بخوبی پتہ چلتا ہے کہ ان پردوں کے پڑنے اور حقائق کے ادراک سے محروم ہونے کا سبب اس عظیم عدالت پر ایمان نہ رکھنا ہی ہے۔ اس کی دلیل بھی اظہر من الشمس ہے کہ حساب و کتاب اور جزائے اعمال کی طرف عدم توجہ انسان کو خود غرضی، غرور، تعصب، نفس پرستی اور ہٹ دھرمی کے گھوڑے پر سوار کر دیتی ہے۔ ایسی حالت میں کیسے ممکن ہے کہ انسان حقائق کو جیسے کہ وہ ہیں سمجھ سکے اور ان پر ایمان لے آئے۔

ہوائے نفس کے بدترین پردوں سے بڑھ کر اور کیا پردے ہوں گے؟ اور خود پرستی و غرور کی بدترین سواری سے بڑھ کر اور کیا سواری ہوگی؟

بعض مفسرین نے کہا کہ ”حجاب مستور“ سے مراد دکھائی نہ دینے والے پردے اور دیوار ہے کہ جو خداوند کریم قرآن مجید کی تلاوت کے وقت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مشرکین کے درمیان حائل کر دیتا تھا تاکہ وہ پیامبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نہ دیکھ سکیں اور نہ کوئی اذیت پہنچائیں اسی ضمن میں بعض شان نزول بھی نقل کی گئی ہیں۔

لیکن آیت کا ظاہر تفسیر کی نفی کرتا ہے چونکہ آیت گویا ہے کہ یہ حجاب و پردے قرآن کے لطیف نکات اور حقائق کے فہم و ادراک میں رکاوٹ ہیں لہذا ہمیں قبول کرنا پڑے گا کہ اس ”حجاب مستور“ سے مراد وہی حجاب معنوی ہے کہ جو خود غرضی، متعصب اور ہوس پرست مشرکین کے دلوں، کانوں، اور آنکھوں پر پڑے ہیں اور انہیں قرآن کے اعلیٰ مفاہیم کے ادراک سے روکتے ہیں۔

یہ وہی بات ہے کہ جس کی طرف قرآن کی متعدد آیات میں اشارہ ہوا ہے اور ہم نے اس بحث کو جلد اول میں معرفت شناخت کے موانع کے زیر عنوان بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے۔<sup>[۱]</sup>

سورہ نحل کی آیت ۲۲ میں بھی اسی معنی کے مشابہ ارشاد ہوتا ہے کہ

**فَالَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ قُلُوبُهُمْ مُنْكَرَةٌ وَهُمْ مُسْتَكْبِرُونَ ﴿۲۲﴾**

”جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ان کے دل حق کا انکار کرتے ہیں اور تکبر کرتے ہیں“

یہاں پر بھی حق کا انکار کرنے اور اس کے مقابلے میں تکبر کرنے کی اصلی وجہ ”آخرت پر ایمان نہ رکھنا“ ہی بیان کی گئی ہے۔

## نتیجہ بحث

متذکرہ بالا بارہ آیات (اور اس سے مشابہ دوسری آیات) سے یہ بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ ایک طرف تو آخرت (دوسری دنیا میں عدالت الہی) پر ایمان، بیداری، آگاہی، تقویٰ اور اصلاح نفس کا سبب بنتا ہے اور اسی طرح گناہ اور ظلم و ستم کے ارتکاب سے خوف کا باعث بنتا ہے اور دوسری طرف اس امر پر ایمان نہ لانا حقائق سے دوری، حق کے مقابلے میں غرور و تکبر برتنے اور گناہوں اور فسق و فجور کے دریا میں غرق ہوجانے کا باعث بنتا ہے۔

بنابریں قرآن کی نگاہ میں انسانوں کی تربیت میں معاد پر ایمان کی انتہائی غیر معمولی اور عمیق تاثیر کا ملاحظہ ہو جاتی ہے۔

## توضیحات

### ۱۔ قیامت پر ایمان کے غیر معمولی اثرات

”مراقبہ اور محاسبہ“ تربیت کے دو اہم عوامل ہیں۔ مراقبہ کا ایک معنی یہ ہے کہ انسان جان کہہ کے کوئی اس کی نگرانی کرنے والا ہے اور ہر وقت اس کے افعال کو زیر نظر رکھے ہوئے ہے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ اس کے اندرونی بھید بھی اس پر آشکار ہیں۔

اس امر کی طرف توجہ انسان کو ہمیشہ ایک بیدار باش حالت میں رکھنے کا باعث بنتی ہے ”محاسبہ کی طرف توجہ اور یہ کہ تمام اعمال چھوٹے سے بڑے تک اور نیک و بد کا حساب کتاب ہوگا اور ہر ایک کے ساتھ عادلانہ برتاؤ ہوگا یہ اس بات کا سبب بنتا ہے کہ انسان مختلف کام انجام دینے میں اپنے آپ کو مطلقاً آزادانہ سمجھے اور کسی بھی کام کو معمولی اور حقیر نہ جانے، جیسا کہ حساب کتاب اور نگرانی سخت اور باریک بینی کے

[۱] ”حجاب“ کے ساتھ ”مستور“ کی صفت کو بعض اوقات اس کے ظاہری معنی میں لیا گیا ہے یعنی ”غیر مرئی حجاب“ اور بعض اوقات کہا جاتا ہے کہ ”اسم مفعول یہاں پر اسم فاعل کے معنی میں ہے۔“ لہذا ”مستور“ کے معنی ہوئے ”ساتر“ یعنی چھپانے والا، پردہ پوشی کرنے والا۔



ساتھ ہے ایسے ہی اسے بھی اپنے کاموں کے انجام دینے میں دقیق اور سخت ہونا چاہیے۔

آج کل بعض ممالک میں بڑی سڑکوں اور ان پر گاڑیوں کی نقل و حرکت کو مخفی کیمروں کے ذریعے کنٹرول کیا جاتا ہے۔ ٹریفک پولیس والے اپنے مرکز میں بیٹھ کر بڑے دقیق انداز سے ان کی نگرانی کرتے ہیں اور خلاف ورزی کرنے والی گاڑیوں کو موبائل پولیس والوں کے ساتھ (وائرلیس کے ذریعے) رابطہ کر کے یا پھر مختلف چوکیوں پر روک لیا جاتا ہے اور جرمانہ کر دیا جاتا ہے۔

اس نگرانی اور اس جرمانی کی طرف توجہ اس امر کا سبب بنتی ہے کہ سڑکوں پر حتیٰ کہ بیابانوں میں بھی نظم و ضبط کی حکمرانی ہو۔ جہاں یہ انسانی نگرانی اور حساب کتاب کہ جو غلطی سے مبرا نہیں اس قدر گہرا اثر رکھتا ہے تو پھر خداوند کہ جو اندرونی اور بیرونی تمام اسرار سے آگاہ ہے اس کی دائمی نگرانی پر ایمان اور اس عدالت پر ایمان کہ جہاں ”مشتال ذرہ“ کا بھی حساب ہوگا اور جہاں کسی بھی قسم کی نافرمانی اور سفارش نہ چلے گی، اس ایمان کی انسان کے اندر گہری تاثیر بدرجہ تم آشکار ہے۔

واضح ہے کہ یہ بات تدریجاً فعل کی صورت سے عادت میں تبدیل ہوتی ہے اور پھر عادت سے ملکہ حاصل ہو جانے تک جا پہنچتی ہے اور یہ حقیقت کہ جس کا نام ”وجدان اخلاقی“ اور تقویٰ الہی“ ہے با ایمان انسان میں راسخ ہو جاتی ہے۔

درحقیقت عدالتوں کے وجود، معمولی سزاؤں اور اسی طرح عام ترغیب دلانے اور صلہ ادا کرنے کا فلسفہ بھی یہی ہے کہ نظم و ضبط برقرار ہو قانون کی حکمرانی ہو اور تربیت انسان کا سبب بنے اس فرق کے ساتھ کہ اس دنیا کی معمولی عدالتوں میں تجدید نظر ہو سکتی ہے اور بیشتر عدالتوں میں رشوت اور سفارش کی خرابی چل جاتی ہے علاوہ ازیں قوانین کی پیچیدگیاں، تاویلات، استثنائات اور جھوٹی اسناد بہت موارد میں اس بات کا سبب بنتی ہیں کہ مجرم عدالت کے چنگل سے فرار حاصل کر لے اور بعض اوقات مجرم عدالتوں کے تکلفاتی مسائل سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی سزا کو سالوں موخر کروا لیتے ہیں۔ لیکن قیامت کی عدالت ان خامیوں میں سے کسی ایک کی بھی حامل نہیں۔ بلکہ جیسا کہ بعد میں اشارہ کیا جائے گا وہاں پر سزا و جزاء چیزوں کے طبعی آثار اور خواص کے ساتھ زیادہ شباهت رکھتی ہے۔ آیا کسی شفا بخش دوائی یا ہلاک کنندہ زہر کے اثر کو جھوٹی اسناد، سفارش اور رشوت کے ذریعے تبدیل کیا جاسکتا ہے؟

یقیناً ایک ایسی عدالت پر ایمان انسان کی پاکیزگی اور تربیت میں دنیا کی معمولی عدالتوں کی نسبت زیادہ موثر ہے۔ دوسری طرف یہ کہ ایسی عدالت پر ایمان انسان میں فداکاری اور ایثار کی روح زندہ کر دیتا ہے کیونکہ:

**مَا عِنْدَ كُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللَّهِ بَاقٍ ط**

وہ جو کچھ تمہارے پاس ہے فنا ہو جائے گا اور وہ جو کچھ خدا کے ہاں ہے باقی رہنے والا ہے۔ (نحل ۹۶)

اس آیت کے مطابق اس دنیا کی زندگی ناپائیدار، فانی، اور جلد ختم ہو جانے والی ہے جب کہ وہ جو کچھ اس جہان کے لیے ذخیرہ کیا جائے گا وہ پائیدار اور جاوداں ہوگا۔ کون عاقل ہے کہ جو ”متاع قلیل“ کے مقابلے میں ”مواہب کثیر“ بلکہ لامحدود کا انکار کرے؟ یہی وجہ ہے کہ معاد پر ایمان مختلف قسم کے انفاق (راہ خدا میں مال خرچ کرنا) ایثار اور درگزشت کا سرچشمہ ہو سکتا ہے۔

تیسرا یہ کہ یہ ایمان انسان میں شجاعت و دلیری اور صبر و استقامت کی روح پھونک دیتا ہے۔ موت سے وہی ڈرتا ہے جو یہ کہے ان ہی الاحیاء الدنیا (اس دنیاوی زندگی کے علاوہ اور کچھ ہے ہی نہیں) لیکن وہ جو معتقد ہے کہ وان الدار الاخرة لہی الحیون (حقیقی زندگی تو فقط دار آخرت ہی میں ہے) [۱] اسے موت سے کیا ڈر؟!

وہ جو راہ خدا میں شہادت کو اس کے جوار رحمت میں پہنچنے کا دروازہ سمجھتا ہو اور بہشت کی باقابل تعریف نعمتوں اور اس کی قربت کے مقام تک پہنچنے کا ایک راستہ جانتا ہو کس طرح ممکن ہے کہ وہ راہ خدا میں اپنی جان و مال فدا کرنے سے دریغ کرے، یا دشمن کے لشکر سے ہراساں ہو؟

یہ جو صدر اسلام کی جنگوں میں اور خود ایران عراق کی ٹھونی گئی حالیہ جنگ میں ہم دیکھتے ہیں کہ اسلامی فوج کے دلیر سپاہی بے مثال استقامت اور تعجب انگیز شجاعت کا مظاہرہ کرتے تھے اور دشمن کے وسائل اور لاؤ لشکر کی برتری کے باوجود ان پر غلبہ حاصل کر لیتے تھے اس کا راز یہی ہے کہ معاد پر ایمان انہیں ایک اور ہی قسم کا انسان بنا دیتا ہے، ایک ایسا انسان جو موت سے ہرگز نہیں ڈرتا اور راہ خدا میں شہادت کو اپنے لیے باعث افتخار سمجھتا ہے۔

مختصر یہ کہ جتنا زیادہ ہم اس رابطے (معاد پر ایمان اور انسانی تربیت کا رابطہ) کے متعلق سوچیں اتنا ہی زیادہ اس کی اہمیت سے واقف ہوتے چلے جائیں گے اور اصولاً جیسا کہ بارہا یہ کہا گیا ہے متعدد آیات قرآن میں اس کا ذکر اسی مطلب کی خاطر ہے۔ ممکن ہے کہا جائے کہ وہ جو کچھ بھی آپ نے کہا ہے ”عمل“ اور ”ایمان“ کے درمیان رابطے کو مشخص کرتا ہے نہ کہ ”اخلاق“ اور ”ایمان“ کے رابطے کو۔

لیکن جیسا کہ اوپر بھی اشارہ کیا گیا ہے ”عمل“ تکرار کی وجہ سے پہلے تو ”حالت“ اور پھر ”عادت“ اور بعد ازاں ”اخلاقی ملکہ“ کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

## ۲۔ معاد کا تربیتی اثر روایات کی نظر میں

نہ فقط آیات قرآن بلکہ روایات اسلامی میں بھی اس موضوع کی وسیع پیمانہ پر بازگشت سنائی دیتی ہے جس سے ان دونوں کے درمیان دائمی عمیق اور گہرا رابطہ آشکار ہوتا ہے نمونے کے طور پر درج ذیل روایات کی طرف توجہ فرمائیں۔

نسخ البلاغہ میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

واللہ لان ابیت علی حسک السعدان مسہدا، اذا جرفی الاغلال مصفدا،

احب الی من ان القی اللہ ورسولہ، یوم القیمة ظالما لبعض العباد



### و غاصبا للشیء من الحطام

خدا کی قسم! اگر راتیں جان گھلا دینے والے ”سعدان“<sup>[۱]</sup> کے کانٹوں پر بسر کروں اور دن کو مجھے طوق وزنجیر میں باندھ کر گھسیٹا جائے یہ میرے لیے اس سے زیادہ محبوب ہے کہ روز قیامت خدا اور رسول اللہ سے اس حالت میں ملاقات کروں کہ میں نے کسی بندے پر ظلم کیا ہو اور دنیا کے مال میں سے کچھ غصب کیا ہو۔<sup>[۲]</sup>

ان جملوں کے بعد حضرت علی علیہ السلام اپنے بھائی عقیل کے مشہور واقعے کا ذکر فرماتے ہیں کہ جو فقر و پریشانی کی شدت کی وجہ سے آپ کے پاس آئے اور تقاضا کیا کہ اسلامی عدالت کے قانون کے برخلاف بیت المال سے ان کے حصے میں کچھ اضافہ کر دیا جائے۔ لیکن امام علیہ السلام نے لوہے کے ایک ٹکڑے کو آگ میں تپایا اور انکے جسم کے نزدیک لے گئے۔ جب حضرت عقیل کی چپٹیں بلند ہوئیں تو ان سے فرمانے لگا! تم اس لوہے کے ٹکڑے سے چیخ اٹھے ہو جسے ایک انسان نے ہنسی مذاق میں (بغیر جلانے کی نیت کے) تپایا ہے اور تم مجھے اس آگ کی طرف کھینچ رہے ہو جسے خدائے جبار نے اپنے غضب سے بھڑکایا ہے۔<sup>[۳]</sup>

معاد پر ایمان کی لرزادینے والی طاقت و رمجین اور عدل قائم کرنے میں ان کی تاثیر اور ہر قسم کے گناہ اور انحراف کے مقابلے میں استقامت ان چند مختصر جملوں میں اظہر من الشمس ہے اور انسانی اعمال میں الہی عدالت اور قیامت پر ایمان کی تجلی کا ایک زندہ نمونہ ہے۔

۲۔ مولائے متقیان حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

### من ایقن بالخلف جاد بالعطیة

”جسے عوض کے ملنے کا یقین ہو وہ عطیہ دینے میں دریاد لی دکھاتا ہے۔“<sup>[۴]</sup>

اس حدیث سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ معاد پر ایمان انسان کو دریا دل فیاض، اور سخاوت مند بنادیتا ہے۔

۳۔ غرر الحکم میں حضرت امیر المومنین علیہ السلام سے اس سے زیادہ صراحت اور واضح عبارت کے ساتھ نقل ہوا ہے کہ انہوں نے فرمایا:

### اجعل هبک لمعادک تصلح

[۱] ایک قسم کی خاردار جھاڑی جسے اونٹ چرتا ہے۔ (مترجم)

[۲] نہج البلاغہ خطبہ ۲۲۴ (مولانا مفتی جعفر حسین مرحوم کے ترجمہ میں یہ عبارت خطبہ ۲۲۱ میں موجود ہے۔) (مترجم)

[۳] نہج البلاغہ خطبہ ۲۲۴ (مولانا مفتی جعفر حسین مرحوم کے ترجمہ میں یہ عبارت خطبہ ۲۲۱ میں موجود ہے۔) (مترجم)

[۴] نہج البلاغہ ۱۳۸ (چھوٹے چھوٹے حکیمانہ جملوں میں سے) بحار الانوار ج ۴، ۷، روضۂ بحار ص ۳۸۵

”اپنے غم کو اپنی قیامت پر چھوڑ دو تا کہ صالح ہو جاؤ“۔<sup>[۱]</sup>

۴۔ معرکہ کربلا میں حضرت امام حسین علیہ السلام نے اپنے ساتھیوں سے روز عاشورا خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

صبرا بنی الکرام فما الموت الا قنطرة تعبر بكم عن البوس والضرأ

الى الجنان الواسعة والنعيم الدائمة فايكم يكره ان ينتقل من سجن

الى قصر

”استقامت کرو اے کرامت مند فرزندو! کیونکہ موت (شہادت) تو فقط ایک ایسا پل ہے جو سختیوں اور تکالیف

سے جنت کی ہمیشہ ہمیشہ رہنے والی نعمتوں اور وسیع باغوں کی طرف منتقل کرتا ہے آپ میں سے کون ہے جو اس

زندگانی سے اس محل میں منتقل ہونے سے ناراحت ہو؟“

یہ گفتگو امام حسین علیہ السلام نے اس وقت فرمائی جب امام اور ان کے سپاہیوں کے محاصرے کا دائرہ تنگ سے تنگ تر ہو رہا تھا۔

میدان جنگ کی مشکلات بہت بڑھ گئی تھیں لیکن دوسری طرف چہرے دمک رہے تھے اور حالات پرسکون تھے۔

اسی مقام پر امام علیہ السلام کے جانثار ایک دوسرے کی طرف اشارہ کرتے اور کہتے:

انظر والایبالی بالموت

”دیکھو! وہ تو موت کی پرواہ ہی نہیں کرتا اور اسے اس کا کوئی خوف ہی نہیں۔“

امام علیہ السلام نے جب یہ بات سنی تو متذکرہ بالا گفتگو کے بعد فرمایا: میرے والد نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس

طرح نقل کیا:

ان الدنيا سجن المومن وجنة الكافر، الموت جسر هولاء الى جنالهم

وجسر هولاء الى جحيمهم ما كذبت ولا كذبت

”دنیا مومن کے لیے قید خانہ اور کافر کے لیے جنت ہے اور موت پل ہے پہلے گروہ کے لیے بہشت کی طرف اور

دوسرے گروہ کے لیے پل ہے دوزخ کی طرف۔ (یہ ایک حقیقت ہے) نہ میں جھوٹ بولتا ہوں اور نہ مجھ سے

جھوٹ کہا گیا ہے۔“<sup>[۲]</sup>

[۱] غرر الحکم۔ میزان الحکمة جلد اول ص ۷۳ حدیث ۱۳۳

[۲] بحار الانوار ج ۴ ص ۲۹۷ (باب فضل الشهداء معه وعلة عدم مبالا تهم بالقتل) مرحوم صدوق نے کتاب ”معانی

الاخبار“ میں باب ”معنی الموت“ میں اس حدیث کو حضرت امام علی بن الحسینؑ سے نقل کیا ہے۔ ص ۲۸۸

تاریخ میں سنہری حروف سے مثبت ہونے والے معرکہ کر بلا اور امام حسین علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کی بے نظیر شجاعت کے راز کو اگر تلاش کرنا چاہیں تو آخرت کی زندگی جاوید اور معاد پر ان کے قوی اور مستحکم ایمان میں ڈھونڈیں۔

۵۔ اعمال کے اچھے ہونے میں معاد پر ایمان کی تاثیر اس قدر آشکارا اور روشن ہے کہ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام تعجب کرتے ہیں اس شخص پر کہ جو آخرت پر تو ایمان رکھتا ہے لیکن اپنے اعمال کو اچھا کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔ امام علیہ السلام فرماتے ہیں:

### عجبت لمن يعلم ان للاعمال جزاء كيف لا يحسن عمله<sup>[۱]</sup>

۶۔ اس گفتگو کو بانی اسلام پیامبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث پر تمام کرتے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اہل یقین کی علامات اور نشانیاں بتاتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ان کی علامات میں سے یہ ہے کہ:

ایقن بان الجنة حق فاشتاق اليها، وایقن بان النار حق فظهر سعيه

للنجاۃ منها، وایقن بان الحساب حق فحاسب نفسه۔

وہ جنت پر ایمان رکھتے ہیں۔ اسی لیے اس کے مشتاق ہیں (اور اسے پانے کے لیے نیکیاں کرنے کی کوشش کرتے ہیں) اور جہنم کی آگ پر یقین رکھتے ہیں لہذا اس سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں (گناہوں کے پیچھے نہیں بھاگتے) اور یقین رکھتے ہیں کہ روز قیامت کا حساب حق ہے اسی لیے اپنا محاسبہ کرتے ہیں (قبل ازیں کہ انکا محاسبہ کیا جائے)۔<sup>[۲]</sup>

اس ضمن میں احادیث بہت زیادہ ہیں جو کچھ اوپر بیان کیا گیا ہے ان احادیث کا عشر عشر بھی نہیں۔ البتہ یہ تمام احادیث سرائے آخرت پر ایمان کے انسانی تربیت میں گہرے نقوش ثبت کرنے پر دلالت کرتی ہیں۔

## ۳۔ ایمان آخرت اور آسودگی حال

موت کے بعد کی زندگی پر اعتقاد نہ صرف تہذیب نفوس۔ اخلاص قلوب پرورش، اخلاق اور پاکیزگی اعمال میں موثر ہے بلکہ اسی دنیاوی زندگی میں انسانی صحت و سلامتی اور فلاح و بہبود میں بھی انتہائی موثر ہے۔

ہم جانتے ہیں وہ اہم ترین چیز کہ جس کی وجہ سے انسان مختلف درد و رنج میں مبتلا ہوتا ہے۔ جو انسانی زندگی کے جام شیریں کو انسانی حلق میں تلخ بنانے کا باعث ہے اور انسانی اعصاب کو درد ہم برہم کر دیتی ہے مختلف قسم کی پریشانی ہے کہ جو آدمی کی زندگی کو چہار سو سے احاطہ کئے ہوئے ہے۔

[۱] عز ورا الحکم۔ ج ۲ ص ۹۵

[۲] تحف العقول ص ۲۳

ماضی پر حسرت و ملال ہاتھ سے نکل جانے والے مواقع پر پشیمانی اور دامن گیر ہونے والے نقصانات پر افسوس۔ مستقبل زندگی کے خاتمے نیز دوست، عزیز و اقارب، اولاد، مال و ثروت اور قوائے جسمانی کے ہاتھ سے نکل جانے کے بارے میں پریشانی اور مختلف غیر متوقع حادثات کی پریشانی ایک زبردست طوفان کی مانند زندگی سکون و اطمینان کو درہم برہم کر دیتی ہے۔

اسی دلیل کی بنا پر دانشوروں کا کہنا ہے کہ اگرچہ آج طبی علوم اور جراحی فنون کی ترقی کی بدولت انسان نے بہت سی بیماریوں پر قابو پالیا ہے حتیٰ کہ کئی ایک بیماریوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا ہے لیکن اس کے باوجود روحانی اور نفسیاتی بیماریوں کے ہاتھوں پہلے کی نسبت زیادہ پریشان ہے اور ایسے بیماروں کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے۔

پرنسٹن یونیورسٹی کے سوشیالوجی کے ایک معروف استاد ڈونالڈ لائٹ کا کہنا ہے کہ ”حال حاضر میں فقط امریکہ کے اندر پانچ ملین افراد ایسے ہیں کہ جنہوں نے اپنی زندگی میں کم از کم ایک دفعہ ضرور اقدام خودکشی کیا ہے اور اس ضمن میں خودکشی کے خلاف جہاد کرنے والی انجمنوں کی طرف سے کی جانے والی تمام تر کوششوں کے باوجود کوئی قابل توجہ نتیجہ حاصل نہیں ہوا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ناامیدی کی وجہ سے زندگی کے بے معنی ہونے کے احساس کی بنا پر غیر یقینی صورت حال کا شکار ہونے کی وجہ سے اضطراب، وبے چینی اور اجتماعی بحرانوں سے پیدا ہونے والی تشویش کی بنا پر خودکشی کی کوشش کرتے ہیں اور یہ امر متذکرہ بالا وسائل کے ساتھ قابل علاج نہیں ہے۔“ [۱]

اگرچہ ہمارا دور انسانی راحت کا دور ہے اوقات کار پہلے کی نسبت کم ہو گئے ہیں انسان کے کندھوں سے بوجھ کم ہو کر کارخانوں کے بڑے بڑے پیہوں پر جا پڑا ہے اندرون خانہ کے سخت اور مشکل کاموں کو بھی برقی وسائل نے اپنے ذمے لے لیا ہے گھر ماڈرن اور تمام تر سہولیات سے مزین ہیں نقل و حمل اور آمدورفت کے ذرائع زیادہ منظم اور آسان تر ہو گئے ہیں وہ سفر جو گذشتہ زمانے میں نہایت مشکل شمار ہوتے تھے آج کل تفریح کا ایک موثر ذریعہ بن گئے ہیں مختلف قسم کی ماڈرن اور صحت افزاء سرگرمیوں کے جدید طریقوں نے انسانی زندگی کو ایک نئے رنگ میں رنگ دیا ہے۔

ان حالات میں توقع کی جاتی ہے کہ ہمارے اس دور کا انسان مکمل آرام کی آغوش میں چلا جائے اور جسم و روح کی مکمل سلامتی سے مستفیض ہو لیکن ہم آشکار دیکھتے ہیں کہ اضطراب اور پریشانی اسے پہلے سے زیادہ دکھ پہنچا رہی ہے۔ نفسیاتی مریضوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے خودکشی کا دائرہ وسیع ہو رہا ہے شراب اور نشیات کی پناہ ڈنڈھونڈنے والوں کی تعداد دن گئی رات چوگنی ہو رہی ہے۔

اس امر کا اصل محرک زندگی کے بے معنی اور بے ہدف ہونے کا احساس ہے جان لیوا مشکلات میں کسی پناہ گاہ کے نہ ہونے کا احساس ہے موت کے بھیانک چہرے کی تصویر تکلیف دہ بدبینی دنیا کے مستقبل کا خوف یا پھر انفرادی زندگی کے مستقبل کا خوف اس کا اصلی عامل ہے بے شک دوسری دنیا پر ایمان اور اس دنیا میں آرام و سکون اور عدالت کے ساتھ گزرنے والی زندگی جاوید پر ایمان ہی ان

پریشانیوں کا خاتمہ کر سکتا ہے۔

نفیسات کے معروف استاد اور فرائیڈ کے مشہور معاونین میں سے ایک پروفیسر ”یونگ“ کا کہنا ہے کہ پوری دنیا سے میری طرف رجوع کرنے والے بیماروں میں سے دو تہائی افراد ایسے ہیں کہ جو پڑھے لکھے خوشحال اور کامیاب ہیں لیکن زندگی کے بے معنی اور بے پوچ ہونے کا احساس انہیں دکھی کیئے ہوئے ہے وجہ یہ ہے کہ بیسویں صدی کا انسان ٹیکنالوجی کی پیش رفت تنگ نظری اور تعصب کی وجہ سے مذہب کو ہاتھ سے گنوا بیٹھا ہے اور حیران و سرگرداں اپنی روح کی جستجو میں ہے یہ انسان جب تک مذہب کو پانہ لے اسے چین نہیں آتا کیونکہ لامذہبیت زندگی کے بے پوچ اور بے معنی ہونے کا سبب بنتی ہے۔<sup>[۱]</sup>

آئیے قرآن کی روشنی کی طرف پلٹتے ہیں اور اس سے مدد حاصل کرتے ہیں سورہ یونس میں اس معنی کی طرف ایک لطیف اشارہ دکھائی دیتا ہے ارشاد ہوتا ہے:

الان اولیاء الله الاخوف علیہم والاهم یخزنون لہم البشری فی

الحیوة الدنیا و فی الآخرة

آگاہ رہو کہ اولیاء اللہ اور دوستان خدا کونہ کوئی ڈر ہے (مستقبل کا) اور نہ کوئی غم (ماضی کا) وہ دنیا کی زندگی میں اور آخرت میں شاد و مسرور ہیں۔“ (یونس ۶۱-۶۲)

جی ہاں یہ وہ لوگ ہیں کہ جنہوں نے خدا کے ساتھ دل باندھ لیا ہے اور اس بحر عظیم کے ساتھ پیوست ہو گئے ہیں اور جو دنیاوی زندگی کو جہان آخرت کی زندگی جاوید کے لیے ایک گذر گاہ اور پل سمجھتے ہیں۔ اس بنا پر نہ وہ احساس تنہائی کرتے ہیں اور نہ ہی زندگی کے لایعنی ہونے کا خیال اگرچہ اس ضمن میں بہت ساری بحثیں تشنہ رہ گئی ہیں لیکن ان عرائض کے ساتھ ہی ہم روز قیامت پر ایمان کے انسان کی انفرادی و اجتماعی اور مادی و معنوی زندگی پر نقش ہونے والے گونا گوں آثار کو گفتگو کو ختم کرتے ہیں۔

دروازہ عالم بقاء

(۱) موت

(۲) برزخ

## (۱) موت عالم بقاء کا دروازہ

اگرچہ موت کا مام بہت ساروں کے لیے وحشت ناک اور ہول انگیز ہے لیکن اسلامی تصور کائنات میں یہ موضوع ایک اور ہی رخ کا حامل ہے کیونکہ اس کے نزدیک موت تو دوسری دنیا کے لیے ایک گذرگاہ اور پل ہے اور درحقیقت یہ ایک دوسری پیدائش ہے۔ نوزائیدہ بچہ پیدائش کے وقت زار و قطار روتا ہے اور خیال کرتا ہے کہ شاید تباہ و برباد ہو جائے گا بالکل نابود ہو جائے گا حالانکہ وہ ایک ایسے جہان میں وارد ہو رہا ہوتا ہے کہ جو شکم مادر سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔

بہر حال اس دروازے سے گذرنا سب کے لیے خوش آئند نہیں ہے بلکہ فقط انہی کے لیے خوشی و مسرت کا باعث ہے جنہوں نے اس عظیم سفر کے لیے کافی دانی زاد راہ فراہم کر لیا ہے۔ بنا براس دلیل کے اگر بدکار و مجرم افراد اگرچہ موت کے بعد کی زندگی پر اعتقاد بھی رکھتے ہوں موت سے ڈریں اور اس سے وحشت زدہ ہوں تو یہ کوئی عجیب بات نہیں۔

موت کے بارے میں ایسا عقیدہ ایک تو انسان کو ایثار و فداکاری اور جہاد کی قوت عطا کرتا ہے اور موت کا خوف اسے ذلت و خواری اور پستی کی طرف نہیں دھکیلتا، دوسرا یہ انسانوں کو گناہوں کے بارے میں خبردار کرتا ہے اور ان کی تربیت کا ایک موثر وسیلہ ہے۔ قرآن مجید نے اس مسئلے کا بہت زیادہ ذکر کیا ہے اور اس اہم واقعے کی حقیقت کو کہ جو سب کے لیے بلا استثناء پیش آتا ہے بڑی صراحت سے بیان کیا ہے اور اس بارے میں بڑے پتے کی باتیں کی ہیں۔

اس مقدمے کے ساتھ پہلے مرحلے یعنی مرحلہ مرگ کی طرف توجہ کرتے ہیں اور مندرجہ ذیل پر معنی آیات کے لیے دل و جان سے گوش بر آواز ہوتے ہیں (اس امر کی طرف توجہ رہنا چاہئے کہ ہر آیت اس موضوع کے مختلف پہلوؤں میں سے ایک پر دلالت کرتی ہے)۔

(۱) كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ۖ وَإِنَّمَا تُوَفَّقُونَ أُجُورَ كُمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ

۱ (ال عمران: ۱۸۵)

(۲) اللَّهُ يَتَوَفَّى الْأَنفُسَ حِينَ مَوْتِهَا وَالَّتِي لَمْ تَمُتْ فِي مَنَامِهَا ۖ فَيُمْسِكُ

الَّتِي قَضَىٰ عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْأُخْرَىٰ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى ۖ (الزمر: ۴۲)

(۳) قُلْ يَتَوَفَّكُم مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِي وُكِّلَ بِكُمْ ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّكُمْ تُرْجَعُونَ ۝

(سجدة: ۱۱)

(۴) الَّذِينَ تَتَوَفَّيْهُمْ الْمَلَائِكَةُ ظَالِمِي أَنْفُسِهِمْ ۖ فَالْقُوا السَّلَامَ مَا كُنَّا

نَعْمَلُ مِنْ سُوءٍ ۖ بَلَىٰ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ۝ (نحل: ۲۸)

(۵) الَّذِينَ تَتَوَفَّيْهُمْ الْمَلَائِكَةُ طَيِّبِينَ ۖ يَقُولُونَ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ ۖ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿۳۲﴾ (نحل: ۳۲)

(۶) قُلْ يَٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ هَادُوا إِن رَّعَيْتُمْ أَنَا أَوْلَىٰٓ بِكُمْ بِإِلَٰهٍ مِّن دُونِ النَّاسِ فَتَمَنَّوْا الْمَوْتَ إِن كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿۶﴾ وَلَا يَتَمَنَّوْنَہٗ أَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيہُمْ ۖ وَاللّٰهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ ﴿۷﴾ (جمعة: ۶، ۷)

(۷) تَبَارَكَ الَّذِي بِيَدِهِ الْمُلْكُ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿۱﴾ الَّذِي خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا ۖ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْغَفُورُ ﴿۲﴾ (ملک: ۲، ۱)

(۸) وَجَاءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ۖ ذٰلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيدُ ﴿۱۹﴾ (ق: ۱۹)

(۹) كَلَّا ۚ إِذَا بَلَغَتِ النَّرَاقِيَ ﴿۳۱﴾ وَقِيلَ مَنْ رَاقٍ ﴿۳۲﴾ وَظَنَّ أَنَّهُ الْفِرَاقُ ﴿۳۸﴾ وَالتَّفَّطُّ السَّاقُ بِالسَّاقِ ﴿۳۹﴾ إِلَىٰ رَبِّكَ يَوْمَئِذٍ الْمَسَاقُ ﴿۴۰﴾ (قیامت: ۲۶ تا ۳۰)

(۱۰) حَتَّىٰ إِذَا جَاءَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُونِ ﴿۹۹﴾ لَعَلِّي أَعْمَلُ صَالِحًا فِيمَا تَرَكْتُ كَلَّا ۖ إِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَائِلُهَا ۖ (مومنون: ۹۹، ۱۰۰)

ترجمہ

(۱) ہر جان (ایک نہ ایک دن) موت کا مزہ چکھے گی اور تم لوگ قیامت کے دن (اپنے کئے کا) پورا پورا بدلہ بھراؤ گے۔

(۲) خدا ہی مرنے کے وقت روحوں کو قبض کرتا ہے اور ان کی روحوں کو بھی کہ جو ابھی نہیں مرے، حالت خواب میں کھینچ لیتا ہے۔ پھر جن کے بارے میں خدا موت کا حکم صادر کر چکا ہے ان کی روحوں کو روک رکھتا اور باقی دوسری روحوں کو (کہ جنہیں زندہ رہنا چاہیے) پھر ایک وقت مقررہ تک کے لیے بھیج دیتا ہے

(۳) کہہ دو: ملک الموت جو تمہارے اوپر متعین ہے وہی تمہاری روحیں قبض کرے گا اس کے بعد تم اپنے پروردگار کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔



(۴) یہ وہ لوگ ہیں کہ جب فرشتے ان کی روح قبض کرنے لگتے ہیں جب کہ انہوں نے اپنے نفسوں پر ظلم بھی کیا ہوتا ہے تو اس دوران میں یہ تسلیم ہو جاتے ہیں (اور کہتے ہیں کہ) ہم کوئی برائی نہیں کرتے تھے۔ جی ہاں! جو کچھ تمہاری کرتوتیں تھیں خدا ان سے خوب اچھی طرح واقف ہے

(۵) یہ وہ لوگ ہیں جن کی روحیں فرشتے اس حالت میں قبض کرتے ہیں کہ وہ پاک و پاکیزہ ہوتے ہیں۔ ان سے کہتے ہیں: تم پر سلام ہو۔ جو اعمال دنیا میں انجام دیتے تھے ان کے صلہ میں جنت میں چلے جاؤ۔

(۶) (اے رسول اللہ تم) کہہ دو: اے یہودیو! اگر تم یہ خیال کرتے ہو کہ تم ہی خدا کے دوست ہو اور لوگ نہیں، تو اگر تم (اپنے دعوے میں) سچے ہو تو موت کی تمنا کرو (تا کہ اپنے محبوب سے ملاقات کر سکو) اور یہ لوگ ان اعمال کے سبب جو یہ پہلے کر چکے ہیں، میں کبھی اس کی آرزو نہ کریں گے اور خدا تو ظالموں کو خوب جانتا ہے۔

(۷) پر برکت اور زوال ناپذیر ہے وہ کہ جس کے ہاتھ میں جہان ہستی کی حکومت ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہی کہ جس نے موت و حیات کو خلق کیا تا کہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے کون بہتر عمل انجام دیتا ہے اور وہ شکست ناپذیر اور بخشنے والا ہے۔

(۸) موت کی بے ہوشی یقیناً طاری ہوگی (اور انسان سے کہا جائے گا) یہ وہی چیز ہے کہ جس سے تو بھاگا کرتا تھا۔

(۹) ایسا نہیں، وہ ہرگز ایمان نہیں لائے گا یہاں تک کہ جان اس کی ہنسی تک پہنچ جائے اور کہا جائے گا: آیا کوئی ہے جو اس بیمار کو موت سے نجات دے؟ اور دنیا سے جدائی کا یقین پیدا کر لیگا (اور موت کی شدت سے) پنڈلی سے پنڈلی لپٹ جائے گا۔ (جی ہاں) اس دن سب کا رخ تیرے پروردگار کی (عدالت کی) طرف ہوگا۔

(۱۰) (وہ اسی طرح اپنے غلط راستے کو جاری و ساری رکھتے ہیں یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کی موت آئی تو کہنے لگے: اے میرے پروردگار! مجھے واپس لوٹا دے (دنیا میں) شاید وہ جو کچھ میں نے ترک کیا ہے (اور کو تاہی کی ہے) عمل صالح انجام دوں۔ (جواب دیا جائے گا) ہرگز نہیں یہ تو وہ ایک بے ہودہ بات کہہ رہا ہے (اور اگر واپس پلٹ بھی جائے تو بھی اس کی کرتوتیں پہلے ہی کی طرح رہیں گی)۔

## تفسیر

### ۱۔ موت ایک عمومی قانون ہے

پہلی آیت میں قانون موت کی عمومیت کے بارے میں بات کی گئی ہے یہ ایک ایسا مقدر ہے کہ جو تمام انسانوں اور تمام زندہ موجودات حتیٰ کہ غیر زندہ موجودات کے لیے بھی حتمی ہے ارشاد ہوتا ہے:

### کل نفس ذائقۃ الموت

”ہر انسان (آخر کار) موت کا ذائقہ چکھے گا۔“

یہ تعبیر قرآن مجید میں تین بار آئی ہے [۱] اور یہ تکرار موت کے قطعی ہونے کی جانب اشارہ ہے ضمناً تمام انسانوں کے لیے تنبیہ بھی ہے کہ اس قطعی مقدر سے غافل نہ ہوں۔

جہاں یہ فرمایا گیا ہے کہ موت عالم بقاء کی طرف ایک دریچہ ہے اس کے فوراً بعد اضافہ فرمایا گیا ہے:

### وانما تقوفون اجور کم یوم القيامة

اپنے اعمال کا بطور کامل صلہ فقط روز قیامت میں پاؤ گے۔

یہ اشارہ ہے اس امر کی جانب کہ دنیا عمل کی جگہ ہے نہ حساب و جزا کی اور آخرت حساب و جزا کی جگہ ہے نہ کہ عمل کی۔ اگرچہ دنیا اور عالم برزخ میں ایک محدود حد تک صلہ اور جزا ہے لیکن یہ مسلم ہے کہ کامل صلہ اور جزا فقط سرائے آخرت میں ہے۔

اس احتمال کا بھی امکان ہے کہ متذکرہ بالا تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ روز قیامت نجات انسان کا واحد وسیلہ اس کے پاکیزہ اعمال ہیں ورنہ مال و جاہ، مقام و منزلت، اولاد، قبیلہ اور طائفے کسی کے لیے عقدہ کشا نہیں ہیں، جیسے اس آیت قرآن حکیم میں ہے:

يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَلَا بَنُونَ ﴿٨٨﴾ إِلَّا مَنْ آتَى اللَّهَ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ ﴿٨٩﴾

”جس دن نہ تو مال ہی کچھ کام آئے گا اور نہ ہی اولاد قبیلہ مگر یہ کہ جو شخص خدا کے سامنے قلب سلیم (شرک اور فاسد

اعتقادات سے پاک دل، لینے ہوئے حاضر ہوگا۔“ (شعراء ۸۸-۸۹)

لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب دکھائی دیتی ہے اور کئی ایک مفسرین نے اسے اختیار کیا ہے اصولاً یہ امر واضح ہے کہ انسان خواہ ہر چیز میں شک و تردید کا شکار ہو لیکن موت کے بارے وہ شک و تردید میں مبتلا نہیں ہو سکتا۔ تمام اہل زمین و آسمان مرجائیں گے۔ تمام زندہ موجودات موت کے حلق میں اتریں گی۔ ہر کسی کے لیے بلا استثناء موت اور ایک اختتام ہے جس میں ایک لمحے کی بھی تاخیر نہیں ہے اور یہ جو لوگ ایک دوسرے کے بارے میں یا پھر اپنے رہبروں اور بزرگوں کے بارے میں ہیبتگی اور جاودانی کی دعائیں کرتے ہیں محض تکلفات ہیں ورنہ کون سی ہیبتگی اور کون سی جاودانی جب کہ تمام انبیاء اور اولیاء نے اس راستے کو طے کیا ہے سب کے سب بلا استثناء اس گذرگاہ سے گزرے ہیں۔

ضمناً اس آیت سے پتہ چلتا ہے کہ اولاً یہ کہ آدمی کی روح اس کی موت کے ساتھ نہیں مرتی کیونکہ کہا جاتا ہے کہ ہر نفس موت چکھے گا اور چکھنے کا معنی یہ ہے کہ روح باقی ہے اور موت کو درک کرتی ہے اور نائیا کہ روح بدن کے علاوہ کوئی چیز ہے کیونکہ اس کی موت کے ساتھ یہ باقی رہتی ہے۔

حدیث میں ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی:

**کل من علیہا فان**

وہ سب جو زمین پر ہیں فنا ہو جائیں گے۔ (رحمن ۲۶)  
تو فرشتوں نے کہا:

**مات اهل الارض**

یعنی! اہل زمین کی موت کا فرمان صادر ہو گیا!

اور جب یہ آیت نازل ہوئی کہ کل نفس ذائقة الموت تو فرشتوں نے کہا کہ ہماری موت کا بھی فرمان صادر ہو گیا۔<sup>[۱]</sup>  
اگرچہ یہ درست ہے کہ کلمہ ”نفس“ کا بعض اوقات خدا کی ذات پر بھی اطلاق ہوتا ہے جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے خدا سے مخاطب ہو کر کہا:

**ولا اعلم ما فی نفسک (مائدہ ۱۶۶)**

لیکن یہ بھی واضح اور روشن ہے کہ مورد بحث آیت میں ”کل نفس“ کی تعبیر مخلوقات کی طرف اشارہ ہے نہ کہ خالق کی جانب۔

## ۲۔ حقیقت موت

اکثر لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ موت فناء نابودی اور ہر چیز کے خاتمے کا نام ہے اسی دلیل کی بنا پر وہ خوفزدہ اور وحشت زدہ ہیں جب کہ قرآن مجید نے اس کی حقیقت کو توفی (پاک پروردگار کی ذات کے ذریعے روح انسان کا قبضہ نوایا دوسرے الفاظ میں یہ کہ اس حقیر و ناچیز عالم سے اس جہان بزرگ کی طرف انتقال) کے عنوان سے تفسیر فرمایا ہے۔  
دوسری آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

**اللہ یتوفی الا نفس حین موتہا<sup>[۲]</sup>**

”خدا موت کے وقت ارواح کو قبض کر لیتا ہے“

اس کے بعد اس دنیاوی زندگی ہی میں موت کا ایک نمونہ پیش کرنے کے لیے مزید فرماتا ہے:

[۱] تفسیر کبیر۔ ج ۹ ص ۱۲۵

[۲] ”موتہا“ کی ضمیر اگرچہ ظاہراً نفس کی طرف پلٹ رہی ہے لیکن درحقیقت یہ انسانوں کے ابدان اور اجساد کی طرف اشارہ ہے کیونکہ بدن مرتا ہے نہ کہ روح۔ اسی طرح منامہا کی ضمیر بھی۔

## والتي لم تمت في منامها

”اور ان کی روحوں کو بھی کہ جو ابھی نہیں مرے حالت خواب میں کھینچ لیتا ہے۔“

پھر جن لوگوں کی موت کا حکم صادر ہو چکا ہو ان کی ارواح کو روکے رکھتا ہے • اور وہ ہرگز موت سے بیدار نہیں ہوتے (اور باقی دوسرے لوگوں کی ارواح کو) (کہ جنہیں اس دنیا میں مزید زندہ رہنا چاہئے) پھر ایک مقررہ وقت تک کے لیے پلٹا دیتا ہے۔ (فیہمسک التی قضی علیہا الموت ویرسل الاخری الی اجل مسمی)۔

اور اس میں روشن نشانیاں ہیں (موت و حیات کے قانون اور ان دو مظاہر کی حقیقت سے متعلق) ان لوگوں کے لیے کہ جو فکر کرتے ہیں۔ (ان فی ذلک لآیت لقوم یتفکرون)۔

قرآن کا مقصد اس حقیقت کو بیان کرنا ہے کہ جیسے عالم خواب یا نیند میں روح انسان ختم نہیں ہوتی بلکہ وقتی طور پر اس کا بدن کے ساتھ رابطہ کمزور ہو جاتا ہے اور وہ روح دوسرے عوالم کی سیر کر سکتی ہے بالکل اسی طرح مرنے کے ساتھ فنا کا اصل وابد کوئی ربط نہیں بلکہ مرنا تو روح کا آزاد ہونا اور دوسرے بڑے بڑے عوالم کی سیر ہے۔

”یتوفی“ ”وفی“ کے مادے سے ہے۔ یہ دراصل کمال کے معنی میں ہے لہذا ”درہم دافی“ کامل درہم کے معنی میں ہے (یعنی چاندی کی مقدار اور وزن کے اعتبار سے کامل، اور اسی طرح ”توفی“ کامل دریافت کے معنی میں ہے۔ اس امر کی طرف متوجہ رہتے ہوئے کہ وصول کرنے والا اور دریافت کرنے والا خدا ہے اس جملے کا مفہوم یہ بنتا ہے کہ موت کے بعد ایک بزرگ تر اور بالاتر جہان میں انسان قدم رکھتا ہے موت کے بارے میں ایسا نظریہ بہت سارے مفاہیم اور محاسبات کو دگرگوں کر دیتا ہے۔ یہی وجہ یہ کہ اس کا عالم بقا کی طرف کھلنے والے ایک درجے کے عنوان سے تعارف کرایا گیا ہے۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ یہ کہ متذکرہ بالا آیت موت اور نیند کو ایک دوسرے سے ہم آہنگ شمار کرتے ہوئے تمام انسانوں کو خبردار کرتی ہے کہ تم کس طرح موت سے غافل ہو جبکہ موت ہر شب و روز تمہاری تلاش میں آتی ہے اور تم بخوبی اسے لمس بھی کرتے ہو۔ آپ حالت نیند میں اس دنیا سے بیگانہ ہو جاتے ہیں اور اپنی تمام تر زندگی اور مقام و منزلت سے وقتی طور پر جدا ہو جاتے ہیں۔ موت بھی ایک جاودانی نیند ہے اور نیند ایک عارضی موت ہے۔ شاید آیت کا یہ آخری جملہ ان تمام جہات کی طرف ارشاد ہو:

ان فی ذلک لآیت لقوم یتفکرون

## ۳۔ روح قبض کرنے والے فرشتے

اگرچہ گذشتہ آیت میں روح قبض کرنے کی خدا کی طرف نسبت دی گئی ہے لیکن قرآن کی دیگر آیات سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کام فرشتوں کے ذریعے انجام پاتا ہے۔

زیر بحث تیسری آیت میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خطاب ہے۔ جب مشرکین نے انکار معاذ کیا تو ارشاد باری تعالیٰ ہوا:

**قل یتومنکم ملک الموت الذی وکل بکم ثم الی ربکم ترجعون**  
کہہ دو کہ ملک الموت جو تمہارے اوپر تعینات ہے وہی تمہاری روحمیں قبض کرے گا اس کے بعد تم پروردگار کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ یہاں فرشتہ مرگ (ملک الموت) کی بات کی گئی ہے یعنی وہ فرشتہ کہ جو اس کام کے لیے مامور ہے جب کہ گذشتہ آیات میں ارواح قبض کرنے والے کی نسبت خدا کی طرف دی گئی ہے اور سورۃ نحل آیت ۲۸ میں فرشتوں کے گروہ کی طرف:

**الذین تتوفہم الملائکۃ**

اور اسی طرح سورہ انعام آیت ۶۱ میں رسولانِ الہی کی جانب:

**توفتہ رسلنا**

اگر متذکرہ بالا ان آیات میں تھوڑی باریک بینی سے کام لیا جائے تو ان میں کسی قسم کا کوئی تضاد نظر نہیں آئے گا کیونکہ اصل میں روح قبض کرنے والی خدا ہی کی پاک ذات ہے۔ پھر عالم اسباب میں موت کا بڑا فرشتہ ”عزرائیل“ اس فرمان کو اجراء کرنے والا ہے اور وہ بھی ”فرشتوں کے ایک گروہ“ کے ذریعے اس اموریت کو انجام دیتا ہے ان فرشتوں کی طرف ہی ”رسلنا“ کہہ کر اشارہ کیا گیا ہے اصولاً اس دنیا کے اہم حوادث فرشتوں ہی کے ذریعے انجام پاتے ہیں جو سب کے سب خدا کے تابع فرمان ہیں اور اس کے حکم کا اجراء کرنے والے ہیں۔ موت بھی کہ جو اس دنیا کے اہم حوادث میں سے ایک ہے اس قانون سے مستثنیٰ نہیں ہے۔

**ثم الی ربکم ترجعون**

اس کے بعد تم اپنے پروردگار کی طرف لوٹا دیے جاؤ گے۔

یہ آیت اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ خدا کی جانب بازگشت کیلئے اس سیر صعودی میں موت بالکل اسی طرح ایک مقدمہ ہے کہ جیسے پیدائش علم فنا اور انسانی روح کی سیر نزولی کی جانب کھلنے والا ایک دریچہ ہے اور ”شمہ“ کی تعبیر ممکن ہے وجود برزخ پر دلالت کرتی ہو۔

**۴۵ موت کے وقت مومنوں اور ظالموں کی حالت**

مومن و ظالم اور نیک و بد لوگ اسی موت کے لمحے ہی سے ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے ہیں اور مختلف حالات کے حامل ہوتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہ ان کے عقائد اور اعمال کے نتائج اسی لمحے آہستہ آہستہ ظاہر و آشکار ہونا شروع ہو جاتے ہیں ”چوتھی اور پانچویں“ آیت اسی حقیقت کی جانب ایک پر معنی اشارہ ہے۔  
پہلے ارشاد ہوتا ہے:

## الذین تتوفهم الملائكة ظالمی انفسهم فاقولوا لسلام ما كنا نعمل

من سوء.....

”یہ کافروہ لوگ ہیں کہ جب روح قبض کرنے والے فرشتے ان کی روح قبض کرتے ہیں اس حالت میں جب کہ ان کافروں نے اپنے نفس پر ظلم بھی کیا ہوتا ہے تو اس دوران میں یہ تسلیم ہو جاتے ہیں اور اظہار ایمان کرتے ہیں (جیسے فرعون نے غرق ہوتے وقت خدا کی وحدانیت پر ایمان کا اظہار کیا تھا، اور پھر یہ کافر کہتے تھے کہ ہم کوئی برائی نہیں کرتے تھے۔“

اس بات سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے کاملاً سر تسلیم خم نہیں کیا۔ وہ نہیں جانتے کہ خداوند عالم الغیب اور اس کے گواہ فرشتوں کے سامنے یہ انکار بہیودہ ہے اسی لیے آخر میں فرمایا گیا ہے:

بلی ان الله علیہ بما كنتم تعملون  
”جی ہاں! جو کچھ تمہاری کرتوتیں تھیں خدا اس سے خوب اچھی طرح واقف ہے۔“  
پھر انہیں حکم دیا جاتا ہے۔

## فَادْخُلُواْ اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا ط (نحل ۲۹)

اب جب ایسا ہے تو جاؤ پھر جہنم میں داخل ہو جاؤ اور ہمیشہ ہمیشہ وہیں پڑے رہو۔

اب تک جو کچھ بیان ہوا ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ اظہار تسلیم یہاں توحید کے معنی میں ہے اور حق تعالیٰ شانہ کے سامنے سر تسلیم خم کرنا (جیسا کہ بعض مفسرین نے کہا ہے) لیکن چونکہ ابھی تک دنیا کی ہوا و ہوس کا بھوت ان کے سروں پر سوار ہے اور یہ موت کے بعد کے مراحل پر حاکم قوانین سے نا آشنا ہیں اسی لیے اپنی سابقہ برائیوں کا انکار کرتے پھرتے ہیں اور جھوٹ اور فریب کاری سے کام لے رہے ہیں لیکن انہیں جلد ہی پتہ چل جائے گا کہ یہ جگہ غلط بیانی اور دروغ گوئی کی نہیں ہے۔

یہ کہ یہاں پر جہنم سے مراد عالم برزخ کی جہنم ہے یا جہنم قیامت اس سلسلے میں دو احتمال ذکر کئے گئے ہیں۔ موت کے لمحات سے مناسب تر تو جہنم برزخ ہی میں داخل ہونا ہے اگرچہ خلود اور ہمیشہ رہنے کی تعبیر جہنم قیامت کی طرف اشارہ ہے۔ لیکن یہ کہہا جائے کلام برزخ میں ابواب جہنم میں وارد ہوں گے نہ کہ خود جہنم میں اور خلود و ہمیشگی کافروں کے لیے خود دوزخ میں وارد ہونے کے وقت کی صفت ہے نہ کہ ابواب دوزخ میں۔

## بلی ان الله علیہ بما كنتم تعملون

یہ آیت ممکن ہے کہ موت کے فرشتوں کی زبانی ہو کہ جو انہیں خبردار کر رہے ہیں کہ (اپنی سابقہ کرتوتوں کا) خواہ مخواہ انکار نہ کرو کیونکہ

خدا کا لاتنا ہی علم تمہارے اعمال سے پردہ ہٹا دے گا۔

بہر حال یہ آیت سورہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی آیت ۲۷ سے مشابہ ہے کہ جس میں ارشاد باری تعالیٰ ہوتا ہے:

**فكيف اذا توفتهم الملائكة يضربون وجوههم وادبارهم**

”ان کی کیا حالت ہوگی جب روح قبض کرنے والے فرشتے ان کے چہروں اور پیٹھ پر مار رہے ہوں گے؟“

جی ہاں! ملائکہ ان کے چہروں اور پیٹھ پر تھپڑوں اور مکوں کی بارش کے ساتھ انکا استقبال کریں گے اور شاید انکا حق باتوں اور توحید کا اعتراف کرنا بھی اس منظر کو دیکھنے کی وجہ سے ہے نہ کہ اخلاص کی بناء پر۔

ان کے مقابل رحمت کے فرشتے ہیں کہ جو مومنوں کی ارواح قبض کرنے آتے ہیں جیسا کہ دوسری آیت میں ذکر ہوا ہے:

**الذين تتوفهم الملائكة طيبين يقولون سلام عليكم ادخلوا الجنة**

**بما كنتم تعملون**

پرہیزگار وہ لوگ ہیں کہ ملائکہ جب ان کی روح قبض کرتے ہیں تو وہ اپنے عقیدے، گفتار اور کردار میں پاک و پاکیزہ ہوتے ہیں اور فرشتے ان سے کہتے ہیں کہ تم پر سلام ہو (ایسا سلام کہ جو امن و امان اور سلامتی کی علامت ہے) جو اعمال تم دنیا میں انجام دیتے تھے ان کی بدولت جنت میں چلے جاؤ۔

واقعاً تقویٰ و پاکیزگی کی جزا اس کے علاوہ کچھ نہیں ہو سکتی کہ فرشتگان الہی درود و سلام کے ساتھ ان کا استقبال کریں اور انہیں بہشت کی دعوت دیں، ایسی دعوت کہ جو احترام اور لطف و محبت میں گندھی ہو۔

یہاں یہ بھی ممکن ہے کہ یہ جنت برزخ کی جنت کی طرف اشارہ ہو یا پھر قیامت کی جنت ہی کی طرف چونکہ بہشت برزخ بھی تو اسی جنت کا دروازہ شمار ہوتی ہے۔

بہر حال یہ موت کے مختلف پہلوؤں میں سے ایک ہے کہ جس کی کیفیت صالح اور بدکار لوگوں کی نسبت بالکل متفاوت ہے۔

## ۶۔ موت سے ڈرنے کی دلیل

معمولاً لوگوں کے لیے چہرہ موت وحشت ناک ہوتا ہے اور اس کی دلیل ان دو چیزوں میں سے کوئی ایک ہے: یہ لوگ یا تو موت کو ہر چیز کا خاتمہ اور فنا کے مترادف سمجھتے ہیں یا پھر ایسا گناہوں کی آلودگی اور دنیا سے ان کی دبستگی کی بناء پر ہوتا ہے۔

لیکن وہ جو موت کو ایک نیا جنم ایک وسیع تر جہان میں منتقلی کا نقطہ آغاز اور ایک اعلیٰ و برتر زندگی جانتا ہو اور اس نے اس سفر کے لیے بھاری بھر کم اعمال صالح کا ازاد راہ بھی ذخیرہ کیا ہو اور پھر دنیا سے بھی کوئی خاص دبستگی نہ رکھتا ہو وہ آخر موت سے کیونکر ڈرے؟

چھٹی آیت میں اس مطلب کی جانب ایک ظریف اشارہ فرمایا گیا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے:

**قل یا ایہا الذین ہادوا ان زعمتم انکم اولیاء للہ من دون الناس**

**فتمنوا الموت ان کنتم صادقین**

(اے رسول اللہؐ) کہہ دو: اے یہودیو! اگر تم یہ خیال کرتے ہو کہ تم ہی خدا کے دوست ہو اور لوگ نہیں، اگر تم (اپنے دعوے میں) سچے ہو تو موت کی تمنا کرو (تا کہ اپنے محبوب سے ملاقات کر سکو)۔  
بعد میں مزید فرماتا ہے:

**ولا یتمنونہ ابدالاً بما قدمت ایدیہم واللہ علیم بالظلمین۔**

اور یہ لوگ ان اعمال کے سبب کہ جو پہلے کر چکے ہیں کبھی اس کی آرزو نہ کریں گے اور خدا تو ظالموں کو خوب جانتا ہے۔  
یہ امر قابل توجہ ہے کہ یہاں پر یہودیوں کو مخاطب کیا گیا ہے اور یہ ظاہراً دو کلمتوں کی بناء پر ہے:  
اول یہ کہ یہودی ہمیشہ حتیٰ کہ آج بھی اپنے آپ کو خدا کی برگزیدہ نسل جانتے ہیں اور خود ہی سے اپنے لیے دوسروں کی نسبت اپنی امتیازی حیثیت کے خیالی پلاؤ پکاتے رہتے ہیں۔ کبھی اپنے آپ کو خدا کی اولاد سمجھتے ہیں تو کبھی اس کے اولیاء اور بندگان خاص میں سے اپنے آپ کو شمار کرتے ہیں۔<sup>[۱]</sup> اور کبھی کہتے ہیں کہ:

”ہم خواہ جتنے بھی گناہ گار ہوں ہمیں دوزخ کی آگ ہرگز نہیں چھوئے گی مگر گنتی کے چند دن۔“<sup>[۲]</sup>

قرآن ان سے کہتا ہے کہ اگر تم اپنے اس اعتقاد میں سچے ہو تو پھر یہ موت کا خوف کیسا؟ کیا کوئی عاشق اپنے محبوب کے لقا سے ڈرتا ہے؟ کیا ایک زندان سے کسی سرسبز و شاداب باغ میں منتقل ہونا وحشت ناک ہے؟  
سورہ بقرہ کی آیت ۹۴ میں بھی اس سے مشابہ بات کی گئی ہے:

**قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمْ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوْا**

**المَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۝۹۴**

ان سے کہہ دو: اگر خدا کے نزدیک آخرت کا گھر خاص تمہارے واسطے ہے اور لوگوں کے لیے نہیں ہے تو اگر تم سچے ہو تو موت کی آرزو کرو۔

دوسرا یہ کہ وہ لوگ دنیا پرست اور عالم مادہ سے دل بستہ تھے۔ علاوہ ازیں نافع خونریزی اور کثرت گناہ سے ان کا دامن آلودہ تھا

[۱] وقالت اليهود والنصارى نحن ابنوا الله واحباؤه (مائدہ ۱۸)

[۲] وقالوا لن تمسنا النار الا اياماً معدودة (بقرہ ۸۰)



۔ یہی وجہ تھی کہ وہ موت سے سخت خوفزدہ تھے۔

سورہ بقرہ آیت ۹۶ میں قرآن گویا ہے:

**وَلْتَجِدَنَّهُمْ أَحْرَصَ النَّاسِ عَلَى حَيٰوةٍ ۖ**

اور آپ لوگوں میں سے اس پست مادی زندگی کا سب سے زیادہ حریص انہیں پائیں گے۔

اسی سورہ بقرہ کی آیت ۹۵ میں ارشاد ہوتا ہے:

**وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًا ۚ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ۖ**

لیکن وہ ان اعمال بد کی وجہ سے جنہیں ان کے ہاتھوں نے پہلے سے آگے بھیجا ہے، ہرگز موت کی آرزو نہ کریں گے۔

لہذا اس انداز سے قرآن مجید نے موت سے ڈرنے کی وجوہات کو بھی واضح طور پر بیان کر دیا ہے اور اس وحشت و خوف سے نجات کے مختلف طریقوں کو بھی ذکر فرما دیا ہے۔ بعض مفسرین متذکرہ بالا آیت کو یہودیوں کے ساتھ ایک قسم کا مقابلہ سمجھتے ہیں کہ جو جھوٹا دعویٰ کرنے والوں کے ساتھ مقابلے کا ایک طریقہ ہے اور وہ یہ کہ اپنے دعوے کو سچ ثابت کرنے کے لیے بارگاہ خداوندی میں دعا کریں کہ اگر وہ جھوٹے ہیں تو رسوا ہوں۔ (اور اگر مقابلے کی شرائط اس میں موجود ہوں تو اس کا اثر ہوگا)۔

اور اس بات کی شہادت یہ ہے کہ روایات میں ذکر ہوا ہے کہ اگر یہ جھوٹے دعویدار یعنی یہودی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے موت کی آرزو کرتے تو بلافاصلہ وہی آب و ہن ان کے حلق میں پھنس جاتا اور وہ سب ڈھیر ہو جاتے۔

**والذی نفسی بیدہ لا یقولہا احد منکم الا غص بریقہ ۱۱**

## ۷۔ فلسفہ موت و حیات

بہر صورت انسانی زندگی محدود ہے اور ہر جاندار کو موت سے دوچار ہونا ہے۔ یہاں جو پہلا سوال ابھرتا ہے وہ یہ کہ آخر اس موت و حیات کا ہدف کیا ہے؟

زیر بحث اس ساتویں آیت میں قرآن مجید اسی مطلب کی طرف اشارہ کر رہا ہے:

**تَبَارَكَ الَّذِیْنَ بَیْدَہُ الْمَلٰٓئِکَ وَهُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَ**

**الْحَیٰۃَ لِیَبْلُوَ کُمْ اَیْکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْغَفُوْرُ**

”زوال ناپذیر اور پر برکت ہے وہ ذات کہ جس کے ہاتھ میں کائنات کی حکومت ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہی کہ جس نے موت و حیات کو خلق کیا تا کہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے کون بہتر عمل انجام دیتا ہے اور وہ عزیز و غفور ہے۔“

یہاں پر خداوند تبارک و تعالیٰ نے پہلے تو خلقت موت و حیات کا تعارف اپنی لامتناہی قدرت کی علامت کے طور پر کروایا ہے، بعد میں فرماتا ہے:

اس خلقت کا ہدف حسن عمل کی آزمائش ہے، ایسی آزمائش کہ جو قرب الہی کے راستے میں انسانوں کی ہدایت، تربیت اور نمو کا باعث بنتی ہے۔

اس آیت سے چند نتائج حاصل ہوتے ہیں:

۱: موت و حیات دونوں مخلوق ہیں۔ اگر موت فنا اور نیستی مطلق کے معنی میں ہوتی تو اس کا مخلوق ہونا بے معنی تھا۔ چونکہ موت ایک دنیا سے دوسری دنیا کی طرف انتقال ہے لہذا ایک امر وجودی ہے اور قابل خلقت۔

۲: موت حیات سے پہلے ہے۔ یا تو یہ دنیا کی موت اور جہان آخرت کی حیات کی طرف اشارہ ہے یا انسان کے خاک ہو جانے اور پھر اسی خاک سے زندہ ہونے کے مرحلے کی طرف اشارہ ہے اور یا پھر ان دونوں امور کی جانب۔

۳: اس دنیا کا ایک میدان آزمائش کے عنوان سے تعارف کروایا گیا ہے، ایک ایسا میدان کہ جو عمل کے اعتبار سے بہترین افراد کے امتحان کی جگہ ہے اور لازمی بات ہے کہ اس امتحان کا نتیجہ اور کامیابی کی سند دوسری دنیا میں واضح ہوگی۔

۴: خدا کی بارگاہ میں انسان کی قدر و قیمت کا معیار اس کا حسن عمل ہے۔ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ نیک اعمال کا سرچشمہ خالص نیت، پاکیزہ عقائد اور قلب مومن ہی ہے کیونکہ عمل انہی امور کا انعکاس ہے۔

شاید اسی دلیل کی بنا پر جملہ ”احسن عملاً“ کی تفسیر میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

**اتمکم عقلاً واشدکم لله خوفاً واحسنکم فیما امر الله به ونہی عنه**

**نظراً، وان کان اقلکم تطوعاً**

مراد یہ ہے کہ تم میں سے کون ہے جو عقل و خرد کے اعتبار سے کامل ہو، خدا خوفی کے حوالے سے زیادہ قوی اور خدا

کے اوامر و نواہی سے زیادہ آگاہی کا حامل ہو اگرچہ تمہارے مستحب اعمال کم ہی کیوں نہ ہوں۔<sup>[۱]</sup>

اس سے واضح ہوتا ہے کہ ”احسن عملاً“ کے بارے میں جو مختلف تفاسیر کی گئی ہیں جیسا کہ اخلاص عمل، افزونی عقل، زہد فراوان، موت کو یاد رکھنا اس سفر کے لیے بیشتر آمادہ رہنا وغیرہ یہ سب ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہیں یہ مختلف تفاسیر شمار نہیں ہوتیں۔ چونکہ یہ سب

ایک ہی درخت کی شاخیں پتے، جڑیں، ٹہنیاں، تنے اور پھل ہیں۔

۵: حقیقی قدر و قیمت عمل کی ”کیفیت“ سے ہے نہ کہ ”کمیت“ اور اس کے حجم سے بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک معمولی و حقیر عمل خلوص، ایمان اور معرفت کے حوالے سے اپنی اعلیٰ کیفیت کے اعتبار سے کثرت اعمال پر فوقیت رکھتا ہے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

**لیس یعنی اکثر عملا ولکن اصبکم عملا**  
ہدف یہ نہیں ہے کہ کون زیادہ عمل انجام دیتا ہے بلکہ مقصد یہ ہے کہ کون زیادہ صحیح اور خالص عمل انجام دیتا ہے۔

❶

۶: الہی افعال ہدف یا دوسرے الفاظ میں ”معلل بالا غراض“ ہیں، ان نا آگاہ اور بے خبر لوگوں کی بات کے برخلاف کہ جو خدا کے افعال کو بے ہدف گردانتے ہیں۔

۷: ممکن ہے اس عظیم امتحان کے میدان میں انسان تنہائی اور ناتوانی کا احساس کرے اور لغزشوں کی وجہ سے مایوس ہو جائے، لہذا آیت کے آخر میں خدا کے لیے عزیز و غفور کی صفت لانے سے ان پریشانیوں کا خاتمہ کر دیا گیا ہے اور انسان سے کہا گیا ہے کہ تم تنہا نہیں ہو امتحان کے عظیم ہونے سے نہ ڈرو۔ خدا سے دل باندھو اور اگر تم سے کوئی غلطی سرزد ہو تو اس کے عفو و درگزر کے دامن کو تھامو۔

## ۸ و ۹۔ عالم نزع کی سختی اور جان کنی کے مقدمات

قرآنی آیات سے پتہ چلتا ہے کہ موت کے لمحات وحشت ناک اور تکلیف دہ ہوتے ہیں۔  
زیر بحث آٹھویں آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

**وجاءت سكرة الموت بالحق**  
بالآخر موت کی سختی یقیناً آ پہنچی۔

اور پھر ایسے عالم میں انسان سے خطاب ہوتا ہے کہ:

**ذلك ما كنت منه تحيد**

”یہ وہی چیز ہے کہ جس سے تم فراری تھے“ (آخر کار تمہارے دامن گیر ہو ہی گئی)۔

”سکرۃ“ سکر کے مادے سے ہے۔ ارباب لغت کے بقول یہ ایک ایسی حالت ہے کہ جو انسان اور اس کی عقل کے درمیان پیدا ہوتی ہے اور یہ فقط زیادہ شراب کے سلسلے میں استعمال ہوتا ہے اگرچہ بعض اوقات ایسی حالت کو بھی کہا جاتا ہے کہ جو شدت غضب اور آتشین و

سوزاں عشق کی وجہ سے رونما ہو۔

لیکن ”مقائیس اللغۃ“ کے بقول دراصل یہ مادہ ”حیرت“ کے معنی میں ہے۔ اور بعض نے اسے ”شدت“ کے معنی میں تفسیر کیا ہے ظاہراً یہ سب مختلف تعبیرات کے ساتھ ایک ہی معنی پر دلالت کرتے ہیں۔ موت کے وقت مستی کی سی حالت کا پیدا ہونا یا تو یہ طبعیئتاً ایسا ہوتا ہے چونکہ اس دنیا سے ایک ایسی دنیا کی طرف منتقلی ہو رہی ہے کہ جو مختلف جہات سے ناشاختہ ہے۔ یہ بالکل ان نوزائیدہ بچوں کی سی ہجانی حالت ہے کہ جو عالم جنین سے عالم دنیا میں منتقل ہوتے وقت پیدا ہوتی ہے۔

یاموت کے بعد کے حالات و شرائط کا مشاہدہ کرنے نتیجہ اعمال کا سامنا کرنے اور انجام کے خوف کی وجہ سے ایسا ہوتا ہے۔

اور یا پھر دنیا، عزیز و اقارب اور محبوب اشخاص و اشیاء سے جدائی کی بنا پر ایسی کیفیت طاری ہوتی ہے۔

روایات سے پتہ چلتا ہے کہ انبیاء و اولیاء اللہ علیہم السلام کہ جن کی نہ اس دنیا سے وابستگی تھی اور نہ ہی انہیں آئندہ کا کوئی خوف و خطر لاحق تھا اور اسی بنا پر وہ اس لمحے ایک خاص سکون و آرام سے بہرہ ور ہوتے تھے لیکن اس کے باوجود اس لمحہ منتقلی کے وقت مشکلات و شدائد سے وہ بھی مبرا نہ تھے۔

جیسا کہ پیامبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی زندگی کے آخری لمحات میں اپنے ہاتھوں کو پانی کے ایک برتن میں گिला کر کے چہرہ مبارک پر پھیرتے اور کہتے لا الہ الا اللہ اور پھر فرماتے

### ان للموت سكرات

”موت سختیوں اور تکالیف سے پر ہے۔“ [۱]

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کا بھی ارشاد گرامی ہے کہ:

ان للموت غمرات هی افطع ان تستغرق بصفة او تعتدل علی عقول

### اهل الدنيا

”موت اس قدر تکالیف اور سختیوں سے پر ہے کہ جو بیان سے باہر ہے یا جسے دنیا والوں کے عقلی معیار سے نہیں

پرکھا جاسکتا۔“ [۲]

”غمرة“ ایسی سختیوں کی طرف اشارہ ہے کہ جو انسانی وجود پر چھا جاتی ہیں۔ بعض اوقات سكرات موت کچھ دیگر امور کے ساتھ جمع ہو جاتے ہیں جو اس کی شدت کو دو چند کر دیتے ہیں جیسا کہ امیر المومنین علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

[۱] تفسیر روح البیان - ج ۹ ص ۱۱۸

[۲] غرر الحکم

## اجتمعت علیہم سکرۃ الموت وحسرت الفوت

”سکرات موت اور دنیا کو ہاتھ سے کھودینے کی حسرت ان کو گھیر لیتی ہے۔“ [۱]

ایک طرف تو یہ پہلو ہے اور دوسری جانب آیات مجیدہ سے اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ بدن سے روح کی خدائی تدریجاً عمل میں آتی ہے اور خودیہ عمل وحشت کو دو گنا کر دیتا ہے۔ اگر یہی عمل اچانک اور ایک لمحے میں انجام پاتا تو اس کا برداشت کرنا نسبتاً آسان تھا۔ چنانچہ مورد بحث آیت میں ہم دیکھتے ہیں کہ ارشاد باری تعالیٰ ہوتا ہے:

## کلا اذا بلغت التراقي وقيل من راق

ایسا نہیں (کہ یہ ہٹ دھرم جو کہتے ہیں کہ ہرگز ایمان نہیں لائیں گے) یہاں تک کہ جان ان کے گلوں تک جا پہنچے اور کہا جائے: آیا کوئی ہے جو اس بیمار کو موت سے نجات دلائے۔

## وظن انه الفراق والتفت الساق بالساق

اس دوران (دنیا سے) جدائی کا یقین پیدا کر لیتا ہے (اور جان کنی کی شدت کی وجہ سے) ٹانگوں کو آپس میں بھینچ لیتا ہے۔

سورہ واقعہ آیت ۸۳ میں اسی مطلب کو دوسرے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

## فلولا اذا بلغت الحلقوم

”پس کیونکر جب جان گلے تک پہنچی ہے۔“ (تو پھر اس کے واپس پلٹانے پر قادر نہیں ہو)۔

## وانتم حينئذ تنظرون

اور تم اس دوران میں دیکھتے ہی رہتے ہو (اور تم سے کچھ نہیں بن پاتا)۔

”تراقی“ ”ترقوہ“ کی جمع ہے جس کے معنی ایسی ہڈیوں کے ہیں کہ جو گلوں کی ہونے اور جان کا گلے تک پہنچ جانا زندگی کے آخری لمحات کے لیے کنایہ ہے۔ ایسا دکھائی دیتا ہے کہ جب انسان کے بدن سے جان جدا ہوتی ہے تو جو اعضاء مغز اور دل سے جتنے دور ہیں اتنا ہی جلدی ناکارہ ہو جاتے ہیں اور کام کرنا چھوڑ جاتے ہیں۔

”التفت الساق بالساق“ کا جملہ ممکن ہے اسی مطلب کی طرف اشارہ ہو۔ (تفسیر مجمع البیان میں اس آیت کی مختلف تفاسیر میں سے ایک تفسیر یہ بھی ذکر کر گئی ہے کہ اس سے مراد ٹانگوں کا ناکارہ ہو جانا ہے) ”ضمناً جان کے حلقوم تک پہنچ جانے کی تعبیر بھی اسی معنی میں ہے۔ البتہ جب جان گلے تک پہنچتی ہے تو پھر نظام تنفس درہم برہم ہو جاتا ہے اور نظام تنفس کی خرابی آکسیجن کی کمی، گھٹن اور دماغ کے ناکارہ ہونے کا

سبب بنتی ہے۔ اس دوران حاضرین رونا پینا شروع کر دیتے ہیں بے چینی کا اظہار کرتے ہیں اور اسے واپس پلٹانے کی بے شمار کوششیں کرنا شروع کر دیتے ہیں لیکن کسی سے کچھ بن نہیں پاتا اور کچھ ہی لمحوں بعد انسان ہمیشہ کے لیے اس دنیا سے جدا ہو جاتا ہے اور اس کا بے جان جسم اس طرح ایک کونے میں پڑا ہوتا ہے جیسے وہ ہرگز اہل دنیا میں سے نہ تھا۔

اور یہ بات تعجب سے خالی نہیں کہ ان مراحل سے سبھی کو گزرنا ہے کہ جو کبھی دیر سے اور کبھی جلدی طے ہو جاتے ہیں سنگمر، جابر، بادشاہ بھی اسی طرح مرجائیں گے جیسے مظلوم اور مستضعف و ستم رسیدہ لوگ مرجائیں گے بلکہ ان کے جان کنی کے لمحات زیادہ دردناک ہیں۔۔۔ چونکہ مادی دنیا کے ان دلہستگان کے لیے اس مال و دولت اور مقام و منزلت سے جدا ہونا کہ جس کے لیے انہوں نے زندگی بھر محنت کی اور ان سے منہ موڑنا آسان نہیں۔

### ”واپس لوٹنے اور تلافی کرنے کی تمنا“

دنیا سے جدائی اور موت کے لمحے کہ جب چشمِ برزخ کھل جاتی ہے، پس پردہ بعض غیبی اسرار انسان پر آشکار ہو جاتے ہیں، نتیجہ، اعمال اس کی آنکھوں کے سامنے ہوتا ہے، ہاتھوں کو حسنت سے خالی اور پشت کو گناہوں کی بوجھ تلے دبنا محسوس کرتا ہے تو اپنے ماضی پر شدید نادم اور پشیمان ہوتا ہے اور اس کی تلافی کی فکر میں پڑ جاتا ہے۔ ان حالات میں، جیسا کہ زیر بحث دسویں آیت میں ذکر ہوا ہے، قبض روح کرنے والے فرشتوں کی طرف رخ کر کے بارگاہِ خداوندی میں التجا کرتا ہے اور پکارتا ہے: اے میرے پروردگار! مجھے واپس بھیج دے۔

### حقى اذا جاء احدہم الموت قال رب ارجعون

شاید اپنے گزشتہ کی تلافی کر سکوں اور وہ جو کچھ مجھ سے ترک ہوا ہے اس کے بدلے عمل صالح انجام دے سکوں۔

### لعلی اعمل صالحا فیما ترکت

لیکن الہی سنت کسی کو ایسی اجازت نہیں دیتی نہ نیک لوگوں کے لیے واپسی کا کوئی راستہ ہے کہ وہ اپنے نیک اعمال میں اضافہ کر سکیں اور نہ ہی بدکاروں کے لیے توبہ اور تلافی کی کوئی سبیل، لہذا قاطعاً نہ طور پر اسے جواب دیا جاتا ہے کہ

### کلا

نہیں! ہرگز واپسی کی کوئی راہ نہیں۔

مزید برآں فرماتا ہے:

### انہا کلمۃ ہو قائلہا

یہ ایسی بات ہے جو وہ فقط زبان سے کہتے ہیں دل سے نہیں۔

تمام مجرم جب سزاؤں کے پھندے میں گرفتار ہوتے ہیں تو اس وقت ایسی باتیں کرتے ہیں لیکن جو انہی امواجِ مصائب اور سختیوں کا

زور ٹوٹتا ہے تو بیشتر وہی پہلے والے کاموں کی تکرار ہوتی ہے۔

یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ ”رب ارجعون“ میں مخاطب پاک پروردگار کی ذات ہے لیکن ”ارجعون“ کی ضمیر جمع استعمال ہوئی ہے۔ مفسرین کا کہنا ہے کہ یہ مقام حق تعالیٰ کے احترام و تعظیم کی خاطر ہے یا درحقیقت مخاطب فرشتگان خدا ہیں کہ جو ایک گروہ کی صورت میں قبض روح کے لیے آتے ہیں۔

یہ معنی بھی ممکن ہے کہ اولاً انسان لطف خدا کا دامن تھامتا ہے اور پھر فرشتوں کی طرف رخ کر کے ان سے بازگشت کا تقاضا کرتا ہے۔<sup>[۱]</sup>

سورۃ منافقوں کی دسویں آیت میں بھی اسی سے مشابہ مطلب بیان ہوا ہے۔

**وَأَنْفِقُوا مِنْ مَّا رَزَقْنَاكُمْ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُولَ رَبِّ**

**لَوْلَا أَخَّرْتَنِي إِلَىٰ أَجَلٍ قَرِيبٍ ۖ فَأَصَّدَّقْتُ وَأَكُنُ مِنَ الصَّالِحِينَ<sup>۱۰</sup>**

وہ جو روزی ہم نے آپ کے نصیب کی ہے اس میں سے خدا کی راہ میں انفاق کرو قبل اس کے کہ تم میں سے کسی ایک کی موت آپہنچے اور پھر وہ کہنے لگے: اے میرے پروردگار! تو نے مجھے کچھ تھوڑی سی مہلت اور کیوں نہ دی تاکہ خیرات کرتا اور صالحین میں سے ہو جاتا۔

اس آیت کے ذیل میں بھی ایک اور انداز سے انہیں نفی میں جواب دیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

**وَلَنْ يُوْخِرَ اللَّهُ إِذَا جَاءَ أَجْلُهَا وَاللَّهُ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ۔**

اور جب کسی کو موت آجاتی ہے تو خدا اس کو ہرگز مہلت نہیں دیتا اور جو کچھ تم کرتے ہو خدا اس سے آگاہ ہے۔

سورہ انعام کی آیت ۲۸ سے بھی پتہ چلتا ہے کہ مجرمین دوزخ کے کنارے یہی باتیں کریں گے چونکہ یہ بات موضوع بحث سے خارج ہے اس لیے ابھی اس کی تشریح سے صرف نظر کرتے ہیں۔

## نتیجہ بحث:

متذکرہ بالا دس عناوین اور آیات کی تفسیر سے مسئلہ موت کے بارے میں مختلف زاویوں سے قرآن کی نظر واضح ہو جاتی ہے۔ قابل توجہ ہے کہ قرآن نے ان تمام موارد میں ان کے تربیتی آثار پر انحصار کیا ہے کیونکہ قرآن ایک مکمل تربیتی کتاب ہے۔ اصول

<sup>[۱]</sup> تفسیر ”المیزان“ میں یہ احتمال بھی پیش کیا گیا ہے کہ جمع کی ضمیر جمع فاعل کی بجائے جمع فعل کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی عالم نزع کی حالت میں گویا وہ شخص چند بار ”ارجع ارجع“ کہنے کی بجائے ”ارجعوا“ کہتا ہے۔

المیزان ج ۱۵ ص ۷۱ (لیکن مسلمان یساعری ادبیات میں بہت کم ہے)۔

دین، فروع دین اور تاریخی و اجتماعی مسائل وغیرہ کو بیان کرتے وقت ان کے تربیتی پہلوؤں پر قرآن خاص نگاہ رکھتا ہے۔ یعنی واقعات اور حقائق کو واضح طور پر بیان کرتا ہے اور ان سے سرکش نفس کو کنٹرول کرنے تقویٰ و پرہیزگاری کی دعوت اور قرب خدا کی راہ طے کرنے کے لیے انتہائی ظریف اور دقیق انداز سے استفادہ کرتا ہے اور واقعاً ان تمام پہلوؤں میں قرآن کی باریکی اور ظرافت کس قدر جاذب اور دلکش ہے!

## چند وضاحتیں

### ۱۔ موت، دریکہ عالم بقاء

آیات قرآنی سے استناد کے ساتھ وہ جو کچھ سطور بالا میں ذکر ہوا ہے منطقی طریقوں سے قابل استدلال ہے۔ (لیکن غیبی عوالم اس سے مستثنیٰ ہیں چونکہ ان تک ہماری رسائی نہیں اور قرآن نے ان سے پردہ اٹھایا ہے)۔

اس میں شک نہیں کہ موت کے بارے میں معتقدین معاد اور الہی افراد کی نظرمادی افراد اور منکرین معاد کی نظر کی نسبت زمین و آسمان کے تفاوت کی حامل ہے یہ نظریے انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں اور ان کے پیروکاروں کی روش کو ایک دوسرے سے ممتاز کرتے ہیں۔

مادی افراد موت کو انتہائی تاریک اور ظلمانی عالم تصور کرتے ہیں ایک ایسا عالم کہ جس کے ساتھ ہر چیز کا خاتمہ ہو جاتا ہے ان کے نزدیک موت انسان کی تمام تر کوششوں، جدوجہد، آرزوں اور تمناؤں کا اختتام ہے بنا برائیں باعث تعجب نہیں کہ مادی انسان موت کے خوف سے اپنے اوپر لرزہ طاری رکھے اور اسی فکر سے زندگی کے جام شیریں کو ساغر زہر بنا ڈالے۔

باعث تعجب نہیں کہ وہ انفرادی اور اجتماعی دباؤ کے بغیر ایثار و فداکاری کے قریب بھی نہ پھٹکیں چونکہ ایثار کے بعد کوئی ایسی چیز نہیں جو اس کی نعم البدل ہو سکے یا دوسرے الفاظ میں یہ کہ ایثار کا ہدف نہائی بنے۔

تعجب آور نہیں کہ وہ زندگی کو لغو بیہودہ اور بے معنی جانیں کیونکہ اگر موت ہر چیز کا خاتمہ ہو تو یہ دنیاوی زندگی کہ جو چھوٹی سطح کے تکراری کاموں مثلاً کھانے پینے پہننے اور مصرف کرنے کا مجموعہ ہے ایک عالی ہدف کے عنوان سے روح انسانی کو ہرگز سیراب نہیں کر سکتی لہذا بعض لوگ خودکشی کا راستہ اختیار کرتے ہیں اور اپنے اس اقدام کو روزمرہ زندگی کے بے معنی تکراری افعال کے خاتمہ کے لیے ایک صحیح انتخاب تصور کرتے ہیں اور اسے عقل و منطق کے عین مطابق سمجھتے ہیں جب کہ زندہ رہنے کو ایک طرح کی حماقت، نادانی اور مایہ ذلت خیال کرتے ہیں۔

لیکن معتقدین معاد اور الہی افراد موت کو اسی طرح دیکھتے ہیں کہ جیسے شکم مادر سے جنین کی پیدائش۔

درحقیقت جنین مرجاتا ہے یعنی شکم مادر والی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے لیکن ٹھیک اسی لمحے ایک ایسے جہان میں قدم رکھتا ہے کہ جو شکم مادر کے محدود تاریک محیط کی نسبت وسیع تر، کشادہ تر اور مختلف نعمتوں اور عنایتوں سے معمور ہے۔

موت بھی ایک تولد ثانوی ہے انسان موت کے راستے میں دنیاوی زندگی کے محدود و محیط سے ایک انتہائی وسیع تر جہان میں قدم



رکھتا ہے۔

واقعاً اگر جنین جان لے کہ تولد کے بعد کہاں قدم رکھے گا تو شروع ہی سے اپنی پیدائش کے لیے ایک ایک گھڑی گئے وحشت و ہراس کو اپنے قریب بھی نہ پھٹکنے دے عالم جنین کو ہرگز لغو اور بے ہودہ شمار نہ کرے اور اس راہ میں فداکاری و ایثار سے ہرگز دریغ نہ کرے۔ مختصر یہ کہ در پیچہ عالم بقاء کے عنوان سے موت کے بارے میں انسان کی نگاہ اس کی زندگی کو ایک نیا رنگ بخشی ہے۔ اسے ایک دل پذیر مفہوم عطا کرتی ہے اور اسے سرگردانی بد بینی حیرت احساس پوچ اور بے مدنی سے نجات دلاتی ہے کہ جس سے پیدا ہونے والا رنج انتہائی جانکاہ ثابت ہوتا ہے

## ۲۔ موت سے ڈر کیسا؟

گذشتہ بحث سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ معاد پر اعتقاد رکھنے والے انسانوں کے لیے موت سے ڈر یا خوف کوئی معنی نہیں رکھتا لیکن وہ لوگ کہ جن کا اعمال نامہ ہی سیاہ ہو چکا ہو اور وہ لوگ کہ جو سرائے آخرت میں عذاب الہی سے وحشت زدہ ہیں۔ بہر حال تین طرح کے لوگ موت سے خوف زدہ ہیں۔

پہلا گروہ ان لوگوں کا ہے جو موت کو فنا اور نابودی کے مساوی سمجھتے ہیں نابودی وحشت ناک ہے۔ فقر بیماری ضعف اور ناتوانی سب مایہ وحشت ہیں چونکہ نیستی و نابودی ثروت سلامتی قدرت اور طاقت کی نابودی کے معنی میں ہے اور انسان ایک ایسا موجود ہے کہ جو ہستی کا حامل ہے اور ہستی ہستی ہی کے ساتھ مانوس و آشنا ہے۔ جب کہ نیستی کے ساتھ اس کی کوئی مناسبت نہیں پس انسان کو موت سے گریزاں ہی ہونا چاہیے اور اسے موت سے فرار ہی کرنا چاہیے۔

لیکن اگر ہم موت کو ایک برتر ہستی تک پہنچنے کے لیے زینے کے عنوان سے تعبیر کریں اور جہان بعد از مرگ کو نعمت اور وسعت کے اعتبار سے اس جہان کے ساتھ قابل تقابل نہ جانیں دنیا کو زندان اور موت کو اس زندان سے رہائی شمار کریں، موجودہ زندگی کو طائر روح کے لیے قفس سمجھیں اور موت کے در قفس کے کھل جانے اور پرواز روح سے تعبیر کریں تو نہ صرف خوف و ہراس والا مسئلہ ہی نہ رہے گا بلکہ موت خود اپنی جگہ دلپسند اور مرغوب بن جائے گی۔

بقول کسی دانشمند حکیم کے:

بمیر ای حکیم از چین زندگانی  
کز ایں زندگائی بمیر ی بمانی  
سفر ہای علوی کند مرغ جانت  
چو از چیز آرز ، بازش رہانی

اے حکیم! اس زندگی سے تو مر ہی جاؤ چونکہ مر کر ہی باقی رہ سکتے ہو اور پھر تیرا طائر جاں ایسے بلند و بالا سفر کرے گا

کہ جیسے تو نے اس کے شاہیں کو آرزوؤں طمع اور حرص کے چنگل سے رہائی دلوائی ہو۔

ایک شاعر کے بقول

مرغ باغ ملکوتیم نیم از عالم خاک  
دوسہ روزی قفسی ساختہ انداز بد نم  
خرم آن روز کہ پرواز کنم تا بردوست  
بہ ہوائی سر کویش پر و بالی بزنم

میں باغ ملکوت کا طائر ہوں۔ میرا کچھ حصہ عالم خاک سے ہے میرے بدن کو دو تین دن کے لیے میرا قفس بنایا گیا ہے خوشی تو اس دن ہوگی جب میں کوچہ یار کی ہوا میں پرواں مارتا ہوا محبوب کی طرف پرواز کروں گا۔

ایک اور شاعر آغوش پھیلا کر موت کا استقبال کرتا ہے اور اسے اپنی طرف پکارتا ہے  
موت اگر مرداست کو نزدمن آی  
تادر آغوشش بگیرم تنگ تنگ  
من زاو جانی ستانم جاودان  
اوزمن دلہی ستاند رنگ رنگ!

موت اگر مرد ہے تو اسے کہہ دو کہ میرے پاس آئے تاکہ میں بازو پھیلا کر اس سے خوب بغل گیر ہو جاؤں میں اس سے حیات جب جاوداں لے لوں اور وہ مجھ سے خرقہ رنگ رنگ لے لے۔

واضح ہے کہ جب موت کی ایسی تفسیر ہو تو کوئی بھی اس سے نہیں ڈرتا اور خوف کو اپنے اوپر طاری نہیں کرتا ہم یہ نہیں کہتے کہ خودکشی کر لے کیونکہ یہ زندگی تو زیادہ سے زیادہ پس انداز کرنے کسب زاد راہ اور اس جہان کے سفر کی تیاری کے لیے ہے۔

بلکہ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ اس عقیدے کا مالک دنیا سے جدا ہوتے وقت کھلے بازوؤں سے آگے بڑھتا ہے جرات و شجاعت کے ساتھ ایک ایسی چیز کے استقبال کو اٹھتا ہے جو اسے حیات تو بخشتی ہے۔

دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جو حیات بعد از ممات پر ایمان رکھتے ہیں موت کو ہرگز فنا اور نیستی نہیں سمجھتے لیکن فقط اس وجہ سے کہ ان کا اعمال نامہ سیاہ اور تاریک ہے اور انہیں بعد از مرگ روز محشر رطرح طرح سزاؤں کا خوف ہے اسی لیے موت سے گریزاں اور فراری ہیں بالکل ان مجرموں کی طرح کہ جو اپنے سیاہ اعمال نامہ کی وجہ سے ہمیشہ یہی آرزو کرتے ہیں کہ روز عدالت میں تاخیر ہوتی رہے اور وہ اسی طرح زندان میں پڑے رہیں۔

اس گروہ کے افراد بھی حق بجانب ہیں کہ موت سے ڈریں۔ زندان سے رہائی خوب ہے لیکن اس مجرم کے لیے نہیں کہ جسے آزادی

زندگانی سے تھنہ دار تک پہنچا دے۔

تیسرا گروہ یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ دنیاوی زندگی سے وابستگی اور دبستگی انسان کو اذیت پہنچاتی ہے مال و مقام اور دنیا کی چکا چوند سے انسان کی شدید محبت اسے اس موت سے کہ جو یہ سب کچھ چھین لے بیزار کر دیتی ہے۔ لیکن وہ لوگ جو موت کو فنا نہیں سمجھتے اور ان کا اعمال نامہ بھی سیاہ نہیں اور نہ ہی دنیا کی مادی زندگی سے ان کی کوئی وابستگی ہے کوئی دلیل نہیں بنتی کہ وہ موت سے خوفزدہ ہوں۔

### ۳۔ موت روایات اسلامی میں

روایات اسلامی میں بھی موت سے وحشت اور خوف کی وجوہات سے متعلق انتہائی اہم نکات دکھائی دیتے ہیں جو بہت سبق آموز ہیں۔

۱۔ کسی نے حضرت امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام سے پوچھا!

یا بن رسول اللہ! ما بالنا نکرۃ الموت ولا نحبہ؟

ہم کیوں موت کو ناخوش آئندہ سمجھتے ہیں اور اسے پسند نہیں کرتے؟

امام نے جواب دیا:

انکم اخرجتم اکرتکم وعمرتم دنیا کم وانتم تکرہون النقلة من

العمران الى الخراب!

یہ اس وجہ سے ہے کہ تم نے اپنی آخرت کو ویران کر لیا ہے اور اپنی دنیا کو آباد اسی لیے آبادی سے ویرانی کی طرف منتقل ہونا تم پر ناگوار گزرتا ہے۔<sup>[۱]</sup>

۲۔ امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

ایک شخص رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی:

مالی لا احب الموت؟

مجھے کیا ہے کہ میں موت کو پسند نہیں کرتا۔

بنی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

### الک مال؟

کیا تمہارے پاس کوئی ثروت ہے؟

عرض کرنے لگا۔ جی ہاں!

آنحضرت نے فرمایا:

### فقد متہ

آیا کچھ آگے بھی بھیجا ہے؟

عرض کیا: نہ

### فرمایا: فمن ثم لا تحب الموت

یہی وجہ ہے کہ تم موت کو پسند نہیں کرتے۔<sup>[۱]</sup>

۳۔ ایک اور حدیث میں وارد ہوا ہے کہ حضرت امام علی نقی علیہ السلام اپنے ایک دوست کی عیادت کے لیے گئے دیکھا کہ وہ مسلسل رو رہا ہے اور موت کے خوف سے بے چین ہوئے جا رہا ہے امامؑ نے اس سے مخاطب ہوئے اور فرمایا:

### یا عبد اللہ! تخاف من الموت لا نک لا تعرفہ

اے بندہ خدا! تم موت سے ڈرتے ہو کیونکہ حقیقت موت کو نہیں جانتے۔

پھر امام علیہ السلام نے موت کو ایک صاف ستھرے حمام سے تشبیہ دی جہاں ایک آلودہ انسان وارد ہوتا ہے اور اس کے تمام تر غم و انداؤہ اور دکھ دھل جاتے ہیں اور وہ سرور و شادمانی پالیتا ہے۔<sup>[۲]</sup>

۴۔ امام زین العابدین علی بن الحسین علیہ السلام فرماتے ہیں:

لما اشتد الامر بالحسین بن علی بن ابی طالب... کان الحسین و بعض من

معه تشرق لوالہم و تہدا جوار حہم و تسکن لفوسہم فقال بعضہم

لبعض انظروا الایالی بالموت۔

جب ورز عاشور امام حسین علیہ السلام پر بہت زیادہ مشکل آن پڑی تو آپ اور آپ کے کچھ ساتھیوں کے چہرے

[۱] بحار الانوار۔ ج ۶ ص ۱۷۷ حدیث ۹

[۲] معانی الاخبار۔ ص ۲۹۰ حدیث ۹ (باب فی معنی الموت)

لُحْظَہٗ بِلُحْظَہٗ زیادہ دکنے لگے اور آپ کے جسم کے اعضاء زیادہ پرسکون ہونے لگے اور نفوس زیادہ مطمئن ہونے لگے۔ بعض لوگ ایک دوسرے کو کہتے کہ انہیں دیکھو کہ انہیں موت کی کچھ بھی پرواہ نہیں۔<sup>[۱]</sup> یہ احادیث موت سے خوف کی علت بیان کرنے کے لیے کافی واضح ہیں اور ان کی تشریح کی ضرورت نہیں۔

## (۲) برزخ

”برزخ“ اس چیز کے معنی میں ہے جو دو اشیاء کے درمیان حائل ہو۔ آہستہ آہستہ اس معنی نے وسعت حاصل کر لی اور پھر اس ہر امر پر اس کا اطلاق ہونے لگا۔ جو دو مرحلوں یا دو چیزوں کے درمیان حائل ہو [۱]۔

یہاں پر برزخ سے مراد وہ جہان ہے جو دنیا اور عالم آخرت کے درمیان موجود ہے یعنی جب روح بدن سے جدا ہوتی ہے تو قبل ازیں کہ قیامت میں دوبارہ بدن اصلی کے ساتھ حاضر ہو اس عالم میں ٹھہرے گی جو ان دونوں جہانوں کے درمیان واقع ہے اور برزخ سے موسوم ہے۔

عالم برزخ کے اثبات کے لیے ہمارے پاس اہم دلائل، آیات، روایات اور نقلی دلائل ہیں اگرچہ یہ مسئلہ طرق عقلی یا حسی (ارواح کے ساتھ رابطے کے ذریعے) سے بھی ممکن ہے۔

اگرچہ قرآن مجید میں برزخ کے بارے میں زیادہ بحث نہیں اور نسبتاً ایک طائرانہ نگاہ ڈالتے ہوئے قرآن مجید اس مسئلے سے گزر گیا ہے لیکن اس کے باوجود اس ضمن میں متعدد آیات بڑی صریح اور روشن تعبیرات کی حامل ہیں جو ہمارے لیے جہان برزخ سے مربوط کلی اصول واضح کرتی ہیں۔

اس وضاحت کے ساتھ ہم قرآن کی طرف رجوع کرتے ہیں اور نگاہ دل و جان سے درج ذیل آیات کو دیکھتے ہیں:

(۱) حَتَّىٰ إِذَا جَاءَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُونِ ﴿۹۹﴾ لَعَلِّي أَعْمَلُ صَالِحًا فِيمَا تَرَكْتُ كَلَّا ۚ إِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَائِلُهَا ۚ وَمَنْ وَرَّاهُمْ بِهِمْ بَرْزَخٌ إِلَىٰ يَوْمِ يُبْعَثُونَ ﴿۱۰۰﴾ (مؤمنون: ۹۹، ۱۰۰)

(۲) وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ ﴿۹۸﴾ فَرِحِينَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ ۚ وَيَسْتَبْشِرُونَ بِالَّذِينَ لَمْ يَلْحَقُوا بِهِمْ مِنْ خَلْفِهِمْ ۚ أَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿۹۹﴾

(ال عمران ۹۸، ۹۹، ۱۰۰)

[۱] سورہ رحمن آیت ۲۰ میں شیریں اور تلخ سمندروں کے بارے میں ذکر ہوا ہے کہ جو ایک دوسرے کے ہم جوار ہیں ”بینہما برزخ لا یبغیان“ ان دونوں کے درمیان برزخ ہے کہ جو ایک کو دوسرے پر غلبہ کرنے سے باز رکھتی ہے۔

(۳) وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَكِنْ لَا تَشْعُرُونَ ﴿۱۵۴﴾ (بقرہ: ۱۵۴)

(۴) النَّارُ يُعْرَضُونَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَعَشِيًّا ۖ وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ ۖ أَدْخِلُوا آلَ فِرْعَوْنَ أَشَدَّ الْعَذَابِ ﴿۱۵۵﴾ وَإِذْ يَتَحَاوُونَ فِي النَّارِ فَيَقُولُ الضُّعَفَاءُ لِلَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا إِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ أَنْتُمْ مُغْنُونَ عَنَّا نَصِيبًا مِّنَ النَّارِ ﴿۱۵۶﴾ (مؤمن: ۴۶، ۴۷)

(۵) إِنَّمَا خَطِيئَتُهُمْ أُغْرِقُوا فَأَدْخِلُوا نَارًا ۚ فَلَمْ يَجِدُوا لَهُمْ مِّنْ دُونِ اللَّهِ أَنْصَارًا ﴿۲۵﴾ (نوح: ۲۵)

(۶) قِيلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ ۚ قَالَ يَلَيْتَ قَوْمِي يَعْلَمُونَ ﴿۲۶﴾ بِمَا غَفَرَ لِي رَبِّي وَجَعَلَنِي مِّنَ الْمُكْرَمِينَ ﴿۲۷﴾ (يس: ۲۶، ۲۷)

(۷) وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ يُقْسِمُ الْمُجْرِمُونَ ۚ مَا لِبِئْسَا غَيْرِ سَاعَةٍ ۚ كَذَلِكَ كَانُوا يُؤْفَكُونَ ﴿۵۵﴾ (روم: ۵۵)

(۸) قَالُوا رَبَّنَا آمَنَّا ائْتِنَا اثْنَتَيْنِ وَأَحْيَيْتَنَا ائْتِنَا ثَلَاثَتَيْنِ فَأَعْتَرَفْنَا بِذُنُوبِنَا فَهَلْ إِلَىٰ خُرُوجٍ مِّنْ سَبِيلٍ ﴿۱۱﴾ (مؤمن: ۱۱)

ترجمہ

(۱) یہاں تک کہ ان میں سے کسی ایک کی موت آپہنچتی ہے تو کہنے لگتا ہے: اے میرے پروردگار! مجھے واپس بھیج دے شاید وہ کچھ جو میں نے ترک کیا ہے (اور کوتاہی کی ہے۔ ازالہ کروں) عمل صالح انجام دوں اسے جواب دیا جائے گا) ایسا نہیں ہے یہ فقط اس کے کہنے کی باتیں ہیں (اگر اسے واپس بھیج بھی دیا جائے تو یہ اپنی پہلی سی ڈگر پر قائم رہے گا) اور انکے پیچھے برزخ ہے اس دن تک کہ جب یہ دوبارہ اٹھائے جائیں گے (۲) (اے رسول خدا کی راہ میں قتل ہونے والوں کو ہرگز مردہ نہ جانو بلکہ وہ زندہ ہیں اور اپنے پروردگار کے

حضور سے روزی حاصل کرتے ہیں وہ ان فروان نعمتوں کے باعث خوش ہیں کہ جو خدا نے انہیں اپنے فضل سے عطا کی ہیں اور ان لوگوں (مجاہدیں) کے لیے بھی خوشی سے پھولے نہیں سماتے جو ان کے بعد (ابھی) ان سے ملحق نہیں ہوئے (کیونکہ یہ اس دنیا میں ان مقامات عالیہ کو دیکھتے اور جانتے ہیں) کہ ان پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ ہی انہیں کوئی غم ہوگا۔

(۳) جو خدا کی راہ میں قتل ہوتے ہیں انہیں مردہ مت کہو بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تم شعور نہیں رکھتے۔

(۴) ان کا عذاب آگ ہے کہ جس کے سامنے وہ صبح و شام لا کھڑے کیے جاتے ہیں اور جس دن قیامت برپا ہوگی حکم ہوگا کہ آل فرعون کو سخت ترین عذاب میں جھونک دو یا د کرو اس وقت کو جب آتش جہنم میں یہ باہم جھگڑیں گے ضعیفاء مستکبرین سے کہیں گے ہم تمہارے پیروکار رہے ہیں کیا (آج) ہماری بجائے تم کچھ آگ قبول کرتے ہو؟

۵۔ (جی ہاں بالآخر) سب کے سب اپنے گناہوں کی بدولت غرق ہو گئے اور آتش دوزخ میں جا پڑے اور خدا کے سوا کسی کو اپنا یا اور مددگار نہ پایا۔

(۶) (آخر کار اسے شہید کر دیا گیا اور) اس سے کہا گیا کہ جنت میں داخل ہو جاؤ تو اس نے کہا: اے کاش میری قوم جانتی۔ کہ میرے پروردگار نے مجھے بخش دیا اور مجھے ان میں سے قرار دیا کہ جن کی تکریم کی گئی۔

(۷) جب قیامت برپا ہوگی تو گناہگار قسم کھائیں گے کہ گھڑی بھر سے زیادہ (عالم برزخ میں) نہ ٹھہرے۔ اس طرح وہ ادراک حقیقت سے محروم رہے۔

(۸) وہ کہیں گے: اے ہمارے پروردگار! تو نے ہمیں دوبارہ مارا اور دوبارہ زندہ کیا۔ اب ہم اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہیں۔ کیا (دوزخ سے) خارج ہونے کی کوئی سبیل ہے؟!

## تفسیر

### برزخ اور اس کی خصوصیات

پہلی آیت میں آغاز بحث کافروں، ظالموں اور مجرموں کی کیفیت سے ہوا ہے ارشاد ہوتا ہے:

حقى اذا جاء احدہم الموت قال رب ارجعون لعلہ اعمل صالحا فاما

ترکت



وہ یونہی اپنی غلط ڈگر پر چلتے رہتے ہیں یہاں تک کہ ان میں سے کسی ایک کی موت آپہنچتی ہے تو کہنے لگتا ہے  
: پرودگار! مجھے واپس بھیج دے جو کچھ میں کوتاہی کر چکا ہوں اس کے بجائے شانہ عمل صالح انجام دوں (اور اپنی  
گذشتہ سیاہ کاریوں کی تلافی کروں)  
لیکن جلد ہی اسے مدلل منفی جواب کا سامنا کرنا پڑتا ہے اسے خطاب ہوتا ہے:

### کلا انہا کلمۃ ہو قائلہا

ایسا نہیں ہے یہ وہ بات ہے جو وہ زبان سے کہتا ہے (اگر وہ واپس لوٹ جائے تو پھر وہی پہلے سے کاموں کی تکرار  
کرے گا)۔  
مزید ارشاد ہوتا ہے:

### ومن وراۃہم برزخ الی یوم یبعثون

انہیں اس دن تک برزخ درپیش ہے کہ جب یہ پھر اٹھائے جائیں گے۔  
آیت کے شروع میں پہلے مرحلے یعنی مرگ کی طرف اور آخر آیت میں دوسرے مرحلے یعنی برزخ کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔  
اگرچہ بعض کا اصرار ہے کہ برزخ کو یہاں پر انسان اور بہشت کے درجات عالی کے درمیان حائل کے طور پر تفسیر کیا جائے۔ لیکن  
”الی یوم یبعثون“ (تاروز قیامت) کے جملے سے بخوبی آشکار ہو جاتا ہے کہ برزخ قبل از قیامت اور بعد از موت کا مرحلہ ہے۔  
بعض نے اس دنیا میں واپس لوٹنے میں رکاوٹ کے معنی میں بھی برزخ کا بیان کیا ہے اور یہ معنی بھی آیت کے آخری جملے کے ساتھ ہم  
آہنگ نہیں کہ جس میں کہا گیا ہے برزخ روز قیامت تک جاری رہے گا۔  
بنا برائیں متذکرہ بالا آیت بڑی وضاحت کے ساتھ دنیا و آخرت کے درمیان ایک ایسے عالم کی نشاندہی کرتی ہے۔  
”وارء“ کی تعبیر ”آگے“ کے لیے اور کبھی پیچھے کے معنی میں استعمال ہوتی ہے۔ چونکہ یہ کلمہ ”وری“ کے مادے سے بروزن ”سعی“  
ہے جس کا معنی ہے ”چھپانا“ مثلاً اگر کوئی دیوار کے ایک طرف کھڑا ہو تو دیوار کی دوسری طرف اس کے لیے پوشیدہ ہوگی جسے وارء کہا جائے گا بناء  
بریں انسان دیوار کے کسی بھی طرف کھڑا ہو اس کے دوسری جانب ”وارء“ ہے۔ [۱]  
حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

### اتحوف علیکم فی البرزخ

”میں تمہارے لیے برزخ سے ڈرتا ہوں“

[۱] مفردات راغب مادہ ”وری“

راوی نے سوال کیا:

**ما البرزخ**

(برزخ کیا ہے؟)

فرمایا:

**القبر منذ حين موته الى يوم القيامة**

برزخ قبر ہی ہے، انسان کے مرنے سے لے کر روز قیامت تک۔<sup>[۱]</sup>

حضرت امام علی بن الحسین علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

**ان القبر روضة من رياض الجنة**

**او حفرة من حفر النيران**

قبر بہشت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے

یا دوزخ کے گڑھوں میں سے ایک گڑھ ہے۔<sup>[۲]</sup>

دوسری آیت میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مخاطب ہوتے ہوئے صریحاً ارشاد ہوتا ہے:

**ولا تحسبن الذين قتلوا في سبيل الله امواتا بل احياء عند ربهم**

**يرزقون**

خدا کی راہ میں قتل ہونے والوں کو ہرگز مردہ نہ سمجھو بلکہ وہ زندہ ہیں اور اپنے پروردگار کے حضور سے روزی حاصل

کرتے ہیں۔

تیسری آیت میں تمام مومنین سے بالصراحت خطاب کیا گیا ہے:

**ولا تقولوا لمن يقتل في سبيل الله اموات بل احياء ولكن لا تشعرون**

راہ خدا میں قتل ہونے والوں کو مردہ مت کہو بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تم اس کا شعور نہیں رکھتے۔

یہ دونوں آیتیں عالم برزخ کے وجود پر روشن دلائل میں سے ہیں (اگرچہ بات فقط شہداء کے بارے میں کی گئی ہے) کیونکہ دونوں

[۱] تفسیر برہان - ج ۳ ص ۱۲۰ حدیث ۱۲۰

[۲] تفسیر برہان - ج ۳ ص ۱۲۰ حدیث ۱۲۰

آیتوں میں شہیدوں کے زندہ ہونے بلکہ اس سے بڑھ کر اس کے حضور سے روزی حاصل کرنے اور قرب خدا سے متعلق گفتگو کی گئی ہے۔ وہ کلمات کہ جو ان آیات میں اور اس کے بعد والی آیات میں بھی ذکر ہوئے ہیں اور سب کے سب شہدا کی زندگی (زندگی اپنے تمام حقیقی معنی میں) سے متعلق حکایت کرتے ہیں، تعجب یہ ہے کہ ان کلمات کو بعض مفسرین نے بغیر کسی توجہ کے توجیہات کر کے مجازی معنی میں بیان کیا ہے مثلاً شہدا کے نام اور ان کے آثار کا زندہ رہنا، ہدایت، اطاعت اور ان کے دین کا زندہ ہونا یا روز قیامت قبروں سے زندہ ہونا۔

کیا وہ غور نہیں کرتے کہ قرآن کہتا ہے کہ شہدا اپنے پروردگار کے پاس ہیں انہیں روزی دی جاتی ہے؟ خدا کے فضل و کرم سے حاصل ہونے والی نعمتوں پر خوش ہیں۔

انہیں آئندہ کا خوف اور گزشتہ کا غم نہیں۔

یہ تعبیرات مفاہیم مجازی کے ساتھ کس طرح ہم آہنگ ہو سکتی ہیں؟

علاوہ ازیں خدا فرماتا ہے کہ: تم ان کی زندگی کا ادراک نہیں رکھتے اگر نام و نشان ہدایت اور دین کا زندہ ہونا مقصود ہوتا تو سب کے لیے قابل فہم تھا۔

ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مفسرین حیات برزخ کو صحیح طرح ہضم نہیں کر پائے۔

چوں ندید ند حقیقت

رہ افسانہ زدند

چونکہ حقیقت سمجھ نہیں آ سکی اس لیے آئیں بائیں شائیں کرنے لگے ہیں۔

فخر رازی بھی اپنی تفسیر میں یوں رقمطراز ہے کہ اکثر معتقد ہیں کہ یہاں پر زندگی سے مراد حیا حقیقی ہے۔<sup>[۱]</sup>

مجمع البیان میں طبری مرحوم نے اگرچہ اس آیت کی چار تفسیریں بیان کی ہیں لیکن پہلی تفسیر کو جو حیات حقیقی کے معنی میں ہے آیت کی صحیح تفسیر کے طور پر انتخاب کیا ہے۔<sup>[۲]</sup>

البتہ اس بارے میں روایات بھی فراوان ہیں کہ جنگی طرف انشاء اللہ بعد میں اشارہ کیا جائے گا۔

ایک اور عجیب بات ہے کہ بعض مفسرین اس آیت کو شہدائے بدر کے لیے مخصوص سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ سارے شہدا اس آیت کے ضمن میں نہیں آتے اس بات کو تفسیر المیزان نے نقل کیا ہے اس بات کی طرف توجہ رہنا چاہیے کہ پہلی آیت کی شان نزول کے بارے میں

[۱] تفسیر فخر رازی۔ جلد ۴ ص ۱۴۵

[۲] مجمع البیان۔ جلد ۲ ص ۲۳۶

مفسرین نے بڑی صراحت سے شہدائے احد کا ذکر کیا ہے اور دوسری آیت سے متعلق شہدائے بدر کا)۔<sup>[۱]</sup>

بہر حال شان نزول سے آیت کا مفہوم محدود نہیں ہو جاتا اور آیت تمام شہدا کو اپنے اس وسیع مفہوم کے دامن میں لیے ہوئے ہے۔

بہر حال اگرچہ آیت راہ خدا میں شہید ہونے والوں کے بارے میں گویا ہے لیکن غیر از شہدا کی نفی نہیں کی گئی یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر حیات برزخ سب انسانوں کے لیے ہے تو پھر شہداء کو دوسروں پر کیا فضیلت ہے؟

اس سوال کا جواب واضح ہے کہ ان کی فضیلت ایک خاص قسم کی زندگی کی بنا پر ہے یعنی ان کی زندگی بارگاہ خداوندی میں اس کے جوار رحمت میں، اس کے قرب میں اور الہی دسترخوان پر غریق نعمت ہونے کی وجہ سے فضیلت کی حامل ہے اور یقیناً دوسروں کی زندگی ان نعمتوں اور برکتوں سے معمول نہیں۔

چوتھی آیت عالم برزخ میں آل فرعون کے عذاب میں مبتلا ہونے سے متعلق حکایت کرتی ہے اور یہ درحقیقت آیات شہدا کے مقابل مفہوم رکھتی ہے۔

ارشاد ہوتا ہے:

**وَحَاقَ بِالْأَلْفِ فِرْعَوْنَ سُوءُ الْعَذَابِ<sup>(۴۵)</sup>**

”آخر کار آل فرعون پر سخت عذاب نازل ہوا“ (مومن ۴۵)

پھر اس عذاب الہی کی اس طرح وضاحت کی گئی ہے:

**”النار يعرضون عليها غدوا وعشيا ويوم تقوم الساعة ادخلوا ال**

**فرعون اشد العذاب**

”ان کا عذاب وہ آگ ہے جس کے سامنے وہ صبح اور شام لاکھڑے کئے جاتے ہیں اور جب قیامت برپا ہوگی

تو خدا حکم دے گا: آل فرعون کو سخت ترین عذاب میں جھونک دو۔“

واضح ہے کہ یہ آگ کہ جس کے بارے میں آیت کے (شروع میں) اشارہ ہوا ہے کہ آل فرعون کو صبح و شام اس کے سامنے لاکھڑا کیا جاتا ہے۔ دوزخ برزخ ہے کیونکہ آخر آیت میں ان کی نظر قیامت کی سزا کا علیحدہ سے ذکر ہوا ہے لہذا اکثر مفسرین نے اس آیت کو عذاب قبر اور عالم برزخ کے بارے میں بیان کیا ہے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ آل فرعون کے عذاب کے بارے میں تو فرمایا گیا ہے کہ ”آل فرعون صبح اور شام آگ کے سامنے لا

[۱] بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ سورہ آل عمران کی آیت شہدائے بدر کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ درحالیکہ سورہ بقرہ کی آیت کی شان نزول شہدائے بدر اور احد دونوں کے بارے میں ہے۔

کھڑے کئے جاتے ہیں۔“ لیکن ان کے عذاب آخرت کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے ”حکم دیا جائے گا کہ انہیں سخت ترین عذاب میں جھونک دیا جائے۔“

ان دو عبارتوں (لاکھڑا کیا جانا اور جھونک دیا جانا) کے فرق سے پتہ چلتا ہے کہ آگ سے مراد آتش دوزخ ہی ہے البتہ عالم برزخ میں دور سے اس کا مشاہدہ کریں گے اور اذیت پائیں گے جب کہ روز قیامت نزدیک سے اور اس میں داخل ہو کر اس کا مزہ چکھیں گے یہ سزا عالم برزخ میں فقط صبح اور شام کے وقت ہے اور روز قیامت مسلسل اور دائمی ہے۔

اسی بارے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک حدیث نقل ہوئی ہے جو اس مطلب کی تائید کرتی ہے آپؐ فرماتے ہیں:

**ان احدکم اذا مات عرض عليه مقعده بالغداة والعشي، ان كان من**

**اهل الجنة، فمن الجنة وان كان من اهل النار فمن النار، يقال هذا**

**مقعدك حين يبعثك الله يوم القيمة۔**

جب تم میں سے کوئی ایک مر جاتا ہے تو اس کو ہر صبح اور شام اس کا مقام دکھایا جاتا ہے اگر اہل جنت میں سے ہو تو جنت میں اور اگر اہل نار میں ہو تو نار میں۔ اور اس سے کہا جاتا ہے کہ یہ تمہاری جگہ ہے جب روز قیامت خدا تمہیں دوبارہ زندہ اٹھائے گا۔<sup>[۱]</sup>

ان روایات سے پتہ چلتا ہے کہ یہ مسئلہ آل فرعون کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ عمومیت رکھتا ہے۔

کیا اہل برزخ جنت یا دوزخ کو فقط دیکھنے ہی سے خوش ہوں گے یا سزا میں مبتلا ہوں گے؟ یا جنت و دوزخ ان کے ظاہری وجود پر بھی کوئی اثر مرتب کرے گی جیسا کہ جب کوئی دہکتی ہوئی آگ کے قریب سے گزرے تو آگ کی تیش اس کے چہرے کو جھلسا دیتی ہے یا پھر سرسبز و شاداب باغ کے نزدیک سے گزرے تو جان افزاء باد نسیم اور اس کی خوشبو اسے مسحور کر دیتی ہے یا پھر دونوں طریقوں سے سزاء و جزاء پائے گا۔ تیسرا احتمال سب سے زیادہ مناسب دکھائی دیتا ہے۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ آیت ظاہراً تو یوں ہے کہ آل فرعون کو آگ کے سامنے پیش کیا جاتا ہے لیکن بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہ عبارت اس کے برعکس معنی کے لیے کنایہ ہے یعنی آگ ان کے سامنے پیش کی جائے گی۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے عرضت النافۃ علی الحوض (میں نے اونٹ کو تالاب کے سامنے پیش کیا)۔ یعنی اسے پانی پیش کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عبارت بھی اسی معنی کی تائید کرتی ہے چونکہ ارشاد ہوتا ہے: بہشت و دوزخ میں ان کی جگہ انہیں دکھائی جاتی ہے۔

چھٹی آیت ”مومن آل یس“ کے بارے میں (وہ مرد با ایمان کہ جس کی داستان سورہ یس میں بیان ہوئی ہے جو شہر انطاکیہ میں آنے

[۱] ”مجمع البیان“ میں اس حدیث کو گذشتہ آیت کی تفسیر میں صحیح بخاری اور مسلم سے نقل کیا گیا ہے۔ (جلد ۷ اور ۸ ص ۵۲۶)

والے حضرت مسیح علیہ السلام کے رسولوں کی مدد کے لیے اٹھ کھڑا ہوا اور لوگوں کو نصیحت کی کہ ان رسولوں کی پیروی کریں لیکن اس ہٹ دھرم اور گناہگار قوم نے نہ صرف اس پاک باز مومن کی باتوں پر کان دھرے بلکہ اس پر ٹوٹ پڑی اور شہید کر دیا۔  
ارشاد ہوتا ہے:

**قِيلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ قَالَ يَلِيْتُ قَوْمِي يَعْلَمُونَ بِمَا غَفَرَ لِي رَبِّي وَجَعَلَنِي مِنَ**

**الْمَكْرُمِينَ**

اس سے کہا گیا کہ جنت میں داخل ہو جائے تو اس نے کہا: اے کاش میری قوم جانتی کہ میرے پروردگار نے مجھے بخش دیا اور مجھے ان میں سے قرار دیا ہے کہ جن کی تکریم کی گئی۔

واضح ہے کہ جنت قیامت والی جنت نہیں ہے بلکہ بہشت برزخ ہے چونکہ مومن آل یس یہاں آرزو کرتا ہے کہ دنیا میں اس کی قوم اس کے انجام سے آگاہی حاصل کرے اور جان لے کہ کس طرح خدا نے اسے مشمول غفران قرار دیا ہے اور اسے مکرمین میں سے شمار کیا ہے۔  
مجمع البیان میں جناب طبری مرحوم فرماتے ہیں یہ آیت قبر (برزخ) کی نعمتوں پر دلالت کرتی ہے چونکہ مومن آل یس نے یہ بات اس وقت کی جب اس کی قوم زندہ تھی۔ لہذا جب قبر میں نعمت کا تصور ہو سکتا ہے تو عذاب قبر بھی ممکن ہے۔<sup>[۱]</sup>  
کئی ایک تفاسیر میں ذکر ہوا ہے کہ یا با ایمان شخص ”حبیب نجار“ تھا۔ بعض روایات میں اسے مومن آل یس کے نام<sup>[۲]</sup> سے شاید اس وجہ سے پکارا گیا ہے کہ وہ ایک انتہائی با ایمان شخص تھا کہ جس بنا پر سورہ یس میں اس کا ذکر ہوا ہے بعض نے کہا کہ لفظ آل یہاں پر اضافی ہے اور یہ ”مومن یس“ کے معنی میں ہے۔<sup>[۳]</sup>  
ساتویں آیت قیامت میں مجرموں کی حالت کے بارے میں اشارہ کرتی ہے۔  
ارشاد ہوتا ہے:

**وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ يُقْسِمُ الْمُجْرِمُونَ مَا لَبِثُوا غَيْرَ سَاعَةٍ**

جب قیامت برپا ہوگی تو گناہگار قسم کھائیں گے کہ وہ گھڑی بھر سے زیادہ نہیں ٹھہرے۔  
مزید ارشاد ہوتا ہے:

**كَذَلِكَ كَانُوا يُؤْفَكُونَ**

[۱] مجمع البیان۔ جلد ۷ اور ۸ ص ۲۲۱

[۲] تفسیر درمنثور۔ بنا بر نقل المیزان ج ۱ ص ۷۶

[۳] تفسیر ”ابوالفتوح رازی“ ج ۹ ص ۲۷۰ (فٹ نوٹ علامہ شعرانی مرحوم)۔

اس طرح وہ ادراک حقیقت سے محروم رہ جاتے تھے۔

اگرچہ آیت میں ان کے ٹھہرنے کی جگہ مشخص نہیں ہوئی لیکن بعد والی آیت سے پتہ چلتا ہے کہ انکے ٹھہرنے سے مراد عالم برزخ ہی ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

**وقال الذین اوتوا العلم والایمان لقد لبثتم فی کتاب اللہ الی یوم**

**البعث فهذا یوم البعث ولکنکم کنتم لاتعلمون**

وہ لوگ کہ جنہیں علم و ایمان عطا کیا گیا ہے مجرموں سے کہیں گے تم نے روز قیامت تک حکم الہی پر عمل سے توقف کیا اور اب روز قیامت ہے لیکن تم نہ جانتے تھے۔

اس آیت سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا ٹھہرنا قیامت تک ہوگا اور یہ فقط برزخ ہی کے بارے میں صحیح ہو سکتا ہے۔ بزرگ مفسرین میں سے بھی بعض نے اسی تفسیر کا انتخاب کیا ہے کہ آیت حیات برزخ کی طرف اشارہ کرتی ہے جب کہ بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد دنیا میں توقف پذیر ہونا ہے جسے مجرمین انتہائی کم شمار کرتے ہیں جلد ختم ہو جانے والی گھڑی کی مانند اور سورہ نازعات کی آیت ۴۶ کو دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

ارشاد ہوتا ہے:

**کانہم یوم یرونہا لم یلبثوا الا عشیۃ اوضحها**

اس دن جب قیامت کا مشاہدہ کریں گے تو سمجھیں گے کہ دنیا میں ایک شام یا ایک صبح سے زیادہ نہ ٹھہرے۔

لیکن اس آیت میں دنیا میں ٹھہرنے سے متعلق کوئی واضح اشارہ نہیں ملتا جبکہ اس کے برعکس عالم برزخ میں توقف پذیر ہونے سے متعلق پھر بھی احتمال موجود ہے۔

علاوہ ازیں زیر بحث آیت میں ذکر ہوا ہے کہ اس توقف کا اختتام روز قیامت ہے اس نکتے کو مد نظر رکھتے ہوئے برزخ کے علاوہ آیت کی کوئی اور تفسیر نہیں ہو سکتی۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کس طرح وہ عالم برزخ کے اتنے لمبے عرصے کو اس قدر سمجھیں گے اور اسے شمار میں ہی نہ لائیں گے؟ اس ایک نکتے کی طرف توجہ کرنے سے اس سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہ جب انسان کو کوئی اچھی خوشخبری دی جاتی ہے تو اس کو پانے کے لیے اس کی آتش شوق بھڑک اٹھتی ہے اور پھر ایک ایک لمحہ بڑی دیر سے گزرتا ہے بلکہ لمحے صدیوں میں بدلتے دکھائی دیتے ہیں اس کے برعکس اگر کسی کو دردناک عذاب کی خبر دی جائے تو وہ چاہتا ہے کہ چرخ زمان ٹھہر جائے گھڑیاں رک جائیں اور پھر دن اور مہینے اسے پل بھر میں گزرتے دکھائی دیتے ہیں اور روز قیامت مجرموں کی حالت بھی ایسی ہی ہوگی یہ درست ہے کہ عالم برزخ میں بھی وہ عذاب الہی سے چھٹکا رانہ پائیں گے لیکن کہاں عذاب برزخ اور کہاں عذاب قیامت؟

اس بات کا بھی احتمال ہے کہ عالم برزخ عذاب قبر شروع ہونے کے بعد بعض کے لیے خواب کا حکم رکھتا ہو لہذا قدرتی بات ہے کہ وہ روز قیامت یعنی بیداری کے دن نہ جان سکیں گے کہ انہوں نے کس قدر توقف کیا؟  
چونکہ عالم برزخ میں تمام حقائق انسان پر منکشف اور آشکار نہیں ہوتے لہذا یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ اس قوم کے امور انسان پر مخفی رہیں البتہ روز قیامت کہ جو یوم البروز ہے اس میں حقائق بخوبی آشکار ہو جائیں گے۔  
زیر بحث آٹھویں آیت میں کفار کی زبانی نقل ہوا ہے:

**قالوا ربنا امتنا اثنتین واحییتنا اثنتین فاعترفنا بذنوبنا فهل الی**

**خروج من سبیل**

کفار بارگاہ خداوندی میں عرض کریں گے: پروردگار! تو نے ہمیں دوبارہ مارا اور دوبارہ زندہ کیا اب ہم اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہیں کیا (دوزخ) سے نکلنے کی کوئی سبیل ہے؟

جہاں برزخ پر اس آیت کی دلالت اس بنا پر ہے کہ دوبارہ زندہ ہونے اور دوبارہ مرنے کا تصور عالم برزخ کے قبول کیے بغیر ممکن نہیں یعنی اس دنیاوی زندگی کی موت اور پھر حیات برزخ بعد ازاں حیات برزخ کی موت اور پھر عالم آخرت کی زندگی۔  
چونکہ اس دنیا کے اختتام پر اور صور پھونکے جانے کے وقت نہ فقط انسان بلکہ تمام فرشتے اور مردوں کی ارواح کہ جو عالم برزخ میں ایک خاص قالب میں ڈھلی ہوئی ہیں سب کی سب مرجائیں گی اس آیت کے مصداق کے طور پر فصعق من فی السموت ومن فی الارض (زمر ۶۸) اور پھر اس دن ماسوائے اللہ تعالیٰ کی ذات پاک کے کوئی بھی باقی نہ بچے گا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حیات برزخ کے بعد بھی موت کا وجود ہے۔

لیکن دنیاوی زندگی کا مسئلہ اس سے جدا ہے چونکہ آیت مبارکہ میں موت کے بعد کی دوزندیوں کے بارے میں بات کی گئی ہے جبکہ دنیاوی زندگی موت کے بعد نہیں ہے۔

بعض کا خیال ہے کہ پہلی موت سے مراد انسان کا وہ وجود ہے کہ جب وہ خاک تھا اور ابھی اس دنیا میں نہ آیا تھا لہذا پہلی زندگی بھی یہی دنیاوی زندگی ہوگی جبکہ دوسری موت اس عالم کے اختتام پر اور دوسری زندگی روز قیامت واقع ہوگی جیسا کہ سورہ بقرہ کی آیت ۲۸ میں بھی بیان ہوا ہے: کیف تکفرون باللہ وکنتم امواتا فاحیاء کم ثم یمیتکم ثم یمحییکم ثم الیہ ترجعون (کیسے خدا کا انکار کرتے ہو حالانکہ تم مردہ تھے اس نے تمہیں زندہ کیا وہی مار ڈالے گا اور پھر دوبارہ زندہ کرے گا اور پھر اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے)۔

”واضح ہے کہ ”پہلی موت“ کا لفظ تو ٹھیک ہے لیکن ”مار ڈالنا“ صحیح نہیں ہے یا دوسرے الفاظ میں یہ کہ جب انسان خاک تھا مردہ تھا نہ یہ کہ خدا نے اسے مار ڈالا تھا کیونکہ مار ڈالنے کا مفہوم زندگی کے بعد ہی صادق آتا ہے بنا برائیں زیر بحث آیت کو عالم برزخ کے معنی میں تفسیر کئے بغیر چارہ ہی نہیں مگر یہ کہ مار ڈالنے کا کوئی مجازی معنی تصور کیا جائے اور وہ بھی قرینے کے بغیر جائز نہیں۔



بعض نے اس آیت سے قبر کی زندگی کے بارے میں استدلال کیا ہے یعنی وہ زندگی کہ جو کچھ ہی دیر بعد پھر موت میں بدل جاتی ہے (اور درحقیقت یہ بھی حیات برزخ کی ایک عارضی قسم ہے)۔

قبر میں زندگی کیسی ہوگی؟ کیا یہ زندگی جسمانی ہے یا برزخی اور ایک خاص قالب میں ڈھلی ہوئی؟ یا پھر نیم جسمانی؟ اس بارے میں علمائے کی آراء مختلف ہیں۔ ہم انشاء اللہ بعد میں اس کے بارے میں اشارہ کریں گے۔

## نتیجہ بحث

گذشتہ سات آیات کی بحث سے عالم برزخ (کہ جو اس دنیا اور عالم آخرت کے درمیان ایک فاصلہ ہے) کے بارے میں قرآن مجید کی نظر بخوبی واضح ہو جاتی ہے فرض کریں اگر بعض آیات قابل بحث بھی ہوں تو دوسری آیات (ابتدائی آیات کی مانند) کی صراحت سے شک کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

علاوہ ازیں قرآن مجید کی متعدد آیات میں موت کو تو فی، (قبض ارواح) سے تعبیر کیا گیا ہے یہ خود عالم برزخ کے وجود پر ایک واضح اور روشن دلیل ہے۔

اگرچہ آیات قرآن میں عالم برزخ کی جزئیات سے متعلق کوئی زیادہ وضاحت نہیں ملتی فقط اس عالم کے وجود نیک لوگوں کے لیے کچھ جزا اور بدکاروں کی سزا کا ذکر ملتا ہے البتہ روایات اور احادیث میں اس سے متعلق بہت زیادہ تفصیل موجود ہے جن میں سے بعض کی طرف ہم اشارہ کریں گے۔

## چند وضاحتیں

### ۱۔ برزخ، روایات کے آئینے میں

عالم برزخ اور اس کی خصوصیات کے بارے میں احادیث میں بہت وسیع پیمانے پر گفتگو کی گئی ہے یہ احادیث و روایات اس قدر زیادہ ہیں کہ خواجہ طوسی مرحوم نے تجرید العقائد میں انکے تواتر کا دعویٰ کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

### وعذاب القبر واقع بالامکان وتواتر السبع بوقوعه

عذاب قبر حقیقت رکھتا ہے کیونکہ عقلاً ممکن ہے اور روایات متواتر سے بھی اس کے وقوع کی خبر ملتی ہے۔

اب ہم اسلامی روایات کے چند واضح نمونے قارئین کے لیے پیش کرتے ہیں۔

۱۔ حدیث مبارکہ ہے:

### القبر اما روضة من رياض الجنة او حفرة من حفر النيران

قبر بہشت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے یا

دوزخ کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے۔

اس حدیث کو ترمذی نے اپنی صحیح میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کیا ہے جب کہ علامہ مجلسی مرحوم نے بحار الابوار میں ایک جگہ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام سے اور دوسری جگہ حضرت امام علی بن الحسین علیہ السلام سے نقل کیا ہے۔<sup>[۱]</sup>

۲۔ جنگ بدر میں قتل ہونے والے مشرکین مکہ کے اجساد کو جب کنوئیں میں پھینکا گیا تو پیغمبر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کنوئیں کے کنارے کھڑے ہو کر یہ معروف کلمات ارشاد فرمائے:

يا اهل القليب هل وجدتم ما وعد ربكم حقا؟ فاني وجدت ما وعدني

ربي حقا۔ قالوا: يا رسول الله! هل يسمعون؟ قال ما انتم باسمع لما اقول

منهم ولكن اليوم لا يجيبون۔

اے اہل چاہ! تمہارے پروردگار نے جو تم سے وعدہ کیا تھا کیا تم نے اسے حق پایا؟ میں نے تو اپنے پروردگار کے وعدہ کو فتح سے متعلق حق پایا ہے۔

بعض نے عرض کیا: اے رسول اللہ! کیا وہ سنتے ہیں فرمایا جو کچھ میں کہتا ہوں تم انکی نسبت زیادہ سننے والے نہیں ہو لیکن وہ آج جواب نہیں دیتے۔<sup>[۲]</sup>

یہی مطلب متعدد روایات میں مختلف عبادات کے ساتھ ذکر ہوا ہے جن میں سے ایک حدیث یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بعض مشرکین کو ان کے ناموں سے مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

يا ابا جهل! يا عتبة! يا شيبه! يا امية! هل وجدتم ما وعد ربكم حقا؟

فاني قد وجدت ما وعدني ربي حقا، فقال عمر: يا رسول الله اما تكلم من

اجساد لا ارواح فيها؟ فقال والذي نفسي بيده ما انتم باسمع لما اقول

منهم غير انهم لا يستطعون جواباً۔

[۱] صحیح ترمذی۔ ج ۴ کتاب صفۃ القیامۃ باب ۲۶ حدیث ۲۶۶۰، بحار الانوار۔ ج ۶ ص ۲۱۸ و ص ۲۱۴

[۲] کنز العمال۔ ج ۱۰ ص ۳۷۷ حدیث ۲۹۸۷۶

اے ابو جہل! اے عتبہ! اے شیبہ! اے امیہ! خدا نے جو تم سے وعدہ کیا تھا تم نے اسے حق پایا؟ مجھ سے تو خدا نے جو وعدہ کیا تھا میں نے اسے حق پایا۔ حضرت عمرؓ: اے رسول اللہ! کیا آپ ایسے اجساد سے باتیں کر رہے ہیں کہ جن میں روح ہی نہیں؟ فرمایا! قسم اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے تم میری باتوں کو ان کی نسبت زیادہ سننے والے نہیں ہو۔ فقط وہ جواب نہیں دے سکتے۔<sup>[۱]</sup>

یہ احادیث نہ صرف عالم برزخ کے وجود اور جسمانی موت کے بعد انسان کے لیے ایک خاص قسم کی زندگی پر دلالت کرتی ہیں بلکہ اس بات پر بھی دلیل ہیں کہ ان کا اس دنیا کے ساتھ ایک خاص ارتباط بھی ہے اور کم از کم بعض باتوں کو سنتے ہیں۔  
۳: جنگ صفین سے پلٹتے ہوئے کوفے کے دروازے کے عقب میں واقع ایک قبرستان کے کنارے کھڑے ہو کر حضرت علی علیہ السلام نے مردوں کی ارواح کو ان الفاظ سے مخاطب کیا:

انتم لنا فرط سابق، ونحن لكم تبع لاحق، اما الدور فقد سكنت، و  
اما الازواج فقد نكحت واما الاموال فقد قسمت هذا خبر ما عندنا  
فما خبر ما عندكم؟

تم نے پیش قدمی کی اور ہم بھی تمہارے ساتھ ملحق ہو جائیں گے۔ تمہارے گھروں میں دوسرے بس گئے ہیں۔  
تمہاری بیویاں دوسروں کی زوجیت میں چلی گئی ہیں اور تمہارا مال و اسباب تقسیم ہو چکا ہے۔ یہ تو ہمارے یہاں کی  
خبریں ہیں تمہارے ہاں کیا خبر ہے؟  
پھر اصحاب کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا:

اما لو اذن لهم في الكلام لا خبروكم ان خيرا زاد التقوى۔

اگر انہیں بات کرنے کی اجازت دی جائے تو تمہیں خبر دیں کہ بہترین زادِ اور توشہ سفر آخرت تقویٰ ہے۔<sup>[۲]</sup>  
یہ حدیث بھی اس بات پر شاہد ہے کہ نہ صرف عالم برزخ مردوں کی ارواح کے لئے حقیقت کا حامل ہے بلکہ ان کا اس دنیا کے ساتھ  
ایک خاص قسم کا ارتباط بھی ہے۔

۴: نبی البلاغہ کے متعدد خطبوں میں عالم برزخ کے بارے میں صراحت سے گفتگو کی گئی ہے۔  
امام علی علیہ السلام نے بعض گذشتگان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

[۱] کنز العمال - ج ۱۰ ص ۳۷۶ حدیث ۲۹۸۷۴

[۲] نبی البلاغہ - کلمات قصار (چھوٹے حکیمانہ جملے) کلمہ ۱۳۰

**اولئکم سلف غایتکم..... سلکوا فی بطون البرزخ سبیلا**

وہ آپ سے پہلے موت کے منہ میں جا پڑے..... اور عالم برزخ میں وارد ہو گئے۔<sup>[۱]</sup>  
 ”اہل ذکر“ کی تعریف کرتے ہوئے امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

**فکانما قطعوا الدنیا الی الاخرۃ وہم فیہا، فشاہدوا ما وراء ذلک، فکانما**

**اطلعوا عیوب اہل البرزخ فی طول الاقامۃ فیہ۔**

اگرچہ وہ اس دنیا میں ہیں لیکن گویا انہوں نے دنیا و آخرت کے درمیانی فاصلے کو طے کر لیا ہے اور آخرت کے ساتھ پیوستہ ہو گئے ہیں۔ وہ ماورائے دنیا کا مشاہدہ کرتے ہیں گویا جہان برزخ کو دیکھتے ہیں اور اس میں دورانِ اقامت اس کے اسرار سے باخبر ہو گئے ہیں۔<sup>[۲]</sup>

۵: امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

**واللہ ما اخاف علیکم الا البرزخ**

خدا کی قسم میں تمہارے لئے فقط برزخ سے ڈرتا ہوں۔

(یہ اس مطلب کی طرف اشارہ ہے کہ روز قیامت تو مومنین رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آئمہ معصومین علیہم السلام کی شفاعت سے بہرہ ور ہوں گے لیکن برزخ کا حساب جدا ہے)۔<sup>[۳]</sup>

۶: ایک اور جگہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے:

**البرزخ القبر وهو الثواب والعقاب بین الدنیا والاخرۃ**

برزخ عالم قبر ہی ہے اور دنیا و آخرت کے درمیان موجود سزا و جزا ہے۔<sup>[۴]</sup>

۷: تفسیر در المنثور میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حدیث منقول ہے کہ فرمایا: جب مومن کی روح قبض ہوتی ہے تو بندگانِ خدا جو اہل رحمت ہیں اس کے استقبال کے لئے آتے ہیں اور کہتے ہیں: نو وارد کا خیال رکھیں، استراحت کرے، چونکہ سخت درد و تکلیف میں مبتلا رہا ہے۔ بعد ازاں بعض دوستوں اور رفقاء کے بارے میں سوال کرتے ہیں اور جب انہیں پتہ چلتا ہے کہ بعض اس نو وارد سے پہلے دنیا سے جا چکے

[۱] منج البلاغۃ - خطبہ ۲۲۱

[۲] منج البلاغۃ - خطبہ ۲۲۲

[۳] تفسیر نور الثقلین - ج ۳ ص ۵۵۳ حدیث ۱۲۰

[۴] تفسیر نور الثقلین - ج ۳ ص ۵۵۳ حدیث ۱۲۲

ہیں تو کہتے ہیں: انا لله وانا اليه راجعون۔ اسے دوزخ میں لے گئے ہیں۔ (اسی لئے اس کا یہاں کوئی نام و نشان نہیں ہے۔<sup>[۱]</sup>)  
 ۸: متعدد روایات سے پتہ چلتا ہے کہ لواحقین کے نیک اعمال مومنین کی ارواح کے لئے مسرت و انبساط کا باعث بنتے ہیں۔ امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

ان الميت ليفرح بالترحم عليه والاستغفار له كما يفرح الحي بالهدية  
 ميت کے لئے طلب رحمت اور استغفار کرنے سے وہ خوش ہوتی ہے جیسے زندہ لوگ تحفے سے خوش ہوتے ہیں۔<sup>[۲]</sup>

یہی مطلب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول حدیث میں بھی ذکر ہوا ہے۔  
 آپ فرماتے ہیں:

ان هدايا الاحياء للاموات الدعاء والاستغفار  
 زندوں کے مردوں کے لئے تحفے، دعا اور استغفار ہے۔<sup>[۳]</sup>  
 ۹: حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ:

من أنكر ثلاثة اشياء فليس من شيعتنا: المعراج والمسألة في  
 القبر والشفاعة

جو ان تین چیزوں کا انکار کرے ہمارے شیعوں میں سے نہیں: معراج، قبر میں سوال، شفاعت۔<sup>[۴]</sup>  
 واضح ہے کہ قبر میں سوالات عالم برزخ ہی کا ایک حصہ ہے۔  
 ۱۰: کنز العمال میں رسول خدا سے نقل ہونے والی اس حدیث پر ہم احادیث کے سلسلے کو ختم کرتے ہیں۔ (اگرچہ اس ضمن میں احادیث بہت زیادہ اور متواتر ہیں)۔

آنحضرتؐ نے شہدائے احد کی جانب اشارہ کیا اور فرمایا:

ايها الناس زوروهم واتوهم وسلموا عليهم فالذي نفسي بيده لا

[۱] تفسیر در المنثور طبق نقل تفسیر المیزان - ج ۲۰ ص ۴۹۴ (خلاصہ)

[۲] محجة البيضاء - ج ۸ ص ۲۹۲

[۳] محجة البيضاء - ج ۸ ص ۲۹۱

[۴] بحار - ج ۶ ص ۲۲۳

### یسلم علیہم مسلم الی یوم القیمة الارادوا علیہ السلام

اے لوگو! ان کی زیارت کرو اور ان کے پاس جاؤ اور ان پر سلام بھیجو۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں

میری جان ہے روزِ قیامت بھی کوئی مسلمان اگر ان پر سلام بھیجے گا تو وہ اس کا جواب دیں گے۔<sup>[۱]</sup>

اسی سلسلے میں اور بھی کئی ایک احادیث اسی کتاب میں نقل ہوئی ہیں۔

ضمناً اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ جو لوگ اہل قبور کی زیارت کا انکار کرتے ہیں اور انہیں لکڑی اور پتھر کی طرح بے جان سمجھتے ہیں کس قدر احادیث سے بے خبر اور تعلیماتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دور ہیں۔

اصولاً وہ تمام روایات جو عذابِ قبر، اس کی سختی اور سوالات کی نشاندہی کرتی ہیں اور وہ روایات جو موت کے بعد انسان کے نیک و بد اعمال کے نتیجے کی خبر دیتی ہیں نیز وہ روایات جو ارواح کے اپنے خاندانوں کے ساتھ رابطے اور ان کے حالات کے مشاہدے سے متعلق بحث کرتی ہیں اور وہ روایات بھی کہ جو شبِ معراج کے واقعات اور رسول اکرمؐ کی دوسرے انبیاء اور پیغمبروں سے ملاقات کا ذکر کرتی ہیں، سب عالم برزخ کے وجود پر دلالت کرتی ہیں اور ایک ایسے عالم کا تصور کئے بغیر یہ تمام متذکرہ روایات بے معنی ہو جائیں گی۔

### ۲۔ برزخ، عقل و احساس کے میزان میں

دنیا و آخرت کے درمیان موجود ایک عالم پر دلالت کرنے والی گذشتہ آیات و روایات کے علاوہ یہ مسئلہ عقلی و حسی طریقوں سے بھی قابل اثبات ہے۔ چونکہ وجودِ روح اور بدن کی قید و بند کے بغیر روح کے باقی رہنے سے متعلق تمام دلائل عالم برزخ کے وجود کی گواہی دیتے ہیں کیونکہ ان دلائل کے مطابق جسمانی بدن کی موت سے انسانی روح فنا نہیں ہوتی۔ چونکہ یہ جسم کے عوارض میں سے نہیں ہے کہ جو جسم کے فنا ہونے سے ختم ہو جائے بلکہ ایک جوہر مستقل ہے جو جسم کے بغیر بھی باقی رہتا ہے۔ اس بات کو قبول کرنا عالم برزخ کو قبول کرنے کے مساوی ہے چونکہ بحث دراصل عالم برزخ کے وجود کے بارے میں ہے نہ کہ اس کے روحانی ہونے کے بارے میں۔

علاوہ ازیں عالم ارواح سے ارتباط ایک ایسا فن ہے جو آج کل علماء کے درمیان مسلمات میں سے ہے، اس سے بخوبی پتہ چلتا ہے کہ ارواح بدن سے جدائی کے بعد ایک مخصوص عالم میں خود سے باقی اور موجود ہیں اور ان کے ادراکات کا دائرہ انتہائی وسیع ہے اور بعض اوقات اپنی معلومات اس دنیا کے لوگوں سے رابطے کے ذریعے ان تک منتقل کرتی ہے۔

بہت سے افراد ایسے ہیں جنہوں نے ارواح سے پیغامات حاصل کئے ہیں اور ایسے افراد بھی بہت ہیں جو کہتے ہیں کہ انہوں نے روح کو ایک ”مثالی قالب“ میں اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ اس بات کا دعویٰ کرنے والے سب کے سب سچے ہیں، کیونکہ جھوٹے، مکار، دغا باز اور منافع خور لوگوں نے اس مسئلے سے بہت سوائے استفادہ کیا ہے۔ لیکن یہ باعث نہیں بنتا کہ اصل موضوع ہی کو نظر انداز کر دیا جائے

کہ جو علمی اور سائنسی پہلوؤں کا حامل ہے یا اس موضوع کا سرے سے انکار کر دیا جائے۔ چونکہ کئی ایک با اعتماد افراد نے اس بارے میں اپنے تجربات بیان کئے ہیں اور بہت سارے علمی اداروں اور بڑے بڑے صاحبانِ علم نے اس بارے میں اس قدر کتابیں لکھیں ہیں کہ اب اس مسئلے کی حقیقت کے انکار کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ اگر ہم اس کے کسی ایک پہلو کی بھی تشریح کریں تو بات بہت طول پکڑ جائے گی۔<sup>[۱]</sup> لہذا عالم برزخ کو ان طریقوں سے بھی ثابت کیا جاسکتا ہے۔

### ۳۔ عالم برزخ، علماء کی نظر میں

علمائے اسلام کے درمیان عالم برزخ کی جزئیات سے متعلق پائی جانے والی بحث سے صرف نظر ایک ایسے عالم کے وجود کی حقیقت پر سب اتفاق نظر رکھتے ہیں ماسوائے ان چند افراد کے کہ جو قابلِ اعتناء نہیں ہیں۔

اس اتفاق نظر کی وجہ قرآنی آیات اور روایات کی فراوانی ہے، ایسی آیات جو موت کے بعد انسان کے حالات اور جزاء و سزا کے بارے میں مفصل گفتگو کرتی ہیں اور ان کے اس جہان کے ساتھ ارتباط اور اسی طرح کے دیگر امور کے بارے میں بھی بیان کرتی ہیں۔ (اس مطلب کی تشریح پہلے ہو چکی ہے)۔

لہذا عالم برزخ کے وجود کی حقیقت زیر بحث نہیں ہے بلکہ یہ جاننا اہم ہے کہ برزخی زندگی کیسی ہے؟ اس سے متعلق علماء نے مختلف تصور پیش کئے ہیں جن میں سے وہ اہم ترین تصور جو احادیث سے مطابقت رکھتے ہیں درج ذیل ہیں:

انسانی روح دنیاوی زندگی کے اختتام پر ایک ایسے لطیف جسم کی صورت اختیار کر لیتی ہے جو مادی جسم کے بہت سے عوارض سے مبرا ہے۔ لیکن چونکہ اس مادی جسم کے مشابہ ہے اس لئے اسے ”مثالی بدن“ یا ”مثالی قالب“ کہتے ہیں کہ جو نہ تو کامل مجرد ہے اور نہ ہی خالص مادی بلکہ یہ بدن ایک قسم کا ”تجرّد برزخی“ ہے۔ (توجہ فرمائیے گا)۔

البتہ جس طرح اس عالم مادہ کے زندان میں ہم اسیروں کے لئے عالم آخرت کی زندگی کی حقیقت کا ادراک غیر ممکن ہے بالکل اسی طرح عالم برزخ کی بطور کامل آگاہی بھی ناممکن ہے کیونکہ اس کا مرتبہ اس دنیا سے بالاتر ہے، دوسرے الفاظ میں یہ کہ یہ عالم عالم دنیا پر محیط ہے۔ بعض علماء کے بقول اسے حالت خواب سے تشبیہ دی جاسکتی ہے۔ حالت خواب میں انسانی روح اس مخصوص قالب سے استفادہ کرتے ہوئے مختلف نقاط کی طرف پرواز کرتی ہے، مختلف مناظر کا مشاہدہ کرتی ہے، تازہ بہ تازہ نعمتوں سے بہرہ ور ہوتی ہے، ان سے محظوظ اور لطف اندوز ہوتی ہے اور کبھی ہولناک مناظر دیکھ کر خوف زدہ ہو جاتی ہے اور چیختی ہوئی نیند سے بیدار ہو جاتی ہے۔ قرآن حکیم میں ہے:

اللَّهُ يَتَوَفَّى الْأَنفُسَ حِينَ مَوْتِهَا وَالَّتِي لَمْ تَمُتْ فِي مَنَامِهَا ۖ (زمر ۴۲)

[۱] مزید توضیح کے لئے ہماری کتاب بنام ”عود ارواح و ارتباط با ارواح“ کی طرف رجوع فرمائیں۔

[۲] ترجمہ: اللہ ہی جانوں کو موت کے وقت قبض کرتا ہے اور جن کی موت نہیں آئی وہی انہیں نیند میں قبض کرتا ہے۔

یہ آیت بھی اس حقیقت کی تاکید کرتی ہے۔

علامہ مجلسی مرحوم نے بحار الانوار میں واضح کیا ہے کہ عالم برزخ کی حالت نیند یا خواب سے تشبیہ بہت سی روایات میں بیان ہوئی ہے۔

اس کے بعد علامہ فرماتے ہیں: ممکن ہے قوی و عالی نفوس متعدد مثالی اجساد میں ہوں۔ بنا بریں وہ روایات جو کہتی ہیں کہ وقت احتضار اور جان کنی کے وقت آئینہ ہر کسی کے سر ہانے آتے ہیں ان کی کسی توجیہ اور تفسیر کی ضرورت نہ ہوگی۔<sup>[۱]</sup> (وقت نظر فرمائیں) بعض وضاحت کرتے ہیں کہ مثالی قالب ہر انسان کے باطنی بدن میں موجود ہے۔ البتہ موت کے وقت اس بدن سے جدا ہو جاتا ہے اور اپنی برزخی زندگی شروع کر دیتا ہے۔

مقتناطیسی خوابوں میں روح مختلف نقاط کی طرف پرواز کرتی ہے۔ اپنی فعالیت انجام دیتی ہے۔ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ بعض قوی روحوں حالت بیداری میں بھی دور ترین مناطق کی طرف جانگفتگی ہیں اور اپنے اس روحانی سفروں کے ذریعے وہاں کے اسرار سے مطلع کرتی ہیں۔ یہ سرگرمیاں بھی قالب مثالی کے ذریعے انجام پاتی ہیں۔

مختصر یہ کہ بدن مثالی جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، اسی جسم کے مشابہ ہے لیکن اس عنصری کثیف مادے کا حامل نہیں ہے بلکہ ایک ایسا جسم ہے جو لطیف، نورانی اور اس ساری دنیا کے متعارف عناصر اور مواد سے خالی۔

یہاں بعض افراد کو اشتباہ ہوا ہے اور شاید اسی اشتباہ کی وجہ سے انہوں نے بدن مثالی کا انکار کیا ہے اور وہ یہ کہ ایک ایسے جسم کے وجود کا اعتقاد مسئلہ ”تناسخ“ کے اعتقاد کا باعث بنتا ہے چونکہ تناسخ بھی ایک روح کا متعدد اجسام میں منتقل ہونا ہی ہے۔

لیکن اگر قالب مثالی کو اس عنصری بدن کے باطن میں تصور کیا جائے تو کسی دوسرے بدن میں اس کے منتقل ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بنا بریں مسئلہ تناسخ بھی باقی نہیں رہتا۔

علاوہ ازیں شیخ بہائی کے بقول: تناسخ کہ جس کے بطلان پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے یہ ہے کہ روحوں بدن کے خراب اور خاک ہونے کے بعد اسی دنیا میں کسی دوسرے بدن اور جسم میں منتقل ہو جائیں لیکن عالم برزخ میں اجساد مثالی کے ساتھ ارواح کے تعلق اور روز قیامت اپنے پہلے جسموں میں ان کے انتقال کا مسئلہ تناسخ کے ساتھ کوئی ربط نہیں۔<sup>[۲]</sup> کلینی مرحوم نے فروف کا کافی ایسی روایات نگلی کی ہیں جو صدق سے جسم مثالی کی خبر دیتی ہیں

امام جعفر صادق علیہ السلام سے نقل ہونے والی معتبر روایات میں ہے کہ آپ کے اصحاب میں سے کسی ایک نے آپ سے کہا کہ بعض لوگ معتقد ہیں کہ مومنین کی ارواح اطراف عرش میں سبز رنگ کے پرندوں کے قفس میں ہوں گی۔

[۱] بحار الانوار ج ۶ ص ۷۱

[۲] اس بات کو علامہ مجلسی نے بحار الانوار ج ۶ ص ۷۱ پر شیخ بہائی مرحوم سے نقل کیا ہے۔



امامؑ نے فرمایا:

لا، المؤمن اكرم على الله من ان يجعل روحه في حوصلة طير، ولكن في

ابدان كابدانهم

نہیں، ایسا نہیں، مومن خدا کے نزدیک گرامی تر ہے اس سے کہ اس کی روح پرندے کے قفس میں رکھی جائے

بلکہ ارواح پہلے بدن سے مشابہ بدنوں میں ہوں گی۔<sup>[۱]</sup>

امام جعفر صادق علیہ السلام ہی سے نقل ہونے والی ایک اور حدیث کچھ یوں گویا ہے:

فاذا قبضه الله عز وجل صبر تلك الروح في قالب كقالبه في الدنيا۔

خدا جب مومن کی روح قبض کرتا ہے تو اسے ایک ایسے قالب میں منتقل کرتا ہے جو دنیاوی قالب کے مشابہ ہے۔

[۲]

اس ضمن میں ایک اور جگہ امام ششم علیہ السلام فرماتے ہیں:

في حجرات في الجنة يأكلون من طعامها ويشربون من شرابها، ويقولون

ربنا اقم الساعة لنا وانجز لنا ما وعدتنا۔

ارواح مومنین کے بارے میں ہونے والے سوال کے جواب میں فرمایا: وہ جنت کے کمروں میں مقیم اور وہاں

کی شراب اور کھانوں سے بہرہ ور ہیں اور کہتے ہیں: پروردگار! ہمارے لئے قیامت برپا کر دے اور ہمارے

ساتھ کئے ہوئے وعدوں کو وفا فرما۔<sup>[۳]</sup>

واضح ہے کہ یہاں پر بہشت سے مراد برزخی بہشت ہے کہ جو قیامت والی بہشت سے کہیں کم تر ہے۔ اسی لئے ارواح مومنین قیامت

کی آرزو مند ہیں۔

ضمناً برزخ میں ان کے مکانی ہونے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ قالب مثالی کی حامل ہیں چونکہ دنیاوی جسم کو تو ترک کر چکی ہیں۔

[۱] فروع کافی۔ ج ۳ ص ۲۴۴ (ارواح مومنین کے بارے میں آخری باب) حدیث ۱

[۲] فروع کافی۔ ج ۳ ص ۲۴۴ حدیث ۶

[۳] فروع کافی۔ ج ۳ ص ۲۴۴ حدیث ۴

## ۴۔ عالم برزخ کی خصوصیات

قرآن مجید نے ان خصوصیات کے بارے میں زیادہ وضاحت نہیں کی۔ فقط یہ کہتا ہے: ایک برزخ ہے۔ کچھ لوگ وہاں رحمت الہی میں غوطہ ور ہیں اور کچھ عذاب میں مبتلا ہیں۔ لیکن اس کی جزئیات کیا ہیں یہ مشخص نہیں ہوا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ قرآن کی روش کلی اصول بیان کرنا ہے۔ جزئیات کو وہ سنت پر چھوڑ دیتا ہے۔

لہذا اس ضمن میں سنت سے درج ذیل استفادہ ہوتا ہے:

## الف: سوال قبر

روایات کثرت سے اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ جب انسان کو قبر میں ڈال دیا جائے گا تو خدا کے بھیجے ہوئے دو فرشتے اس کے پاس آئیں گے اور اس کے اصول و عقائد، توحید، نبوت، ولایت اور بعض روایات کے مطابق مختلف طریقوں سے زندگی گزارنے کی کیفیت، مال و دولت کمانے اور اس کے خرچ کرنے کے طریقوں کے بارے میں سوالات کریں گے۔ چنانچہ اگر پکے سچے مومنین میں سے ہوا تو بخوبی ان کے جوابات سے عہد برآ ہوگا اور حق تعالیٰ کی رحمتیں اور عنایتیں اس کے شامل حال ہوں گی اور اگر ایسا نہ ہوا تو ان سوالات کے جواب سے قاصر رہے گا اور برزخ کے دردناک عذاب میں مبتلا ہو جائے گا۔

بعض روایات میں ان دو فرشتوں کو ناکر و نکیر<sup>[۱]</sup> اور بعض میں منکر و نکیر<sup>[۲]</sup> سے موسوم کیا گیا ہے۔

امام علی بن الحسین علیہ السلام فرماتے ہیں: رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر روز جمعہ مسجد میں لوگوں کو وعظ فرماتے اور اس انداز سے نصیحت کرتے کہ لوگوں نے اس کے خلاصہ مطلب کو حفظ کر کے لکھ لیا۔ آپ فرمایا کرتے:

ایہا الناس اتقوا الله واعلموا انکم الیہ ترجعون.....

لوگو! تقویٰ اختیار کرو اور جان لو کہ تمہیں اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

اور پھر دو فرشتوں منکر و نکیر کے قبر میں آنے اور سوالات سے متعلق آپ کے لرزادینے والے مبارک کلمات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

الا وان اول ما یسئلانک، عن ربک الذی کنت تعبدہ، وعن نبیک

الذی ارسل الیک، وعن دینک الذی کنت تدین بہ، وعن کتابک الذی

[۱] اصول کافی۔ ج ۲ ص ۶۳۳ حدیث ۲۶ (باب النوادر)

[۲] بحار الانوار۔ ج ۶ ص ۲۲۲، ص ۲۲۳ حدیث ۲۲، ۲۴

كنت تتلوہ، وعن امامك الذی كنت تتولاہ، ثم عن عمرک فیما افنیته  
ومالك من این اكتسبته وفیما اتلفتہ فخذ حذرک، وانذر لنفسك واعد  
للجواب قبل الامتحان والبسئلت والاحتبار فان تك مومناً تقياً  
عار فابدينك متبعاً للصادقين موالياً لاولیاء الله لقاءك الله حجتك،  
وانطق لسانك بالصواب، فأحسنت الجواب فبشرت بالجنة والرضوان  
من الله والخیرات الحسان، واستقبلتك الملائكة بالروح والريحان، وان  
لم تكن كذلك تلجلج لسانك ودحضت حجتك وعمیت عن الجواب،  
وبشرت بالنار واستقبلتك ملائكة العذاب.....

جان لو! وہ پہلی چیز جس کے بارے میں وہ دو فرشتے سوال کریں گے تمہارا پروردگار جس کی تم عبادت کرتے  
رہے، تمہارا نبی جو تمہاری طرف بھیجا گیا، تمہارا دین جس پر تم کاربند تھے، وہ کتاب جس کی تم تلاوت کرتے  
تھے، وہ امام جس کی ولایت کو تم نے قبول کیا۔ بعد ازاں تمہاری عمر کے بارے میں سوال کریں گے کہ کہاں فنا  
کی؟ تمہارے مال کے بارے میں کہ کہاں سے لائے اور کہاں خرچ کیا؟ دامن احتیاط تھا موار اپنے بارے  
میں سوچو! امتحان، آزمائش اور سوال سے پہلے جواب تیار رکھو۔ اگر باایمان، متقی، دین سے آگاہ، سچوں کے  
پیروکار، اولیاء اللہ کے موالی رہے تو اللہ ضروری جوابات تمہیں الہام کر دے گا اور تمہاری زبان کو حق گو بنادے گا  
اور تم جواب دے لو گے۔ اس وقت خدا کی جانب سے تمہیں جنت و رضوان اور خیر کثیر کی بشارت دی جائے گی  
اور ملائکہ روح و ریحان کے ساتھ تمہارا استقبال کریں گے۔ اگر تم ایسے نہ ہوئے تو تمہاری زبانی لکنت کا شکار ہو  
جائے گی، تمہاری دلیل باطل ہو جائے گی، جواب دینے سے قاصر رہو گے، اندھے ہو جاؤ گے، تمہیں آگ کی نوید  
سنائی جائے گی اور عذاب کے فرشتے تمہارا استقبال کریں گے.....<sup>[۱]</sup>

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا سوالات قالب مثالی اور برزخی روح سے ہوں گے یا اسی عضری و مادی جسم سے؟ روح وقتی طور پر  
واپس آجاتی ہے۔ (البتہ بطور کامل نہیں فقط اتنی حد تک کہ سوالات کے جوابات دینے پر قادر ہو) اور پھر روح سے سوال ہوتا ہے۔ بعض روایات

[۱] بحار الانوار۔ ج ۶ ص ۲۲۳ حدیث ۲۴۔ اس بارے میں بڑی تعداد میں روایات موجود ہیں۔ مزید اطلاع کے لئے بحار الانوار ج ۶۔  
تفسیر رہبان ج ۲ ص ۳۱۲۔ (آیہ ۲ سورۃ ابراہیم کے ذیل میں) مجتہ البیضاء ج ۸ ص ۳۰۹ کی طرف رجوع فرمائیں۔

سے پتہ چلتا ہے کہ روح اسی مادی و عنصری جسم کے ساتھ اتنا تعلق اور ارتباط پیدا کر لیتی ہے کہ سوالات سمجھ سکے اور ان کے جوابات دے سکے۔<sup>[۱]</sup> درحالیکہ علامہ مجلسی مرحوم نے اس بارے میں وارد ہونے والی احادیث سے متعلق اپنی تحقیق میں فرمایا ہے:

### فالمراد بالبر فی اکثر الاخبار ما یكون الروح فیہ فی عالم البرزخ

اکثر روایات میں قبر سے مراد وہ چیز ہے جس میں روح دورانِ عالم برزخ میں پائی جاتی ہے۔<sup>[۲]</sup>

یہ نکتہ بھی قابل ذکر ہے کہ روایات میں موجود قرائن نشانہ ہی کرتے ہیں کہ قبر کے سوال و جواب کوئی معمولی نہیں ہیں کہ انسان جس قدر مائل ہوتا جواب دے بلکہ یہ ایسے سوال ہیں کہ جن کے جواب کا سرچشمہ انسان کے اندر اور ہر کسی کے عقیدے کے باطن سے پھوٹتا ہے اور اموات کے لئے تلقین پڑھنا ان کے لئے اس چشمے کے پھوٹنے میں مدد و معاون ثابت ہوتا ہے اور ایسا نہیں ہے کہ یہ کوئی اپنا آزادانہ اثر رکھتی ہو۔ گویا ایسا جواب ہے جو حقیقت باطن اور عمق تکوین سے ملتا ہے۔

### ب۔ فشارِ قبر

یہ مسئلہ بھی احادیث میں بکثرت موجود ہے حتیٰ کہ روایات میں فشارِ قبر سب کے لئے بلا استثناء بیان ہوا ہے۔ البتہ بعض کے لئے شدید ہے اور ان کے کفر اعمال کے حساب میں آتا ہے جب کہ بعض کے لئے کم تر ہے اور ان کے کفارہ گناہ اور کوتاہیوں کی تلافی کے زمرے میں ہے۔

مشہور صحابی سعد بن معاذ کو دفن کرتے ہوئے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

### انه ليس من مومن الا وله ضمة

کوئی مومن ایسا نہیں جسے فشارِ قبر نہ ہو۔<sup>[۳]</sup>

امام جعفر صادق علیہ السلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ حدیث نقل فرماتے ہیں:

### ضغطة القبر للمومن كفارة لما كان منه من تضييع النعم

مومن کے لئے فشارِ قبر اس کا نعمتوں کو ضائع کرنے کا کفارہ ہے۔<sup>[۴]</sup>

لیکن دیگر احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ بعض مومنین کو اصلاً فشارِ قبر نہ ہوگا۔ سعد بن معاذ کا فشارِ قبر ان کی اپنے گھرانے کے ساتھ کج

[۱] تفسیر برہان ج ۲ ص ۳۱۴ حدیث ۹ (سورہ ابراہیم کی آیت ۲۷ کے ذیل میں)

[۲] بحار الانوار ج ۶ ص ۲۵۱

[۳] بحار الانوار ج ۶ ص ۲۲۱ حدیث ۱۹

[۴] بحار الانوار ج ۶ ص ۲۲۱ حدیث ۱۶

خالقی کی بناء پر تھا (انہ کان فی خلقہ مع اہلہ سوء)۔<sup>[۱]</sup>

لہذا روایات میں ہے کہ جن لوگوں نے اچھے اعمال انجام دیئے ہوں گے (جیسے چند بار حج کرنا یا بعض قرآنی سورتوں اور اذکار کا ورد کرنا) فشاں قبر سے امان میں رہیں گے۔<sup>[۲]</sup>

بہر حال عالم برزخ میں جزاء و سزا کا پہلا مرحلہ فشاں قبر معلوم ہوتا ہے۔ آیا فشاں اس مادی و عنصری جسم پر وارد ہو گا اور پھر وہاں سے روح کی طرف منتقل ہو جائے گا (اس جسم اور روح کے درمیان پائے جانے والے رابطے کی وجہ سے) یا فقط اسی بدن مثالی پر وارد ہو گا؟ یہاں پھر وہی پہلے والے دو نظریے موجود ہیں۔ چونکہ ان جزئیات میں وارد ہونے سے کوئی اہم مشکل حل نہیں ہوتی۔ لہذا ہم اس بحث کو مختصر کرتے ہوئے صرف یہ کہیں گے کہ بہت ساری روایات کے مطابق فشاں قبر کا ہونا مسلم ہے<sup>[۳]</sup> حتیٰ کہ ایک روایت میں ہے کہ امامؑ سے پوچھا گیا کہ اگر کوئی چند دن تک پھانسی کے پھندے پر لٹکا رہے تو اسے فشاں قبر کیسے ہوگا؟ امام علیہ السلام نے فرمایا: ”وہ ہوا جو اسے احاطہ کئے ہوئے ہے اس ہوا کو حکم دیا جائے گا کہ ہر طرف سے اس پر فشاں ڈالے۔“<sup>[۴]</sup>

## ج: کن امور کے بارے میں سوال ہوگا؟

سوالات قبر کے بارے میں وارد ہونے والی متعدد روایات سے پتہ چلتا ہے کہ قبر میں دو گروہوں سے سوال ہوگا: ایک گروہ خالص با ایمان لوگوں کا ہے اور دوسرا خالص اہل کفار کا ہے لیکن کمزور افراد کہ جو ان دو گروہوں کے درمیان واقع ہوئے ہیں ان کے سوالات کو روز قیامت پر موقوف کر دیا جاتا ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

**لا یسأل فی القبر الا من محض الایمان محضا و محض الکفر محضا و**

**الآخرین یلہون عنہم**

قبر میں سوال نہیں ہوگا لیکن فقط ان سے کہ جو ایمان خالص یا کفر خالص کے حامل ہیں اور باقی تمام افراد اس سے

[۱] بحار الانوار ج ۶ ص ۲۲۰ حدیث ۱۴

[۲] مزید توضیح کے لئے سفینۃ البحار ج ۲ ص ۳۹۷۔ مادۃ قبر

[۳] وہ روایات کہ جو کہتی ہیں کہ ”القبر ما روضۃ من ریاض الجنۃ و حضرۃ من حضر النیران“ پہلے بھی اس طرف اشارہ کیا جا چکا ہے یہ روایت اس بات پر دلیل بن سکتی ہے کہ فشاں قبر قابل مثالی اور روح پر ہے کیونکہ مسلمان مادی و جسمانی قبر تو جنت کے باغوں اور آگ کے گڑھوں میں تبدیل نہیں ہو سکتی۔

[۴] امام جعفر صادق علیہ السلام نے اس سوال کے جواب میں کہ جو پھانسی پر لٹکا یا گیا ہے اسے عذاب قبر کیسے ہوگا، فرمایا: ان رب الارض ہو رب الهواء فیوحی اللہ عز و جل الی الهواء فیضغطہ ضغطۃ اشد من ضغطۃ القبر بحار الانوار ج ۶ ص ۲۶۶ حدیث ۱۱۲

مبراہوں گے۔<sup>[۱]</sup>

یہی مطلب حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے نقل ہونے والی ایک حدیث میں بھی بیان ہوا ہے۔ آپ کے اصحاب میں سے کسی ایک نے پوچھا: من المسئولون فی قبورہم؟ قبر میں کن لوگوں سے سوال ہوگا؟ امام نے اس کے جواب میں فرمایا:

## من محض الایمان و من محض الکفر

وہ لوگ کہ جو خالص ایمان اور خالص کفر کے حامل ہیں۔

راوی نے پوچھا: باقی لوگوں کا کیا بنے گا؟ آپ نے فرمایا: وہ مبراہیں۔

راوی نے پھر سوال کیا: کس بارے میں سوال ہوگا؟ امام نے فرمایا:

## عن الحجة القائمة بین اظهر کم

اس حجت کے بارے میں جو آپ کے درمیان قائم ہے۔<sup>[۲]</sup>

بعض خیال کرتے ہیں کہ اعمال کے بارے میں سوال نہ ہوگا اور فقط عقائد کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ لہذا من محض الکفر و من محض الایمان کے جملے کو ”صلہ و موصول“ کے بجائے ”جار و مجرور“ کی صورت میں پڑھتے ہیں جس سے اس کا مفہوم یہ بنتا ہے کہ فقط ایمان خالص اور کفر خالص کے بارے میں پرسش ہوگی۔

لیکن متذکرہ بالا روایت کو مد نظر رکھا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ اعمال کے بجائے اشخاص کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دوسری تفسیر صحیح نہیں ہے۔ علاوہ ازیں امام علی بن الحسین علیہما السلام سے نقل ہونے والی گذشتہ روایت میں ہم دیکھتے ہیں کہ انسان کی زندگی کے لمحات اور اس کے کمائے ہوئے مال کے بارے میں بھی وہاں پوچھا جائے گا۔

## د: دنیا سے روح کا رابطہ

متعدد روایات نشان دہی کرتی ہیں کہ عالم برزخ میں منتقل ہونے کے بعد اس دنیا سے روح کا رابطہ کلی طور پر منقطع نہیں ہوتا بلکہ روح کبھی کبھار اس جہان سے بھی رابطہ برقرار رکھتی ہے۔

کافی کی جلد سوم میں ایک باب ان المیت یزور اہلہ (مردے اہل خانہ سے ملاقات کے لئے آتے ہیں) کے عنوان سے بیان ہوا ہے۔ اس میں پانچ روایات بیان کی گئی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ باایمان افراد بلکہ بے ایمان افراد بھی گاہ گاہ اپنے اہل خانہ سے ملاقات کے لئے آتے ہیں۔ مومنین اپنے خاندان کی فقط خوبیاں اور خوشیاں دیکھتے ہیں اور فرط مسرت سے واپس لوٹتے ہیں جب کہ کفار اپنے خاندان کی

[۱] بحار الانوار ج ۶ ص ۲۶۰، کافی ج ۳ ص ۲۳۵ (باب المسألة فی القبر۔ حدیث ۱)

[۲] کافی۔ ج ۳ ص ۲۳۷ حدیث ۸

برائیوں اور ناراحتیوں کا مشاہدہ کر کے غمگین ہو جاتے ہیں۔

امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

**ان المومن لیزور اہلہ فیری مایجب ویستر عنہ مایکرہ وان الکافر**

**لیزور اہلہ فیری مایکرہ ویستر عنہ مایجب** [۱]

سائنسی اور تجربی طریقوں سے ارواح کے ساتھ ارتباط پیدا کرنے والے اہل علم بھی بڑی صراحت سے بیان کرتے ہیں کہ انسانوں کی روہیں مرنے کے بعد کئی طور پر اس عالم سے لا تعلق نہیں ہو جاتیں بلکہ دنیا کے حالات سے کم و بیش آگاہ رہتی ہیں اور ان کے ساتھ رابطہ بھی ممکن ہے۔ (اگرچہ اس بارے میں بیانات اور مشاہدات فراواں ہیں لیکن ان کا ذکر ہمیں اپنے مقصد سے دور کر دے گا)۔

**ر: دوسروں کے نیک اعمال سے ارواح کا بہرہ مند ہونا**

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ جو مختلف منابع اسلامی سے نقل ہونے والی روایات سے پتہ چلتا ہے کہ مرحومین کے لئے انجام دیئے جانے والے اچھے اعمال تحائف کی صورت میں ان تک پہنچتے ہیں۔ یہ بات ایک طرف تو عالم برزخ کے وجود پر دلالت کرتی ہے اور دوسری طرف روحوں کے دنیا کے ساتھ رابطے کی واضح دلیل ہے۔

امام علی بن موسیٰ رضا علیہما السلام فرماتے ہیں:

**ما من عبد زار قبر مومن فقراء علیہ انا انزلنہ فی لیلة القدر سبع مرات**

**الا غفر الله له ولصاحب القبر**

جو شخص کسی قبر مومن کی زیارت کرے اور اس پر سات بار انا انزلنہ پڑھے تو خدا اسے اور صاحب قبر کو بخش

دیتا ہے۔ [۲]

بلکہ ایک روایت میں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک قبر کے پاس سے گزرے تو اس صاحب قبر کو عذاب الہی میں گرفتار پایا۔ ایک سال بعد دوبارہ وہیں سے گزر ہوا تو دیکھا کہ پہلے سے بہتر اور سکون میں ہے۔ جب بارگاہ الہی میں سوال کیا تو خطاب ہوا کہ یہ اس عمل خیر کی وجہ سے ہے کہ جو اس کے نیک و صالح فرزند نے انجام دیا ہے۔ اس نے ایک راستے کی مرمت کی ہے اور ایک یتیم کو پناہ دی ہے۔ [۳]

[۱] کافی۔ ج ۳ ص ۳۳۰ حدیث ۱

[۲] حجة البیضاء۔ ج ۸ ص ۲۹۰

[۳] بحار الانوار۔ ج ۶ ص ۲۲۰ حدیث ۱۵

متعدد روایات یہاں تک بتاتی ہیں کہ اگر انسان لوگوں کے درمیان کوئی اچھی سنت قائم کر جائے یا کسی بری سنت کی ابتداء کر جائے تو اس کے اثرات اس تک پہنچتے ہیں۔ اسی طرح صدقات جاریہ (وہ نیک کام کہ جو دائمی اثر رکھتے ہیں) کی برکات اس کو ایصال ہوتی ہیں۔<sup>[۱]</sup> امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

**ست خصال ینتفع بہا المؤمن من بعد موتہ: ولد صالح یتستغفر لہ و**

**مصحف یقرء فیہ، وقلیب یحفرہ وغرس یغرسہ، وصدقۃ ماء یجریہ**

**وسنۃ حسنۃ یوخذ بہا بعدہ**

چھ چیزیں ایسی ہیں کہ مومن اپنی موت کے بعد ان سے بہرہ مند ہوتا ہے۔ وہ نیک و صالح فرزند جو اس کے لئے استغفار کرے، وہ قرآن کہ جو لوگ پڑھیں، پانی کا کنواں جو کھودا گیا ہو، وہ درخت جسے کاشت کیا گیا ہو، وہ جاری پانی جو لوگوں کے اختیار میں دیا گیا ہو اور وہ نیک سنت کہ جس پر اس کے بعد عمل ہو۔<sup>[۲]</sup>

## ۵۔ کیا برزخ عمومیت رکھتی ہے؟

کیا وہ لوگ جو دنیا سے چل بے اور عالم برزخ میں منتقل ہو گئے۔ سب کے سب آگاہانہ زندگی سے مستفید ہو رہے ہیں یا بعض کی برزخی زندگی گہری نیند سونے والے افراد کی مانند غیر آگاہانہ اور بے شعور ہے گویا روز قیامت بیدار ہوں گے اور ہزاروں سال کو چند لمحوں کے برابر تصور کریں گے؟

سورہ روم آیت ۵۵ دوسرے معنی کی طرف اشارہ کرتی ہے:

**وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ يُقْسِمُ الْمُجْرِمُونَ لَمَّا لَبِثُوا غَيْرَ سَاعَةٍ ط**

اور جب قیامت برپا ہوگی تو گناہگار قسم کھائیں گے کہ انہوں نے (عالم برزخ میں) چند لمحوں سے زیادہ توقف نہیں کیا۔

البتہ یہ اس صورت میں ہے کہ آیت کو ”قیامت کے مقابلے میں دنیا یا عالم برزخ کو حقیر و ناچیز جاننا“ کے معنی میں نہ لیا جائے۔ (توجہ فرمائیے گا)۔

لیکن برزخ کی طرف اشارہ کرنے والی بعض آیات ظاہراً مطلق اور عام ہیں جیسا کہ سورہ مومنون کی آیت ۱۰۰ کہ جو ظاہراً تمام کفار

[۱] سنت حسنہ اور سیئہ سے مربوط روایات بحار الانوار۔ ج ۶۸ (بیروت الوفاء کی چھپی ہوئی) ص ۲۵۷ باب نمبر ۷۳

[۲] بحار الانوار۔ ج ۶ ص ۲۹۳ (باب ۱۰ حدیث ۱)



کے بارے میں ہے۔

ارشاد رب العزت ہے:

**ومن وراءهم برزخ الی یوم یبعثون**

اور انہیں آگے برزخ درپیش ہے تا روز قیامت۔

(لیکن یہ کہ پہلی آیت کو ”خاص“ کہا جائے اور اسے ”عام“ اور اس کے ذریعے اس کی ”تقیید و تفسیر“ کی جائے)۔ روایات میں بھی اس بات کا بار بار ذکر ہوا ہے کہ صرف دو گروہوں سے سوال قبر ہوگا۔ وہ لوگ جو خالص اہل ایمان ہیں یا خالص کفر پر قائم رہے، لیکن باقیوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے گا۔

ان روایات کو گذشتہ بحث میں بیان کر چکے ہیں اور مزید آگاہی کے لئے بحار الانوار۔ ج ۶ ص ۲۶۰ احادیث ۹۷، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰ ملاحظہ فرمائیں۔

البتہ ”یلہی عنہم“ (انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے گا یا ان سے صرف نظر کیا جائے گا) کی عبارت سے مراد یہ نہیں کہ ان کے لیے برزخ نہیں ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان سے قبر میں سوال نہ ہوگا۔ اس کے برعکس فشار قبر کی روایات سے پتہ چلتا ہے کہ یہ مسئلہ عمومیت کا حامل ہے اور بعض اولیاء اللہ کے علاوہ سب اس سے دو چار ہوں گے۔ (اس بارے میں روایات قبل بیان ہو چکی ہیں)۔

## ۶۔ فلسفہ برزخ

دنیاوی زندگی کا فلسفہ تو واضح ہے کہ یہ محل امتحان ہے۔ سیکھنے، سکھانے اور پرورش پانے کی جگہ ہے۔ علمی کمالات کے حصول اور دوسرے عالم کی تیاری کے لئے میدانِ عمل ہے۔ روایات اور بعض قرآنی آیات میں زمین کو کھیتی، درہ گاہ، میدانِ عمل، تجارت گاہ وغیرہ کے نام سے موسوم کیا گیا ہے، یا پھر اسے دوسری دنیا کے لئے عالم جنین قرار دیا گیا ہے۔ جب کہ آخرت انوار الہی کا مرکز، حق تعالیٰ کی عظیم عدالت، اعمال کے حساب کتاب کی جگہ، جوار رحمت باری تعالیٰ اور قرب خداوندی ہے۔

لیکن یہ سوال اپنی جگہ باقی ہے کہ فلسفہ برزخ کیا ہے؟

اس سوال کے جواب میں کہہ سکتے ہیں کہ دنیا و آخرت کے درمیان واقع ہونے والے عالم برزخ کا فلسفہ ہر اس فلسفہ کی مانند ہے جو متوسط مرحلے سے متعلق ہے چونکہ ایک محیط سے دوسرے محیط کی طرف منتقل ہونا کہ جو پہلے سے کئی طور پر مختلف ہو اسی صورت میں قابلِ تحمل ہو سکتا ہے کہ جب ایک درمیانی مرحلہ بھی موجود ہو، ایک ایسا مرحلہ کہ جس میں کچھ خواص پہلے مرحلے والے اور کچھ خصوصیات دوسرے مرحلے کی بھی پائی جاتی ہوں۔

علاوہ ازیں قیامت تمام انسانوں کے لئے ایک ہی دن برپا ہوگی کیونکہ زمین و آسمان ایک ہی دن میں زیر و برز ہوں گے اور ایک نئی

دنیا وجود میں آئے گی۔ پھر اسی نئی دنیا میں انسانوں کی حیات نو کا آغاز ہوگا۔ لہذا اس صورت حال کے پیش نظر اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں کہ دنیا و آخرت کے درمیان ایک برزخ ہوتا کہ ارواح ابدان مادی سے جدا ہو کر اس برزخ میں منتقل ہو جائیں اور دنیا کے خاتمے تک وہیں رہیں اور پھر دنیا کے خاتمے پر اور آغاز قیامت پر اکٹھی محسوس ہوں کیونکہ ممکن نہیں ہے کہ ہر انسان اپنے لئے جداگانہ قیامت رکھتا ہو، اس لئے کہ قیامت اس دنیا کے فنا ہونے اور زمین و آسمان کے ایک اور زمین و آسمان میں تبدیلی کے بعد رونما ہوگی۔

مزید برآں روایات سے پتہ چلتا ہے کہ مومنین کی تعلیم و تربیت میں رہ جانے والی کمی کی تلافی عالم برزخ میں ہوں گی۔ یہ درست ہے کہ وہ عمل صالح انجام دینے کا مقام نہیں ہے۔ لیکن اس کے پہلے سے زیادہ معرفت کے حصول اور آگاہی کے مقام ہونے میں کیا مانع ہے؟  
حضرت امام موسیٰ ابن جعفر علیہ السلام سے منقول ہے:

**من مات من اولیائنا وشیعتنا ولم یحسن القرآن علم فی قبرہ لیرفع**

**اللہ بہ من درجہ فان درجات الجنة علی قدر آیات القرآن یقل له اقر**

**وارق، فیقرأ ثم یرقی**

جو کوئی ہمارے دوستوں اور پیروکاروں میں سے مر جائے اور وہ اس وقت تک تعلیم قرآن سے مکمل طور پر بہرہ ور نہ ہوا ہو تو قبر میں اسے (قرآن کی) تعلیم دی جائے گی تاکہ خداوند تبارک و تعالیٰ اس وسیلے سے اس کے درجات بلند کرے چونکہ درجات بہشت قرآنی آیات ہی کی تعداد کے مطابق ہوں گے۔ اس سے کہا جائے گا کہ پڑھو اور اوپر چلتے جاؤ۔ وہ پڑھے گا (اور درجات بہشت) طے کرے گا۔ ﴿۱﴾

## ایک وضاحت

پہلے خیال یہ تھا کہ ”معاد در قرآن“ سے متعلق تمام بحث کو ایک ہی جلد میں جمع کر دیا جائے تاکہ رجوع کرنے میں آسانی رہے، لیکن عملاً ایسا مشکل دکھائی دیا کیونکہ معاد سے متعلق بحث اس قدر وسیع ہے کہ ممکن ہے نو سو سے ایک ہزار صفحے تک طول پکڑ جائے۔ (وہ بھی اختصار کا دامن تھامتے ہوئے)۔ بنا برآں ایک جلد بنانا مشکل تھی۔ لہذا مجبوراً کلیات معاد سے مربوط بحث کو ایک جلد میں اور اس سے متعلق خصوصیات کو دوسری جلد میں سمودیا گیا ہے۔ امید ہے کہ تاحداً امکان اس کا حق ادا ہو گیا ہوگا۔

خداوند! ہم جانتے ہیں کہ ہمیں ایک عظیم اور پرخطر سفر کا سامنا ہے اور ابھی تک ہم نے اپنے آپ کو اس کے لئے آمادہ نہیں کیا۔ لہذا ہمیں اس کے لئے جلد از جلد اور زیادہ سے زیادہ آمادگی کی توفیق مرحمت فرما۔

پروردگار! جب تیرا خاص بندہ علیؑ سیل اشک جاری کرتے ہوئے یہ فرماتا ہے کہ: ”سفر طویل ہے اور علیؑ کے پاس اس سفر کے لئے زادِ راہ کم ہے“

تو ہم ان خالی ہاتھوں کے ساتھ کیا کہیں؟ ہماری امید تو فقط تیرے بے انتہا لطف و کرم سے وابستہ ہے۔  
 لیکن ہمارا الہا! ہم جانتے ہیں کہ جو کچھ بھی ہے ایک ایسا عامل ہے جو اس دنیا سے کہیں والا تر و بالاتر ہے۔ اس ننگ، محدود اور تاریک عالم کی حدود سے کہیں زیادہ ہے اور ایک ایسا عامل ہے کہ جس پر تیرے انوار کا پے در پے بطور واضح و آشکار پرتو ہوگا اور وہاں قدرت و عظمت کے آثار روشن تر و تابندہ تر ہوں گے۔ تیرے اس روحانی دیدار کی نوید مسرت دی جائے گی جس سے ہم اس دنیا میں محروم رہے اور اس عظیم دعوت کی بشارت دی جائے گی کہ جس کے دسترخوان پر ایسی چیزیں ہیں کہ جنہیں کسی آنکھ نے دیکھا نہ کسی کان نے سنا اور نہ ہی کسی کے دل میں اس کا گزر ہوا۔“

**مَآلَا عَيْنِ رَا ت وَلَا اَذْنَ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلٰی قَلْبِ بَشَرٍ**

اے پروردگارِ بزرگ! ہمیں محروم نہ فرما۔

اختتام جلد پنجم

تفسیر موضوعی (قیام قرآن)

۱۶ جمادی الثانی ۱۴۱۱ھ